روبرو

{وقت کے اہم اور سلگتے ملی، سیاسی، تعلیمی اور زبان وادب کے مسائل
سے متعلق ملی قائدین، علماء ودانشوران کے انٹرویوز کا مجموعہ}

امین الدین شجاع الدینؒ
سابق رئیس التحریر 'تعمیر حیات'، مدیر 'بانگ حراء' لکھنؤ
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ترتیب
منور سلطان ندوی

ناشر
مکتبہ ندویہ
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	روبرو
مؤلف	:	امین الدین شجاع الدین
مرتب	:	منور سلطان ندوی
صفحات	:	۵۴۴
سن اشاعت	:	مارچ ۲۰۱۳ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	

ناشر
مکتبہ ندویہ
ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ لکھنؤ

ملنے کے پتے:
۞ الفرقان بکڈپو، نظیرآباد، لکھنؤ
۞ دارین بک ڈپو، ندوہ روڈ، لکھنؤ
۞ شباب بکڈپو، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

فہرست

دینی وملی مسائل

تعلیم اور تعلیمی ادارے

تحریکات

شخصیات

سیاسی مسائل

زبان، تہذیب اور معاشرت

کچھ اپنی زبان میں......

جب اس کتاب پر (جوانٹرویو پر مشتمل ہے) کچھ لکھنے کی بات آئی تو ماضی کی کئی یادیں تازہ ہورہی ہیں، مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن کا زمانہ تھااور ہمارے گھر میں بھائی صاحب کئی رسائل منگایا کرتے تھے،ان میں ایک میگزین ہما بھی آیا کرتا تھا میں اس کی ورق گردانی کرتا،لیکن اس کے دوکالم بڑے غور سے پڑھتا،ایک تو انٹرویو کا کالم اور ایک شکاریات کا کالم،انٹرویو کے کالم سے شغف ودلچسپی اتنی بڑھی کہ اب مجھے ماہنامہ ہما کا انتظار رہا کرتا، یہ انٹرویو کسی بڑی شخصیت سے لیا جاتا اورانٹرویو لینے والے تھے جناب عبدالوحید صدیقی جو ہما کے ایڈیٹر بھی تھے،اس میں بڑی بڑی شخصیتیں ہوتیں، عام طور سے وہ شخصیتیں جومشہور ومعروف ہوا کرتیں میں بغور ان کا مطالعہ کرتا اور لفظ بہ لفظ پڑھ ڈالتا، یہ شغف اتنا بڑھا کہ ہمارے اساتذہ کو بھی اس کا علم ہوگیا۔

نویں جماعت کے طلبا ایک قلمی میگزین (سالانہ) نکالا کرتے تھے، جب میں نویں جماعت میں پہونچا تو ہمارے استاذ ابوسفیان صاحب نے مجھے اس کا ایڈیٹر بنادیا، یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، میں نے جب اس سالانہ قلمی میگزین (جس کا نام تعمیر نو تھا) کا خاکہ بنایا تو اس میں اپنا پسندیدہ کالم انٹرویو شامل کردیا، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھئے اس میں ایک انٹرویو بھی ہوگا، تو ہمارے ساتھیوں میں سے بہت سوں نے کہا کہ یہ کیا بلا ہے، بہرحال میں نے اپنی بساط کے مطابق انہیں سمجھایا اور طے کیا کہ ان شاء اللہ ہم لوگ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر جناب غلام محمد مومن صاحب سے انٹرویو لیں گے، سوالنامہ بنایا اور غلام محمد مومن صاحب کے یہاں پہونچ گئے، انہوں نے سنا تو مسکرائے اور کہا آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں، میں نے سوال نامہ آگے بڑھادیا، انہیں کچھ حیرت ہوئی،

مجھ سے پوچھا یہ سوال نامہ کس نے بنایا ہے، میں نے کہا کہ خاکسار نے، اور ہما کا حوالہ دیا بہت خوش ہوئے، اور پورے شرح وانبساط کے ساتھ انٹرویو دیا جو ہمارے قلمی میگزین 'تعمیر نو' میں بھی شائع ہوا اور اسکول کے سالانہ میگزین شمع ادب میں بھی شائع ہوا، اس طرح یہ میری زندگی کا پہلا انٹرویو تھا جو میں نے لیا۔

اس کے بعد ایک طویل مدت تک انقلابات زمانہ کا شکار رہا، مولانا سلمان الحسینی سے مراسلت اور خط وکتابت ہونے لگی، جس پر دوتین برس گزر گئے، ایک خط میں مولانا نے لکھا کہ آپ یہاں آجایئے، میں مولانا کی دعوت پر لکھنؤ آگیا، اور مولانا نے مجھے بانگ درا کا ایڈیٹر بنادیا، چنانچہ بانگ درا کا خاکہ بناتے وقت اس میں بھی انٹرویو کا کالم شامل کیا، ندوہ ایک عالمی ادارہ ہے، یہاں آئے دن بڑی بڑی شخصیات آتی رہتی ہیں، چنانچہ مجھے بانگ درا کے ذریعہ ایک میدان مل گیا اور بانگ درا میں پورے آب وتاب کے ساتھ انٹرویو شائع ہوتے رہے، اور وہ کالم پرچہ کی شناخت بن گیا، اس کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی نے اپنے پرچہ ہدایت جے پور کے لئے بلایا، اوران کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے تعمیر حیات لکھنؤ کی ادارت سپرد کردی، وہاں بھی وقتاً فوقتاً انٹرویو شائع ہوتے رہے، لیکن بانگ درا میں مجھے کھل کر لکھنے اورانٹرویو شائع کرنے کی آزادی تھی اس میں مولانا سلمان الحسینی کی فراخدلی کو دخل تھا۔

زیر نظر مجموعہ ''روبرو'' میں آپ تنوع پائیں گے، مختلف میدانوں کے میدان کار کے انٹرویو ملاحظہ کرسکیں گے، سوالات پوچھتے وقت ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوجائے یا کسی کی شخصیت سے متعلق انٹرویو ہو تو اس میں بھی حیات وخدمات کا ایک تعارف آجائے، مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنے مخدوم ومحترم اور محسن ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کا انٹرویو لیا جوان کی شخصیت سے متعلق تھا تو مولانا نے فرمایا کہ آپ کا انٹرویو میرے لئے وزیٹنگ (Visiting Card) کارڈ بن گیا ہے، اس مجموعہ میں ایسے انٹرویوز بھی آپ دیکھ سکیں گے جن کا تعلق ملت اسلامیہ کے مختلف مسائل سے ہے اور خصوصاً یہ کہ وہ سلگتا ہوا

موضوع رہا ہو مثلاً شیعہ سنی قضیہ، یا بابری مسجد کا مسئلہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اس مجموعہ میں ملی مسائل کی ایک جھلک آپ کو ملے گی، اور اس سلسلہ میں زعمائے ملت کی آراء بھی آپ کو دکھائی دیں گی، عموماً جو باتیں اخبارات میں نہیں آیا کرتیں اور موضوع سے متعلق ہوتی ہیں وہ آراء بھی اس میں آگئی ہیں، جس سے اس مجموعہ کی اہمیت انشاء اللہ بڑھ جاتی ہے، زیر نظر مجموعہ کے تعلق سے ان ہی باتوں پر اکتفا کیا جارہا ہے اس لئے کہ بہت تفصیل سے یہ باتیں مقدمہ اور اس سے متعلق دیگر مضامین میں آچکی ہیں۔

اب شکریہ کی باری ہے لیکن شکریہ سے پہلے شکر ادا کرتا چلوں اس پاک پروردگار کا جس نے موقع عطا کیا، اس کے فضل وکرم اور توفیق کے بغیر سارے ارادے ناکام ہیں، ان زعمائے ملت کا شکریہ جنہوں نے انٹرویو کے لئے نہ صرف وقت دیا بلکہ میرے روا یا ناروا ہر سوال کا جواب عنایت فرمایا، اس کے بعد اس کے نیک بندوں کا ذکر کرتا چلوں، سب سے پہلے تو ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کا جو اللہ کی رحمت کو پہونچ گئے، مولانا سلمان الحسینی کا اور حضرت شاہ محمد فضل الرحیم مجددی کا شکریہ ادا کروں کہ ان حضرات نے مجھے موقع عنایت فرمایا ورنہ موقع کے بغیر ساری صلاحیتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، ان کے بعد مولانا محمد ولی رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر کا کہ موصوف نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور اس کتاب کے لئے ’کتاب اور صاحب کتاب‘ کے نام سے ایک وقیع مقدمہ تحریر فرمایا جس میں میری ہمت افزائی کا سامان موجود ہے، ان کے بعد فقیہ الامت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا کہ انہوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود مقدمہ تحریر فرمانے کے لئے وقت نکالا اور ایک ایسا مقدمہ تحریر فرمادیا جس میں زیر نظر مجموعہ ’روبرو‘ کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے اور انٹرویو پڑھنے کا جذبہ جاگتا ہے، اس کے بعد اپنے دیرینہ کرم فرما صحافی جناب عالم نقوی کا شکریہ کہ موصوف نے اس مجموعہ کی ورق گردانی کے بعد اپنی تحریر سپرد قلم کی، ان سب کے بعد باری آتی ہے جناب مولانا منور سلطان ندوی کی کہ یہ کتاب ہرگز منظر عام پر نہ آتی اگر انہوں نے تحریک نہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد ترتیب کا بوجھ گوارہ نہ کیا ہوتا، ان کے

بعد شکریہ عزیز القدر اشفاق احمد وانی کشمیری کا کہ جو اس کتاب کے ہر مرحلہ میں میرے معاون بنے رہے اور جو کام میرے ذمہ ہوسکتا تھا اس کی ذمہ داری بھی انہوں نے اوڑھ لی، اس طرح میں نے انہیں دعائیں دی نہیں بلکہ ان کے کام اور خلوص نے از خود مجھ سے دعائیں لی ہیں، رب کریم ان کو جزائے خیر دے!

بات نامکمل رہے گی اگر میں عبداللہ اعظمی ندوی کا شکریہ نہ ادا کروں جنہوں نے آخری پروف دیکھنے کی زحمت گوارہ کی، سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ قدر کے ساتھ مکتبہ ندویہ کا جو اس کتاب کا ناشر ہے، جناب نجیب الرحمٰن مللی ندوی اور عبیدالرحمٰن رضوان ندوی کا کہ ان عزیزوں نے مجھے ہمت دلائی اور میں اس کام کو آگے بڑھ کر کر سکا۔

بس دعا ہے اس پاک پروردگار سے کہ جس کی توفیق کے بغیر سارے ارادے ناکام ہیں کہ وہ اس مجموعہ کو نافعیت بخشے اور پڑھنے والوں میں اس سے احساس زیاں اور احساس عمل جاگے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

۱۴؍جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ
۷؍اپریل ۲۰۱۲ء

امین الدین شجاع الدین
ندوہ، لکھنؤ

مقدمہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی
ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

کسی کی فکر سے استفادہ کے لئے جہاں اس کا خطاب اور اس کی تحریر بیحد اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہیں اس کا ایک مؤثر اور مفید طریقہ انٹرویو بھی ہے، بلکہ بعض جہتوں سے انٹرویو کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ جب کوئی شخص اپنے طور پر زبان وقلم کے ذریعہ اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے تو وہ ان افکار پر روشنی ڈالتا ہے جو اس کی نظر میں اہم ہیں، جن مسائل کی اہمیت اس پر واضح نہیں ہے، وہ ان پر اظہار خیال نہیں کرتا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کی اہمیت سمجھنے کے باوجود کسی مصلحت کی وجہ سے گریز کا راستہ اختیار کرتا ہے، اسی طرح ان مسائل کے بارے میں ان کی رائے لوگوں تک نہیں پہونچ پاتی، لیکن انٹرویو میں اگر سوال کرنے والا مسائل کا شعور رکھتا ہو، زمانہ شناس اور بالغ نظر ہو تو وہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق انٹرویو دینے والے کے خیالات کو منظر عام پر لے آتا ہے اور جن سوالات سے لوگ بچنا چاہتے ہیں حالانکہ اس پر ان اظہار خیال کرنا چاہیے، ان پر بھی اظہار خیال کے لئے متعلق شخص کو مجبور کر دیتا ہے، اگر اس جہت سے غور کریں تو تقریر وخطاب اور تصنیف وتالیف سے بڑھ کر انٹرویو کے ذریعہ کسی شخصیت کے افکار وخیالات سامنے آتے ہیں اور چونکہ اس میں بار بار سوال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اس لئے انٹرویو کے ذریعہ زیادہ واضح اور غیر مبہم طور پر باتیں سامنے آتی ہیں۔

اسی لئے انٹرویو معلومات کشید کرنے اور ان کو قارئین تک پہونچانے کا ایک مفید

ذریعہ رہا ہے، حدیث میں بھی بہت سے مضامین اس طرح وارد ہوئے ہیں کہ صحابہ نے سوالات کئے اور حضور ﷺ نے جوابات ارشاد فرمائے، سلف صالحین کے یہاں بعض ایسی تالیفات ملتی ہیں کہ جو اگرچہ کسی خاص فن اور موضوع سے متعلق ہیں لیکن وہ ایک شخص کے سوال کرنے اور ایک عالم کے جواب دینے پر مبنی ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر ابن سحنون مالکی کی "المدونۃ" کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو ایک واسطہ سے امام مالک کے شاگرد ہیں، یہ پوری کتاب اسی منہج پر ہے کہ امام مالک سے یا ان کے بعض جلیل القدر تلامذہ سے سوالات کئے گئے اور انہوں نے جوابات دئے، یہ کتاب فقہ مالکی کی اساس وبنیاد ہے، اس طرح کی بعض اور گراں قدر تالیفات اسلامی علوم کی تاریخ میں موجود ہیں۔

موجودہ عہد میں انٹرویو کے ذریعہ معلومات کے حصول کا طریقہ زیادہ زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ بڑی اہم معلومات حاصل کی جاتی ہیں، بشرطیکہ انٹرویو لینے والا زیرک، معاملہ فہم، زمانہ شناس اور زیر بحث موضوع کی مختلف جہتوں سے واقف ہو، اور جس شخصیت سے انٹرویو لیا جا رہا ہو وہ بھی اسی طرح باخبر، محترم جناب امین الدین شجاع الدین صاحب کا یہ مجموعہ "روبرو" ان دونوں خوبیوں کا حامل ہے، ان انٹرویو میں انہوں نے جو سوالات کئے ہیں اس سے ان کی زمانہ شناسی بھی ظاہر ہوتی ہے اور شخصیت شناسی بھی، یعنی انہوں نے ایسے سوالات کئے ہیں جو اس وقت ملت اسلامیہ کے لئے نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اور ان گوشوں کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے جن پر لوگ کھل کر اظہار خیال نہیں کرتے، نیز ہر شخصیت سے ایسے سوالات کئے ہیں جو ان کے مزاج ومذاق، ان کی خدمات اور ان کی فکری رجحانات سے ہم آہنگ ہیں، واقعہ ہے کہ انٹرویو میں جوابات سے زیادہ اہمیت سوالات کی ہوتی ہے کہ انٹرویو لینے والے نے کن سوالات کا انتخاب کیا ہے اور جناب امین الدین شجاع الدین صاحب کے یہ انٹرویو سوالات کے حسن انتخاب کی بہترین مثال ہے۔

انہوں نے انٹرویو کے لئے قوم وملت کی ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جو اپنے اپنے میدان میں امتیاز اور تفوق کے حامل ہیں، اور ان موضوعات کے لئے شاید ان سے بہتر شخصیتوں کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا، انہوں نے اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ

انٹرویو صرف معلومات کا ذخیرہ نہ ہو بلکہ ان میں ملت کے لئے فلاح وکامیابی کا پیغام بھی موجود ہو، اور یہ پیغام اس طریقہ پر قارئین تک پہونچایا جائے کہ دماغ بھی اس کو قبول کرے اور دل بھی اس پر آمین کہے۔

انٹرویو میں چونکہ ملے جلے موضوعات ہوتے ہیں اور خاص کر جس کسی ہمہ جہت شخصیت سے سوال کیا جاتا ہے تو اس میں مختلف النوع مسائل زیر بحث آجاتے ہیں، اس لئے ان کو مختلف عناوین کے تحت تقسیم کرنا آسان نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہے کہ مرتب شعور وادراک کی دولت سے مالا ہو، تاکہ وہ کسی انٹرویو کی ترجیحات کو متعین کرسکے، انٹرویو لینے والے کی شخصیت کا جو نمایاں پہلو ہے اس جہت سے اس نے جو پیغام دیا ہو، اس کو بنیاد بنا کر عنوان قائم کرے، بحمداللہ ان انٹرویو کے مرتب عزیز الاعز گرامی قدر مولانا منور سلطان ندوی نے بہت بہتر طریقہ پر اس فریضہ کو انجام دیا ہے، اور مختلف مرکزی عنوانات کے تحت انٹرویو کو تقسیم کیا ہے، اور پھر ہر انٹرویو کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اس کے لئے کسی دلچسپ فقرہ یا کسی اہم بات کو انتخاب کیا جائے، اس طرح یہ ایک خوبصورت اور مفید وبہتر مجموعہ کی شکل میں قارئین کے سامنے ہے۔

اس مجموعہ کے ذریعہ جہاں اہم شخصیتوں کے افکار وخیالات سے واقفیت حاصل ہوگی، امت کو پیغام ملے گا، بعض نئے گوشے سامنے آئیں گے، وہیں جب آنے والی نسل اس کتاب کو پڑھے گی تو اس کے لئے اس کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہوگی، اور وہ اس کے آئینہ میں اپنے ماضی کو پڑھ سکیں گے، اپنے حال کو درست کرسکیں گے اور اپنے مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کرنے میں ان سے مدد حاصل کریں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اسے قبول فرمائے اور اسے امت کے لئے نافع بنائے، **وباللہ التوفیق وبہ المستعان**

۲/اپریل ۲۰۱۲ء　　　خالد سیف اللہ رحمانی
نزیل مہمان خانہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

کتاب اور صاحب کتاب

مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ
سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر

مولانا امین الدین شجاع الدین صاحب لانبے عرصہ سے چھپ رہے ہیں، میری ان سے ملاقات پہلے اوراق پر ہوئی، یہ پندرہ سولہ سال پرانی بات ہے، دید وشنید بعد کا قصہ ہے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ کی حیثیت سے آگئے، تو ملنے کی گنجائش اور بات چیت کا موقعہ نکل آیا، پھر تو جب بھی قدم بڑھے، جن ملاقاتوں کی خواہش جاگی، ان میں ایک ملاقات مولانا امین الدین شجاع الدین سے بھی رہا کی ہے، یہ اثر ہے ان کی شخصیت، شرافت، اور قلم کا!

مولانا یکسو قسم کے آدمی ہیں، زندگی کے ساتھ، مگر زندگی کے ہنگاموں سے دور، ان کے یکسو مزاج کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ موبائل رکھتے ہیں، میں نے دسیوں مرتبہ انہیں فون کیا، کبھی بات نہ ہوسکی، ہمیشہ سوئچ آف کی صدائے دلخراش کان سے ٹکرائی، ایک ملاقات میں ٹوکا، کہ مولانا آپ کا موبائل کبھی گویا بھی ہوتا ہے؟ کہنے لگے عصر بعد گفتگو ہوتی ہے، میں نے کہا عصر کے بعد بھی میری کوشش ناکامی پر ہی ختم ہوئی، کہنے لگے کسی صاحب سے گفتگو کررہا ہوں گا، میں نے پوچھا آپ تک رسائی کا کوئی وقت بھی ہے، وہ گویا ہوئے تدریسی اور تحریری کاموں کی وجہ سے بقیہ اوقات بند رکھتا ہوں، کوئی ضرورت آپڑی تو کھول لیتا ہوں، انہوں نے اتنے نرم لہجہ میں یہ بات کہی کہ ان کے ساتھ مجھ کو بھی مسکرانا پڑا، یعنی مولانا آپ سب کو سنا دیتے ہیں، کسی کی سننا نہیں چاہتے، جواب میں پھر ایک معصومانہ مسکراہٹ!

میری ان سے ملاقات کا سلسلہ مضامین سے شروع ہوا، میں ان کے مضامین پڑھتا

اور پسند کرتا تھا، ایک عرصہ تک یہ پسندیدگی ملاقات کی راہ نہ بنا سکی، ان کی تحریری شناخت یہ ہے کہ صاف ستھری لکھتے ہیں، آسان اور بے ساختہ زبان میں، رواں دواں جیسے گرمی کے موسم میں گنگا کا بہاؤ، وہ لفظوں کا قطب مینار کھڑا نہیں کرتے، اور نہ عربی الفاظ کی بھرمار سے جامع مسجد تعمیر کرتے ہیں، وہ اردو دانوں کے لئے لکھتے ہیں، اس لئے بول چال کی زبان اردو میں لکھتے ہیں، اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کی نئی نسل نہ عربی خواں رہی ہے، نہ فارسی داں، سمے کے ابھاؤ میں اردو پڑھنے لکھنے کے لئے وہ وقت نہیں نکال پاتی، اس لئے سہل نہیں، آسان لکھتے ہیں، عام فہم مگر عامیانہ سے دور، اور مجھے ان کی یہ قلمی روایت اچھی لگتی ہے بہت اچھی!

ان کے وجود میں دردمندی رچی بسی ہے، حافظہ اچھا ہے، اور ذہن متحرک رہتا ہے، اس لئے ملی مسائل پر سوچتے رہتے ہیں، اور کوئی ''شخصیت'' مل گئی تو طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں، اور جوابات کو حافظہ کی امانت بناتے جاتے ہیں، ابھی جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ انہیں ملاقاتوں اور یادوں کا نچوڑ ہے، ضروری نہیں کہ وہ کسی سے سوالات کر رہے ہوں تو اسے معلوم بھی ہو کہ باقاعدہ انٹرویو ہو رہا ہے، چھپنے کے لئے...... اس لئے بے خبری کا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا دل میں اتر کر تہہ کی بات معلوم کر لیتے ہیں، پھر دوسروں تک پہونچا دیتے ہیں، اس خطرناک کاروائی کا شرعی حکم کیا ہوگا، اسے تو فقیہ شہر سے پوچھئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سچی بات، دل کی بات لوگوں تک پہونچ جاتی ہے، اور مصلحت کی دبیز چادر سرک کر حقائق کا جلوہ دکھا جاتی ہے!

مولانا امین الدین شجاع الدین کی ان ملاقاتوں اور باتوں کا سلسلہ برسوں پر پھیلا ہوا ہے، کچھ ملاقاتی دنیا سے چلے گئے، اور کچھ ''ملاقات زدہ'' فرشتہ اجل کے انتظار میں ہیں، مولانا نے ''روبرو'' میں ان ملاقاتوں کو محفوظ کر دیا ہے، مگر اس کتاب کو خراج عقیدت نہ سمجھئے، یہ ''خراج زندگی'' ہے، خاصے پڑھے لکھے، زمانہ کے بل کو دیکھے پرکھے، سمجھے لوگوں کی باتیں بڑے کام کی ہوتی ہیں، زندگی کے تجربات کا نچوڑ، جس میں ماضی حال سے لے

کر مستقبل تک کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، کم وقت میں زیادہ معلومات کے لئے انٹرویو بہترین نسخہ ہے، اس کتاب سے انٹرویو کے ذریعہ آپ تھوڑے وقت میں بہت کچھ جان لیں گے، جس میں ''شخصیت'' کے ساتھ مولانا امین الدین شجاع الدین کے چابکدست قلم اور عمدہ حافظہ کا کمال بھی ہے، کتاب پڑھ جائیے، دسیوں جگہ آپ اپنے اندر سوچ کی ابھرتی لہریں محسوس کریں گے اور لگے گا کہ جیسے آپ کے کان میں کوئی کہہ رہا ہو ؎

ابھی خزاں تھی ابھی لہلہا اٹھا گلشن
میں اپنا رنگ تخیل چمن پہ ڈال آیا

اس طرز کی چیزیں بازار میں آتی رہی ہیں، اور اردو ادب کے خزانہ کی رونق بڑھاتی رہی ہیں، ملاقاتیں (جناب الطاف حسین قریشی اردو ڈائجسٹ لاہور) اس صف کی شاہکار اور نمبر ایک کی چیز ہے، ''روبرو'' اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے، گہری سوچ، اونچے خیالات، عمدہ تجزیئے اور الفاظ کے خوبصورت انتخاب کا بہترین مجموعہ ہے، اگر آپ نے یہ کتاب خریدی ہے تو پڑھ جائیے، آپ محسوس کریں گے کہ قیمت وصول ہوگئی، اگر آپ نے یہ کتاب ''حاصل'' کی ہے تو بھی پڑھ لیجئے مفت میں مالال ہوں گے۔

۲۰/مارچ ۲۰۱۲ء (حضرت مولانا) محمد ولی رحمانی
سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر

قحط الرجال میں ایک رجل امین!

سید عالم نقوی

گروپ ایڈیٹر اودھ نامہ لکھنؤ

امین الدین شجاع الدین صاحب کو پڑھ کر بے ساختہ دل سے ان کے لئے دعائیں نکلتی ہیں، قحط الرجال کے اس عہد میں ان کا دم غنیمت ہے ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے!

ان کی پہلی کتاب نقوش فکر و عمل دو سال قبل پڑھی تھی۔ ہم اسی وقت سے ان کی منزلت علمی کے معترف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اسی کو یہ سعادت بخشتا ہے جو اس کے حصول کے لئے ویسی ہی جدوجہد کرتا ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ ان کی تیسری کتاب ہے۔ 2009 میں ’نقوش فکر و عمل‘ اور 2011 میں ’ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم‘ شایع ہوئیں اور اب مختلف زعمائے ملت کے انٹرویوز پر مشتمل یہ کتاب آپ کے روبرو ہے۔ اس میں شامل اکابرین کے انٹرویوز پڑھ کے بار بار مختار مسعود یاد آئے جنہوں نے اپنی معرکۃ آرا کتاب ’آواز دوست‘ میں لکھا ہے کہ ’’ قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط۔ حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالَم موت کی ناحق زحمت کا۔ اور دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں‘‘

پہلے ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم ، اور اب ’روبرو‘ پڑھ کر قحط الرجال کا یہ غم اور شدید ہو جاتا ہے کہ ہائے یہ ہم نے کیسے کیسے گہر ہائے آبدار کھو دیے۔ کہنے کو اول الذکر وفیات پر مشتمل مضامین کا انتخاب اور زیر نظر مختلف ملی شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی کتاب ہے لیکن یہ دونوں ہمارے عہد کی تاریخی دستاویز ہیں۔

یہ کتاب انٹرویوز پر مبنی ہے اور ہر انٹرویو کے دو حصے ہوتے ہیں ایک سوال اور دوسرے جواب۔ اور اہل نظر جانتے ہیں کہ اگر سوال ہی اچھا دوٹوک اور تہ دار نہ ہو تو جواب دینے والے سے بھی ہمیشہ کسی عبقریت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آپ اس مجموعے میں شامل انٹرویوز پڑھیں، آپ دیکھیں گے کہ اگر سوال ہی اتنے صاف شفاف واضح، برمحل، جامع گہرے اور وقیع نہ ہوتے تو انٹرویو دینے والا بھی اپنے جواب میں ٹانکنے کے لئے ہیرے موتی کہاں سے لاتا؟ صرف ہم ہی نہیں مولانا کلب صادق بھی اس کے معترف ہیں۔ ان کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

’’جوابات سے تو مسائل پر انسان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہی ہے۔ خود سوالات بھی مسائل کی بصیرت اور مسائل پر گرفت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ آپ نے سوالات کا جو خاکہ میرے سامنے رکھا ہے اس سے ماشاءاللہ خود آپ کی اسلامی بصیرت اور مسائل پر گرفت کا اندازہ ہو رہا ہے ان میں کچھ سوالات تو ایسے ہیں جو حقیقتاً کسی تحقیقی مقالے کا بہترین عنوان قرار پاسکتے ہیں۔‘‘ انٹرویو کرنے والے (Interviewer) کے لئے غیر جانبداری کی صفت اس حد تک ضروری ہوتی ہے کہ وہ اپنے کسی سوال سے اس شخصیت کو جس کا وہ انٹرویو لے رہا ہے خواہ مخواہ Hurt نہ کرے، اذیت نہ پہنچائے اور مسئلہ کتنا ہی متنازع کیوں نہ ہو، ’فریق‘ بن کر سوال نہ کرے بلکہ ایک غیر جانبدار Third Person کی طرح مسئلہ مذکور میں اس کی، انٹرویو دینے والے کی رائے معلوم کرے۔ برادر محترم امین الدین صاحب اس ’پل صراط‘ کو بھی بآسانی پار کر گئے ہیں۔ یوں تو پوری کتاب ہی اس کا ثبوت ہے۔ لیکن مولانا عبدالعلیم فاروقی اور مولانا سید کلب صادق نقوی کے انٹرویوز بطور

خاص دیکھے جاسکتے ہیں۔اس جگہ ہم ایک بات کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم بذات خود غیر جانبداری کے نہیں حق کی طرفداری کے قائل ہیں کیونکہ غیر جانبداری یا Non Alignment جیسی کوئی چیز دنیا میں فی الواقع پائی ہی نہیں جاتی اوراسلام بھی ایسی غیر جانبداری کا قائل نہیں جس میں حق کے بجائے طاغوت اورعدل کے بجائے ظالم کی حمایت یا تلبیس حق و باطل کا شائبہ ہو۔اوپر ہم نے جس بات کی تعریف کی ہے وہ ایسی غیر جانبداری نہیں جس میں حق کی طرفداری نہ ہو بلکہ سائل، یا انٹرویور(Interviewer) کی وہ کیفیت ہے جو خالص احترامِ آدمیت اوراحترامِ نفسِ مسلم سے پیدا ہوتی ہے۔

یوں تو اس میں ہر انٹرویو ایک سے بڑھ کے ایک ہے اور ہر وہ شخصیت جس سے انٹرویو لیا گیا ہے اپنے اپنے میدانِ کار کی مجاہد ہے لیکن ہمارے نزدیک روبرو میں شامل مولانا مجاہد الاسلام قاسمی اور مولانا کلب صادق کے انٹرویو آل کتاب اور حاصل مطالعہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نکالنا بھی درست نہیں کہ ہم خدانخواستہ بقیہ شخصیات یا ان کے افکار کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔نہیں ہرگز نہیں۔فی الواقع یہ پوری کتاب ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں فطرت کے سبھی رنگ اپنی آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں اوراس متنوع کائنات کی متنوع انسانی زندگی میں اپنی اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ہم امین الدین شجاع الدین صاحب کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس ہیچ مداں کو اس لائق سمجھا،اللہ سے دعا ہے کہ ان کی سعی کو مشکور فرمائے اوران سے اسی طرح اپنے کام لیتا رہے۔

السید محمد عالم النقوی
گروپ ایڈیٹر روزنامہ اودھ نامہ
لکھنؤ(یوپی)

28فروری 2012ء
مطابق 5ربیع الثانی 1433ھ

مرحوم بھائی امین الدین شجاع الدینؒ

آغاز زندگی سے سانحہ ارتحال تک

(یکم دسمبر ۱۹۵۵ء۔۷جون ۲۰۱۲ء)

کسی کی موت سے غمگین یا افسردہ ہونا ایک فطری امر ہے،جس سے جس کا جتنا قرب وتعلق ہوتا ہے غم کی کیفیت بھی اس پر اسی قدر حاوی ہوتی ہے،مرحوم امین الدین شجاع الدین راقم آثم کے حقیقی بھائی تھے،عمر میں وہ مجھ سے تین برس بڑے تھے،نصف صدی سے زائد عرصہ کا تعلق تھا،وہ میرے لئے ایک مخلص بھائی ہی نہیں بلکہ ایک مربی،ایک محسن،ایک مشفق،ایک رہنما،ہر معاملہ میں صحیح مشورہ دینے والے،ایک مخلص دوست اورایک سچے پکے مسلمان تھے،ان کی موت کی خبر سن کر چند دنوں تک ایسا محسوس ہوتا رہا کہ گویا میری ہی موت ہوگئی،ان کے انتقال پر تاثرات اورجذبات کے اظہار کے لئے خود کو قاصر پا رہا تھا،لیکن صبر اللہ جل شانہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے،اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اور ہمارے نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق تین دن سے زیادہ غم منانے کی اجازت نہیں،وقت کے لمحات ہر زخم کو مندمل کردیتے ہیں اور صبر وشکر کے ساتھ انسان زندگی کی راہوں پر گامزن ہوجاتا ہے۔

۷؍جون ۲۰۱۲ء مطابق ۱۷؍رجب ۱۴۳۳ھ کو آپ کا وقت موعود آپہنچا،اور داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہمیں داغ مفارقت دے گئے،آپ سے زندگی کے مختلف مراحل میں پچاس برسوں سے زائد عرصہ کا ساتھ رہا،بچپن کا زمانہ،طالب علمی کا دور،ثانوی تعلیم کے لئے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی،مہاراشٹر کالج ممبئی،بی این این کالج بھیونڈی کا دور،امین بھائی کے مختلف خطابات اور بحیثیت مقرر آپ کی ایک منفرد شان،دارالعلوم ندوۃ العلماء

میں بطور طالب علم حاضری، یہاں سابق مہتمم مرحوم مولانا ابوالعرفان خان ندوی صاحبؒ کی سرپرستی اور تعاون، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار سے متاثر ہوکر مختلف فکروں کو اپنانا، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سے عرصہ دراز سے وابستگی، جے پور میں بانی جامعہ ہدایت حضرت شاہ عبدالرحیم مجددیؒ سے تعلق، لکھنؤ میں محترم مولانا سید سلمان حسینی ندوی سے خط وکتابت اور بانگ حراء کی ادارت، ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاذ تقرر، تعمیر حیات کی ادارت اور رئیس التحریر کی ذمہ داری قبول کرنا......!

امین بھائی کا والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی طیب الدین کے ساتھ عمرہ کی غرض سے بیت اللہ شریف مکہ مکرمہ میں ۲۰۰۲ء میں حاضری، ۲؍نومبر ۱۹۸۵ء میں والد محترم کے انتقال کے وقت اور ۲؍دسمبر ۲۰۰۲ء میں والدہ مرحومہ کے وصال کے وقت امین بھائی کا موجود رہنا......۳؍جون ۲۰۱۲ء کو امین بھائی کی مختصر سی علالت، حیات اسپتال لکھنؤ میں بغرض علاج داخل ہونا، کچھ ہوش آنے پر سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے کی فرمائش کرنا، ۴؍جون ۲۰۱۲ء کو فہمینہ اسپتال میں داخل ہونا، مرض وعلالت میں اضافہ اور ۷؍جون ۲۰۱۲ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملنا، ندوۃ العلماء کے کیمپس میں محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا بھائی امین الدین شجاع الدین کی نماز جنازہ پڑھانا، آخری آرام گاہ کی طرف ہزاروں کے ہجوم میں ندوۃ العلماء سے ڈالی گنج قبرستان تک جنازہ کا لے جایا جانا، تدفین کے بعد محترم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کا قبرستان میں بھائی امین الدین کے حق میں دعائے مغفرت کرنا......وغیرہ جیسے تمام مراحل یکے بعد دیگرے ذہن میں محفوظ ہیں اور بھائی امین الدین کی حیات مستعار کے بچپن تا ستاون برس کی عمر کے درمیان یا آغاز زندگی سے سانحۂ ارتحال تک کے تمام مراحل گویا نگاہوں کے سامنے گردش کررہے ہیں......!!

خاندانی پس منظر

مرحوم کے الفاظ میں ’’کسی شخصیت کی تعمیر میں کن لوگوں کا ہاتھ رہا؟ یہ اس شخصیت کے تعلق سے بڑا اہم سوال ہے‘‘ (ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم، ص: ۱۹۹) یہ سچ ہے کہ کسی کی

شخصیت سازی میں اس کا خاندانی پس منظر، والدین کی تربیت، زمانۂ طفولیت میں تعلیم وتربیت کا ایک سازگار ماحول اور لائق وفائق اساتذہ کرام کا میسر ہونا جیسے کئی عناصر شامل ہوتے ہیں، بھائی امین الدین کی یہ خوش قسمتی رہی کہ انہیں خداترس اور آخرت کو ہر معاملہ میں مقدم رکھنے والے والدین کی تربیت حاصل رہی، بھائی امین الدین پر والد محترم کی شخصیت کے کافی اثرات مرتب ہوئے، معاملات میں صاف گوئی، حق کی حمایت، مردم شناسی، دیانت داری، ایمان داری سے اپنے فرائض کی ادائیگی، اور ہر کام میں یکسوئی و اخلاص جیسی صفات انہیں والد مرحوم کی جانب سے ملیں، بعض دفعہ یہ گمان ہوتا ہے کہ دولت کی بجائے یہ خوبیاں انہیں وراثت میں ملی تھیں۔

یہاں برسبیل تذکرہ والد مرحوم کے احوال وکوائف کا مختصر خاکہ بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے، والد مرحوم شیخ شجاع الدینؒ کا سن پیدائش ۱۹۱۲ء ہے، جد محترم کو تقریباً ایک صدی قبل ۱۹۰۳ء میں حاصل شدہ لاکھوں کی جائیداد میں سے والد مرحوم کو کوئی حصہ حاصل نہیں ہوا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ والد محترم کی ولادت سے ایک دن قبل دادا مرحوم کی وفات ہوئی تھی، اور جائیداد کے سارے معاملات والد صاحب کے چچا کے ماتحت آگئے تھے، والد مرحوم نے زندگی کے حقائق کو بہت قریب سے دیکھا، اور اللہ رب العزت پر مکمل توکل و اعتماد کرتے ہوئے اپنے چچا کی طرف سے دئے گئے ہر ظلم کو بسروچشم قبول کیا، اپنے قریبی عزیز واقارب کے ہر ستم کو صبر وتحمل سے برداشت کیا، لیکن زبان پر شکایت کا کوئی لفظ کبھی آنے نہیں دیا، یہاں تک کہ والد محترم کے حقیقی چچا نے خنجر کی نوک پر جائیداد کی تمام دستاویز پر والد صاحب کے دستخط لے لئے، لیکن ایسے چچا کو بھی والد مرحوم نے موت سے ایک دن قبل معاف کردیا، اور ہم تمام بھائیوں کو بلا کر کہا کہ خاندان کی لاکھوں کی اس جائیداد اور وراثت کو میں چھوڑ چکا ہوں، آپ حضرات کو میری یہ وصیت ہے کہ کبھی اس جائیداد کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھنا، اللہ کی ذات پر بھروسہ کرکے اپنی زندگی گزارنا اور دنیا پر آخرت کو ہمیشہ ترجیح دینا، الحمدللہ ایسے ماحول میں امین بھائی کی پرورش ہوئی، جن کی بناء پر افکار کی بلندی،

عزائم کی پختگی، اللہ پر توکل وبھروسہ اور دنیا سے بے رغبتی جیسے جذبات کو تقویت حاصل ہوئی ،اور یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی میں فکر ونظر کا محور ہمیشہ آخرت پر مرکوز رہا۔

چند خصوصی اوصاف

ع ان کی خوبیاں باقی ان کی نیکیاں زندہ

بھائی امین الدین کی بعض خصوصیات کو الفاظ کا پیراہن نہیں دیا جاسکتا، وہ عوام الناس سے کچھ مختلف نظر آتے تھے، مثلاً نہ کسی ذاتی خواہش کا اظہار، نہ کوئی چیز خریدنے کی آرزو، نہ نئے کپڑے سلوانے کا شوق، نہ بینک بیلنس جمع کرنے کا جنون، نہ زمین وجائیداد بنانے کی فکر، فکر تھی تو خاندان کے بچوں کی کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کرلیں، فکر تھی تو معاشرہ کی، نوجوان طلبا کی کہ وہ صحیح سمت اور صحیح وقت پر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرلیں، انہیں خود اپنا احساس شاید کبھی نہیں رہتا تھا، احساس رہتا تو ملت کے مسائل کا، درد وکڑھن ہوتی تو ملت اسلامیہ کے لئے، ایسا محسوس ہوتا کہ شاید وہ کسی اور صدی کے انسان ہیں، آج کے دور میں ایسے لوگ کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہوا کرتے ہیں، نہ کسی سے انتقام لینے کا جذبہ ان میں تھا، نہ کسی کو ضرر پہونچانے کا، نہ کسی کے خلاف سازش، کسی نے انہیں ستایا تو اس کے ساتھ بھی درگزر کا معاملہ ہی نہیں بلکہ اس کے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام بھی کرتے تھے، اور کبھی کسی کو کچھ کہہ دیا تو فوراً تحریری طور پر اس سے معافی کے طلبگار ہوتے تھے، اور جب تک وہ معاف نہ کردے چین سے نہ بیٹھتے تھے۔

بھائی امین الدین اب اپنے مالک وخالق کے حضور حاضر ہوچکے ہیں ،اللہ انہیں بہترین جزا وصلہ عطا فرمائے، صلح جوئی کی بھی ایک خوبی ان میں موجود تھی، انتقال سے ایک ماہ قبل انہوں نے متعلقین کے دو گروہ میں صلح کی کوشش کی تھی، اللہ کے فضل سے دو خاندان علاحدگی سے بچ گئے، اس ضمن میں راقم سے دن میں کئی مرتبہ ٹیلی فون پر رابطے کا اتفاق ہوتا تھا، اللہ اپنے اس بندے کی اس نیکی کو قبول فرمائے اور آخرت میں بہترین اجر عطا فرمائے، آمین! اور اپنے اس بندے کی مغفرت فرمائے جس کی زندگی کا ایک پہلو صلح جوئی کا بھی تھا!

دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دوسروں کی ضرورت پر اپنی ضرورت کو قربان کردیتے تھے، اندرا گاندھی میموریل میونسپل جنرل اسپتال بھیونڈی میں راقم آثم میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے طبی خدمات پر مامور تھا، دریں اثناء بھائی امین الدین ندوۃ العلماء سے لکھنؤ تعطیل پر گھر آئے تھے، ممبئی کے ایک سفر میں آپ کی اپنے ایک سابق طالب علم سے ملاقات ہوئی، دوران گفتگو موصوف نے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا جس کے حل کے لئے ایک خطیر رقم کی ضرورت تھی، بھائی صاحب کو جب اس طالب علم کی پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے سال بھر کی پس انداز رقم کو یکمشت اسے سونپ دیا، اور وہ طالب علم اپنے وطن عزیز روانہ ہوگئے، ان تفصیلات کا علم ہونے پر راقم محو حیرت ہوا، تو مرحوم نے کہا کہ شاید اس طالب علم کو اس رقم کی مجھ سے زیادہ ضرورت تھی، آج وہ منظر نگاہوں کے سامنے ہے اور ہاتھ بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہے کہ اے باری تعالی! دوسروں کی ضرورت پر اپنی ضرورت کو قربان کرنے والا شخص آج عالم برزخ کے دور سے گزر رہا ہے اور تجھے اس کی ہر ضرورت کا علم ہے، اے اللہ! آپ اپنی رحمت اور مغفرت کے دروازے کھول دیجئے اور اپنے شایان شان رحم وکرم کا معاملہ فرمائیے، آمین!

بچپن کی چند یادیں

اللہ کے فضل وکرم سے بھائی امین الدین شجاع الدین میں بچپن ہی سے چند خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، آپ کی تحریر بہت خوش خط ہوتی تھی، انہیں ابتدائی جماعت میں اساتذہ کے مختلف ریمارکس جیسے خوب، بہت خوب حاصل ہوتے تھے، گفتگو وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور صاف کرنے کے عادی تھے، چھوٹا ہو یا بڑا دونوں سے انتہائی احترام کے ساتھ مخاطب ہوتے تھے، گھر پر والد مرحوم شجاع الدینؒ (اللہ انہیں غریق رحمت کرے) کے حکم پر انہیں عصری علوم کے لئے اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول میں شامل کیا گیا، گھر پر بڑے بھائی محی الدین شجاع الدین جو بذات خود ایک کامیاب معلم کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں، ان کی نگرانی میں روزانہ دو تین صفحات اردو املا لکھنے کے عادی تھے، جس کی بنا پر آپ کا خط

خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔

بچپن ہی سے بھائی صاحب کو خط نویسی کا شوق تھا، یاد آتا ہے کہ آپ کی عمر تقریباً ۷، ۸ر سال کی رہی ہوگی، ایک دن آپ کو کہیں سے ایک پوسٹ کارڈ ہاتھ آ گیا، آپ نے اس پر چند کلمات لکھ کر بذات خود سپرد ڈاک کرنے کی نیت سے ڈاک خانہ کا رخ کیا، چھوٹی عمر کے تھے، گھر سے مدرسہ اور اسکول کے راستے معلوم تھے، ڈاک خانہ کے راستے کا علم نہیں تھا، خط نویسی کے شوق نے انہیں کسی طرح ڈاکخانہ تک تو پہونچا دیا لیکن واپسی میں گھر کا راستہ بھٹک گئے، اور کئی گھنٹوں بعد شام کو گھر پہونچے، والدین کے استفسار پر علم ہوا کہ انہیں محض خط لکھنے کے شوق میں یہ ساری مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرنے کی نوبت آئی۔

ثانوی جماعت کے دوران بارہا آپ کو فی البدیہ تقریری مقابلوں میں انعامات بھی حاصل ہوئے، ۶۷۔۱۹۶۸ء میں لائنس کلب آف بھیونڈی کی جانب سے پی آر ہائی اسکول بھیونڈی کے وسیع ہال میں ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کے عنوان پر کی گئی آپ کی تقریر کے نقوش آج بھی ذہن میں نقش ہیں۔

بچپن میں وہ بھیونڈی شہر کے معروف ترین مقررین مرحوم شبیر احمد راہی صاحب اور مرحوم جناب ابراہیم مدعو صاحب کی عوام الناس میں کی گئی تقاریر کو گھر آ کر لفظ بہ لفظ انہیں کے لہجہ میں سنایا کرتے تھے، زمانۂ طفولیت میں انہیں گھر کے قریب واقع جماعت اسلامی ہند کی شاخ بھیونڈی کے ماتحت درسگاہ اسلامی میں روزانہ صبح کے چند گھنٹے دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوا، جہاں مرحوم مولانا عبداللطیف اصلاحی صاحب، مرحوم محمد حسین اسلمی صاحب اور حافظ سعید احمد صاحب (مقیم حال لندن) جیسے اساتذہ کرام کی سرپرستی اور رہنمائی انتہائی مفید ثابت ہوئی، بچپن سے ہی آپ کو جماعت اسلامی شاخ بھیونڈی کے دارالمطالعہ سے استفادہ کا موقعہ ملا جس کی بناء پر عصری علوم کے ساتھ دینی علوم بھی حاصل کرنے کا شوق وذوق غالب ہوتا گیا۔

سائنس کے مضامین میں خصوصاً الجبرا، جومیٹری، فزکس، کیمسٹری اور بائیلوجی (طبیعات،

کیمیا اور حیاتیات) سے آپ کو نفرت تو نہیں تھی، لیکن ادب ولسانیات کی جانب آپ کی توجہ نسبتاً کچھ زیادہ ہی تھی، اور شاید یہی سبب تھا کہ میٹرک (۱۹۷۲ء) کے امتحان میں اس وقت رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کے پرنسپل مرحوم عبدالغنی خان سرگروہ صاحب نے امین بھائی کو جب ہائر میتھس (Higher Maths) الجبراء جومیٹری لینے پر اصرار کیا تو مستقل انکار کرتے رہے، بالآخر اسکول کے ایک داخلی امتحان میں جوابی پرچہ میں پرنسپل کے نام ایک تفصیلی مضمون ضبط تحریر میں لایا، جس کا نفس مضمون یہ تھا کہ طلبہ پر جبراً کسی ایسے مضمون کو لادا نہ جائے جس میں ان کی دلچسپی نہ ہو، بلکہ طلبہ کے مزاج کو سمجھا جائے اور اسی کے مطابق ان کی دلچسپی کے مضامین کا انتخاب کیا جائے، تاکہ مستقبل میں وہ اس میدان میں مزید نکھار اور عبور حاصل کر سکے، جوابی پرچہ میں مضمون کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پرنسپل سرگروہ صاحب نے بھائی امین الدین کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی بجائے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میٹرک امتحان میں آپ کے لئے انہیں مضامین کا انتخاب کیا جسے وہ چاہتے تھے، بہرکیف۔

بات کتنی ہی بے سلیقہ ہو مگر
بات کرنے کا سلیقہ چاہیے

کے مصداق اپنی بات کو انتہائی سلیقے سے پیش کرنے اور فطری جسارت ان کے اندر بچپن ہی سے بدرجہ اتم موجود تھی۔

بھائی صاحب کا صحافتی سفر

بچپن ہی سے انہیں مضمون نگاری کا بھی شوق تھا، یاد آتا ہے زمانۂ طالب علمی میں طلبا کے لئے ایک تحریری سیرت نبوی کے مقابلہ میں بھی آپ نے ممتاز حیثیت حاصل کی تھی، گھر پر والد محترم مرحوم شجاع الدین شیخ صاحبؒ خصوصی طور پر اسلامی فکر کے ماحول کو برقرار رکھنے کے حامی تھے، اور بڑے بھائی محی الدین شجاع الدین (جو بھیونڈی میں ۱۹۵۷ء سے شعبۂ تدریس سے منسلک تھے بعد ازاں ممبئی میونسپل کارپوریشن سے سبکدوش ہوئے) کی

نگرانی میں گھر پر مختلف اسلامی فکر کے جرائد ورسائل مثلاً نور (رامپور) غنچہ (بجنور) نشیمن (بنگلور) دعوت (دہلی) ہدیٰ (دہلی) صدق جدید (لکھنؤ) وغیرہ گھر پر مطالعہ کے لئے دستیاب رہتے تھے، یقیناً امین بھائی پر اس کے مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے، اور مضامین کو با قاعدہ پڑھنے اور لکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

یاد آتا ہے ۶۸۔۶۷ء میں جب بھائی امین الدین ساتویں درجہ کے طالب علم تھے، آپ کا پہلا مضمون یا اولین قلمی کاوش ''گلاب'' نامی عنوان سے روزنامہ انقلاب اور مائل خیرآبادی کے معروف رسالہ حجاب میں شائع ہوئی، آٹھویں جماعت ۶۹۔۶۸ء میں آپ نے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کے سالانہ جریدہ شمع ادب میں کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے اس دور کے نائب صدر مرحوم جی ایم مومن (غلام محمد مومن صاحب) سے انٹرویو لیا اور شمع ادب رسالہ میں طلباء کی نمائندگی کی۔

غالباً ۱۹۶۸ء کی بات رہی ہوگی، مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی موت پر مادر علمی رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں ایک تعزیتی جلسہ رکھا گیا، اس وقت کے پرنسپل مرحوم جناب عبدالغنی خاں سرگروہ صاحب نے طلباء سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ کیا ان طلبہ میں سے کوئی ہے جو اسٹیج پر آ کر جمال عبدالناصر کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کرے، یاد آتا ہے اس زمانہ میں ٹیلی ویژن اور دیگر وسائل کی سہولت نہیں تھی، صرف اخبارات کی سرخیوں اور ریڈیو پر نشر کی جانے والی خبروں ہی سے حاصل شدہ مواد پر اکتفا کرتے ہوئے بھائی امین الدین نے جمال عبدالناصر کے عنوان پر ایک (Extempor) فی البدیہہ تقریر کی تھی۔

۷۱۔۷۰ء میں جب آپ دسویں جماعت کے طالب علم تھے، رئیس ہائی اسکول میں اردو زبان کے استاذ گرامی محترم ابوسفیان اعظمی صاحب کی نگرانی میں ایک قلمی رسالہ ''تعمیر نو'' کو انتہائی محنت ومشقت سے قلمبند کیا تھا جو شاید آج بھی رئیس ہائی اسکول کی لائبریری میں بطور ریکارڈ موجود ہے۔

۱۹۷۲ء میں رئیس ہائی اسکول کی جانب سے منعقدہ ریاستی سطح کا ایک تقریری مقابلہ

ہوا، جس میں بھائی امین الدین نے کل مہاراشٹر تقریری مقابلہ میں ''یاران تیز گام نے منزل کو جالیا'' نامی عنوان پر پہلا انعام حاصل کیا تھا۔

۷ر مئی ۱۹۷۰ء بروز جمعرات ہندوستان کا مانچسٹر کہلانے والا صنعتی شہر بھیونڈی میں ہندو مسلم فساد ہوا، اس کے متعلق خود بھائی امین الدین کے اپنے الفاظ میں ''۷ر مئی ۱۹۷۰ء میں بھیونڈی میں بھیانک ہندو مسلم فساد برپا ہوا، جس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا، متاثرین سے ملنے کئی اہم شخصیات بھیونڈی آئیں، خود وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی بھی تشریف لائیں، لیکن تین شخصیتوں کا آنا اور ان سے ہجوم میں ملنا اب تک یاد ہے، ایک یونس سلیم صاحب، دوسرے قائد ملت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب صدر انڈین یونین مسلم لیگ، اور تیسرے غلام محمود بنات والا صاحب، ان ملاقاتوں نے گویا ایک آگ لگا دی، بنات والا صاحب سے میری خط وکتابت اور قربت انہی دنوں کی بات ہے'' (ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم، ص: ۹)

مرحوم جناب غلام محمود بنات والا سے ملاقات اور خط وکتابت نے بھائی امین الدین پر مہمیز کا کام کیا اور ملت اسلامیہ کے مختلف مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل ڈھونڈنے کی سمت ایک رخ بھی متعین کیا۔

یاد آتا ہے ۷۲۔۷۱ء میں جب آپ یازدہم کے طالب علم تھے، کرلا قریش نگر بمبئی کے ایک وسیع گراؤنڈ میں جناب غلام محمود بنات والا صاحب کی موجودگی میں آپ کو ہزاروں کی تعداد میں موجود مجمع سے خطاب کا موقع ملا، ملت اسلامیہ کے کسی اہم موضوع پر آپ کی تقریر تھی، سن صغیر کا ایک طالب علم عوام الناس سے مخاطب تھا، اور مجمع سے بار بار اللہ اکبر اور ہمت افزائی کے کلمات کی صدا سنائی دے رہی تھی، آپ کی تقریر کے اختتام پر اسٹیج پر جناب غلام محمود بنات والا فوراً مائک پر آئے اور سارے مجمع کے سامنے بھائی امین الدین کو مبارک باد دی، اور کہا کہ اس نوجوان سے مجھے قوی امید ہے کہ یہ ملک وملت کے کام آئے گا، اور انشاء اللہ مستقبل میں قوم وملت کا درخشاں ستارہ ثابت ہوگا۔

۱۹۷۲ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا، اور بمبئی

یونیورسیٹی سے منسلک ہوکر مہاراشٹر کالج میں آرٹس فیکلٹی میں داخلہ لیا، بھیونڈی سے تھانہ اور تھانہ سے بائیکلہ ٹرین سے ہر دن کے سفر کے آپ متحمل نہیں ہوسکے، ایک دن غلطی سے کسی اور جگہ جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے، کالج میں تاخیر ہوجائے گی یہ جان کر چلتی ٹرین سے آپ کود پڑے، مزاج میں سادگی تھی، بمبئی شہر کی تگ ودو آپ کے مزاج کے خلاف تھی، زخمی ہاتھ کے ساتھ شام میں گھر لوٹے، والدین اور گھر کے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ بھیونڈی ہی میں موجود بی این این کالج میں آپ داخلہ لے لیں، اور دوسرے دن سے مہاراشٹر کالج جانے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

بہرکیف! بی این این کالج میں ادبی سرگرمیاں اور وسائل محدود تھے، لیکن یہاں کالج آتے ہی آپ کو کالج کی بزم اردو کا سکریٹری بنادیا گیا، خود امین بھائی کے الفاظ میں:

''کالج کا پہلا سال تھا، وہاں اردو شعبہ کے تحت بزم اردو ایک انجمن تھی جس کے پروگراموں کے تحت طلباء جمع ہوتے، کسی بڑی شخصیت کو بلایا جاتا اور اس کا کسی عنوان پر لکچر ہوتا، میں اس کا سکریٹری بنادیا گیا، اس کے تحت مختلف شخصیتوں کو کالج میں بزم اردو کے تحت آنے کی دعوت دی گئی، مجھے یاد ہے کہ بزم اردو کے عنوان سے میں سب سے پہلے کرشن چندر سے ملا، ان کے بعد مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی کے یہاں جانا ہوا، ان شخصیتوں سے ملاقاتیں ایک مستقبل عنوان ہے'' (ملنے کے نہیں نایاب ہیں، ص:۹)

کالج کے سالانہ جریدے میں چند صفحات اردو کے طلبہ کے لئے مختص تھے، اس میں بھائی امین الدین کا ایک مضمون ''جنگ آزادی میں اردو کا حصہ'' شائع ہوا، جسے علمی حلقے میں انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اسکول کے زمانہ میں اردو ادب اور تحریر وتقریر کے فن میں دسترس حاصل کرنے میں بھائی امین الدین نے اپنے محسن اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

''میرے اساتذہ کی محبت اور ہمت افزائی ہمیشہ مرے لئے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی رہی، ان میں حافظ سعید صاحب، جناب عبدالجبار ہانی، جناب ابوسفیان صاحب، جناب

شمس الدین ڈیلنگسکر اور پروفیسر یونس گاسکر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں''

(ملنے کے نہیں نایاب ہیں ص:۹)

کالج کے زمانہ ہی میں آپ کے مضامین سہ روزہ دعوت، تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اور روزنامہ انقلاب بمبئی سے شائع ہوتے تھے، دریں اثناء ہندوستان کے شعلہ بیان مقرر، خطیب اور معروف عالم دین مولانا سید سلمان حسینی صاحب سے بھائی امین الدین کی گذشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں سے خط وکتابت رہی تھی، ان کے خطوط کا مجموعہ مختلف ملی مسائل پر مبنی ہوتا تھا۔

بعد ازاں آپ کو ندوۃ لکھنؤ میں علمی وفکری اور دینی مزاج کا ایک وسیع میدان کار حاصل ہوا، محترم مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے آپ کو بانگ حراء کی ادارت سونپی، جے پور راجستھان میں جامعہ ہدایت کے امیر محترم فضل الرحیم مجددی صاحب نے ماہنامہ ''ہدایت'' جے پور کی ادارت کا اعزاز بخشا، اور پھر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کی توجہ نے آپ کو تعمیر حیات کی ادارت سنبھالنے پر آمادہ کیا، بھائی امین الدین نے ان تمام بزرگوں کا ہمیشہ انتہائی قدر ومنزلت سے تذکرہ کیا ہے اور بارہا اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

وکالت اور تجارت متعلق کچھ یادیں

تعلیم کی تکمیل کے بعد امین بھائی کو دو چیزوں کا اشتیاق رہا، ایک وکیل بننے کا اور دوسرے تجارت کا، شہر کے ایک نامور وکیل کے ساتھ چند ماہ آپ نے عدالت میں بھی وقت گذارا، آپ کے شوق کو دیکھتے ہوئے ابتدا میں والد صاحب نے آپ کو کچھ نہیں کہا، مگر آہستہ آہستہ والد کی گفتگو میں اصلاحی پہلو نمایاں ہونے لگا، والد صاحب اس کو اسلامی نقطہ نظر سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، خود امین بھائی کو بھی محسوس ہونے لگا کہ یہاں قانون کے نام پر قانون شکنی کی جاتی ہے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو فن سمجھا جاتا ہے، چنانچہ والد صاحب کی توجہ سے دھیرے دھیرے امین بھائی کے دل سے وکیل بننے کی خواہش ختم ہوگئی، حالانکہ اگر وہ اس میدان میں رہتے تو بڑے وکیل ہوتے، کیونکہ وہ اچھے مقرر ہونے کے ساتھ انگریزی پر عبور رکھتے تھے، اور بحث ومباحثہ میں سامنے والے کو قائل کرنے

کا ہنر خوب جانتے تھے۔

بہر حال وکالت سے واپسی کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہوئے، کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی کے اس وقت کے سکریٹری جناب مرتضی فقیہ صاحب نے انگلش میڈیم اسکول میں بحیثیت معلم آپ کا انتخاب کیا، یہاں کئی سال تک آپ نے اردو زبان پڑھایا، بعد میں کسی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔

اس کے بعد اسلامی علوم کی حصولیابی کی نیت سے ندوۃ العلماء کا رخ کیا، یہ ۱۹۷۵۔۷۷ کا زمانہ تھا، ندوہ جانے سے قبل دودھ کا کاروبار کیا، اس وقت آپ کے ذہن میں تجارت کا شوق چھایا ہوا تھا، امین بھائی کے اصرار پر میں بھی شریک تھا، ''زمزم دودھ سنٹر'' شروع کیا، یہاں بھی امین بھائی کی فیاضی، سادہ دلی، اور فراخ دلی کا سلسلہ جاری رہا، آخر ایک دن قبولیت کی گھڑی آ گئی، امین بھائی ندوہ کی طرف روانہ ہوئے، اور راقم کا داخلہ ایم بی بی ایس میں ہو گیا، اس طرح دودھ کی تجارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انتقال سے قبل کے حالات

ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم احمد علی ہاشمی ندوی کی جانب سے ارسال کردہ ایک ای میل میں تحریر کردہ تفصیلات سے بھائی صاحب کے انتقال سے قبل کے حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، احمد علی ہاشمی لکھتے ہیں:

''۳ جون ۲۰۱۲ء بروز اتوار صبح دس بجے کوارٹر کے صحن میں امین الدین شجاع الدین صاحب نیم بیہوشی کی حالت میں پائے گئے، فوراً لکھنؤ کے حیات اسپتال میں داخل کرایا گیا، علاج شروع ہوا، بخار کی شدت کم ہوئی، شوگر نارمل ہونے پر آپ کو ہوش آیا، اپنا نام ڈاکٹر کو خود بتایا، دن میں تقریباً ایک بجے دوبارہ سو گئے، کچھ دیر بعد بیدار ہوئے تو پوچھے جانے پر پانی مانگا اور یٰسین شریف کی تلاوت کرنے کو کہا، بس یہی آخری آواز تھی، لیکن ڈاکٹر کی ہر بات کو سمجھتے اور جب کوئی عیادت کو آتا تو اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کرتے، ۳/جون کی رات ۲/بجے تک حیات اسپتال میں رہے، ۴/جون کو فہمینہ نرسنگ ہوم کے آئی سی یو

(ICU) میں منتقل کیا گیا، ۵/، ۶/ اور ۷/جون کی صبح پونے چھ بجے تک (انتقال کے وقت تک) آئی سی یو میں کوما (COMA) میں رہے، اور اسی عالم میں دار فانی سے رخصت ہوئے، اور داعی اجل کو لبیک کہا، نماز جنازہ بعد نماز عصر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے پڑھائی، اور آخری تکبیر تک بھی دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی، ندوہ کے ہزاروں طلباء واساتذہ اور لکھنؤ شہر کی سرکردہ شخصیات اور نامور صحافیوں کی موجودگی میں ڈالی گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی''

بھائی امین الدین کے انتقال سے چند دنوں قبل راقم الحروف کے دو بھتیجے عادل اختر رحیم الدین اور عبدالماجد طیب الدین بمبئی سے لکھنؤ فہمینہ اسپتال پہنچ گئے، برادر معظم طیب الدین شجاع الدین بنگلور کی سمت ایک تبلیغی سفر پر تھے، امین بھائی کی کیفیت کو جان کر آپ بنگلور تا لکھنؤ بذریعہ فلائٹ تدفین کے بعد ہی ڈالی گنج قبرستان پہنچے، جہاز کی تاخیر کی وجہ سے آپ براہ راست قبرستان پہونچے، لیکن تدفین ہو چکی تھی، بھائی طیب الدین آج بھی کف افسوس ملتے ہیں کہ کاش چند منٹ فلائٹ میں تاخیر نہیں ہوتی تو شاید تدفین میں کم از کم شرکت کا موقع مل جاتا، بہرکیف بھائی طیب الدین اس عاجز راقم سے تو بہتر ہیں، کیونکہ راقم سطور اس وقت غریب الوطن ہونے کے ناطے ہزاروں کیلومیٹر دور تھا، اور حسرت ویاس کے عالم میں تمام خبروں کو ٹیلی فون پر موصول کر رہا تھا۔

راقم کا قیام مکۃ المکرّمہ میں تھا، بھائی امین الدین کی موجودہ صورت حال کا ٹیلی فون سے لکھنؤ مستقل رابطہ قائم تھا، ندوۃ کے طلبا میں خصوصاً احمد علی ہاشمی ندوی اور حسیب اللہ ندوی اور دونوں بھتیجوں عادل اختر اور عبدالماجد وغیرہ سے راقم مستقل ربط میں تھا اور پل پل کی خبر موصول ہو رہی تھی، حرم مکی شریف میں طواف اور دعاؤں کا اہتمام جاری تھا اور نگاہ بارگاہ رب العزت کے فضل وکرم پر تھی کہ سبحانہ تعالی جو بھی فیصلہ فرماتے ہیں اس پر ہم سب آمنا صدقنا کہتے ہیں۔

میرے ایک بھتیجے عبدالماجد طیب الدین جو ایم فارم (ماسٹرس آف فارمیکالوجی) کے

طالب علم ہیں، بھائی امین الدین کے متعلق انہوں نے آئی سی یو سے تدفین تک تمام تفصیلات کا جو منظر کھینچا ہے اس کا اختصار قارئین کی خدمت میں لفظ بہ لفظ پیش کر رہا ہوں:

۵؍جون ۲۰۱۲ء بروز منگل عصر کے قریب ہم لکھنؤ اسٹیشن سے آٹو رکشا سے فہمینہ اسپتال پہونچے، جہاں ندوۃ العلماء کے طلباء ہمارے منتظر تھے، طلبا میں خصوصاً احمد علی ہاشمی اور محمد انس وہاں موجود تھے، آئی سی یو میں چچا کی طبیعت کچھ اس طرح تھی: غذا پہونچانے کی ایک نلکی کے ذریعہ سیال غذا معدہ تک پہونچائی جا رہی تھی، سانس لینے کی آواز کافی تیز تر تھی، بیہوشی کا عالم تھا، آنکھیں بند تھیں، بلڈ پریشر کافی کم تھا، دل کی دھڑکن نارمل سے کم تھی، تیمارداری کے لئے طلبہ خود کو پیش کر دیتے تھے، اور ذرا سی ضرورت پر فوراً الرٹ ہو جاتے تھے۔

آئی سی یو میں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، دن میں تین مرتبہ ہی ملنے دیا جاتا، ان ہی اوقات میں ہم بھی اندر جاتے، ندوۃ العلماء سے طلبا جو اسپتال میں امین چچا کو دیکھنے آتے وہ لمبی قطار میں کھڑے رہتے، ندوہ کے اساتذہ کرام اور لکھنؤ کی معروف شخصیات بھی قطار میں کھڑے دکھائی دیتے، سب کے لبوں پر ذکر و دعائیں اور اللہ سے ہر کوئی رجوع دکھائی دیتا، ہر شخص ہمیں ہمت و حوصلہ دیتا۔

۶؍جون بدھ کی صبح فجر بعد ہم آئی سی یو میں پہونچے، زم زم پلایا گیا، دودھ لانے کے لئے کہا گیا لیکن وہ پلایا نہیں جا سکا، دال کا پانی منگایا گیا لیکن اسے بھی چھوڑ دیا گیا، بدھ کے دن چچا کو آئی سی یو میں دیکھنے والوں کی قطاریں لگی رہیں، جن میں خصوصاً مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سلمان حسینی ندوی، مولانا عبداللہ حسنی، پروفیسر مسعود الحسن عثمانی (جن سے پہلے ہی اسپتال میں ۲،۳ مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی) مولانا کلب صادق اور مولانا عبد العلیم فاروقی کی آمد ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔

امین چچا کا بلڈ پریشر مستقل کم ہو رہا تھا، اسپتال کے فزیشین ڈاکٹر اتل رستوگی سے ملاقات ہوئی، انہوں نے صحت میں بہتری کی کوئی امید ظاہر نہیں کی، ۶؍جون کی رات دس بجے تک ندوۃ العلماء سے آنے والے طلبا اور اساتذہ کی قطاریں جاری رہیں، ہم نیچے آئی

سی یو میں شب ڈیڑھ بجے تک موجود رہے، بلڈ پریشر مستقل کم ہوتا جا رہا تھا، طلبہ نے ہمیں تھوڑی دیر آرام کی غرض سے کمرے میں بھیج دیا۔

جمعرات کی گھڑی شروع ہو چکی تھی، صبح صادق کے وقت تقریباً چار بجے طلبا ہمیں بلانے آئے، ہمیں آئی سی یو میں اندر بلایا گیا، ڈاکٹر نے بتایا کہ دل کی دھڑکن تیزی سے کم ہو رہی ہے، اور مصنوعی طور پر تنفس جاری رکھ سکتے ہیں، ڈاکٹروں کی ٹیم نے سی آر پی (Cardio Pulmonary Resussitition) دیا، لیکن چند لمحے بعد دل کی دھڑکن اللہ کے حکم سے مکمل بند ہو گئی، ای سی جی (Electro Cardiogram) محض ایک لکیر کی طرح دکھائی دینے لگا، غذا کی نلکی، آکسیجن کی نلکی IVFluids اور دیگر لوازمات کو ہٹا دیا گیا، صبح ۵؍بجکر ۴۵؍منٹ کا وقت رہا ہوگا جب ۷؍جون بروز جمعرات دنیا کا سورج طلوع ہو رہا تھا لیکن امین چچا کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لئے بحکم اللہ رب العزت غروب ہو رہا تھا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون!**

آئی سی یو میں موجود تمام حضرات کی آنکھیں چھلک گئیں، چند لمحات ایک سکوت طاری رہا، پھر تمام متعلقین کو ٹیلی فون پر اطلاع دینا شروع کر دی گئی، تھوڑی دیر بعد ایمبولینس کا انتظام کیا گیا اور امین چچا کے جنازہ کو ندوۃ العلماء لے جایا گیا، اور ندوہ کے مہمان خانہ میں رکھا گیا، چونکہ گرمی شباب پر تھی، طلباء نے فوری طور پر برف کی ایک سل کا انتظام کیا اور نعش کو اس پر رکھا گیا، اور کولر لگا کر مزید ٹھنڈک پہونچائی گئی۔

ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں طلباء، اساتذہ، جملہ اسٹاف اور شہر لکھنؤ سے آنے والوں کا گویا ایک ہجوم سا لگ گیا، ہر کوئی امین چچا کے اخلاق سے، سادگی سے، اور منکسر المزاجی سے بہت متاثر تھا، امین چچا سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتا، اور ہم لوگوں سے بڑی ہمدردی سے مصافحہ کرتا اور انتہائی خلوص سے تعزیت کا اظہار کرتا، اس دن ہمیں اتنے لوگوں سے مصافحہ کا اتفاق ہوا کہ شاید زندگی میں دوبارہ کبھی ایسا موقعہ نہیں ملے گا۔

گرمی انتہائی شدت پر تھی، تدفین کے لئے ہر کوئی جلدی کرنے پر آمادہ تھا، حضرت

مولانا رابع صاحب اس وقت رائے بریلی میں تھے،اور آپ کے حکم کا انتظار تھا، ابا جان (بھائی طیب الدین) شام چھ بجے تک بنگلور سے بذریعہ فلائٹ پہونچنے والے تھے،اس لئے ہم تدفین میں تاخیر کے خواہشمند تھے،حضرت مولانا رابع صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا گیا،مولانا محترم رائے بریلی سے تشریف لائے،اور آپ ہی کے مشورہ سے عصر بعد نماز جنازہ کا اعلان کیا گیا۔

۷/جون کو ظہر بعد ہمیں امین چچا کے کمرہ پر جانے کا اتفاق ہوا، جیسے ہی ہم نے اندر قدم رکھا، پڑوس کے مکان سے ایک معصوم بچہ نے ہم سے سوال کیا کہ امین دادا کہاں ہیں اور کب آئیں گے؟ ہمارے پاس اس وقت معصوم بچہ کو کچھ کہنے کے لئے کوئی جواب نہیں تھا ،امین چچا کے کمرے کی صورت حال دیکھ کر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ آج کے اس دور میں بھی ایسے اہل اللہ ہیں جو درویشانہ اور قلندرانہ مزاج رکھتے ہیں،آپ کے کمرے سے انتہائی سادگی وانکساری کا اظہار ہو رہا تھا،لکڑی کا بنا ہوا ایک تخت،ایک صندوق،الماری میں تین چار جوڑے کپڑے،کتابیں اور کچھ ضروری کاغذات......چند پرانے چیک جو بینک میں جمع نہیں کئے گئے تھے (انہیں بینک سے کیش کروا کر استعمال میں لانا تو بہت دور کی بات!) وغیرہ وغیرہ کا مشاہدہ کیا گیا۔

اسی دوران آفس اسٹاف کے متعلقین میں سے ایک صاحب وہاں تشریف لائے،اور کہنے لگے کہ امین الدین صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایک درخواست بھی کبھی اپنی تنخواہ بڑھانے کے لئے نہیں بھیجی، حالانکہ سینئریٹی کے مطابق وہ اس کے پورے حق دار تھے، بعد میں آفس والوں نے ازخود آپ کی تنخواہ بڑھانے کی ذمہ داری لے لی، طلباء نے بتایا کہ آپ اکثر اپنا کمرہ کھلا رکھتے تھے، جس کی بناء پر فون چوری ہو جاتے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے چور کی شناخت کر لی، جب چچا کو بتایا گیا تو انہوں نے انتہائی لاپروائی سے مسکرا کر کہہ دیا کہ جانے دو، اسی بہانے اب نیا فون لے لیں گے! حالانکہ چوری کیا فون صرف ایک ہفتہ قبل ہی خریدا گیا تھا۔

کمرہ دیکھنے کے بعد ہم مہمان خانہ واپس آئے، جہاں تعزیت کرنے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، کوئی شاگرد چہرے کے قریب کافی دیر تک دعائیں کرتا، کسی کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، طلباء نے بتایا کہ یہ واحد استاذ تھے جو کسی بھی وقت کسی بھی قسم کا سوال پوچھنے پر انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ بڑی خوشی سے تفصیل بتا دیتے تھے،اور کبھی کسی طالب علم سے آپ نے کوئی خدمت نہیں لی۔

تقریباً ۴/بجے عصر سے قبل آپ کو غسل دیا گیا، طلباء کے ساتھ ہم بھی شریک ہوئے، غسل دینے والوں میں خصوصاً چند اساتذہ کرام اور طلباء موجود تھے، عصر کی نماز میں ندوۃ العلماء کی وسیع وعریض مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، نماز جنازہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے پڑھائی، نماز کے بعد لوگ فوراً مسجد سے متصل میدان کی طرف دوڑ پڑے، کاندھا دینے کے لئے ہر کوئی چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اسے موقع نصیب ہو، صرف مضبوط قسم کے لوگ ہی اس میں کامیاب ہو پا رہے تھے، ڈالی گنج قبرستان کا راستہ تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر کے لگ بھگ تھا، ندوہ سے قبرستان کے درمیانی راستہ پر موجود ہزاروں افراد کا ایک جم غفیر نظر آ رہا تھا، دور دور تک سفید کرتا پائجامہ اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے حضرات نظر آ رہے تھے، قبرستان میں نعش اتارنے کے لئے ایک طالب علم اور بھائی عادل رحیم الدین نے ذمہ داری قبول کی، قبر پر مٹی ڈالنے کے لئے مجمع ٹوٹ پڑا، جب کچھ افراد مٹی ڈالنے سے فارغ ہوئے اور بھیڑ کم ہوئی تو ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے جو قبرستان کے گیٹ پر ہی بیٹھ گئے تھے، انہوں نے مٹی دی اور چچا کی مغفرت کی دعائیں کی اور خوب روئے۔

تھوڑی دیر بعد والد محترم (طیب الدین شجاع الدین) جو بنگلور سے لکھنؤ بذریعہ طیارہ پہونچے تھے وہ نائب مہتمم مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی کے ہمراہ قبرستان تدفین کے آخری لمحات میں پہونچ گئے، مغرب کی نماز باجماعت قبرستان سے قریب کی ایک مسجد میں ادا کی گئی، اور ہم سب ندوہ کے مہمان خانہ میں واپس آ گئے۔

بھائی امین الدین کے انتقال سے قبل راقم سطور کی ذہنی کیفیت

۶/جون ۲۰۱۲ء کی شب تھی، لکھنؤ فہمینہ اسپتال کے تقریباً تمام ڈاکٹروں سے مستقل ٹیلی فون پر رابطہ قائم تھا، امین بھائی بے ہوشی کی کیفیت میں تھے، آپ کی طبیعت نازک سے نازک تر ہوتی جارہی تھی، آپ کی Prognosis (پروگنوسس) بالکل واضح تھی اور ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کیا خبر آجائے، اہلیہ محترمہ اور بڑے لڑکے حافظ محمد ابراہیم ہندوستان میں تھے، جدہ کی رہائش گاہ پر راقم الحروف اور دولڑکے منجھلے محمد یوسف اور چھوٹے محمد اسمعیل جدہ میں موجود انڈین ایمبیسی اسکول کے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھے، ہر نصف گھنٹے بعد لکھنؤ سے مکۃ المکرّمہ اور جدہ میں امین بھائی کی خبر موصول ہوتی تھی، آپ کی ہر میڈیکل رپورٹ کا علم تھا، راقم صبح سے عشاء تک حرم مکی شریف میں طبی خدمات کے بعد جب جدہ اپنے گھر لوٹتا تو مستقل ٹیلی فون پر ہی رہتا تھا، بچے میری اس کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے، منجھلے لڑکے محمد یوسف نے کہا: ابو آپ چند دن ایمرجنسی تعطیل لے کر تابیّا کو دیکھنے کیوں نہیں چلے جاتے (بچے امین بھائی کو تایا ابا کی بجائے تابیّا پکارتے تھے) اس وقت اللہ رب العزت نے ذہن میں ایک بات ڈالی اور راقم نے فوراً کہا: بیٹا! تابیّا کی طبیعت بہت نازک ہے، اور وہ زندگی کے آخری لمحات سے گزر رہے ہیں، معاملہ اب صرف اللہ رب العزت کے ہاتھ ہے اور دعا کریں کہ اللہ ان کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے اور انشاء اللہ اگر اللہ نے ہمارے ساتھ بھی عفو ودرگزر کا معاملہ فرمایا تو اب تابیّا سے اس دنیا میں نہیں بلکہ جنت میں ملاقات ہوگی، میرے دونوں لڑکے میری اس گفتگو کو حیرت واستعجاب سے سن رہے تھے، اور اسے سمجھنے کی ایک ناکام کوشش کررہے تھے۔

ابھی چند گھنٹوں کا وقفہ ہی گزرا تھا، رات کے تقریباً ۳ بج رہے تھے، راقم نیم غنودگی میں تھا، میرے موبائیل فون پر جرس مستقل بجے جارہی تھی، لکھنؤ سے دونوں بھتیجے مخاطب تھے، ان کی آواز لرزرہی تھی، انہوں نے دبی آواز میں یہ خبر دی جس کا خدشہ تھا کہ امین چچا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

حجاز مقدس میں شب کی آخری گھڑی تھی اور ہندوستان میں فجر کا وقت تھا، راقم اللہ سبحانہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوا، اور اپنے حقیقی بھائی ہی نہیں بلکہ اپنے محسن کے حق میں مغفرت کی دعا کی کیونکہ وہی قادر مطلق ہے اور غفور رحیم وکریم بھی ہے، بعد ازاں حالت احرام میں حرم مکی کا رخ کیا اور اپنے بھائی جنہیں اب مرحوم کہنا پڑ رہا ہے ان کی جانب سے عمرہ ادا کیا، محض اس امید پر کہ خالق ومالک رب العلمین اسے قبول فرمائے اور آخرت کے سفر میں رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ آمین!

انتقال سے قبل امین بھائی کے متعلق ایک عجیب خواب

انتقال سے دو دن قبل امین بھائی کے متعلق ایک عجیب وغریب خواب نظر آیا، ۵/جون کی شب میں تقریباً ۳، ۴ کا درمیانی وقت تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ امین بھائی خواب میں نظر آئے، اور کہنے لگے کہ خلیل! میں جارہا ہوں، اور مجھے ان لوگوں نے بلایا ہے، میں نے پوچھا بھائی آپ کہاں جارہے ہیں اور کن لوگوں نے آپ کو بلایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میری شادی ہے!...... مجھے خواب میں ہی ہنسی آگئی اور میں سوچنے لگا کہ امین بھائی کب اور کہاں شادی کررہے ہیں، دریں اثناء آنکھ کھل گئی، اور یہ حقیقت آشکارہ ہوگئی کہ یہ محض ایک خواب نہ تھا، نیند سے بیدار ہوکر میں سوچنے لگا کہ امین بھائی تو اسپتال میں ہیں، زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں، آپ کی صحت نازک سے نازک تر ہوتی جارہی ہے، گذشتہ شب ہی ڈاکٹر سلمان خالد سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی، وہ کہہ رہے تھے کہ امین بھائی اس وقت کوما میں ہیں، بس اللہ سے رجوع ہونے کا وقت ہے، اس خواب کو دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا، انتقال تک اس خواب کا تذکرہ میں نے کسی سے نہیں کیا، انتقال کے بعد جب مولانا رابع حسنی ندوی صاحب نے تعزیت کے لئے فون کیا تو میں نے اس خواب کا تذکرہ کیا، جسے سن کر حضرت نے کہا کہ شاید اللہ کی طرف سے اپنے اس صالح بندے کے لئے خوشخبری اور بشارت کی خبر ہے۔

نشور واحدی کی الفاظ میں ان جذبات کی صحیح ترجمانی ہورہی تھی۔

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات جا چکی، ایک برات اور ہے

تعزیتی پیغامات

بھائی امین الدین کے انتقال پر ندوۃ سمیت پورے ملک بلکہ بیرون ملک سے انتقال کے کئی دن بعد تک مسلسل تعزیتی فون آتے رہے، بیشمار لوگوں نے مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی، جن شخصیات نے باضابطہ فون کرکے مجھ سے تعزیت کی ان کی فہرست بہت طویل ہے، اور اس میں ہر طبقہ کے افراد شامل ہیں، مختلف اداروں میں تعزیتی جلسے ہوئے، اور دعائے مغفرت کی گئی، اللہ ان تمام حضرات کی دعا کو قبول فرمائے، اور ہم سبھوں کی بھی مغفرت فرمائے۔

حرم مکی میں غائبانہ نماز جنازہ

۹؍جون کو حرم مکی شریف کے پہلے منزلہ پر صفا سے قریب باب اجیاد کے علاقہ میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں ایک کثیر تعداد میں حرم مکی شریف کے جملہ اسٹاف اور مصلیان موجود تھے، جنہوں نے امین بھائی کے لئے مغفرت کی دعائیں کیں۔

امین بھائی کے متعلق ملک کے اکثر و بیشتر اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے، لکھنؤ کے بعض اخبارات میں تو نمبر بھی شائع کئے، خاص طور پر جمعیت شباب اسلام کے ترجمان بانگ حراء نے ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں ندوہ کے اساتذہ اور طلباء کے تاثراتی مضامین شائع ہوئے۔

امین بھائی کے انتقال پر چند مشاہیر کے تاثرات

☆ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ۲۵؍جون ۲۰۱۲ء کو رابطہ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لائے، آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل رہی، راقم نے حرم مکی میں امین بھائی کے سانحہ انتقال پر آپ کے تاثرات جاننے کی

خواہش کا اظہار کیا، مکہ کے قیام کے درمیان ہی ۲۹؍جون کو آپ نے درج ذیل تاثرات کو قلمبند فرمایا:

’’مولوی امین الدین شجاع الدین مرحوم جو ایک صاحب علم اور نہایت اچھے اسلوب میں علمی و معلوماتی کام انجام دینے میں شہرت رکھتے تھے، اب ہمارے درمیان نہیں رہے، ان کی وفات سے ان کے اختیار کردہ عمل میں ایک خسارہ پیش آیا، یہ خسارہ ان کے ندوہ کے اسٹاف میں ہونے کی بناء پر ندوہ کے لئے بھی خسارہ کا باعث ہوا، ان کا انتقال دو طرح سے خسارہ قرار دیا جا سکتا ہے، ایک تو ایک صاحب تعلق شخصیت کے رخصت ہو جانے سے جس کا درد ہر صاحب تعلق محسوس کرتا ہے، دوسرا یہ کہ اسلامی سطح پر ایک کارگزار انسان جس نے صحافت کے میدان میں نام پیدا کیا تھا، اس کا میدان عمل اس کی کارگزاری سے محروم ہو گیا۔

مولوی امین الدین شجاع الدین سادہ مزاج کے اور اپنے مفید دائرۂ عمل میں ایک فعال شخصیت تھے، ان کی عمر ابھی ایسی نہ تھی کہ ان کے ارتحال کا خطرہ جلد محسوس کیا جاتا، اس کے لئے ان کے انتقال کو خاصا رنجیدہ واقعہ کے طور پر دیکھا گیا، مجھ سے بھی ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، مجھے ان کی کارپردازی کی بڑی قدر تھی، اور ان کی کاموں کی افادیت کا مجھے احساس تھا، بہرحال اس زندگی میں جو بھی آیا ہے اس کو اس سے ایک نہ ایک دن جانا ہے، یہ مقدرات کی بات ہے کہ وہ اپنے رب کے یہاں سے اسی قدر زندگی لے کر آئے تھے، اب ان کی قدردانی دعاؤں کے ذریعہ کی جا سکتی ہے، جو ان کے اہل تعلق کر رہے ہیں‘‘

☆ مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب (صدر جمعیت شباب اسلام لکھنؤ) امین بھائی کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میرا تعلق امین بھائی سے تیس برسوں پرانا ہے، شروع شروع میں خطوط کے ذریعہ ان کا مجھ سے ربط ہوا، وہ بہت اہتمام سے مجھے خط لکھتے تھے، اپنی ہر بات مجھ سے بتاتے تھے، اپنا دکھ درد سناتے تھے، اہم مسئلوں پر میری رائے اور مشوروں کو اہمیت دیتے تھے،

انجمن شباب اسلام سے ان کا تعلق تھا، کوئی بات انہیں اگر گوارہ نہیں ہوتی تھی تو وہ شکایت بھی کرتے تھے، اور جب کوئی بات انہیں اچھی لگتی تو تعریف بھی کرتے تھے، انجمن شباب کی تحریک کو بڑھاوا بھی دیتے تھے، ان کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، انہیں کتابی شکل میں شائع ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اس میں کئی علمی، تعلیمی پہلو شامل ہیں، بہت ساری شخصیات کے کرداراور اخلاقی پہلوان سے اجاگر ہوتے ہیں، ان میں مزاج میں سادگی، کھرا پن، سچائی اور خلوص تھا، بہت جلد خوش بھی ہوجاتے تھے، کسی غلط بات کو کبھی گوارا نہیں کرتے تھے، مختلف دینی، علمی، مذہبی اور سیاسی شخصیات سے متواضع رابطہ بھی قائم رکھتے تھے، انٹرویوز کے سوالات ان کے بہت اہم اور عصری مسائل پر مبنی ہوتے تھے، جس سے ان اہم شخصیات کی زندگی کے بہت سے اہم پہلو سامنے آجاتے تھے، ان کی سوچ میں گہرائی اور قلم میں ایک طاقت تھی، ان کی بات دوسروں کے دلوں میں گھر کر جاتی تھی، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، اوران کی خدمات کا آخرت میں انہیں بہترین صلہ اور جزاء عطا فرمائے، آمین!''

☆ پروفیسر محسن عثمانی (سابق پروفیسر انگلش اینڈ فارن لینگویجز، حیدرآباد) نے مکہ کے قیام کے دوران درج ذیل تاثرات کا اظہار کیا:

''جناب امین الدین شجاع الدین کے ساتھ اب مرحوم کا لفظ استعمال کرنا پڑ رہا ہے، ان سے شناسائی بہت دراز سے تھی، اور میں ان کی تحریریں تعمیر حیات، بانگ درا (موجودہ بانگ حراء) اور دوسرے اخبارات ورسائل میں بہت دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا، اللہ تعالی نے گہری اسلامیت کے ساتھ ان کو شگفتہ رقم بھی بنایا تھا، ان کے زیادہ تر مضامین مسلمانوں کو جگانے اور ان کے اندر شعور بیدار کرنے کے متعلق ہوا کرتے تھے، فکر سلیم کے ساتھ اللہ تعالی نے انہیں دل دردمند اور زبان ہوشمند کی نعمت سے نوازا تھا، اور اس طرح کی جامعیت بہت نایاب نہیں کمیاب ضرور ہیں، اوراچانک انتقال کی خبر سے شدید صدمہ پہونچا، اللہ تعالی ان کے اعمال صالحہ کی بدولت ان کو اجر جزیل اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا

فرمائے، آمین!''

☆ مولانا ابوظفر حسان ندوی (مقیم حال بھیونڈی، مہاراشٹر) نے لکھا:

''امین بھائی اب مرحوم ہوچکے ہیں، ان کے اعمال رک گئے، اب وہ دارالجزاء پہنچ چکے ہیں، امید ہے حق تعالی سبحانہ ان کی خدمات کا بہترین صلہ بہتر طور پر عطا کرے گا، اور ان کی خدمات کو صدقہ جاریہ بنائے گا، ان کا قلم اپنی طاقت اور اپنی تیز رفتاری کے باعث ہم عصر انشاپردازوں میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، وہ قلم جو سچ لکھتا تھا اور سچ کی اشاعت کرتا تھا، ایک ایسا قلم جو حق کی راہ میں چلا اور حق کے لئے دوڑا، ان کے قلم سے باطل کی کہیں سے حمایت نہیں ہوئی، یہ سلامت روقلم پردازوں کی خصوصیت رہی ہے، مرحوم امین الدین عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے، لیکن ہر چیز میں آگے نکل گئے، اللہ ان کے ساتھ وہی معاملہ فرمائے جو صالحین کے ساتھ روا رکھتا ہے''

مولانا فضل الرحیم مجددی (امیر جامعہ الہدایۃ جے پور) سے امین بھائی کا تعلق چار دہائیوں سے رہا ہے، آپ اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میرا بھائی امین الدین سے قلبی تعلق تھا، اس تعلق کی ایک بنیاد تھی کہ آج سے تقریباً بیس برس قبل اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ہمارے والد محترم مرحوم حضرت شاہ عبدالرحیم بانی جامعہ الہدایت جے پور بامبے اسپتال میں بغرض علاج شریک تھے، تو امین بھائی والد محترم کی عیادت کی غرض سے اسپتال تشریف لائے، اس بیماری کی حالت میں بھی والد محترم نے امین بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا کہ بیٹا! میرے فضل الرحیم کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑنا، والد محترم کے الفاظ کے اتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے کہ میں اس کیفیت کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لاسکتا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اللہ نے محض اپنی رضا کی خاطر ہمارے دلوں میں گویا کہ محبت ڈال دی کہ میں اس کیفیت کو بیان ہی نہیں کرسکتا۔

والد محترم کے انتقال کے بعد امین بھائی نے ماہنامہ الہدایت کے خصوصی نمبر کی اشاعت میں انتہائی والہانہ انداز میں بڑی دلچسپی کے ساتھ منہمک ہوگئے، آپ نے بڑی

محنت وکاوش سے وہ خصوصی نمبر نکالا، اس میں خود ان کا ایک مضمون والد مرحوم پر شامل ہے۔

بعد ازاں امین بھائی نے ندوۃ العلماء جانے کا پروگرام بنایا تو میں نے انہیں بہت روکا، بار بار اصرار کیا کہ والد محترم کے سامنے آپ نے جے پور میں رہنے کا وعدہ کیا تھا، اس پر انہوں نے جواب دیا کہ بھائی ذہن وجسم ندوۃ العلماء میں رہا تو قلب جے پور میں رہے گا، ان حالات میں وہ ندوہ چلے گئے، اس وقت بہت رنج ہوا کہ ایک باصلاحیت اللہ واسطے بزرگوں سے تعلق رکھنے والا انسان آخر میرا ساتھ کیوں چھوڑ رہا ہے، ایک ایسا انسان جسے اللہ نے قلب مومن عطا کیا ہے، جس کی زبان میں قوت وتاثیر ہے، جس کی تحریر وقلم میں طاقت ہے، اور میں یہ بات انتہائی وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے دس بہترین لکھنے والوں کو شمار کیا جائے تو ان دس میں سے ایک بھائی امین الدین شجاع الدین کو بھی انشاءاللہ شمار کیا جائے گا۔

وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے موقع پر بھی امین بھائی سے ملاقات ہوتی رہی، مختلف ملی مسائل پر آپ سے ہمیشہ گفتگو ہوتی تھی، ملت اسلامیہ کے مختلف مسائل اور ان کے حل کے تعلق سے ہمیشہ ان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ موجود رہتا، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک ٹیم ان کے ساتھ کردی جاتی اور تمام ضروری وسائل انہیں مہیا ہوتے تو شاید آج امین بھائی سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہوتے۔

اس ضمن میں ان کے سامنے میں نے ایک پیش کش بھی رکھی تھی، اور کہا تھا کہ آپ کی صلاحیتوں کا امت محمدیہ اور ملت اسلامیہ کو فیض پہنچنا چاہیے، میں ان کے سامنے اکثر یہ پروگرام رکھتا تھا کہ مسلمانوں کے مسائل ان کے حل، مختلف تدابیر، منصوبے، عملی اقدامات جیسے اہم موضوعات پر ایک ریسرچ کمیٹی کی تشکیل دی جائے جس کا سربراہ آپ کو بنایا جائے، اس طرح کی گفتگو اکثر وبیشتر میرے اور امین بھائی کے درمیان ہوتی رہتی، لیکن وہ بہت تکلف محسوس کرتے اور کسی پیش کش کو قبول نہیں کرتے تھے۔

امین بھائی سے تو قلبی تعلق تھا اور امین بھائی کی علمی وملی خدمات اور ہمارے والد مرحوم حضرت شاہ عبدالرحیم مجددی کے ساتھ ان کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے محض اللہ کے فضل وکرم سے یہ بات ذہن میں آرہی ہے کہ امین بھائی کے نام سے لکھنؤ ہی میں امین الدین شجاع الدین پبلک اسکول کی شکل میں ایک یادگار قائم کیا جائے، جو آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور ثواب جاریہ کا انشاءاللہ سبب بنے، اللہ کرے یہ منصوبہ تکمیل تک پہونچ جائے''

☆ ہمارے بھائی طبیب الدین شجاع الدین کو جب میرے مضمون کی خبر ملی تو انہوں نے بھی امین بھائی پر ایک تاثراتی مضمون لکھا، یہ ان کی زندگی کی پہلی تحریر ہوگی، صفحات کی تنگی کی وجہ سے یہ مضمون تو اس کتاب میں شامل نہ ہوسکا لیکن اس کا پہلا جملہ ضرور نقل کروں گا، جس میں ان کا پورا تاثر آگیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''برادرم امین مجھ سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے، لیکن اکثر واقف کار انہیں مجھ سے بڑا سمجھتے تھے، اور میں بھی حامی بھرنے میں ہی عافیت سمجھتا تھا، اس لئے کہ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے آگے بڑھے ہوئے تھے''، دوسری اہم بات طبیب الدین بھائی نے یہ ذکر کی ہے کہ ''جب والدہ امین بھائی سے کہتیں کہ تم نے شادی نہیں کی، بڑھاپے میں کون کام آئے گا، تو امین بھائی ہنس کر کہتے کہ میرے ہزاروں طلبہ ہیں، اللہ نے امین بھائی کی لاج رکھ لی اور کسی کی محتاجی کے بغیر مالک حقیقی کے پاس پہونچ گئے''۔

امین بھائی کی پہلی کتاب ''نقوش فکر وعمل'' اکابر علماء کی نظر میں

نقوش فکر وعمل امین بھائی کے مضامین کا ایک انتخاب ہے، جسے نوجوان ندوی فاضل محمد ارشد ندوی نے مرتب کیا ہے، اس کتاب کے بارے میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

مولوی امین الدین شجاع الدین بھیونڈی مہاراشٹر کے باشندے ہیں لیکن اردو زبان اور اسلامیات سے ان کا ایسا ربط رہا ہے کہ وہ فکری مسائل کو اچھے انداز میں اور اردو کے اچھے اسلوب میں پیش کرنے کی مؤثر صلاحیت رکھتے تھے، ان کی متعدد اسلامی اور علمی

رسائل میں ادارہ تحریر کی ذمہ داری ملتی رہی ہے، اور اس کو انہوں نے بخوبی انجام دیا ہے، وہ شگفتہ اور مؤثر اسلوب میں مسائل کو پیش کرتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ بھی اچھا کرتے ہیں۔

مولوی امین الدین شجاع الدین سے میں عرصہ دراز سے واقف ہوں، جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاص کر رہے تھے، اسی وقت سے وہ رابطہ رکھتے تھے، بعد میں بھی انہوں نے رابطہ رکھا، اور اب تو اسی ادارے سے تدریسی طور پر وابستہ ہیں، وہ اچھی طبیعت اور اچھی فکر کے آدمی ہیں، اور اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والے صحافی ہیں، وہ اسلامی افکار و نظریات کو اچھے اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، چانسلر انٹیگرل یونیورسیٹی) فرماتے ہیں:

فکر و عمل اور قول و فعل کے متوازن امتزاج کے حامل تمام مسلم اہل علم و دانش کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم سے اور اپنی دعوت و فکر سے شیطانی عمل جو نہایت طاقت سے ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہو رہا ہے اور اس کے سیلاب کو روکنے کے لئے ہر طرح کے بند تعمیر کریں، میرا خیال ہے کہ امین الدین شجاع الدین کے قلم میں بڑی طاقت ہے، انہوں نے اپنی طاقت کو استعمال کر کے اسلام دشمنی کا جواب دینے اور مخالف اسلام طاقتوں کو مایوس کرنے کی کوشش کی ہے۔

جناب سید حامد صاحب (چانسلر ہمدرد یونیورسیٹی دہلی) اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

نقوش فکر و عمل عنایت کی، مجھ پر بڑا احسان کیا، میں اس وقت سے آپ کا قائل ہوں جب شروع شروع میں آپ کے مضامین رسائل میں چھپا کرتے تھے، آپ کی نظر ہمارے اہم مسائل پر ہے، اور یہ بڑی بات ہے، مزید غور فرمائیے کہ ہمارے طرز فکر میں کیا کیا بنیادی تبدیلیاں درکار ہیں، دست بدعا ہوں کہ ملت کو مزید منفعت آپ کے افکار اور قلم سے پہونچتی رہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی (سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونیورسیٹی) لکھتے ہیں:

اگر امین الدین شجاع الدین کی زیر طبع کتاب ''نقوش فکر و عمل'' کا مسودہ دیکھنے اور اس میں شامل مضامین کے مطالعہ کی سعادت حاصل نہیں ہوتی تو ہمیشہ اس عالم اور دانشور کی بصیرت افروز نکتہ آفرینی اور دینی حمیت سے ناواقفیت کا افسوس رہتا، ناچیز نے امین الدین صاحب کی بعض تحریریں یقیناً پڑھ رکھی تھیں مگر ان پر توجہ مرکوز کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا، ان کے زیر طبع مضامین میں جس طرح اختصار اور جامعیت کے ساتھ بڑے بڑے انسانی، مذہبی اور اخلاقی مسائل کو نہایت سادگی مگر گہرائی کے ساتھ زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے وہ بلاشبہ فکر و خیال کو مہمیز کرنے اور اخلاقی حمیت کو بیدار کرنے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔

امین الدین شجاع الدین ایک پختہ کار صحافی، نکتہ رس مفکر اور با مقصد ترجمان مذہب کی حیثیت سے اپنی تحریروں میں رونق افروز ہیں، مصنف نے اپنی فیض رسانی کے لئے محض مذہبی حوالوں کا سہارا نہیں لیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ان کا علمی دائرہ کار خاصا وسیع ہے، وہ قرآن و حدیث کی بنیادی تعلیمات کو زیادہ دل نشین انداز میں بیان کرنے کی خاطر مشرقی اور مغربی ادبیات سے بھی استفادہ کرتے ہیں منطقی و ثقافتی رویوں کو بھی زیر بحث لاتے ہیں، اپنے گردوپیش سے بھی مثالیں پیش کرتے ہیں، اور مجموعی طور پر ایک ایسے مفکر و نکتہ رس دانشور کا کردار ادا کرتے ہیں جس نے اپنے زمانے کے تقاضوں پر بھی غور و خوض کیا ہے، دین کو صرف دین ہی نہیں دنیا اور اہل دنیا کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا ہے اور قاری کی نفسیاتی تربیت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

امین الدین شجاع الدین ایک ایسے ادیب اور صحافی ہیں جن کے اندر وسیع القلبی بھی ہے، نفسیات شناسی بھی اور اپنے مدعا کو بغیر کسی اغلاق کے شفاف انداز میں بیان کر دینے کی اہلیت بھی، ان کی زبان شستہ، اسلوب بیان دل نشیں اور طریق اظہار دانشورانہ ہے، وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو سہل گفتاری سے آشنا کرنے کا ہنر جانتے ہیں، اسی باعث ان کے مضامین کے ابتدائی جملے ہی اتنے جاذب توجہ ہوتے ہیں کہ پورا مضمون پڑھ لینا ناگزیر

محسوس ہونے لگتا ہے

پروفیسر محسن عثمانی ندوی (سابق پروفیسر انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدر آباد) نقوش فکر وعمل پر اپنے تعارفی کلمات میں یوں فرماتے ہیں:

امین الدین شجاع الدین ان اچھے ادیبوں اور صحافیوں میں ہیں جنہیں قدرت نے ادب کا ذوق عطا کیا اور پھر انہوں نے اس ذوق کو اپنے مطالعہ سے پروان چڑھایا، مائل خیر آبادی اور شفیع الدین نیر کی نظمیں بچپن میں ان کے حافظے کا حصہ بنیں، غنچہ اور نور کے نثری مضامین کو وہ ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے رہے اور لکھنے والوں کی تعبیرات خاموشی کے ساتھ انکے تحت الشعور میں محفوظ ہوتی رہیں اور پھر جب عمر کا آفتاب کچھ ذرا اور بلند ہوا تو پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شاہ کار کتاب رسالہ دینیات کو انہوں نے حرفاً حرفاً اور سبقاً سبقاً بھی پڑھا، رسالہ دینیات کی اور جو خصوصیات بھی ہوں لیکن وہ خوبصورت اور سلیس اور مؤثر اسلوب کی نمائندہ کتاب بھی ہے اور جب وہ ہائی اسکول کے بعد کالج میں آئے تو انہیں تفصیل کے ساتھ اردو ادب اور اسلامی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیفات بھی ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی، اور ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت انسان کی روحانی علمی، فکری اور ادبی حاسہ کو غذا پہنچاتی ہے، مطالعہ کی وسعت سے امین الدین شجاع الدین کا قلم ابر نو بہار اور عطر مشک بار بن گیا ان کے مضامین مختلف رسالوں اور اخبارات میں چھپتے رہے اور انکے فکر سلیم اور حسن انشاء کو دیکھ کر مختلف لوگوں نے ان کو اپنے رسالوں کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔

جناب شاہد لطیف صاحب (ایڈیٹر انقلاب بمبئی) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ مضامین امین الدین شجاع الدین کی ادبی وصحافتی قابلیتوں کے جوہر کو نمایاں کرتے ہیں اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قدرت نے ادب کا ذوق عطا کیا ہے پھر انہوں نے اس ذوق کو اپنے مطالعہ سے پروان چڑھایا اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ ایک پختہ

کار صحافی، سنجیدہ قلم کار، اور فعال ترجمان مذہب کی حیثیت سے اپنی تحریروں میں رونق افروز ہیں، مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں کچھ نیا لکھنا اور کچھ مختلف سوچنا اتنا آسان نہیں، لیکن ان مضامین سے مصنف کی اسی مختلف صلاحیت اور طرز فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ (انقلاب بمبئی)

معروف صحافی جناب ابراہیم علوی صاحب روز نامہ آگ میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

امین الدین شجاع الدین ایک انتہائی سنجیدہ اور پرخلوص انسان ہیں، ان کی شخصیت کی یہی خوبیاں ان کی تحریروں میں نمایاں رہتی ہیں، انہیں ملی درد ہے، جس کا اظہار برملا مگر بڑے سلیقے سے ان کی فکر انگیز مضامین میں غالب رہتا ہے، پھر ان کی عبارت بڑی سلیس، رواں اور شگفتہ ہوتی ہے، اس لئے ان کی مضامین بڑے وقیع اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں، وہ شوقیہ نہیں ضرورتاً لکھتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں چھپنے کا نہیں، سمجھانے کی ضرورت ان کی تحریر کو قابل قدر بناتی ہے (روز نامہ آگ لکھنؤ، ۳ مارچ ۲۰۱۰ء)

’’ملنے کی نہیں نایاب ہیں ہم‘‘ پر ارباب علم وعرفان کے تاثرات

امین بھائی کی دوسری کتاب ’’ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم‘‘ شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، اس کتاب کو مولانا منور سلطان ندوی نے مرتب کیا ہے، امین بھائی کی یہ کتاب بھی بڑی مقبول ہوئی، اس کتاب پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور جناب مسعود الحسن عثمانی کی قیمتی تحریریں ہیں، ان حضرات نے جس طرح کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی فرماتے ہیں:

......ان عناوین سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں، جب کہ آنے والی نسلوں کے لئے یہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے، اس میں زبان وادب کی حلاوت کے ساتھ طرز نگارش کی لذت وچاشنی بھی ہے، اور زندگی کے ظاہر وباطن کو خوبصورت بنانے کا نسخۂ

کیمیا بھی ہے۔

جناب مسعود الحسن عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

......امین الدین شجاع الدین ایسے ہی سرمست اور جیالے کا نام ہے، لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، مجھے کبھی کبھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے سوجاتے ہیں اور اٹھ کر پھر لکھنا شروع کردیتے ہیں، عالم بیداری کی دیگر مصروفیات میں ان کا ذہن کسی نئے مضمون پر لکھتا رہتا ہے، وہ اپنی تحریر کو تاثیر اور اکسیر سے ہمکنار کرنے کی مخلصانہ کوشش میں دردمندی سے مصروف رہتے ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی (مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ) رقمطراز ہیں:

جناب امین الدین شجاع الدین ان اہل علم اور اہل بصیرت لوگوں میں سے ہیں جن کے یہاں تفکر اور غور وفکر کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، انہوں نے گذشتہ برسوں میں اہم مذہبی شخصیات اور اپنی یادوں کے ساتھ مسائل حاضرہ پر لگاتار اظہار خیال کیا ہے، جو اشاعت کے بعد اہل نظر کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرا رہا ہے، امین الدین صاحب باقاعدہ ایک تخلیقی ادیب نہ ہونے کے باوجود اپنی نثر میں تخلیقی شان پیدا کردیتے ہیں، ان کی شفاف زبان، رواں اسلوب اور خیالات کی وضاحت ان کو معاصرین میں ایک امتیاز کا مالک بناتی ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں یوں تو...... سے تمہیدی کلمات لکھوائے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حضرات نے امین الدین صاحب کی کتاب کے مشمولات کے ضمن میں حقیقت پسندانہ بات لکھی ہے، مگر اب امین الدین صاحب اہل قلم حضرات کے اس زمرہ میں شامل ہوچکے ہیں جن کو اس نوع کی کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔

روزنامہ انقلاب لکھنؤ میں ۱۳، اکتوبر ۲۰۱۱ء کو یوں تبصرہ ہوا:

امین شجاع کے اسلوب کے حوالہ سے میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ ندوۃ العلماء میں اس دور کے عبدالماجد دریابادی ہیں، اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا سیدابوالحسن علی ندویؒ، قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ، پروفیسر وصی

احمد صدیقیؒ، ابراہیم سلیمان سیٹھؒ سے لے کر ندوہ کے دربان سالک رام پر مضامین موجود ہیں، جس میں چھوٹے چھوٹے جملے، سلیس زبان، سادگی میں پرکاری، سہل انداز کے ذریعہ دل کو خون کے آنسو رلا دینے والا انداز نرالا ہے، قاری کو کتاب کی تکمیل کے بعد ہی سکون میسر ہوتا ہے۔

امین بھائی کی تیسری کتاب ''روبرو''

انتقال سے ایک ماہ پہلے آپ سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی، انتہائی خوشی سے آپ نے اس کتاب کے بارے میں بتایا کہ اب تک اس کے سات سو صفحات ہوچکے ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریڑی جناب مولانا محمد ولی رحمانی، معروف عالم دین مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور اردو ٹائمز بمبئی کے سابق ایڈیٹر اور موجودہ ایڈیٹر اودھ نامہ لکھنؤ جناب عالم نقوی صاحب نے ''روبرو'' پر اپنے گراں قدر تاثرات قلمبند کئے ہیں۔

اللہ نے زندگی وفا نہ کی اور امین بھائی اس کتاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ سکے، اس وقت یہی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، جن اہم شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ پر آفتاب وماہتاب ہیں، راقم کی وجہ سے ہی اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوئی، اور قارئین کو انتظار کی زحمت کرنی پڑی، مجھے امید ہے کہ امین بھائی کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی قبولیت حاصل کرے گے اور امین بھائی کے لئے رفع درجات کا باعث ہوگی۔

خواہش تھی کہ امین بھائی کے قلمی شہ پاروں کے چند نمونے پیش کروں مگر ان کی کون سی تحریر ہے جو ادبی چاشنی سے خالی ہے، ان کے قلم سے نکلا ہر لفظ اور ہر حرف اپنی جگہ خوبصورتی کا احساس دلاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لکھتے نہیں تھے موتی رولتے تھے، مختلف شخصیات کا انہوں نے جو نقشہ کھینچا ہے ان میں امین بھائی کی تصویر بڑی صاف نظر آتی ہے، مولانا ناصر علی ندویؒ کے بارے میں انہوں نے 'ایک مثالی معلم کی کتاب زندگی' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں امین بھائی کی زندگی کی پرچھائیاں دیکھی جاسکتی ہیں، مولانا اسحٰق حسینی ندویؒ پر ان کے مضمون کا عنوان ہے 'حیات جس کی امانت تھی اس کو

لوٹادی‘اس میں موت کا جوفلسفہ لکھا ہے وہ امین بھائی پر پوری طرح صادق آتا ہے ، مولانا محمود الازہار ندویؒ کے بارے میں جس’ آخرت رخی‘ کی بات کہی ہے وہ امین بھائی کی ایک تصویر ہی تو ہے،اس طرح’’ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم‘‘ پڑھئے تو ہر پیراگراف میں امین بھائی کی تصویر بین السطور سے جھانکتی نظر آتی ہے۔

امین بھائی نے مولانا اسحٰق ندویؒ پر جو کچھ لکھا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا آخری پیراگراف لکھ رہے ہیں:

’’اللہ رب العزت حکیم وعلیم اور خبیر ہے،ان کی مشیت کے آگے سرتسلیم خم ہے،اب ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم دین کے اس خاموش خدمت گزار کے لئے تنہائی میں دعائے مغفرت کریں،اس دنیا سے آخرت کے اس مسافر کے لئے جو اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے، دعاؤں کی سوغات بھیجیں،ان کی خدمت عنداللہ مقبول ہوں......وہ ایک معلم تھے، اپنے طلبہ کے حلقے میں یقیناً ایک شفیق استاذ ثابت ہوئے ہوں گے،اپنی موت سے بھی وہ سب کو ایک سبق سکھا گئے ایسا سبق جس استحضار ہم سب کے لئے ہر لحہ ضروری ہے،اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے زندگی کی جو مہلت دی ہے اس کی مدت وتعیین کا علم اسی علیم وخبیر کو ہے،نہ معلوم کب کس کے لئے پروانہ مراجعت اور کب کس کا وقت موعود آجائے،اسحٰق بھائی کا جب میں نے آخری دیدار کیا تو دل بوجھل تھا،آنکھیں اشکبار تھیں،زبان پر کل نفس ذائقۃ الموت کی آیت قرآنی تھی ،اور ذہن اپنی موت کے تصور میں غلطاں وپیچاں تھا،جب میں نے ان پر آخری نظر ڈالی تو لزر اٹھا اور اپنی موت کو یاد کر کے رواں رواں کانپ گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

(ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم،ص:۱۹۵)

بھائی امین الدین کی موت سے اگر ہم اپنی موت کو یاد کرنے والے بن جائیں اور موت کی تیاری میں لگ جائیں تو یہی اس مضمون کا حاصل کل ہے،اللہ ہمیں آخرت کی

تیاری اور اپنی رضا پر زندگی گزارنے والا بنادے تا کہ دنیا وآخرت دونوں جہاں میں سرخروئی حاصل ہوں۔آمین!

ربناآتنافی الدیناحسنة وفی الآخرة حسنة وقناعذاب النار

(ڈاکٹر)خلیل الدین شجاع الدین
ایم بی بی ایس (بمبئ) ایم سی پی سی
عیادۃ الحرم المکی الشریف

Mob:00966-509716183

Email-Khaliltumandar@yahoo.com

حرفِ چند

وفیات سے متعلق جناب امین الدین شجاع الدین صاحب کے مضامین کی تلاش میں آپ کے لئے ہوئے بہت سے انٹرویو پر نظر پڑی، یوں تو اکثر انٹرویوز پڑھے ہوئے تھے، مگر اب جب دوبارہ دیکھا تو اس کے انداز تحریر نے پڑھنے پر مجبور کیا اور پھر دل نے فیصلہ سنایا کہ ان انٹرویوز میں نہ صرف وقت کے بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں بلکہ ربع صدی کی تاریخ کے بہت سے ایسے گوشے بھی ہیں جو عموماً کتابوں میں نہیں ملتے، اسی احساس کے ساتھ ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' کی ترتیب کے بعد انٹرویوز کو جمع کرنا شروع کیا، یہ کتاب اسی تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے۔

یہ انٹرویوز مختلف اوقات میں مختلف شخصیات سے لئے گئے ہیں، اور مختلف رسائل ومیگزین میں شائع ہوئے، ان میں وقت کے اہم ملی وسیاسی مسائل پر ملی قائدین سے ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی گئی ہے، تعلیم سے متعلق بھی اہم موضوعات پر انٹرویوز ہیں، ہندوستان کی بعض اہم تحریکات تعلیمی اداروں اور شخصیات کی خدمات کو بھی عنوان بنایا گیا ہے، مثلاً آل انڈیا ملی کونسل، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، الامین ٹرسٹ بنگلور، جمعیت شباب اسلام لکھنؤ اور انٹگرل یونیورسیٹی کی بڑی حد تک تاریخ آگئی ہے، شخصیات میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی کے اہم گوشوں کو لکھنؤ کے بزرگ صحافی جناب عشرت علی صدیقی کی زبان میں پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور عشرت علی صدیقی کی خدمات پر بھی تفصیلی روشنی پڑتی ہے، ان اداروں اور شخصیات کی خدمات کے بہت سے ایسے نئے گوشے سامنے آتے ہیں، جو عموماً سوانح یا تاریخ کی کتابوں میں جگہ نہیں پاتے ہیں، ملی مسائل کی فہرست میں بابری مسجد کا قضیہ، شیعہ سنی قضیہ جیسے موضوعات شامل ہیں، اس کوتاہ علم کے خیال میں ان انٹرویوز میں جہاں معلومات کا

ذخیرہ ہے وہیں ملی مسائل کے حوالہ سے ماضی کا جائزہ اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل بھی موجود ہے، اور یہی اس کتاب کا حاصل ہے۔

موضوعات کے لحاظ سے ان انٹریوز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، ساتھ ہی کوشش کی ہے کہ ہر انٹرویو کا پس منظر یا اس سے متعلق وضاحتی نوٹ شروع میں شامل کردیا جائے تاکہ قارئین کو سہولت ہو، جن شخصیات سے انٹرویو لیا گیا ہے وہ سب معروف ہیں، اس لئے ان کے تعارف میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

کتاب کی تکمیل کی فطری مسرت کے ساتھ اس بات کی خوشی زیادہ ہے کہ چند سال قبل مولانا امین الدین شجاع الدین جیسے فقیر منش اور درویش صفت ادیب وصحافی کی تحریروں کو جمع کرنے کا جو خیال ذہن میں آیا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اس سلسلہ کی آخری کڑی انٹرویوز کی شکل میں اب قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جارہا ہے، اس نعمت پر راقم کا قلم بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز اور اس کا دل تشکر وامتنان کے جذبات سے معمور ہے۔

آپ کی تحریریں مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتی رہی ہیں، یہ انٹرویوز بھی متفرق پرچوں میں شائع ہوئے تھے، جس کی وجہ سے کوشش کے باوجود بعض اہم انٹرویوز نہیں مل سکے، اگر یہ سب تحریریں مل جاتیں تو کتاب کی قیمت دوچند ہوجاتی۔

کتاب میں مذکور اکثر مسائل ملت کے اہم ترین مسائل میں شمار ہوتے ہیں، ان مسائل کے بارے میں مسلمانوں کے قائدین کا مستقل موقف ہے، اور مسلمانوں کا اصل موقف وہی ہے، اس کتاب میں اگر کوئی بات مسلمانوں کے عام موقف کے خلاف نظر آئے تو اسے مذکورہ شخصیت کی ذاتی رائے محمول کرنا چاہیے، یہ سارے انٹرویوز (جناب شاہ فضل الرحیم صاحب اور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب کے علاوہ) شائع ہوچکے ہیں، اور ان مسائل پر ملی قائدین ودیگر شخصیات کی آراء منظر عام پر آچکی ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں کسی وضاحتی نوٹ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

کتاب کی ترتیب میں صاحب کتاب کے مشورے اور رہنمائی شامل رہی، جس کی وجہ

سے بڑی آسانی ہوئی، مولانا نے اپنی درویشانہ طبیعت کے باوجود پروف اور وضاحتی نوٹ کے لئے ہمارے اصرار کو قبول کیا اور اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، ابتدائی صفحات میں جن مایہ ناز اہل قلم کی تحریریں ہیں وہ سب ہمارے خاص شکریہ کی مستحق ہیں، ایک جوہری ہی الفاظ وحروف کی صحیح قدر و قیمت جان سکتا ہے، اور بلا شبہ زبان وادب کے ان جوہریوں نے امین الدین شجاع الدین صاحب کی تحریر کی جس طرح داد دی ہے، اس سے ان تحریروں کے استناد واعتبار میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب مولانا کی زندگی میں ہی تیار ہو چکی تھی، بس پریس جانے والی تھی کہ خود آپ کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور یوں یہ بات ہمیشہ کے لئے سوہان روح بن گئی کہ کاش مولانا اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیتے! انتقال کے بعد مختلف عوارض کی بناء پر طباعت میں تاخیر ہوتی گئی، اللہ جزائے خیر دے مولانا مرحوم کے برادران محترم جناب ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین صاحب اور جناب طبیب الدین صاحب کو، کہ یہ حضرات کتاب کی طباعت کے لئے مستقل فکرمند رہے، عزیزی اشفاق احمد وانی کشمیری کا مولانا مرحوم سے بڑا خاص تعلق تھا، وہ اس کتاب کی ترتیب وتیاری میں پوری طرح سرگرم رہے، قارئین کو ان حضرات کا اور مولانا نجیب الرحمٰن ندوی ومولانا نجیب الرحمٰن ململی ندوی صاحبان کا خاص طور پر شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان دونوں کی محنت وتوجہ سے طباعت کے مراحل آسان ہوئے، اور کتاب ان تک پہنچ سکی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس محنت کو قبول فرمائے اور کتاب کو مفید اور نافع بنائے۔

۲۵/فروری ۲۰۱۳ء

منور سلطان ندوی
لکھنؤ

دینی وملی مسائل

جذباتی مسائل کو بھی
سنجیدہ حکمت عملی کے ساتھ حل کرنا چاہئے!

صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے ایک گفتگو

امسال دسمبر ۲۰۰۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کے واقعہ کو دس برس مکمل ہو گئے ......لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے اور طول پکڑتا جا رہا ہے تو دوسری طرف فریق مخالف اس مسئلہ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے وقتاً فوقتاً استعمال کرر ہا ہے...... یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں ہمیں اس مسئلہ کا نیز اس سے پیدا شدہ صورت حال کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہئے ......زندہ اور اقبال مند قومیں خود احتسابی کے عمل سے کبھی گریز نہیں کرتیں، چنانچہ ہمیں اس مسئلہ پر اس لحاظ سے بھی غور کرنا چاہئے کہ مسئلہ کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر بن جانے کی وجوہات کیا ہوئیں اور وہ کون سی کوتاہیاں تھیں جن کی وجہ سے فریق مخالف کو اپنے مقصد کی برآوری میں مدد ملی...... یہ ایک نازک، حساس اور اہم موضوع ہے......ہم نے مناسب جانا کہ اس موضوع پر صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ کے خیالات سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ ہم مشکور ہیں صدر محترم کے کہ آں موصوف نے ہماری درخواست قبول فرمائی۔ صدر محترم نے مذکورہ مسائل کے سلسلہ میں جن آراء کا اظہار فرمایا ہے، اس

کے مطالعہ سے حقیقت پسند قاری محسوس کریں گے کہ اس میں پیش کردہ اصول محض کسی ایک مسئلہ کے لئے نہیں، بلکہ مسائل کے حل کے لئے ایک رہنما اصول ہے۔ امید ہے کہ اس حساس موضوع پر لیا گیا انٹرویو شوق اور توجہ سے پڑھا جائے گا۔

سوال: حسب سابق، بابری مسجد کی شہادت کی دسویں برسی کے موقع پر مسلمانوں نے یوم دعا اور یوم غم، جبکہ سیکولر پارٹیوں نے یوم شرم اور فسطائی جماعتوں نے یوم فتح اور یوم شجاعت منایا۔ ۶ر دسمبر کے ان مختلف ناموں سے منائے جانے پر آنجناب کا تأثر کیا ہے؟

جواب: برسی یا کسی خاص دن کو کسی واقعہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے مختلف ناموں سے منانا عام طور پر سیاسی مزاج ومقصد کے تحت ہوتا ہے اور اسکو اپنی جماعت یا ملت کے لئے اظہار قوت یا حصول شہرت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے یا اس سے کسی قابل رد قومی رویہ کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا ہے۔ یہ با مقصد اور تعمیری طریقہ سے ہو تو بہت اچھی بات ہے اور اچھے نتائج کا حامل بھی ہوسکتا ہے۔ ضرورت ہیکہ باوقار ملت کی طرف سے اس کے لئے باوقار طریقے اور وسائل اختیار کئے جائیں اور اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ایسے اقدامات ایسے طریقۂ کار اور ایسی چیزیں نہ ہوں جو مقصدیت اور حکمت کے منافی ہوں۔

مسلمانوں کے لئے تو اولین اصول یہ ہے کہ ہر مسئلہ میں ان کی نگاہ اس نکتہ پر مرکوز رہے کہ اللہ رب العزت کی خوشنودی کس بات میں ہے اور اس کے رسول ﷺ کا ایسے معاملوں میں کیا طریقہ رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کامل طور پر مشعل راہ ہے، اس حیات طیبہ سے ہمیں ہر گام پر رہنمائی اور روشنی مل سکتی ہے بشرطیکہ ہم غور وفکر کریں۔ سیرت رسول اکرم ﷺ میں ہمیں بہت سے مواقع ملتے ہیں جن میں آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ حالات ومعاملات کا مدبرانہ طریقہ سے جائزہ لے کر، ممکنہ ذرائع اپناتے تھے اور عملی لحاظ سے جو بھی کرنا ضروری ہوتا تھا وہ کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھروسہ صرف اللہ کی مدد پر کرتے تھے اور اللہ سے پوری لجاجت کے ساتھ مدد مانگتے تھے، گڑگڑا کر دعا کرتے تھے، آپ ﷺ نے موقع ومحل کے اعتبار سے جو ضروری ذرائع

تھے وہ اپنائے ،ممکنہ وسائل اختیار کئے مگر آپ کا اعتماد وتوکل اللہ پر رہا ،اور نگاہ اللہ پر رہی۔ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ ہم اس بنیادی نکتہ سے صرف نظر نہ کریں اور پیش آنے والے ہر مسئلہ میں اس بات کا لحاظ رکھیں کہ اس مسئلہ میں حیات طیبہ ﷺ سے اسوۂ رسول اکرم ﷺ سے ہمیں کیا روشنی مل رہی ہے،اور کیا ہماری زندگی اور ہمارے اعمال ایسے ہیں کہ اللہ ہم سے خوش ہوگا اور ہماری مدد کرے گا،اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لئے ہم کو اپنی زندگی کو اس کے حکم کے مطابق اور ایسا بنانا ہے کہ وہ ہماری دعا قبول کرے۔

جہاں تک بابری مسجد کا سوال ہے تو مسلمانوں نے بھی اس مسئلہ میں احتجاج واظہار کے ساتھ دیگر تدابیر بھی اختیار کیں۔لیکن بعض بعض موقعوں پر جذبات کے اظہار میں مدبرانہ طریقے سے دور چلے گئے اور اس کی بنا پر گتھی مزید الجھی۔ایسے اختلافی بلکہ کشمکش کے موقعوں کے لئے یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ بعض وقت پر جوش اظہار کے نتیجہ میں مخالف طبقہ میں بھی اس کے بالمقابل جوش پیدا ہوجاتا ہے جو مسئلہ کے حل کو مزید دشوار بنادیتا ہے اور بعض وقت اس سے نقصان دہ محاذ آرائی کے حالات پیدا ہوجاتے ہیں بدقسمتی کی بات ہیکہ بابری مسجد کے حل کی کوششوں میں اس قسم کی بعض صورتیں پیدا ہوئیں فریق مخالف میں جوش پیدا ہوا اور اس کے اثرات ہمارے جوش کے اثرات سے زیادہ پڑے اور اس سے ہماری مشکلات بڑھیں۔

اب جبکہ مسئلہ عدالت میں زیر سماعت ہے تو اس صورت میں ہمیں اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کیلئے بے احتیاطی کے سیاسی انداز اختیار کرنے سے بچنا چاہئے۔ دعا اللہ سے مانگنے کی چیز ہے،اور اس کو جتنا دل لگا کر اور سرّی طریقہ سے کیا جائے اس میں تاثیر اور قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے،اعلانیہ طور پر اور سیاسی طریقہ سے کرنے میں تاثیر کی توقع کم ہوتی ہے اور دعا کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند بنانا بھی ضروری ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے کرم کی امید زیادہ ہو۔کیونکہ معصیتوں کی حالت میں اللہ کی رحمت نہیں آتی۔

اس مرحلہ پر جب کہ بابری مسجد کی شہادت کو دس برس بیت چکے ہیں ہمیں اب تک

کے اپنے طریقہ کار،طرز عمل،اور حکمت عملی کا جائزہ بھی لینا چاہئے کہ آیا اس میں ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں اور اب کس انداز میں ہم کو اس مسئلہ کے حل کیلئے کوشش کرنا ہے، بہر حال اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہماری فکر وتوجہ صرف اظہار وجوش تک محدود نہ رہے بلکہ حالات میں تغیر کے ساتھ اور وقت کے بدلنے پر جیسی حکمت عملی کا تقاضہ ہو ویسی حکمت عملی اختیار کی جائے۔دوسری طرف اس کے نتیجہ میں فریق مخالف میں ایسا جوش وجذبہ پیدا نہ ہوجائے جو معاملہ پر گہرا اثر مرتب کردے صورتحال اور امکانات کو سامنے رکھ کر حکمت عملی اختیار کرنے پر غور کرنا چاہئے۔اور خاموش کوششوں کو بھی اپنے پروگرام میں رکھنا چاہئے۔

سوال:مسلم پرسنل لاء بورڈ کی نگرانی میں بابری مسجد کمیٹی کام کررہی ہے کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اس کمیٹی نے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں اب تک کیا پیش رفت کی؟

جواب:بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے اپنی ناگواری کے اظہار کی میدانی کوششیں کیں بابری مسجد کے قضیہ سے متعلق جو کمیٹیاں کام کررہی تھیں،مسجد کی شہادت کے بعد انہیں پریشانیاں لاحق ہوئیں،چونکہ یہ مسئلہ امت کا مسئلہ ہے اس لئے بورڈ کو جو کہ مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے لوگوں نے متوجہ کیا کہ اس مسئلہ کو بورڈ کی توجہ اور سرپرستی حاصل رہے بورڈ نے ایک کمیٹی کی تشکیل کردی اس کمیٹی نے اپنے ممبران کے مشورے سے کچھ کام کئے،بورڈ کو تو بہر حال بابری مسجد کے مسئلہ سے اپنے مخصوص دائرہ میں دلچسپی اور ہمدردی ہے اور بورڈ کمیٹی کے مثبت اور تعمیری کام میں تعاون کرتا ہے۔

سوال:بابری مسجد کے سلسلہ میں بورڈ کے موقف سے برادران وطن کو واقف کرانے اور ان میں موجود صاف ذہن افراد کی تائید وحمایت اور ملکی رائے عامہ کی ہمواری کے لئے کون سی کوششیں کی گئیں۔

جواب:واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہم سب سے کوتاہی ہوئی،کاش کہ ایسا ہو پاتا کہ مسئلہ کے اٹھتے ہی ایکطرف تو عدالتی سطح پر اور ٹھنڈے انداز سے اسے حل کرلینے کی کوشش کی جاتی نیز دوسری طرف برادران وطن کو ساتھ لے کر خصوصاً ان میں موجود صاف ذہن رکھنے

والے افراد کو ساتھ لے کر اس مسئلہ کی حل کی کوشش ہوتی ۔ یہ حسن تدبیر کی بات ہوتی کہ جس مسئلہ کے حل کی کوششوں میں ہمارے لئے برادران وطن کو ساتھ لے کر چلنا ممکن ہو سکے، ہم ان کو ساتھ لے کر چلیں ۔بعض مسائل کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اگر محض ایک فرقہ کی بنیاد پر انہیں حل کرنے کی کوشش کی جائے تو پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں اس لئے ایسی صورت میں اب موقف کے حق میں برادران وطن کی تائید وحمایت حاصل کرنے اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش ہونی چاہئے ۔اس کے برخلاف ہر مسئلہ میں احتجاج کی پالیسی اپنانے کے نتیجے میں صورت حال ابتر ہو جاتی ہے، نیز دونوں فریقوں میں جنگ وجدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کیلئے کی جانے والی کوششوں اور اقدامات کو بھی صورتحال سے بچانے کی ضرورت تھی تا کہ مسئلہ مزید پیچیدہ نہ ہو لیکن افسوس کہ کچھ زیادہ گرما گرمی کا ماحول بنا اور اقلیت کی گرما گرمی اور اکثریت کی گرما گرمی ایک دوسرے کے مقابلے میں آ گئی ،جس کی وجہ سے کامیابی میں پیچیدگی بڑھ گئی۔

بہر حال اب جب کہ مسلمانوں نے کورٹ کے فیصلہ کو ماننے کے ارادہ کا اعلان کر دیا ہے ۔اور کورٹ میں مقدمہ جن شہادتوں کے ساتھ چل رہا ہے اس سے ایک امید قائم ہوتی ہے ۔کہ انشاءاللہ فیصلہ ہم مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ اس مسئلہ کے حل کیلئے چیلنج کے انداز اور گرم سیاسی طریقوں کو اپنانے سے گریز کریں، اور قانونی وسنجیدہ انداز میں اس مسئلہ کے حل کی کوششوں کو جاری رکھیں۔

سوال: جناب والا کے نزدیک رام جنم بھومی تحریک کے پس پشت اصل مقاصد کیا تھے؟ اور ان مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہونی چاہئے؟ اس قضیہ کے حل کیلئے فریقین کو کیا کرنا چاہئے؟

جواب: یہ بات صاف ہے کہ رام جنم بھومی تحریک کے پس پشت مقاصد کی نوعیت مذہبی نہیں، بلکہ سیاسی ہے ۔اس سے وابستہ ذمہ دار افراد بھی مذہبی انداز اور خصوصیات کے نہیں ہیں، بلکہ سیاسی نوعیت کے لوگ ہیں ان کا عمومی طریقہ کار عوام میں منفی تاثر اور رد عمل

کا جذبہ پیدا کر کے الیکشن میں اکثریتی فرقہ کے زیادہ ووٹوں کا حاصل کرنا محسوس ہوتا ہے، مسلمانوں کی طرف سے اگر اسی طرح کا جوش اختیار کیا جائیگا تو مخالف عنصر کو اسی طریقے کو جواباً اختیار کر کے اپنی حکمت عملی کو کامیاب بنانے میں مدد ملے گی ۔اب جب کہ بابری مسجد کی شہادت کو دس برس کا عرصہ ہو گیا تو اس مدت میں یہ مسئلہ ''عوامی'' بن گیا ہے اور گویا ایک ایک فرد اس سے وابستہ ہو گیا ہے، اس صورت میں پیچیدگی بڑھ گئی ہے اور صورتحال کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ شاید کسی فریق کا حل دوسرے فریق کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ کے عوامی بن جانے سے رام جنم بھومی کی بات کرنے والوں کو اپنے اسی جوش و نعروں اور تحریکی عمل کو چلاتے رہنے اور جاری رکھنے کی ضرورت ہے ۔اس طرح مسئلہ کو پیچیدگیوں کا سامنا ہے ۔بہتر ہوتا کہ فریقین کے ذمہ داران سنجیدہ اور باوقار انداز میں باہمی مشورہ سے دونوں فریقوں کو صحیح نقطہ پر لا سکتے۔

سوال: بابری مسجد سانحہ کے سلسلہ میں ایک ذہنیت ایسی بھی ہے جو اسے جذباتی مسئلہ قرار دیتی ہے اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ جذباتی مسائل سے دامن بچاتے ہوئے اپنے تعلیمی واقتصادی مسائل کے حل کی طرف متوجہ ہوں؟

جواب: تعلیمی واقتصادی یا اس نوعیت کے دوسرے مسائل میں دلچسپی لینے کی بات غلط تو نہیں ہے لیکن مسائل بہر حال مسائل ہیں ۔چاہے وہ جذباتی نوعیت کے یا غیر جذباتی ہوں ۔مسائل اپنا حل چاہتے ہیں ۔البتہ جذباتی مسائل کو بھی مدبرانہ طور پر اور سنجیدہ حکمت عملی کے ساتھ حل کرنا چاہئے ۔نہ کہ جذباتیت کی رو میں اس طرح آگے بڑھا جائے کہ مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں پیچیدگی میں اضافہ ہو۔

سوال: حال میں گجرات کے انتخابات کے نتیجے میں اقلیتی طبقے میں جو بے دلی پید اہوئی اور اکثریتی طبقے کے لیڈروں کے جس طرح کے بیانات آرہے ہیں اس سے مسلمانوں کو کیا سمجھنا چاہئے؟

جواب: گجرات کے انتخابات کے نتائج کوئی بہت حیرت والے نتائج نہیں ہیں ان انتخابات کی کنونسنگ میں ہندو مذہب کو خطرہ میں بتا کر اور مسلمانوں کے متعلق برا تصور دے کر

وقتی اور جذباتی سطح سے ووٹوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔تنہا گودھرا کے واقعہ سے جذباتی احساسات پیدا کر کے اور مسلمانوں کو من حیث القوم مجرم اور ہندو دشمن بتانے کی بھرپور کوشش کی گئی اور ذہنوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر بی جے پی نہ آئے گی تو ہندو مذہب خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں الیکشن کے اس نتیجے کے ظاہر ہونے میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

گجرات ہندوستان کا ایک صوبہ ہے، کل ہندوستان نہیں ہے اور وہاں صوبائی حکومت ہندوفرقہ وارانہ ذہنیت کی تھی۔اور مرکزی حکومت بھی ان کی ہمدرد رہی ہے۔دوسرے صوبوں کو اس صوبے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ہندوفرقہ پرست لیڈر بیانات جو بھی دیں، ہندوستان کے باشعور ہندوعوام بہت دنوں تک اور بڑی تعداد میں دھوکے میں نہیں آئیں گی۔اور یہ طریقہ کار ہر جگہ اختیار بھی نہیں کیا جاسکے گا۔اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے گجرات کے ہولناک فسادات ہوں یا وہاں کے انتخابات کے نتیجے ان کے مطابق نہ ہوں تو ان سب باتوں کو وقتی اور محدود واقعات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔مسلمانوں پر ان کی تاریخ میں بڑے بڑے دشوار حالات وحوادث پیش آئے اور ان کو مٹانے اور کمزور کرنے کی سازشیں کی گئیں۔لیکن ان سے من حیث القوم مسلمانوں کو کوئی طویل نقصان نہیں پہنچا بلکہ ان کی ہمتیں بڑھیں اور حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بڑھا بلکہ تعداد بھی بڑھی ہے۔جو لوگ مسلمانوں کے تعلق سے تاریک پہلو دیکھتے ہیں ان کا مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ بہت ناقص ہے، مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہوتا رہتا ہے اور مشکلات کے باوجود آگے بڑھے ہیں۔اس حقیقت کو غیروں کو بھی سمجھنا چاہئے اور مسلمانوں کو بھی سمجھنا چاہئے اور محدود واقعات سے متاثر ہوکر بددل نہ ہونا چاہئے۔لیکن اپنے عمل کو درست کرنے اور اپنے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، اس کو راضی کر کے ہی ہم اس کی نصرت کے مستحق ہوسکتے ہیں۔معصیتوں کی کثرت کی صورت میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو بھی سزا دی جاتی ہے اپنے کو اس سے بچانے کی ضرورت ہے ہم اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں اور اپنے اللہ سے مدد بھی مانگتے رہیں۔

(پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ)

دارالقضاء متوازی نظام نہیں!

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب سے ایک ملاقات

تین طلاق سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے عوامل کیا ہوسکتے ہیں، باہمی اختلافات نے مسائل کو کیسے جنم دیا، قضاۃ کی تربیت کے لئے عملی اقدامات کیا ہوسکتے ہیں، دارالقضاء کی تاریخ سے واقفیت کی مہم کیسے چلائی جاسکتی ہے، متنازعہ مسائل کے حل کے لئے کیا کوئی اجتہادی قدم اٹھایا جانا ممکن ہے اور لوگ شرعی مسائل کے لئے شریعت کے بجائے عدالت سے کیوں رجوع کرتے ہیں، ان تمام مسائل پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا انٹرویو پیش ہے۔

س:-۲۲/اپریل ۲۰۰۶ء کے اخبارات میں اڑیسہ کی ایک تین طلاق یافتہ بیوی نجمہ بی بی سے متعلق سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ یا تبصرہ شائع ہوا ہے کہ "کوئی کسی کو اس کی مرضی کے خلاف الگ رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا" جبکہ میڈیا کے اس پرچار کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جسٹس کتجو نے اس مسئلہ پر محض اپنی رائے پیش کی ہے کہ کوئی فیصلہ نہیں سنایا، اس پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- عدالت میں جو فیصلے ہوتے ہیں اس میں الفاظ اور متن کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور اسی سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، مشکل یہ ہوتی ہے کہ عدالت کے فیصلوں کو پریس والے اپنی معلومات کی حد تک شائع کردیتے ہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ

عدالت کا فیصلہ ایسا نہیں ہوا کرتا جیسے آپس میں لوگ بات چیت کرتے ہیں اور پھر اس کو کوئی اپنے اسلوب میں یا اپنی زبان میں نقل کردے، فیصلہ کو دیکھنا پڑتا ہے، یہ کام وکیل حضرات ہی کرسکتے ہیں کہ اس میں کیا اشارات پائے جاتے ہیں، اس سے پہلے بھی اس طرح کے واقعات پیش آئے ہیں، بورڈ ایسے موقعوں پر فوری طور پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا، حالانکہ لوگ کہتے بھی ہیں کہ بورڈ کیوں نہیں اس مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کردیتا تاکہ جھگڑا نہ ہو، بورڈ ایسا غیر ذمہ دارانہ کام نہیں کرسکتا کہ اخبار میں کوئی خبر آئے اور اس کی بنیاد پر اپنی رائے دیدے یا اس پر تبصرہ کردے، یہ بات تو بورڈ کی سنجیدگی کے خلاف ہے، جب تک عدالت کے فیصلہ کا پورا متن سامنے نہ ہو، اس وقت تک ہم کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے، اڑیسہ کے حالیہ مسئلہ کے متعلق بعض قانون دانوں نے بتایا اور اخبارات میں بھی آیا کہ جس طرح سے بات سامنے آئی ہے، فی الواقع بات اس طرح کی نہیں ہے، کورٹ کے سامنے ایک مسئلہ آیا کہ ایک جوڑا ساتھ رہنا چاہتا ہے لیکن اسے ایک ساتھ نہ رہنے پر زبردستی مجبور کیا جارہا ہے، اس پر سماجی دباؤ بنایا جارہا ہے، اس پر کورٹ نے کہا کہ اس صورت میں اگر ایک جوڑا ساتھ رہنا چاہتا ہو تو اسے ایک ساتھ نہ رہنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں اور اگر کوئی مجبور کرتا ہے تو پولیس انہیں تحفظ دے، یہ ایک عام بات ہے اس فیصلے کے کیا الفاظ ہیں، کس طریقہ سے اس قضیہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا متن کیا ہے، اس سے کما حقہ واقفیت کے بغیر کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا، ہم اس کو شریعت میں مداخلت کیسے قرار دے سکتے ہیں، جب تک کہ پوری بات ہمارے سامنے نہ ہو۔

اہم بات یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان جوڑا شریعت کے بجائے کسی اور طرح سے اپنے مسئلہ کا فیصلہ چاہتا ہے اور عدالت سے اس سلسلہ میں رائے لینا چاہتا ہے تو اس میں عدالت کا کیا قصور ہے بلکہ یہ تو ہماری خرابی ہے کہ ایک شخص شریعت پر عمل نہیں کرنا چاہتا، غلطی یہ ہوتی ہے کہ مسلمان جب غیر مسلموں سے یا غیر مسلم عدالتوں سے رائے لیں گے تو وہ رائے بالکل وہ نہیں ہوسکتی جو اسلامی شریعت کی اور مسلمان عالم کی رائے ہوتی ہے، انہیں مسلم عالم

سے پوچھنا چاہئے، اب جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے جسے میڈیا بار بار اچھالتا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے تبصرے شائع کئے جاتے ہیں کہ آیا تین طلاقیں ہیں یا ایک طلاق، حقیقت یہ ہے کہ تین طلاق کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سارے مسالک اس بات پر متفق ہیں کہ تین طلاق کے بعد طلاق واقع ہوجاتی ہے، صرف اس میں اختلاف ہے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دی ہیں یا کئی مجلسوں میں دی ہیں، سب مانتے ہیں کہ تین طلاق کے بعد قطعی طلاق ہوجاتی ہے، حنفی بھی مانتے ہیں، غیر حنفی بھی مانتے ہیں، بس اختلاف اس پر ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کی کیا نوعیت ہے اور علیحدہ علیحدہ مجلسوں میں دینے کی کیا نوعیت ہے، بعض مسلکوں میں یہ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دی جائے گی تو اس کی نوعیت ایک ہی طلاق کی ہوگی، گویا کہ دو طلاقیں باقی ہیں اور دوسروں کا مسلک یہ ہے کہ ایک سمجھدار آدمی جب تین مرتبہ طلاق طلاق کہتا ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہہ رہا ہے کہ وہ تین طلاقیں دے رہا ہے، اس لئے اس کو تین طلاق ماننا چاہئے، یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے، یہ مسلکی اختلاف ہے، تین طلاق کے معاملہ میں دونوں متفق ہیں، ہر ایک متفق ہے کہ تین طلاقوں کے بعد ہی قطعی طلاق ہوتی ہے خواہ وہ الگ الگ دی جائیں یا ایک مجلس میں دی جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگ طلاق کو ایک طرف تو بہت برا کہتے ہیں اور اسلام پر الزام لگاتے ہیں، جبکہ مسلمانوں میں تناسب بہت کم ہے، دوسری طرف ایسے ترقی یافتہ ممالک جو خود کو بہت ماڈرن کہتے ہیں اور اپنی تہذیب کے مقابلہ میں اسلام کو بہت دقیانوسی اور فرسودہ مذہب سمجھتے ہیں خود ان کے یہاں طلاق کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں، ان کے ہاں طلاق کے جو اعداد وشمار سامنے آتے ہیں، انہیں دیکھ کر آدمی حیران ہوجائے، لیکن انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اس صورت میں مسلمانوں کو طلاق کے سلسلہ میں متہم اور بدنام کرنے کا ان نام نہاد مغربی مفکرین کا طرز عمل صحیح اور مبنی بر انصاف نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ دیگر مذاہب میں طلاق کا کوئی تصور ہی نہ تھا لیکن اب سب نے طلاق کی اہمیت وضرورت کو تسلیم کرلیا ہے حتی کہ ہندو مذہب نے بھی طلاق کی حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے، اس صورت میں

مسلمانوں کو مجرم قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے، جبکہ پہلے کسی کے یہاں طلاق کی صورت نہیں تھی اور مجبور ہو کر انہوں نے طلاق کے قانون کو اختیار کیا ہے، اس کے برخلاف اسلام میں پہلے سے طلاق موجود ہے اور یہ اس بات کا حل ہے کہ جب میاں بیوی کسی طرح ایک ساتھ نہ رہ سکتے ہوں دونوں میں ایسی کشمکش ہے کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو اس مسئلہ کا حل کیا ہوگا؟ کیا ان کو زبردستی ایک کمرہ میں بند کردیں گے؟ کہ وہ آپس میں لڑیں، ایک دوسرے کو ماریں اس کا حل طلاق ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے یہاں فوری طور سے طلاق دے دی جاتی ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے اس سلسلہ میں بہت سخت احکام وضع کئے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ طلاق دینا ناپسندیدہ اور بدترین عمل ہے اور مجبوری کا کام ہے، منع کیا گیا ہے، طلاق دینے سے سوائے اس صورت میں کہ مجبوری ہو اس وقت طلاق دی جائے، اسلام نے تو عجلت اور جلد طلاق دینے کی ہمت شکنی کی ہے، اس کے علاوہ اسلام نے طلاق کے لئے اصول بتایا ہے کہ ایک ایک کرکے طلاق دی جائے تاکہ سوچنے کا موقع ملے اور اگر مسئلہ حل ہوجائے تو وہ واپس ہوجائے، اس سے منع کیا گیا ہے کہ تین طلاقیں جلدی جلدی دیدی جائیں، لیکن بعض وقت ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ دونوں کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہوجاتا ہے بلکہ ایسا اختلاف ہوجاتا ہے کہ دونوں سے اگر کہا جائے کہ طلاق ابھی نہیں ہوگی ایک مہینہ کے بعد ہوگی تو کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے، ایسے اختلافات رونما ہوتے ہیں کہ بھائی بھائی کو مار سکتا ہے اور عزیز عزیز کو مار سکتا ہے، باپ بیٹے کو مار سکتا ہے تو شوہر بیوی کو یا بیوی شوہر کو نہیں مار سکتی؟ جب اختلاف اس حد تک ہو تو تین طلاق دے کر جلدی چھٹی پاجانا حکمت کی بات ہے یہ کہنا کہ فوراً طلاق دیدینا قطعی درست نہیں اور صحیح نہیں ہے، طلاق کی ایک ایسی قسم ضروری ہے جس میں فوراً مسئلہ کو حل کردیا جائے اسلام کی غلط تصویر پیش کرکے اس سلسلہ میں اسلام کو بدنام کیا جارہا ہے ورنہ اسلام میں ان چیزوں کی بڑی رعایت ہے۔

عدالت کے جس حالیہ فیصلہ کی بات ہورہی ہے اس کے تعلق سے معلوم ہوا کہ عدالت

نے یہ جو رائے دی ہے وہ اسلام کی شریعت کو سامنے رکھ کر نہیں دی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ایک جوڑے نے کہا کہ دونوں میاں بیوی ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ الگ ہوجائیں تو عدالت نے یہ کہا کہ زبردستی نہیں کی جاسکتی اور اگر زبردستی کی جارہی ہے تو پولیس تحفظ دے، یہ تو اس نے ایک انسانی سطح پر فیصلہ دیا ہے لیکن دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس میں شریعت کا ذکر ہے، شریعت کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی مخالفت کی گئی ہے، اس صورت میں بات دوسری ہے لیکن جب تک متن سامنے نہیں آتا ہم اس کے بارے میں کوئی بڑی رائے قائم نہیں کرسکتے اور اس پر اس وقت تک کوئی تبصرہ بھی نہیں ہونا چاہئے جب تک کہ قانون داں اس کے متن کو دیکھ کر کسی نتیجہ پر نہ پہنچیں۔

س:- مذکورہ مفتی چونکہ حنفی ہے اور خبروں کے مطابق وہاں کے علماء کا یہ اصرار ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ اسی صورت میں رہ سکتی ہے جب کہ وہ حلالہ کرے کیا، آپ کے نزدیک اس طرح کے اصرار اور سماجی دباؤ نے تو کہیں نئے جوڑے کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور نہیں کیا؟

ج:- جیسا کہ ابھی ہم نے عرض کیا کہ ایک اور تین طلاق میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس بات پر ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دی جاسکتی ہے یا نہیں لیکن یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے، جس کا جو مسلک ہے وہ اپنے مسلک کے مطابق عمل کرے، اگر کوئی ایک مجلس میں تین طلاق کے مسلک کو ماننے والا ہے مثلاً حنفی ہے، میاں بیوی حنفی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ حنفی مسلک کے مطابق عمل کریں گے، اس کے برخلاف دوسرے مسلک کے ہیں تو اس کے مطابق عمل کریں گے، اس کو اسے ایک دوسرے کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، البتہ اپنے مسلک کا پابند ہوا ایسا نہ ہو کو حسب ضرورت یا مصلحت کبھی اس مسلک پر عمل کرلیا اور کبھی دوسرے مسلک کو اپنا لیا، جو جس مسلک کا ہے وہ اس مسلک کے مفتی سے پوچھ کر عمل کرے۔

مفتی جو بات کہتا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ شرعی کتابوں کے حوالوں سے کہتا ہے اور قرآن وحدیث کے مطابق کہتا ہے اس لئے ایسا شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہوا اس کے

لئے لازم ہے کہ قرآن وحدیث کوتسلیم کرے اوران کے مطابق عمل کرے چاہے اس کا جی چاہے یا نہ چاہے، اگر وہ عمل نہ کرے تو پھر مفتی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مفتی نے تو مسئلہ بتادیا کہ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں یہ ہے فقہ میں یہ ہے اب تم اپنے خدا کوخوش کرنا چاہتے ہوتو عمل کرواور خدانخواستہ اپنے خدا کوناراض کرنا چاہتے ہوتو تمہاری مرضی۔

اس صورت میں اگر کوئی عدالت چلا جاتا ہے تو یہ اس کا عمل ہے مفتی اور قاضی منع بھی نہیں کر سکتے، ہمارے ملک کا جو قانون ہے اس میں اگر وہ بات قانون کے دائرہ میں آتی ہے تو اسی کے مطابق وہ قانون اس پر جاری کیا جائے گا، ہندوستان کے دستور میں مسلم پرسنل لاء کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ہم مسلم پرسنل لاء کے معاملات میں مطالبہ بھی کرتے رہتے ہیں، البتہ دستور کی دوسری دفعات بھی ہیں، مسلمان کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے مطابق زندگی گذارے، اس پر عمل کرے، مسائل کو علماء سے پوچھ کر حل کرے اس صورت میں اسے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے گی اور اگر وہ جاتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں بے پرواہ ہے اور اس سے انحراف کررہا ہے۔

حلالہ کا جہاں تک مسئلہ ہے اس کو لوگوں نے ایک خاص انداز دیدیا ہے، حلالہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے کوئی گالی سمجھی جائے، اصل بات یہ ہے کہ تین طلاق واقع ہوجانے کے بعد زوجین میں یکجائی نہیں ہوسکتی اور اب وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے، البتہ اگر ایسی شکل بنتی ہے کہ عورت نے مایوس ہوکر دوسری شادی کرلی لیکن وہاں بھی حالات ناسازگار پیش آئے اور اسے طلاق دیدی گئی تو اب اسے اختیار ہوگا کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کرلے وہ اس کے یہاں یونہی واپس نہیں آجائیگی بلکہ جس طرح اوروں سے نکاح کرسکتی ہے، اسی طرح اس سے بھی نکاح کرسکتی ہے، اس کا نام لوگوں نے حلالہ رکھ دیا حلالہ کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا نکاح کرلینے پھر کسی وجہ سے طلاق واقع ہوجانے کے بعد بعد از نکاح وہ اپنے سابق شوہر کے لئے حلال ہوجاتی ہے، حلالہ حلال سے ہے کہ

اب وہ اپنے سابق شوہر کے لئے حلال ہوگئی ہے اوراس سے نکاح کرسکتی ہے، اس کو گالی کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عورت اگر شادی کرتی ہے اوراس کی نیت ہے کہ وہ اس شوہر سے طلاق لے کر اپنے سابق شوہر کے پاس چلی جائے گی تو اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوگا نکاح جب بھی کیا جاتا اس نیت کے پیش نظر کیا جاتا ہے کہ یہ بناؤ ہمیشہ رہے گا لیکن خدانخواستہ حالات ایسے ہوجائیں کہ طلاق کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے تو طلاق دیدی جائیگی بہر حال نکاح وقتی نہیں ہوا کرتا اور نیت اسے زندگی بھر نبھانے کی ہوتی ہے۔

س:-عمرانہ کیس کے سلسلہ میں ہمارے مختلف مسلک کے علماء کی طرف سے جو بیان بازیاں ہوئیں تھیں اس میں جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، اڑیسہ کی نجمہ بی بی کے مسئلہ میں بھی یہی دیکھنے میں آرہا ہے، مزید یہ کہ مختلف سماجی اور خواتین تنظیمیں بھی اس سلسلہ میں آواز بلند کر رہی ہیں، اس پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

ج:-یہ المیہ ہے کہ ایسے مسئلوں میں ہم سے بے احتیاطی ہوتی ہے، ہم اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں اور صحیح صورت حال سے واقفیت اور آگاہی کے بغیر ہی اس پر رائے زنی اور تبصرہ کرنے لگتے ہیں جب کہ ہمیں سوچنا چاہئے کہ اخبارات والوں نے کس نیت سے یہ خبر شائع کی ہوگی مثلاً عمرانہ ہی کے مسئلہ کو لیجئے، اس کا معاملہ یا مسئلہ چھوٹی نوعیت کا تھا جسے بہت بڑا بنا کر پیش کیا گیا، عمرانہ نے اپنے سسر پر الزام لگایا کہ اس نے اس کے ساتھ بدفعلی کی ہے، یہ الزام ابھی ثابت نہیں ہوسکا، مفتی اس وقت تک فتویٰ نہیں دے سکتا جب تک کوئی چیز واقع نہ ہوجائے لیکن اس معاملہ میں مفتی سے مسئلہ اس طرح سے پوچھ لیا گیا کہ واقعہ کو پوری طرح بیان کرنے کے بجائے جزوی طور پر صرف عمرانہ کے مسئلہ کو پوچھا گیا نتیجہ میں مفتی نے پوچھے گئے مسئلہ کے پیش نظر فتوی دیدیا، اس لئے کہ مفتی کا کام یہ ہے کہ جو سوال پوچھا جائے اس کے حدود میں رہتے ہوئے شریعت کے مطابق مسئلہ بتادیں، اگر سوال اور مسئلہ غلط طریقہ سے پوچھا جائیگا اور اصل حقیقت چھپائی جائیگی تو اس میں مفتی کا کوئی قصور

نہیں ہے، وہ تو اتنی ہی بات بتا سکتا ہے جتنا کہ پوچھا جائے گا، چنانچہ عمرانہ کیس میں بھی یہی ہوا، خسر کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں، صرف عمرانہ کے متعلق پوچھ لیا اور مفتی پر یہ الزام لگایا گیا کہ مفتی نے خسر کے جرم کو نظر انداز کر دیا، جب کہ واقعہ یہ نہیں تھا، اس مسئلہ کو اس طرح سے پیش کیا گیا جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ گویا احناف نے اس سلسلہ میں زیادتی کی ہے، اس پر ہمارے سلفی حضرات کو ناگواری ہوئی، جس کا انہوں نے اظہار بھی کیا اور افسوس کہ محض اخبارات کی خبروں پر اکتفا کرتے ہوئے سب کے بیانات آنا شروع ہو گئے، ظاہر ہے کہ بے احتیاطی کی بات تھی، لیکن جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور یہ سمجھ گئے کہ عمرانہ کیس میں پڑنے کا کام ہمارا نہیں تھا، فریقین حنفی تھے چنانچہ جب مفتی سے فتوی لیا گیا تو ظاہر ہے مفتی حنفی مسلک کے مطابق فیصلہ دے گا مثلاً اگر فریقین سلفی ہوتے تو کوئی سلفی مفتی فتوی دیتا، بہرحال اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی اس کا چرچا کیا جاتا اور اس پر بیانات دیے جاتے۔

اس وقت مسلمانوں کی کمزوریوں کو تلاش کرنے کا رواج ہو گیا ہے، جب کمزوریاں نہیں ملتیں تو وہ باتیں جو مخالفین کی سمجھ میں نہیں آتیں وہ انہیں مسلمانوں کی کمزوری بتا کر ان کا چرچا کرنے لگتے ہیں، پریس کو اس سلسلہ میں احتیاط برتنی چاہئے، پریس کی افادیت سے انکار نہیں، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ پریس مثبت ذہن بنائے اور تعمیری رول ادا کرے نہ کہ وہ کمزوریوں کو اچھالے اور ان پر تبصرہ اور رائے زنی کرے، اس سے معاشرہ کو نقصان ہی پہنچے گا۔

س:- ہندوستان میں مسلمانوں کے تناسب کے لحاظ سے دار القضاء کی تعداد بہت کم ہے، سننے میں آرہا ہے کہ چند دنوں میں ہی ندوہ میں قضاۃ (شرعی جج) کی ٹریننگ کے لئے اور دار القضاء کے مسائل پر غور وخوض کے لئے ایک میٹنگ منعقد ہوگی، آنجناب کے نزدیک اس کے کون سے دوررس اور مفید نتائج مرتب ہو سکتے ہیں؟

ج:- دار القضاء کا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مابین شریعت کے دائرہ میں رہتے

ہوئے مسائل اگر سامنے آئیں تو کسی کو حکم (جج) بنا کر شریعت کی روشنی میں مسئلہ کا حل نکالنے اور جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، چونکہ دار القضاء میں مفتیانِ کرام شریعت سے واقف ہوتے ہیں، نیز سماجی یا انفرادی قضیوں کو شریعت کی روشنی میں نپٹانے کا سلیقہ رکھتے ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جگہ جگہ دار القضاء قائم کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کو رواج دیا جائے تاکہ جن کے ذریعہ ایسے مسلمانوں کی دشواریاں کم ہوں جو شریعت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ دار القضاء میں فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہیں، چنانچہ ایسا شخص جو شریعت کا حکم نہیں مانتا وہ دار القضاء میں جائیگا ہی نہیں، پھر یہ کہ دار القضاء کسی کو مجبور بھی نہیں کرتا کہ وہ دار القضاء آکر اپنے قضیہ کو حل کرائے بلکہ قاضی فریقین سے پہلے ہی اس بات کی یقین دہانی لے لیتا ہے کہ آپ ہم کو حکم (جج) تسلیم کریں گے اور ہمارے اس فیصلہ کو مانیں گے جو فیصلہ قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہوگا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہیں کہ دار القضاء مسلمانوں کی سہولت کے لئے قائم کئے جارہے ہیں تاکہ ان کے قضیے آسانی کے ساتھ نمٹ جائیں، دار القضاء اور عدالت کی کارروائی کا بغور جائزہ لیا جائے تو تجربہ اور مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ اولاً تو عدالت کے لوگ شریعت سے کما حقہ واقف نہیں ہوتے، اس کے علاوہ وہاں مقدمات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ انہیں فیصل ہونے میں برسوں درکار ہوتے ہیں، اس کے برخلاف دار القضاء میں چند پیشیوں میں ہی قضیے حل ہو جاتے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ دار القضاء مسائل کو جلد نپٹانے اور مسلمانوں کو سہولت پہنچانے کی خاطر قائم کئے جاتے ہیں، البتہ دار القضاء اپنے فیصلے کو ماننے کے لئے کسی کو بھی مجبور نہیں کرتا، دار القضاء کا مفتی فتوی دیدیتا ہے، اب اس پر دارومدار ہوتا ہے کہ فریقین کو اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر کس حد تک یقین ہے، اب اس کے مطابق وہ دار القضاء کے فیصلہ کو مانے یا نہ مانے ان سارے امور کی روشنی میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ دار القضاء عدالت کے متوازی کوئی چیز ہے، نہ اس میں کوئی زور وزبردستی کی جاتی ہے، بس اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص قانونی چارہ

جوئی کے لئے یا قانونی واقفیت کے لئے کسی وکیل سے رجوع کرے کہ اس سلسلہ میں قانون کیا کہتا ہے، وکیل اسے قانون بتادیتا ہے، اسی طرح سے دار القضاء کا مفتی بھی فتوی سنا دیتا ہے، اپنے قضیہ کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کا خواہش مند شخص دار القضاء سے رجوع کرتا ہے، البتہ جن لوگوں کو شرعی قانون معلوم ہوتے ہیں انہیں دار القضاء جانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، حاصل یہ ہے کہ مفتی کی حیثیت تو بس ایک قانون داں کی ہے جو شرعی مسائل پوچھنے والوں کو ان کا حل بتادے۔

س:- دارالافتاء اور دارالقضاء کی ایک طویل تاریخ رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس تاریخی حقیقت سے عموماً لوگ کما حقہ واقف نہیں ہیں، کیا بورڈ اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور دارالافتاء اور دارالقضاء کے تعارف وافادیت سے واقفیت کے لئے کوئی مہم یا منصوبہ اس کے پیش نظر ہے؟

ج:- جی ہاں! ہمارا منصوبہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس کی اہمیت کو واضح اور اجاگر کریں اور جابجا دار القضاء قائم کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمانوں کے مسائل اور قضیہ حل ہوں، ہم ان پر کوئی چیز مسلط نہیں کر رہے ہیں بلکہ دار القضاء ان ہی لوگوں کے معاملات کو لیتا ہے جو اللہ و رسول ﷺ کے احکام کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں، رہی بات دار القضاء کے لئے تربیت یافتہ مفتیان کرام کی تو اس سلسلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ فکر مند ہے اور چاہتا ہے کہ ایسے قاضی کی تربیت ہو سکے جو معاملات اور قضیوں کو شریعت کی روشنی میں سلجھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دار القضاء کے ذریعہ مسائل کو حل کرنے کوشش کی جاتی ہے، لوگوں پر زبردستی لادنے یا انہیں کسی مصیبت میں گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

س:- یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ شریعت فقہ حنفی تک محدود نہیں ہے اور جب مسائل کا حل دوسرے مسالک کے پاس موجود ہے تو ان سے استفادہ کرنا چاہئے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ نازک صورتحال کو دیکھتے ہوئے متنازعہ مسائل میں کیا علماء کوئی ایسی راہ نہیں نکال سکتے کہ ہمارے شرعی مسائل جگ ہنسائی کا ذریعہ نہ بنیں اور فتنوں کے دروازہ بھی بند ہو جائیں؟

ج:- دیکھئے دائرہ عمل کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے، مفتی اپنی طرف سے کوئی فتوی نہیں دیتا بلکہ جب اسے کوئی فتوی پوچھنے آتا ہے تب ہی وہ فتوی دیتا ہے، اگر کوئی شخص کسی مفتی کے پاس فتوی پوچھنے آئے تو ظاہر ہے کہ وہ اس مفتی کے مسلک سے واقف ہے، اور اسی مسلک کے مطابق فتوی جاننا چاہتا ہے، فتوی پوچھے بغیر فتوی نہیں دیا جاتا، یہ ایک اصول ہے کہ جب فتوی لینے والا ہی کسی مخصوص مسلک کا فتوی پوچھ رہا ہے تو اس میں مفتی کیا کریگا، ظاہر ہے اسی مسلک کے مطابق فتوی دیگا، اسی طرح دوسرے مسالک والے اپنے اپنے مفتیوں سے فتوی لیں گے تو اس صورت میں ٹکراؤ کہاں ہوا، جہاں تک آپ نے احناف کے فتووں کی بات کہی ہے تو اس سلسلہ میں بھی یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ حنفی مفتی احناف کے حلقوں میں ان کے لئے ہی فتوی دیتا ہے ان کے فتووں کو کسی دوسرے مسلک کے خلاف نہیں سمجھا جانا چاہئے، نیز ایک مفتی کوئی بات اپنے دل سے نہیں کہتا بلکہ شرعی کتابوں میں جو حکم ہے وہ اسے بتادیتا ہے، عمل کرنا نہ کرنا فتوی پوچھنے والے پر موقوف ہے اور اس کے لئے وہ اللہ کے حضور جوابدہ ہوگا۔

س:- شریعت میں ہمارے جملہ مسائل کا حل موجود ہے، اس لئے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اس صورت میں ان لوگوں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے جو شریعت کے بجائے عدالت میں اپنے مسائل لے جاتے ہیں اور شریعت سے اپنا دامن بچاتے ہیں؟

ج:- ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ شریعت کو ماننا نہیں چاہتے ہیں، شریعت کے مطابق مسئلہ کو پوچھے بغیر اگر کوئی شخص اپنے کسی مسئلہ میں عام دنیا کے مثلاً امریکہ و برطانیہ کے احکام اور آراء کو جاننا چاہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نعوذ باللہ شریعت کو نظر انداز کر رہا ہے اور اس پر عمل کرنا نہیں چاہتا، اس صورت میں ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں، آدمی کے دین اور عمل کی بات ہے جو دین کی پیروی ہی نہ کرنا چاہے تو ایسے شخص کے سوائے مذمت کرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

(سہ روزہ دعوت دہلی: ۱۹؍ مئی ۲۰۰۶ء)

مخالفین پر اسلام کا رعب اور خوف طاری ہے!

بانی آل انڈیا ملی کونسل وسابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ سے ایک ملاقات

گزشتہ ماہ فروری ۲۰۰۰ء میں ایک مدت بعد قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے ...... قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ حضرت قاضی صاحب گزشتہ مہینوں شدید علالت سے بلکہ موت وزیست کی کشمکش سے دوچار رہے، بظاہر صورت حال بڑی مایوس کن تھی مگر اللہ کا فضل شامل حال رہا اور ماشاء اللہ حیرت انگیز طور پر حضرت قاضی صاحب روبصحت ہوتے چلے گئے ...... لکھنؤ آمد کے اس موقع پر جب ان سے نیاز حاصل ہوا تو ان کی مجلس کا ویسا ہی رنگ پایا جیسا کہ علالت سے قبل مشاہدہ ہوا تھا، باغ و بہار مجلس! علمی و تعلیمی رنگ لئے ہوئے، اس کے ساتھ حاضر ہونے والوں میں احساس عمل کو جگانے والی اور دین وملت کے لیے بساط بھر کچھ کر گزرنے کا احساس دلانے والی مجلس!! حضرت قاضی صاحب کے دوا علاج کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ رب کریم حضرت موصوف کو صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے، موصوف کی تگ ودو کا مقصد یہ ہے کہ اس بیمار ملت کی مسیحائی کے لئے جو کچھ بن پڑے، تدبیریں اختیار کی جائیں، اس لحاظ سے وہ پوری

ملت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں...... لکھنؤ میں ان کی آمد کے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے راقم آثم نے ان سے انٹرویو کے لیے درخواست کی جسے انہوں نے اپنی مصروفیت اور علالت کے باوجود ازراہِ شفقت قبول فرمایا...... صمیم قلب سے حضرت قاضی صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل انٹرویو نذر قارئین ہے۔

سوال: آپ کی ایک طویل علالت کے بعد آج الحمدللہ آپ سے نیاز حاصل ہو رہا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہم آپ کی علالت وصحت کے متعلق جاننا چاہیں گے۔ اس دوران آپ کی تصنیفی وتالیفی مصروفیات کی بھی خبریں آتی رہیں، ہم شکر گزار ہوں گے اگر اس پر بھی جناب والا کچھ روشنی ڈالیں تاکہ ہم طالب علموں کو بھی اس سے کچھ حوصلہ ملے۔

جواب: اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں پہلے سے بہتر ہوں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ صحت کی بہتری میں بزرگوں، دوستوں ملک اور بیرون ملک میں بسنے والے مخلصین کی دعاؤں کو میں بہت مؤثر وکارگر سمجھتا ہوں، شاید میں بیمار تو پہلے سے تھا مجھے احساس نہیں تھا، بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور دور دراز گاؤں گاؤں، دیہات دیہات گھوم رہا تھا لیکن جب اپریل ۱۹۹۸ء میں ۱۷/اپریل کو میں ناگپور ہوتے ہوئے آکولہ گیا جہاں دارالقضا کا قیام عمل میں آنا تھا، وہاں سے واپسی میں دہلی پہنچا تو طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، اسی کیفیت میں چار یا پانچ دن گزرے، اس وقت ملی پولیٹیکل فورم کا مسئلہ تھا، اس کام سے نپٹنے کے بعد میں بالکل معذور ہوگیا۔ ڈاکٹروں کے یہاں سے ہوتے ہوئے ممبئی میں جاکر اپولو اسپتال میں ۲۷/اپریل کو میری بیماری کے بارے میں مکمل تشخیص ہوئی۔ اس وقت سے زیر علاج ہوں، شروع میں حالات زیادہ خراب تھے، تکلیف بہت تھی، میں ہل نہیں سکتا تھا، چل نہیں سکتا تھا لیکن الحمدللہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا گیا، ڈاکٹر بھی حیران ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں، شاید اس کا اثر ہے اور جو Cell 75% سے شروع ہوا تھا وہ گھٹ کر 3% پر آ گیا، اسے اللہ کے فضل خاص کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

لیکن اس مرض کا دوسرا پہلو بہت ہی خاص ہے اور وہ فراغت کا پہلو ہے جو زندگی میں مجھے شاید پہلی بار میسر آیا، مدرسہ میں مدرس تھا اس کے بعد ۶۲ء سے امارت شرعیہ میں آیا تو بھاگ دوڑ کی زندگی تھی۔ پہلی بار ایسا موقع ملا کہ سکون کے ساتھ ایک جگہ رہ سکا، آہستہ آہستہ کتابیں منگواتا چلا گیا، ایک لائبریری وہاں بھی جمع ہوگئی، 'صنوان القضا وعنوان الافتاء' نامی ایک کتاب کی تحقیق کا کام میرے سامنے تھا، ۶۴۲ء میں اس کتاب کے مصنف ہندوستان کے قاضی القضاۃ تھے، اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کے مصنف بہت قدیم علماء میں سے ہیں۔ الحمدللہ اس کتاب کی تحقیق کا کام چار جلدوں میں مکمل ہوگیا، اور وزارت اوقاف کویت نے اس کو اپنی ذمہ داری پر شائع کرنے کے لیے منتخب بھی کیا جو اس کو دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کے علوم وافکار جو بکھرے ہوئے تھے کو مختلف جگہوں سے اپنے دوستوں کی رفاقت اور تعاون سے یکجا کیا گیا، الحمدللہ اس کی ایک جلد ''فتاویٰ مولانا سجادؒ'' کے نام سے چھپ گئی ہے، اس کے علاوہ تقریباً آٹھ نو کتابیں اور ہیں ''خطوط سجادؒ'' مکاتیب سجادؒ'' ''خطبات سجادؒ'' اور جو قانونی مسودات مولانا کے منطبق ہوئے تھے اس کے مشتملات، اس طرح تقریباً آٹھ نو کتابیں الحمدللہ تیار ہوکر شائع ہوگئی ہیں، یہ اللہ کا خاص فضل واحسان ہے، کچھ اور کام بھی ہورہا ہے اور انشاءاللہ جلد ہی پورا ہوجائیگا تو اس طرح اس بیماری میں بھی اللہ کا فضل شامل حال رہا اور یہ نعمت حاصل رہی کہ اس میں کچھ نہ کچھ علمی کام کرنے کا موقع ملا۔

سوال: حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی قدآور شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ عالم اسلام اور دوسرے اداروں کا تو خسارہ ہوا ہی ہے لیکن مسلم پرسنل لاء بورڈ کی ساکھ کے باقی رکھنے کا مسئلہ سامنے ہے، اس سانحہ کے بعد آپ کے نزدیک بورڈ کا مستقبل؟

جواب: حضرت مولاناؒ کے سانحۂ ارتحال پر ہم جیسے خدام کا اپنا تاثر بتانا مشکل ترین کام ہے، میں مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم وہ تمام لوگ جو ملت کا کوئی کام بھی انجام

دے رہے ہیں یا انجام دینا چاہتے ہیں، ہم سب یتیم ہوگئے ہیں، کوئی ہمارے سروں پہ ہاتھ رکھنے والا نہیں، کوئی دست شفقت رکھنے والا نہیں۔ ہم بہرحال ایک بہت بڑی دولت سے محروم ہوگئے ہیں، اللہ نے حضرت مولاناؒ کو بیش بہا خصوصیات سے نوازا تھا، میں نے حضرت مولاناؒ کی وفات پر جو کچھ لکھا ہے ''بحث ونظر'' میں آپ اسے دیکھ لیں، میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

رہی بات مسلم پرسنل لا بورڈ کے مستقبل کی، تو مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم اور برقرار رہے گا، اور انشاء اللہ زیادہ متحرک اور Active رہے گا، مایوس ہونے کی بات نہیں۔ ہمیں تو ہمت سے یہ کہنا چاہیے کہ اذا مات منا سید قام سید حضرت مولاناؒ کے ساتھ رہ کر بہت سے لوگوں نے تربیت بھی حاصل کی، حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ یہ دو بڑی رجال ساز شخصیتیں گذری ہیں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ارکان مسلم پرسنل لاء بورڈ خلوص کے ساتھ اللہ کے لیے ادارہ کی بقاء کے لیے جدوجہد کریں۔

سوال: اکیسویں صدی میں مسلمانوں کا مستقبل؟

جواب: یہ الفاظ بولے جاتے ہیں اکیسویں صدی اور بائیسویں صدی، لیکن ہمارے نزدیک صدیوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، سن ہو، مہینہ ہو، ہفتہ ہو، ایام ہو، صدی ہو تو وقت تو گزرنے والا ہے، گزر جاتا ہے، وقت کی حیثیت ظرف کی ہے، اور ظرف کی کوئی حیثیت نہیں، اس ظرف میں کیا رکھا ہے اس کی قیمت ہوتی ہے، اس لیے یہ دیکھنا چاہئیے کہ ہم نے پچھلی صدی میں کیا کیا اس کا محاسبہ۔ اور آئندہ صدی میں ہم کو کیا کرنا چاہیے، اس کا خاکہ اور پروگرام بنایا جانا چاہیے، ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو بنیادی مسائل ہیں ان میں ہیں: دعوت، تعلیم کو گاؤں گاؤں گھر گھر تک پہنچا دینا، پوری مسلمان قوم کو تعلیم یافتہ بنا دینا اور جس طرح کے حملہ ان کے دین پر، ان کے عقائد پر، ان کے ایمان پر ہو رہے ہیں

موجودہ حالات میں، ان پر Cautious رہنا، چوکنا اور ہوشیار رہنا...... یہ بے حد ضروری ہے، اسی طرح دین کے معاملہ میں صلابت بے حد ضروری ہے تو تعلیم کو عام کرنا، دعوت کی روح پیدا کرنا، آنے والے فتنوں پر نظر رکھنا اور ایمانی فراست سے ان کو پہچاننا اور دین کے معاملہ میں اور اللہ کی توحید کے معاملہ میں حساس اور ہوشیار و چوکنا رہنا...... شرک مختلف راہوں سے اس طرح آرہا ہے ''**کدیب النمل**''، ایسے ہی خاموش راہوں سے شرک ہمارے دلوں کے اندر گھس رہا ہے، اس معاملہ میں ہم کس قدر حساس ہیں! اپنی ملت کو حساس بنا سکتے ہیں، یہ ایک مسئلہ ہے، چیلنج ہے ہمارے لیے، خصوصا ہندوستان کے ماحول میں اور پھر یہ کہ کس قدر صلابت دینی کیساتھ اس طرح کی صورت حال کا مقابلہ کرسکتے ہیں، اس چیلنج کو ہمیں قبول کرنا ہے۔

آنے والی صدی میں ہندوستان میں ہمارے مسلمان کی حیثیت سے باقی رہنے کے لیے اس پر غور وخوض ضروری ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو بہت بڑا نقصان ہوگا، خلاصہ کے طور پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں ساری صورت حال کو سامنے رکھ کر۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے عقائد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے اور رکھنے کا مسئلہ ترجیحی مسئلہ ہے، اعمال دین کو ان رسوم کی شکل نہیں اختیار کرنے دینا ہے جو رسوم ورواج Fashion بن کر سامنے آرہے ہیں، اس کے بعد ملت میں تعلیم کی اشاعت کا کام دین کی بنیادی تعلیم کا اور جدید علوم سے وابستگی کا کام ہو، اس کے علاوہ اپنی معاشی حالت کو بھی سنوارنے کی کوشش ہو، ساتھ ساتھ شعور کی بیداری اور پختگی تا کہ ایسے رواج جو دین اور اسلام کی بنیادی تعلیم کے ہیں ان کی مخالفت اور پوری دینی حمیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔

سوال: ان دنوں میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں پر دہشت گردی کے الزام اور پروپیگنڈہ پر آپ کا ردعمل؟

جواب: دراصل مخالفین پر اسلام کا رعب اور خوف طاری ہے، اسلام بہر حال ایک طاقت ہے، خواہ ہم خود اس کو پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں، ابوجہل نے اس کو بہت پہلے

پہچان لیا تھا اور آج کے دور کا ابوجہل بھی اس کو پہچانتا ہے، یہ جو میڈیا ہے ابولہبی میڈیا ہے جو حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے گھوم گھوم کر یہ کہتا تھا کہ نعوذ باللہ یہ ساحر ہیں، مجنون ہیں، ان کی بات مت سننا...... تو یہ وہی ابولہب والا میڈیا ہے جو اسلام کے بارے میں دہشت گردی کی بات پھیلا کر لوگوں کو متنفر کررہا ہے تاکہ لوگ اسلام کی بات سنیں ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میڈیا اور اس طرح کے دوسرے پروپیگنڈوں کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ ایسے واقعات وحالات دنیا کے سامنے آئیں جن سے خود بخود وہ پروپیگنڈہ جھوٹا اور باطل قرار پائے، عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب لوگوں نے سچائیوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کایا ہی پلٹ گئی اور مخالفین جاں نثار ہوگئے۔ اس روشنی میں آج کے مسلمانوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ خود اسلام پر چل کر عملی طور پر ثابت کردیں کہ وہ انسانوں کے دوست ہیں، وہ ہر کمزور انسان کے مددگار ہیں، وہ مذہب کی تفریق اور امتیاز کے بغیر ہر محتاج اور مستحق انسان کی مدد کرتے ہیں، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے، ان کے پڑوس کا کوئی آدمی ان کے برتاؤ سے ہراساں نہیں ہوتا، اگر ان کے پاس کچھ بھی راحت پہنچانے کا سامان ہے تو وہ اپنے پڑوس کو بھی اس کے ذریعہ راحت پہنچائیں گے، میرا مطلب ہے کہ عملی زندگی میں اگر بولہبی میڈیا کا مقابلہ چراغ مصطفوی سے کیا جائے گا تو انشاء اللہ یہ جھوٹے پروپیگنڈے پادر ہوا ہو جائیں گے، اور رسول اللہ ﷺ کے دین کے محاسن مخالفین کے دلوں کو چھولیں گے۔

سوال: یوپی کا ریگولیشن بل اور دستور ہند پر نظر ثانی جیسے اقدامات کے تناظر میں آپ کے نزدیک ہندوستان میں سیکولرزم کا مستقبل؟

جواب: ایسا لگتا ہے کہ دنیا نے یہ سمجھ لیا ہے کہ سیکولرزم کے بچانے کے ٹھیکیدار تنہا ہم ہی ہیں، ایسا تاثر دیا جارہا ہے کہ گویا سیکولرزم کی حفاظت کی ذمہ داری اب ہماری ہی رہ گئی ہے حالانکہ لوگ نہیں جانتے کہ جس ملک میں ایک لاکھ عقائد کے لوگ بستے ہوں اور خود ایک ہندو دھرم کے اندر ہزاروں فرقے ہوں، وہاں پر باہم جینے کے لیے، ایک دوسرے کو برداشت کرنا اور ایسا رویہ اختیار کرنا کہ کوئی جبر کے ذریعہ ان کے عقیدہ کو نہ بدلے خود اس ملک کی بنیادی

ضرورت ہے، میرے نزدیک یہی اصول ہے سیکولرزم کا، اس سے آگے اور مختلف کوئی معنی ہو تو ہم نہیں جانتے۔ یہ اصول تو خود یہاں کی اکثریت یعنی ہندو مذہب کے ماننے والوں کے لیے زیادہ ضروری ہے، ابھی چونکہ ہم سامنے ہیں، اس لیے یہ صورت حال ہے، ورنہ اگر ہم نہ رہیں تو وہ آپس ہی میں لڑ پڑیں گے، ہندوستان کو ایسے مسلک پر لے چلنا جس سے اس ملک کے بسنے والوں کو اپنے مذہب اور اپنے عقیدہ کے معاملہ میں آزادی ہو، یہ یہاں کی بنیادی ضرورت ہے، دستور میں تبدیلی کی جو کوشش کی جارہی ہے ظاہر ہے کہ وہ انتہائی درجہ خطرناک ہے، ارادے کیا ہیں۔ بہرحال یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نیت اچھی ہے، جو کچھ سامنے آئے گا اس کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے، مسجدوں یا دیگر معابد پر پابندی لگانا انتہائی قابل مذمت فعل ہے .R.S.S کو کھلی چھوٹ دینا انتہائی قابل مذمت فعل ہے۔ اس طرح کے بہت سارے اقدامات ہو رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھاجپا کا خفیہ ایجنڈا ابھر کر سامنے آگیا ہے ہندوستان کے شہریوں کو اس کا نوٹس لینا چاہئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس طرح بھاجپا اور خصوصا جو حلیف پارٹیاں ہیں، جو محض اقتدار کی لالچ میں اور ستا کی چاہت میں .B.J.P کے ساتھ چل رہے ہیں، وہ یہ دیکھیں کہ .B.J.P اپنے دور اقتدار میں ہندوستان کو کس راستہ پر لے جارہی ہے جب کہ ابھی B.J.P پورے طور سے اقتدار (POWER) میں نہیں، کل خدانخواستہ وہ POWER میں آگئی اور حکومت اور اقتدار کے لیے ان بیساکھیوں کی بھی ضرورت نہ رہی تو وہ ہندوستان کے پورے ڈھانچے کو تبدیل کردیگی۔

سوال: حال میں منعقد ہونے والے فقہی سیمینار میں ایک موضوع مسلکی اختلافات اور اتحاد امت بھی ہے، ایک فقیہ کی حیثیت سے کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ عملی سطح پر یہ کس حد تک ممکن ہے؟ جب کہ ملت کا حال بھی آپ کے علم میں ہے، مثلا: رویت ہلال کے مسئلہ میں مسلمان جس باہمی اختلاف کا مظاہرہ کرتے ہیں اس سے برادران وطن پر بھی کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔

جواب: جہاں تک مسئلہ رویت ہلال کا ہے اور اس سلسلہ میں جتنا جھگڑا ہوتا ہے تو

میرے نزدیک یہ فقہ اور شرع کا اختلاف نہیں ہے بلکہ مسئلہ انتظام کا، اور لوگوں کی نفسانیت کا ہے۔ مسائل بالکل واضح ہیں اگر خبریں پہونچانے کا نظم صحیح ہو اور مزاج ہو اس پر اعتماد کرکے آگے چلنے کا، تو یہ مسئلہ ہی پیدا نہ ہو مگر کچھ تو عوام کے ڈر سے، ان کے ڈر سے ان کے ڈر سے، لوگ صحیح بات اعلان کرنے میں ہچکچاتے ہیں اس لئے مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس لحاظ سے میرے نزدیک یہ فقہی جھگڑا نہیں ہے، انتظامی مسئلہ ہے۔

بستی میں منعقد ہونے جارہے سیمنار میں ایک موضوع اتحاد ملت کا بھی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیکڑوں مسائل میں علماء کے اختلاف ہیں لیکن یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ایک تو وہ مسائل ہیں جو منصوص ہیں، منصوص مسائل میں اختلاف کا کوئی سوال نہیں لیکن وہ مسائل جس پر نص قطعی موجود نہیں ہے وہاں پر دو سمجھ کام کر سکتی ہے۔ اصل جواب تو آپ کو سمینار دے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسائل میں اجتہادی آراء کی وجہ سے جو اختلافات ہیں، وہ دراصل حق و باطل کا فرق نہیں۔ یہ ایک بات اگر سب کے سمجھ میں آجائے تو مسئلہ حل ہے مثلا زور سے آمین کہنے کو نہ تو باطل کہہ سکتے ہیں اور نہ آہستہ آمین کہنے کو ہی حق۔ اس طرح اس کا عکس ہے یا مثلا ہاتھ اٹھائیں کہ نہیں اٹھائیں، رفع یدین کریں کہ نہیں کریں یا اس طرح دیگر مسائل، یہ سارے کے سارے مسائل اجتہادی ہیں اور اس میں دو رائے کی گنجائش ہے پس یہ مناسب نہیں کہ یہ سمجھا جائے حق وہی ہے جس پر ہم ہیں بلکہ اس کے حق ہونے کا امکان ہے، جس کو ہم نہیں جانتے، ہاں جس مسلک پر ہم نہیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہی حق ہو، اور ممکن ہے کہ ہماری ہی سمجھ نہ ہو، لہٰذا اس کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ کاش یہ بات ہندوستان بھر میں عام کرسکیں! صحیح معنی میں مسلک کا اختلاف اجتہادی آراء کا اختلاف ہے، یہ دراصل دو فہم کا اختلاف ہے جس کی شریعت میں گنجائش موجود ہے، نہ اس سے کوئی فرقہ گمراہ ہوگا اور نہ ایک فرقہ پیدا ہو جائیگا، جب یہ مزاج پیدا ہوجائے گا تو دوسرے کو انگیز کرنے کا بھی مزاج پیدا ہوجائیگا۔

(ماہنامہ بانگ حراء: مارچ ۲۰۰۰ء)

مسلمانوں کے مشتعل ہونے سے
ہمیشہ فرقہ پرستوں کو فائدہ پہونچا

امیر شریعت بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ

حضرت مولانا نظام الدین صاحب سے ایک ملاقات

ملت اسلامیہ ہند یہ ہی نہیں عالم اسلام کے مسلمان مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، اغیار اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف ایسے شوشے چھوڑے جاتے رہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت ان کے دفاع میں خرچ ہو، اس انٹرویو میں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ملکوں میں مسلمانوں کے مختلف مسائل پر امیر شریعت سے گفتگو ہوئی، جو ہمارے لئے چشم کشا ہے، ملاحظہ ہو امیر شریعت کا درج ذیل انٹرویو!

سوال: آپ کے علم میں ہے کہ فاشسٹ عناصر نے تاج محل کے تاجیشوری مندر ہونے کا شوشہ چھوڑ کر باسی کڑھی کو ایک بار پھر ابال دینے کی کوشش کی ہے، پیش بندی کے طور پر شاہ جہاں وممتاز محل کی قبروں کو بنیاد بنا کر تاج محل کو سنی سنٹرل وقف بورڈ میں قبرستان کے طور پر مندرج کرنے کی بات ملت کے دردمند افراد نے کی ہے۔ کیا یہ اقدام فاشسٹ عناصر اور شر پسندانہ عناصر کو روکنے کیلئے کافی ثابت ہوگا؟ آپ کے نزدیک اس کا پائیدار حل کیا ہے؟

جواب: تاج محل کو آج کل ہی سے تاجیشوری کا مندر نہیں کہا جا رہا ہے، یہ پروپیگنڈہ آج کا نہیں ہے۔ انگریز مؤرخ برسہا برس قبل اس قسم کی زہر افشانی کر چکا ہے اور تاج محل

ہی نہیں قطب مینار اور جامع مسجد کے متعلق بھی ایسا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے۔ تاج محل کو تاجیشوری کا مندر سب سے پہلے انگریز مورخ نے کہا۔ اب یہ جو بات آپ نے کہی کہ سنی سنٹرل وقف بورڈ میں ملت کے ذمہ دار عناصر تاج محل کا رجسٹریشن کرانا چاہتے ہیں تا کہ پیش بندی ہو۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبروں کی بنیاد پر تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ صرف اتنا ہی اقدام اس پروپیگنڈہ کے پیش نظر کافی نہیں ہے۔ اصل کام تو حکومت کا ہے۔ اس کے پاس سارا ریکارڈ موجود ہے، وہ اپنے ریکارڈ کو بنیاد بنا کر اس قسم کے مذموم پروپیگنڈہ کا استیصال کر سکتی ہے۔

اس کی پوری قوت کے ساتھ تردید کر سکتی ہے۔ محض سنی سنٹرل بورڈ کا قبروں کے بنیاد پر رجسٹریشن کافی نہیں۔ اس کے بعد بھی یہ پروپیگنڈہ جاری رہے گا۔ تاج محل وقف بورڈ میں اندراج کرالیں گے۔ لیکن تب بھی پروپیگنڈہ تو جاری رہے گا۔

مثلاً جو دہلی کی جامع مسجد ہے وہ آج بھی وقف بورڈ میں درج ہے۔ لیکن یہ پروپیگنڈہ کہ یہ مندر پر بنائی گئی، اب بھی کیا جاتا ہے تو ایسا پروپیگنڈہ تو اس لئے کیا جاتا ہے کہ جھوٹ کو اتنی بار دہراتے رہو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔ اور اس کی بنیاد پر تہذیبی کارروائی اور مذہبی جذبات کو بھڑکانے کا بھی موقع ملے۔ اس لئے مسلمانوں کے جو شعائر ہیں جن سے ان کی تاریخ وابستہ ہے جن سے ان کی شناخت بنتی ہے اور قائم ہے کہ اس کو تبدیل کرنے کیلئے مسخ کرنے کیلئے بلکہ ان کو ختم کرنے کیلئے منصوبہ بند کوششیں بہت دنوں سے جاری ہیں۔ جو اسی کا ایک شاخسانہ ہے۔

جو لوگ رجسٹریشن کیلئے کوششیں کر رہے ہیں ٹھیک ہے ہم ان کی مخالفت نہیں کرتے لیکن یہ کافی نہیں۔ اصل ذمہ داری حکومت کی ہے۔ حکومت کو اپنی سطح سے تاج محل کے مندر ہونے جیسے پروپیگنڈہ کی مذمت ومخالفت اور ان کے تدارک کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان کے پاس اس کا ریکارڈ موجود ہے۔ اگر حکومت اس کی تردید کر دے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ میڈیا کے ذریعہ ایک بات پھیلتی رہتی ہے حکومت کی طرف سے کوئی بیان نہیں آتا۔

سوال: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ایسے جذباتی ایشوز مخصوص شر پسندانہ مقاصد کی

تکمیل کیلئے کئے جاتے ہیں۔تا کہ مسلمان مشتعل ہوکر اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں۔اس موقع پر مسلمانوں کو آپ کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

جواب: یہ جذباتیت کا مسئلہ ہی نہیں ہے مسلمانوں کو اس پر مشتعل ہی نہیں ہونا چاہئے ۔میں نے مدارس کے بارے میں بھی یہی کہا تھا کہ جولوگ مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ کہہ رہے ہیں ان کے جواب میں ہمیں مشتعل ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مدارس کے دروازے سب پر کھول دئے جانے چاہیے۔کہ آؤ دیکھو ہم کیا کررہے ہیں۔ہمیں مدارس کا معیار تعلیم اوران کے نظام تربیت کو بہتر سے بہتر بنانا چاہئے۔ بلکہ موقع ہوتو آپ برادران وطن کیلئے بھی تعلیم کے دروازے کھول دیں۔

تو تاج محل کے متعلق جو کچھ پروپگینڈہ کیا جارہا ہے وہ کھلا جھوٹ ہے۔اگر ہم مشتعل ہوئے تو شر پسند عناصر کو کھیل کھیلنے کا موقع ملے گا۔مسلمانوں کے مشتعل ہونے سے ہمیشہ فرقہ پرستوں کو فائدہ پہنچا۔جھوٹ جھوٹ ہے۔اس پر اشتعال کیسا؟ کوئی رات کو دن کہہ دے،کوئی دن کو رات کہہ دے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا۔سوائے اس کے کہ آپ اس کو جھوٹا سمجھیں۔اس پر مشتعل ہونا حماقت کی بات ہوگی۔

اس سے زیادہ سنگین مسئلہ ملت کے سامنے آیا جیسا کہ ابھی آپ نے بابری مسجد کا ذکر کیا،اس سلسلہ میں بڑے سنگین مرحلے آئے۔آئینی حقوق وقانونی دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہم اپنی پرامن جدوجہد جاری رکھیں۔تو اس کے لئے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔اس لئے کہ سچ کو سچ کہنے میں کسی ملاوٹ کی ضرورت نہیں ہے۔اور کسی سچ کو جھوٹ بنانے کیلئے کافی ملاوٹ کرنی پڑتی ہے۔

سوال: گوانتانا موبے قیدخانے میں قرآن پاک کی بے حرمتی کے واقعہ کو منظرعام پرلانے کے پس پشت امریکہ کے کیا عزائم ہوسکتے ہیں،نیز عالم اسلام کو امریکہ کی اس نفسیات کا جواب کس انداز میں دینا چاہئے؟

جواب: دیکھئے اگر آپ بغور مسائل کا جائزہ لیں تو آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ عالم اسلام میں حالیہ چند برسوں میں اس سے زیادہ سنگین واقعات رونما ہوئے۔مثلاً ایک

مثال سقوط کابل کی ہے۔افغانستان پر حملہ کیا کم سنگین واقعہ ہے۔آخر طالبان کا قصور کیا تھا۔یہی نا کہ ایک مثالی اسلامی نظام حکومت کیلئے کوشاں تھے۔اوراسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کررہے تھے۔بغیر کسی تصادم وٹکراؤ کے دنیا کے سامنے اسلام کی پرامن شبیہ پیش کررہے تھے۔لیکن طالبان کو ملیا میٹ اورنیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ انسانوں کا قتل ناحق کیا گیا ہے۔اسی طرح عراق کے معاملے کو لیجئے صدام حسین کی شخصیت پر بحث ایک جداگانہ بحث ہے۔لیکن صدام حسین پر بھی مہلک ہتھیاروں کو رکھنے کا الزام ثابت نہیں ہوا۔اورآج تک عراق میں حالات پرامن نہیں ہیں ۔نیز معصوم عوام نشانے پر ہیں۔تو یہ واقعات قرآن کی بے حرمتی سے بھی زیادہ بڑھ کر ہیں۔

قرآن کریم کی بے حرمتی تو ہمیں مشتعل کرنے کیلئے ہے اس لئے کہ جنہوں نے قرآن کریم کی بے حرمتی کی ہے انہوں نے ہی اس واقعہ کو میڈیا میں پیش کیا۔اوراس کی تشہیر کی ہے۔اس تشہیر کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے سوا کچھ نہیں ہے یہ بات ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔جیل کی چہاردیواری کے واقعہ کو ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ساری دنیا میں عام کرنے کے پس پشت مقصد یہی ہے کہ مسلمان سہل انگاری سے کام لیں،اس کے خلاف احتجاج کریں،دفاع میں اپنی توانائی خرچ کریں،اورتعمیری کاموں کی طرف سے ان کی توجہ منعطف ہوجائے۔

قرآن پاک کی بے حرمتی پر مسلمانوں کے احتجاج کو بے جا تو نہیں کہا جاسکتا یہ غیرت وحمیت کا تقاضا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو اقدام طاقت کے نشے میں اٹھایا جاتا ہے وہ طاقت ہی کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے۔اگر عالم اسلام میں طاقت ہے تو وہ امریکہ کی مذموم حرکت کو طاقت سے روک دے۔کہ پھر وہ کبھی جرأت وجسارت نہیں کرے گا قرآن پاک کی بے حرمتی جیسی ناپاک حرکت کی۔

جولوگ قرآن پاک کی بے حرمتی کے خلاف بیانات دے رہے ہیں مذمتی قرارداد یں پاس کررہے ہیں تو اس سے امریکہ پر کیا اثر پڑنے والا ہے۔اصل مسئلہ طاقت کا ہے۔شعائر اسلام کو مٹانے مدارس کو دہشت گرد قرار دینے،اسلامی نظام حکومت کو نیست ونابود کرنے،مسلم ممالک

پرنظر بدر کھنےاوراس زمرہ کے جتنے اقدامات ہیں انہیں روکنے کیلئے احتجاج کافی نہیں۔طاقت کی ضرورت ہے، دنیاMight is Rightکے اصول کو جانتی ہے۔

عالم اسلام جب تک مضبوط ومتحدنہیں ہوگا،اپنی طاقت وتوانائیوں کومجتمع نہیں کریگا،انتشار کو باہمی اتحاد سے نہیں بدلے گا۔اور جب تک امریکہ اوراس کی حلیف قوتوں کے سامنے خطرہ اور چیلنج بن کرنہیں آئے گا، عالم اسلام امریکہ کی مذموم حرکتوں اوراس کے ناپاک ارادوں کوروک نہیں سکتا،اصل مسئلہ ہے عالم اسلام کی غیرت ایمانی کا،ان کے اتحادفکروعمل کا۔کیا وہ بدلہ لینے کی پوزیشن میں آسکتے ہیں تب ہی جاکر مسئلہ کاحل سامنے آئے گا۔

یہ مسئلہ ہے سارے عالم اسلام کا،ایک ایسی طاقت جونشہ میں سرشار ہوکر ہماری قوتوں کوضائع کرنے پرتلی ہوئی ہے۔اس پرعالم اسلام غیرت ایمانی کا ثبوت نہ دے۔رہا احتجاج کا مسئلہ تو ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ایسے مسائل کھڑے ہی اس نیت سے کئے جاتے ہیں کہ مسلمان سڑک پرآجائیں،احتجاجی مظاہرے کریں اور پھرانہیں بہانہ تراشنے میں آسانی ہو ۔نقص امن کے نام پرمسلمانوں پر زیادتی کریں،گولیاں برسائیں،عورتوں کی عصمت وناموس سے کھلواڑ کریں۔

امریکہ ایک طرف توعالم اسلام کو تباہ کرنے کے درپے ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کومشتعل کرنے کے درپے ہےاورمسلمانوں کومشتعل کرنے کیلئے وقتاًفوقتاً شوشے بھی چھوڑتا رہتا ہے۔اس طرح ان کا استہزاء وتضحیک بھی کرتا ہے۔

سوال:ماڈل نکاح نامہ اب تک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔علی العموم اس کی کس حد تک پذیرائی ہوئی ہے؟

جواب:خواص کے طبقے نے،پرسنل لاءبورڈ کے اراکین نے اورمثبت فکر رکھنے والے اخبارات نے بھی اس معیاری نکاح نامہ کی تائید کی ہے۔عوام کے ہاتھوں تک تو یہ نکاح نامہ اب تک نہیں پہنچا ہے۔نکاح دراصل ایک معاہدہ ہےاورنکاح نامہ کا مقصد اس کوضبط تحریر میں لانا ہے۔ہمارے یہاں اگر گواہان موجود ہیں تو وہ معاہدہ میں Valid ہوگا لیکن لکھ لینا مستحب ہے۔جیسے صلح حدیبیہ میں لکھا گیا اسی طرح زبانی نکاح نامہ،جوایجاب

وقبول ہوتا ہے گواہان کی موجودگی میں وہValid تو ہےلیکن اسے اگر لکھا جائے تو کیا لکھا جائے یہ اس نکاح نامہ میں موجود ہے،نکاح آسان ہو،قابل قبول ہواورکوئی بات اس میں خلاف شرع نہ ہواس کالحاظ اس نکاح نامہ میں رکھا گیا ہے۔نکاح نامہ میں زیادہ سے زیادہ یہ اقرار لیا جاتا ہے کہ باہمی حقوق کی زوجین ادائیگی کریں گےلیکن اگر خدانخواستہ کوئی نزاع پیدا ہوگیا تو اسے شریعت کی روشنی میں حل کریں گے نکاح کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کاحل نکاح نامہ میں ڈھونڈنا ایک عجیب بات ہوئی،تو نکاح نامہ کے خلاف کوئی معقول اشکال کی خبراب تک تو ہمیں نہیں ملی یہاں تک کہ خواتین نے بھی اسے سراہااور پسند کیا۔

سوال:جمعیۃ العلماء کی طرف سے ایک علاحدہ اقرارنامہ لانے کی اڑتی اڑتی خبرسنی جارہی ہے؟اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:اصل میں نکاح نامہ کی کاپی پہلے طبقۂ علماء کومطالعہ ورائے زنی کے لئے بھیجی گئی تھی جس کی علی العموم تائید ہوئی تھی،حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ علماء نے بھی اس کی تائید کی تھی،رہی بات جمعیۃ کے ذریعہ اقرارنامہ کی،تواصلاح معاشرہ کے سلسلے میں ایک تجویز کےطور پراقرارنامہ کی بات آئی تھی، اور میں نے خوداس کی تائید کی،مجھ سے اس کی تائید کے لئے کہا گیا تو میں نے نکاح نامہ کی تفصیل میں اقرارنامہ موجود ہونے کا ذکر کیا،اس میں الگ سے کوئی بات نہیں ہے۔

سوال:حال میں ملت کے سامنے ایک اہم مسئلہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مسلمانوں کو پچاس فیصد ریزرویشن دیئے جانے کا سامنے آیا ہے جس پرسنگھ پریوار کے علاوہ بائیں بازو نے واویلا مچایا ہے؟اس پرآپ کا تبصرہ۔

جواب:مخالفین کوریزرویشن کی مخالفت کرنا ہی چاہئے۔مسلمانوں کے مفاد کی بات جب بھی آتی ہے تو وہ خوامخواہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔بائیں بازو کی پارٹیاں تو چاہتی ہیں کہ مذہب کے نام پرکچھ نہ ہو۔نہ تومسلم یونیورسٹی ہونی چاہئے نہ ہندو یونیورسٹی ہونی چاہئے نہ زبان کے نام پرنہ علاقہ کے نام پر،ایسی کسی بھی چیز کی مخالفت کووہ اپنا دھرم سمجھتے ہیں لیکن جب مسلم یونیورسٹی یونیورسٹی ہے تواس پرمسلمانوں کا حق ہوگا۔اسے اقلیتی ادارہ کہا

جائے گا۔ جمہوریت میں اقلیتوں کیلئے خصوصی مراعات نہ دی جائیں تو ان کے حقوق کا تحفظ نہیں ہوسکتا۔ بصورت دیگر اس اقلیتی ادارہ میں اقلیتوں کی کماحقہ نمائندگی نہیں ہوگی جیسا کہ عام یونیورسٹیوں میں ہم دیکھتے ہیں۔ اس لئے مسلم یونیورسٹی جو اقلیتی ادارہ ہے۔ اس میں اگر مسلمانوں کو پچاس فیصد ریزرویشن دیا جارہا ہے تو اس میں نئی بات کیا ہے؟ خلاف قانون وآئین کون سی بات ہے؟ انشاءاللہ اس اقدام سے فائدہ پہنچے گا۔

سوال: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ برسوں پہلے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے سلسلہ میں جو تحریک چلائی گئی تھی، حال میں مسلمانوں کو ۵۰ فیصد داخلہ میں ریزرویشن دیا جانا اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کڑی ہے؟

جواب: یہ اقلیتی کردار کی بحالی کی کوششوں کا ایک حصہ ہے، یہ سفارش برابر چلی آرہی تھی، طیب جی رپورٹ میں بھی یہ سفارش موجود ہے تو پچاس فیصد مسلمانوں کو ریزرویشن دیئے جانے کا یہ اقدام اسی سلسلہ کی کڑی ہے ان سفارشات کی روشنی ہی میں یہ تجویز پاس ہوئی۔

جب ملک آزاد ہوا تو اس پر ہمارا بھی حق ہے اور آج مسلم یونیورسٹی ایک مکمل امداد یافتہ تعلیمی ادارہ ہے، ہمارے ملک کو ناز ہے کہ مسلمانوں کا اتنا بڑا ادارہ اس میں موجود ہے جہاں سے بڑی تعداد میں علماء نکلتے ہیں اس سے ملک کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ادارے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے لئے تعلیمی ترقی کا کام کررہے ہیں، یہ تو ملک کے وقار کے لئے اور ملک کیلئے فائدے کی بات ہے۔

بائیں بازو کی پارٹیاں تو اپنی ایک مخصوص پالیسی کی وجہ سے مخالفت کررہی ہیں، جو ایک خلاف واقعہ بات ہے اس لئے کہ اگر کبھی ان کے ہاتھ میں بھی حکومت کی باگ ڈور آئی تو وہ بھی مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کرسکیں گے اور اگر نظر انداز کریں گے تو ان کی حکومت باقی نہیں رہے گی۔

سوال: بعض خواتین روشن خیالی، اعتدال پسندی اور عورتوں کی حق تلفی کے نام پر ہائے توبہ مچارہی ہیں آپ کے نزدیک اس کی اصلیت کیا ہے؟

جواب: دیکھئے نکاح نامہ کو لازم نہیں کیا گیا ہے اگر کوئی وایلا مچارہا ہے تو وہ اپنا نکاح

نامہ تیار کرلے، نکاح تو ہوتا ہے دو گواہان کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے، رہے واجبات مثلاً مہر، مکان، چاہے ان کا ذکر ہو یا نہ ہو لیکن وہ نکاح ہوجانے سے واجب ہوجاتے ہیں۔ مرد کی بات کا عورت پر ماننا واجب ہے۔ قرآن میں عورت کی نافرمانی پر کہا گیا ہے کہ اگر کوئی نزاع ہوجائے زوجین میں تو تنبیہ کرو، سمجھاؤ اور جب کسی طرح نباہ کی صورت باقی نہ رہے تو پھر حکم کے حوالہ قضیہ کو کردو، اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کردے گا۔

جہاں تک عورتوں کے حقوق کا سوال ہے تو معیاری نکاح کے ذریعہ ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت کی کوشش کی گئی ہے اس میں اقرارنامہ کے ذریعہ زوجین باہمی حقوق کی ادائیگی کا اقرار کرتے ہیں۔ البتہ نکاح کے بعد کس کس نوعیت کے اور کس کس قسم کی شکایات پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان سب کا تو احاطہ نہیں ہوسکتا، نہ کوئی قبل از وقت ان باتوں کا قیاس کرسکتا ہے۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ نکاح کے وقت ہی ان کو حق طلاق تفویض کردیا جائے جبکہ خود عورتوں نے اسے مسترد کردیا اور پورے ایوان نے اسے مسترد کردیا، جدید طرز پر سوچنے والی خواتین آخر کیا چاہتی ہیں اس کا آج تک پتہ نہیں چل پایا، ان طبیعتوں پر شاید شریعت پر عمل کرنا ہی دشوار معلوم ہوتا ہے۔

سوال: خواتین کیساتھ حق تلفی اور مساوات مرد وزن کے پرفریب نعرہ کے نام پر میڈیا نے عورت کی امامت کا مسئلہ چھیڑ رکھا ہے۔ شریعت اسلامیہ کی اس سلسلہ میں واضح ہدایات کیا ہیں؟

جواب: دیکھئے امامت عورت کی ہے ہی نہیں، اسلام آج کا مذہب نہیں چودہ سو برس سے اس کی اپنی شریعت رائج ہے، مخلوط مجمع میں عورت کی امامت ہے ہی نہیں۔ ہاں اگر عورتیں ہوں تو اس میں بھی امامت کرنے والی خاتون بیچ میں (وسطھن) کھڑی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورتوں پر جماعت ہی واجب نہیں، عورتیں اگر پڑھ لیں گی تو ادا ہو جائے گی۔ خود حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ تمہارے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے بہتر ہے، عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکا نہیں گیا ہے لیکن ان کی صف کی جگہ

پیچھے ہے یا کوئی علاحدہ اور مخصوص جگہ جیسے حرمین شریفین میں ہے۔لیکن مساوات مرد وزن کے پرفریب عنوان سے یہ سیاسی قسم کا پروپگینڈہ کیا جاتا ہے کہ مرد مسجد میں جاسکتے ہیں تو عورتیں کیوں نہیں جاسکتیں اور مرد امامت کرسکتا ہے تو عورتیں کیوں نہیں کرسکتیں۔

کائنات کا خالق اللہ ہے وہ حکمتوں کو جانتا ہے۔مرد وزن کا خالق بھی اللہ ہے اور اسی نے ان کے لئے شریعت بنائی ہے جس میں ان کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔مثلاً دس روز عورتوں پر ایسے ہیں جن میں عورتوں پر نماز ہی فرض نہیں ،تو خلقی اعتبار سے عورت امامت کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی اور اسی لئے اللہ نے عورت کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا۔

یہ بات خود عورتوں کے ذہن نشین ہونا چاہئے ،اسلام سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ بآسانی مغرب کے پروپیگنڈہ کا شکار ہوجاتی ہیں۔وہ قرآن وحدیث کا، کتاب وسنت کا، تاریخ اسلام کا مطالعہ نہیں کرتیں۔

ورنہ آپ دیکھئے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا کیا مقام تھا اسلام اور علم دین کے اعتبار سے اور کس قدر جلیل القدر خدمات ہیں ان کی حدیث شریف کے سلسلہ میں ،اسی طرح حضرت فاطمہؓ کا مقام بہت بلند ہے ،والدہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ ایک ولیہ صفت خاتون تھیں لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی امامت نہیں کی اور نہ ہی ان کے دور کے مسلمانوں نے ان سے کہا کہ وہ ان کی امامت فرمادیں۔دراصل یہ لوگ شریعت سے واقف تھے مرد وزن کے دائرہ کار سے واقف تھے،ان کی علاحدہ علاحدہ ذمہ داریوں سے واقف تھے،شریعت کے حدود سے واقف تھے لیکن افسوس کہ موجودہ دور میں اسلامی شریعت سے ناواقف خواتین مغرب کے پروپیگنڈہ کا بآسانی شکار ہوجاتی ہیں۔

(تعمیر حیات)

احتجاج کا سنجیدہ طریقہ اختیار کریں!!

جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

مولانا سید نظام الدین صاحب سے ایک گفتگو

امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب ملت کے اکابر کی صف اول میں ہیں،ان کی آمد کو غنیمت جانتے ہوئے ہندستان اور بیرون ممالک میں مسلمانوں کو پیش آنے والے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، جو درج ذیل ہے:

سوال (۱) حضرت والا! ہم سب سے پہلے تو یہ پوچھنا چاہیں گے کہ حال میں آپ کی پرائم منسٹر کے ساتھ جو میٹنگ ہوئی ہے،ان کے جو (Issues) اشوز اخبارات میں آئے وہ تو آہی چکے ہیں،البتہ ان کا خلاصہ کیا رہا؟

جواب: وزیر اعظم سے ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایڈوکیٹ صاحب کے ذریعہ سے سپریم کورٹ میں دارالافتاء ودارالقضاء کے خلاف جو رٹ پیٹشن (Writ petition) داخل ہوا ہے اور جس میں فتوی کے عمل کو اور قضاء کے عمل کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی لگانے کی مانگ کی گئی ہے،اور اس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ مرکزی حکومت (سنٹرل گورنمنٹ) اور اس کے علاوہ سات ریاستوں کو جو مجالا کیا گیا ہے اس پر ان سے گفتگو تھی، پہلے تو یہ بتایا گیا کہ فتویٰ کیا ہے، یہ دراصل مذہبی معاملات میں رہنمائی کا ایک طریقہ رہا ہے کہ لوگ سوال کرتے ہیں اور ان کے سوال کے مطابق مفتی جواب دیتا ہے یا شریعت کے مطابق ان کو اس کا حل بتادیتا ہے، عمل کرنا نہ کرنا اس کی ذمہ داری ہے،مفتی کا کام اسکی صحیح رہنمائی کرنا ہے شریعت کی روشنی

میں قاضی کا کام باضابطہ تحقیق کرنا ہے صرف مدعی کے عرض یا دعویٰ یا مدعی علیہ کے تحریری بیان پر فیصلہ نہیں کرتا ہے۔ بلکہ گواہوں کے ذریعہ سے اور جو بھی ضروری ثبوت فراہم کرنا مطلوب ہوتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر پوری پوری تحقیق کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس کا فیصلہ ایک طرح سے شرعاً لازم ہوتا ہے مسلمان پر، لیکن ہمارے پاس قوت نافذہ نہیں ہے اس لئے البتہ ایمانی طاقت ہے اور اپنا جو جذبہ ایمانی ہے اس کی بناء پر اس کو قاضی نافذ کرتا ہے اور ہم بھی اس کے جذبہ ایمانی کو اور مذہبی جذبہ کو ابھارتے ہیں۔ تاکہ وہ فیصلہ کو خود پر نافذ کرے اگر وہ ایسا نہ کرے تو ہم اس کا کچھ نہیں کر سکتے یہ سلسلہ جب سے یہاں مسلمان آئے تب سے قائم ہے اور اس کی مثالیں دی گئیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں بہار میں امارت شرعیہ قائم ہوئی اس میں سب سے پہلا شعبہ جو قائم ہوا وہ دارالقضاء مرکزی ادارہ کا تھا۔ اس طرح بہار میں چالیس اور ایک مرکزی ادارے دارالقضاء پھلواری شریف کے علاوہ ۴۰ اس کی شاخیں ہیں۔ اور اب تک ۱۹۰۰۰ر مقدمات کے فیصلے ہو چکے ہیں اور ہر سال ۱۰۰۰ سے ڈیڑھ ہزار تک سے زیادہ مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ مقدمات ایسے تھے جس میں فریق سرکاری عدالتوں میں اپیل لے کر گیا مگر وہاں بھی فیصلہ وہی سنایا گیا۔ مقدمہ اتنا واضح تھا اور قاضی کا فیصلہ ایسا تھا کہ جج نے اس کو بحال رکھا۔ اور بقیہ سارے مقدمات گویا نافذ ہوئے اور لوگوں نے عمل کیا۔ وجہ یہ ہے کہ کم وقت میں اور کم پیسوں میں یہاں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور مجبور لوگوں اور مظلوم انسانوں کو نیز خاص طور پر عورتوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اور یہ آئین وضابطہ کے بالکل مطابق ہے یہ بات میں نے ان پر واضح کی جس سے انہوں نے بڑی حد تک اتفاق کیا۔ اور کہا کہ ہم اب تک یہ بات سمجھتے ہیں کہ یہ ہوتا رہے اور ملک میں اس کی اجازت ہے لیکن جب یہ بات عدالت میں آئی ہے تو اسکو ضرور دیکھنا چاہئے تو ہم نے ان سے کہا کہ کیونکہ مرکزی حکومت بھی اس کے اندر مجالہ ہے اس لئے آپ کو اپنے وزیر قانون کو بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ تاکہ ہمارے اور ان کے درمیان میں رابطہ رہے اور جواب میں یکسانیت رہے۔

اور اس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے انہوں نے اپنے طور پر وعدہ کیا کہ سرکار اس میں ضرور تعاون کرے گی۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے وزیر قانون کو بھی ہدایت کر دی کہ یہ حضرات ملیں تو ان کی باتوں کو سن کر ان کا کام کیجئے اس طرح ہمارا وفد ایک حد تک وہاں سے ان کی باتوں سے مطمئن ہو کر لوٹا۔ پھر وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد چند افراد نے جیسے ہمارے ایڈوکیٹ یوسف مچھالہ، جناب عبدالرحیم قریشی، ایڈوکیٹ ظفریاب جیلانی اور بیرسٹر اسدالدین صاحب اویسی (جناب صلاح الدین صاحب کے بیٹے) ان کے ساتھ وزیر قانون سے ملے، پھر ان سے بات چیت ہوئی، انہوں نے کہا کہ ہاں ہم اس کے لئے تیار ہیں، چنانچہ اس ملاقات کے بعد وفد واپس ہو گیا اور اس کی کاروائی کی جا رہی ہے ۴ر ہفتہ کے بعد جواب داخل کرنا ہے جواب کی تیاری ہو رہی ہے جواب داخل کیا جائیگا اور ریاستوں کو بھی داخل کرنا ہے وہ جس طرح سے داخل کرے اس میں کئی کانگریسی ریاستیں ہیں، لیکن مسئلہ دوبارہ چلے گا اس لحاظ سے اس میں ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم پورے مسئلہ کو عدالت کے سامنے پیش کریں کہ افتاء کی کیا حیثیت ہے، قضیہ کیا ہے، عدالت اسلامی کیا ہے وغیرہ۔ ان ساری باتوں کو پوری طرح سے واضح کریں اور بتائیں کہ یہ قانون کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے سرکاری عدالتوں میں مقدمات کا بوجھ کم ہوگا۔ جو مقدمہ سرکار کے یہاں سول عدالتوں میں دس دس سال تک چلتا ہے اور ۱۰ر سال میں بھی فیصل نہیں ہو پاتا۔ وہ ہمارے یہاں ۶ر مہینے سے دو سال کے درمیان میں فیصل ہو جاتا ہے۔ پھر یہاں لوگ زیادہ جھوٹ موٹ سے کام نہیں لیتے ہیں کیونکہ وہاں مذہبی بنیاد پہ ہی ان کے مسئلوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہاں وقت کی بربادی اور پیسے کے بربادی نہیں ہوتی۔ ایمان کی بربادی نہیں ہوتی۔ تو بہرحال ہماری ملاقات وزیر اعظم سے ایک حد تک اطمینان بخش رہی۔ وہ بھی اچھے طور پر ملے۔ آئندہ کی بات ہے تو یہ عدالت کا مسئلہ ہے۔

سوال: (۲) دستور میں دفعہ ۴۴ کا جو آرٹیکل ہے جس کے تحت یونیفارم سول کوڈ نافذ کرنے کی بات کی جاتی ہے۔ دستور ۴۴ تو سب سے پہلے غالبا مولانا ابواللیث صاحب

اصلاحیؒ نے یہ بات کہی تھی، کیا یہ ممکن ہے ایسا ہوسکتا ہے۔ کہ مسلم پرسنل لا کو دفعہ۴۴ سے مستثنیٰ کیا جائے، سوال یہ ہے کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے؟

جواب: پورے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا یہ موقف ہے اس میں ہمارے سارے ارکان شامل ہیں کہ دفعہ ۴۴؍ میں یونیفارم سول کوڈ کو لاگو کرنے کا ایک طرح مشورہ دیا گیا ہے حکومت کی دفعہ ۴۴؍ میں اور باتیں بھی شامل ہیں، اس میں ایک بات شراب بندی کی بھی ہے کہ آئندہ اس ملک میں شراب نوشی کو فروغ نہ دیا جائے اور شراب پر پابندی عائد کی جائے۔ کیونکہ گاندھی جی کی بھی اسکیم تھی کہ اس ملک کے آزاد ہوجانے کے بعد شراب پر پابندی لگادی جائیگی۔ تو اس دفعہ ۴۴ میں اس کی بھی ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ شراب بندی کی جائے اس کے علاوہ ۱۲/۱۱ سال کی عمر کے بچوں، بچیوں کو مفت تعلیم دی جائے اور تمام سہولتوں کے ساتھ ملک کو خواندہ بنایا جائے۔ یہ بھی دفعہ ۴۴ میں ہے تیسری بات دفعہ ۴۴ میں یہ ہے کہ ملک میں یونیفارم سول کوڈ لایا جائے تو اس کے لئے کافی شور مچاتے ہیں کہ مسلمانوں کا جو شرعی قانون ہے اس میں عورتوں کی حقوق رسی نہیں ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے اس طرح کچھ لوگ کھڑے ہوئے ۱۹۵۵ء۔ ۵۶ کے بعد سے ہنگامہ آرائی اور شور زیادہ شروع ہوا۔ اور ۶۰ کے بعد اور زیادہ تیزی آئی ۶۴ء کے بعد یہاں تک کہ ۷۲ء میں ہنگامہ آرائی اور شور شرابہ کے درمیان لے پالک بل پاس ہوگیا۔ اس موقع پر وزیر قانون نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ سول کوڈ کی طرف اس موقع پر ایک قدم ہے۔ جب ۶۵ء میں ہندو کوڈ بل بنا تو آئندہ اسی طرز پر یونیفارم سول کوڈ ہوگا جو اس کے اندر ہے خیر جب انہوں نے لے پالک بل پیش کیا اور کہا کہ یہ یونیفارم سول کوڈ کی طرف پہلا قدم ہے۔ لیکن آپ اس کے ذریعہ معاشرہ میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ خانگی مسائل میں۔ یہاں سارے مذاہب کے لوگ رہتے ہیں وہاں یکساں سول کوڈ کیسے لاگو کیا جاسکتا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ سول کوڈ کیا ہوگا اور کیسے لاگو کیا جائیگا؟ یہ دو ایک مشکل ہے اسلئے بورڈ کا کہنا یہ ہے کہ یا تو دفعہ ۴۴ سے اس کو نکال دیجئے یا یہ کہ جو لوگ ایسا چاہتے ہیں ان کے لئے لاگو کردیجئے ہم

نہیں چاہتے ہیں کہ اس سے مستثنیٰ کردیجئے اگر یکساں سول کوڈ ہمارے خلاف ہوا تو ہم اس کے خلاف احتجاج کریں گے۔ اور ہم مطالبہ کریں گے کہ ہم کو مستثنیٰ کیا جائے۔

موجودہ وزیر اعظم نے بھی یہ کہا کہ حکومت کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کرے، انہوں نے بھی کہا کہ اب تک ارادہ نہیں ہے لیکن دفعہ ۴۴ کی موجودگی سے دوسرے لوگ جو فرقہ پرست ہیں انہوں نے خواہ مخواہ الیکشن مینی فیسٹو میں بھی اسے شامل کررکھا ہے، آخر یہ تلوار کیوں لٹک رہی ہے، اس لئے اگر یہ اعلان کردیا جائے کہ مسلمانوں کے مسئلہ میں مداخلت نہیں کی جائیگی اور مسلم پرسنل لاء یونیفارم سول کوڈ میں شامل نہیں ہوگا، اسے قانونی شکل دے دی جائے یہ ہمارا مطالبہ ایک معقول مطالبہ ہے۔

سوال: (۳) دارالقضاء کو مسلم پرسنل لاء نے فروغ دینے کے لئے کیا کچھ کیا ہے اور آئندہ اس کے منصوبے کیا ہیں؟

جواب: مسلم پرسنل لاء بورڈ تو کافی کوشش کررہا ہے لیکن دارالقضاء کے قیام کے ۳؍ فیگر ہوتے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ وہ مقام جہاں پر دارالقضاء قائم کیا جارہا ہے اس کا مناسب وموزوں انتخاب وہاں کے لوگوں کا خواہش مند ہونا کہ یہاں شرعی قاضی مقرر کردیا جائے اوراس کے انتظامات کی ذمہ داری وہ اپنے اوپر لیں اس لئے کہ ایک درالقضاء کے قیام پر ہر مہینہ تقریبا ۱۵۰۰۰؍روپے خرچ آتا ہے اور اگر مکان بھی کرایہ پر لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ ۲۰۰۰۰ روپئے خرچ ہوجائے تو اس لئے مقامی لوگوں کو اسکی ذمہ داری لینی ہوتی ہے بورڈ کی ابھی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ جابجا دارالقضاء قائم کرے۔ تیسرا عنصر ہے تربیت یافتہ قاضی کے مہیا ہونے کا تو ہمارے یہاں امارت شرعیہ میں المعہد العالی میں تدریب افتاء کا دوسالہ کورس الحمد للہ چل رہا ہے اس میں قاضی کو تربیت دیتے ہیں اور انہیں ہی مختلف مقامات پر بھیجتے ہیں مختلف دارالقضاء میں بھیجا بھی گیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو اور تعلیمی ادارے ہیں جیسے کہ ندوہ ہے وہاں بھی تدریب افتاء کا نظام قائم کیا جائے دارالعلوم دیوبند ہے اور بھی بڑے بڑے ادارے ہیں جہاں قضا کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک بات

اور ہے افتاء میں تربیت دینے میں صرف تدریب افتاء کافی نہیں بلکہ تقریباً اس کی عملی مشق کو بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اس میں حتی المقدور حصہ بھی لے تو یہ عملی مشق ایک قاضی کی تیاری کے لئے ضروری ہے۔ جہاں دارالقضاء پہلے سے ہیں جیسے کہ مالیگاؤں میں ہے ندوہ میں ہے اور سب سے قدیم امارت شرعیہ میں ہے۔ اور آسام میں ہے۔ وہاں اس قسم کی تربیت دارالقضاء کا نظام وہیں قائم ہوسکتا ہے جہاں دارالقضاء پہلے سے ہو اور وہاں مقدمات آتے ہوں۔ اور طلبہ کو عملی تربیت، مقدمات کی سماعت، گواہوں کی باتیں سننا، بحث میں حصہ لینا اور پھر قاضی کے فیصلہ اور رپورٹ کو لکھنا، یہ سب جوان کے لئے عملی مشق ضروری ہے، پھر سب سے زیادہ ضروری ہے کہ آج جو عرضی آئی تو کیا کاروائی ہوئی۔ آئے تو کیا کاروائی کی جائے، قاضی نے اس پر کیا اور کیوں فیصلہ سنایا اور جج کے فیصلہ پر کیا عمل ہوا ۔ پھر گواہان آئے تو کیسے سماعت ہوئی۔ پھر فیصلہ ہوا تو کن کن نکات پر شامل کیا گیا، اپیل ہوئی تو کون سنے گا؟ ہمارے دارالقضاء میں اپیل کی سماعت کا بھی نظام ہے، یہ جو مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے دارالقضاء ہے ان میں بھی اپیل کی سماعت کا نظام قائم کر دیا گیا اور ہمارے یہاں جو امارت شرعیہ ہے وہاں بھی اپیل کی سماعت ذیلی دارالقضاء کے ذریعہ انجام دی جاتی ہے، مثلاً مقدمہ مرکزی درالقضاء کے قاضی الشرعیہ سنتے ہیں۔ اور مرکزی دارالقضاء کے قاضی کے خلاف کوئی اپیل ہو تو اس کو امیر شرعیہ سنتے ہیں۔ یا پھر اپیل کی سماعت کے لئے کوئی بنچ بنا دیتے ہیں (Bench) اس سے لوگ کافی مطمئن ہیں۔

سوال: (۴) ایک اہم مسئلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ ہے اس سلسلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کیا موقف ہے؟ اگر چہ یہ مسئلہ اس کے دائرہ کار میں نہیں آتا؟

جواب: اول تو یہ مسئلہ براہ راست پرسنل لاء میں نہیں آتا لیکن اقلیتی کردار کا بھی بہت بھی اہم مسئلہ ہے اور ایک مستقل مسئلہ ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے، جامعہ ملیہ ہے اور دوسرے ادارے ہیں جو اقلیت کے مسلمانوں کے قائم کردہ ہیں، اس میں سب سے نمایاں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی ہے، اس کا اقلیتی کردار ۶۵ (مجھے سن ٹھیک سے یاد نہیں) منظور کیا

گیا۔ اس میں کچھ کمی اور نقص ہے جس کو پُر کرنا پارلیمنٹ کا کام ہے، یا تو اس سلسلہ میں عدالت سے رجوع کیا جائے، یا پھر پارلیمنٹ کرے اس کا قانون بنا کر لیکن بہر حال اس کا اقلیتی کردار ہر حال میں بحال ہونا چاہئے، ورنہ اگر اقلیتی کردار کو ختم کیا گیا اور یہ فیصلہ باقی رہا کہ اسے کالعدم قرار دیا جاتا ہے تو اس سے مسلمانوں میں زبردست مایوسی پیدا ہوگی۔ اس سے انتشار پیدا ہوگا۔ اور یہ بے انصافی پر محمول کیا جائے گا۔

سوال (۵) اہانتِ رسول کے سلسلہ میں جو احتجاجات ہوئے وہ اپنی جگہ پر بجا ہے اس لئے کہ ایک مسلمان اہانت رسول کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا لیکن کیا مسلمان ایسے جذباتی مسئلوں میں جذباتیت اور ضرورت سے زیادہ سہل انگاری کا ثبوت نہیں دے دیتا؟

جواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عزت اور عظمت ہے وہ من اللہ اور عنداللہ ہے۔ اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اگر اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں سے اور غلط طریقوں سے کارٹون کی اشاعت ہوئی یا کہیں کوئی مذموم فرضی تصویر یا اس طرح کا کوئی گستاخانہ مضمون لکھ دیا جائے تو یہ تو ہم کو مشتعل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

اگر ہم اشتعال میں آکر سڑک پر آجاتے ہیں اور تصادم کر بیٹھتے ہیں یا آپس میں متصادم ہو جاتے یا غیروں سے متصادم ہو جائیں جیسا کہ اسی موقع پر ڈنمارک میں کارٹون کی اشاعت پر ہوئی اور اس کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج ہوا۔ اور ہندوستان کے بعض مقامات پر دکانیں بند کرانے میں فساد ہو گیا، اس لئے کہ انہوں نے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی دکانیں بھی بند کرانا چاہا۔ عام طریقہ پر جب جلوس سڑک پر آجاتا ہے تو نوجوان طبقہ ہمارے قابو میں نہیں رہتا اور وہ ایسے ایمانی جوش میں آجاتے ہیں کہ جس کو آپ روک ہی نہیں سکتے اور اگر روکتے ہیں تو نوجوان طبقہ مانے گا نہیں اس لئے ہماری رائے یہ ہے کہ اس طرح کی بات ہو تو جو ہمارا سنجیدہ طریقہ ہوسکتا ہے احتجاج کا وہ طریقہ ضرور اختیار کریں، لیکن ہم سڑک پر آنے سے لوگوں کو روکیں، سڑکوں پر آنا کوئی مفید نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے اور پروپیگنڈہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم میں اس مجرم کو سزا دینے کی

صلاحیت نہیں ہے یا اس حکومت کو سزا دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یا ہم مجرم کو سزا نہیں دے سکتے ہیں تو ہم کو اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا کرنا چاہئے کہ آئندہ ایسے واقعات نہ ہوں اس طرح ہم ایسے مجرموں کو سزا دینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔

ہمارے قرآن کی یا مذہب کی یا رسول کی توہین یا اہانت کی گئی تو اسی طرح سزا دیں گے جیسا کہ عیسائیت کیلئے قانون بنا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ یہ کیسی دورخی پالیسی ہے ہم تو عیسیٰؑ کی عزت کرتے ہیں، موسیٰؑ کی عزت کرتے ہیں اور تمام رسولوں کی عزت کرتے ہیں، اسی طرح ہم نبی آخر الزماں کی بھی عزت کرتے ہیں، کوئی ان کی شان میں گستاخانہ رویہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو سزا دیئے جانے کا مطالبہ کریں گے۔ اس پر ہم ایکشن لیں گے، ایکشن کی صلاحیت ہم میں نہ ہو تو وہ صلاحیت اصل میں ہمیں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے وہ صلاحیت اگر ہم نہیں پیدا کریں گے تو صرف زبانی احتجاج سے خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آئے گا، دشمن طاقت کے نشے میں چور ہے، مغربی دنیا ہمارے زبانی احتجاج کو کوئی وزن نہیں دینے والی۔ بلکہ اپنے رویہ میں اور سختی لائے گی اور مسئلہ ہمارے لئے مزید سنگین ہوتا جائے گا دراصل ہمیں جائزہ لینا چاہئے کہ آخر کن اسباب کی وجہ سے دوسروں کو یہ ہمت ہو رہی ہے۔

(تعمیر حیات)

طلاق کا مقصد

مشکل کا حل پیش کرنا ہے نہ کہ مشکلات میں اضافہ کرنا!

امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب سے ایک گفتگو

اوائل اگست ۲۰۰۴ء میں امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب مدظلہ (امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) ندوہ لکھنؤ تشریف لائے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کے حالیہ اجلاس کانپور کے موقع پر میڈیا نے یہ بے بنیاد شوشہ چھوڑا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے عاملہ کے ایجنڈہ میں ایک مجلس میں تین طلاق اور مہر جیسے موضوعات بھی شامل ہیں، اس پر نام نہاد دانشور طبقہ نے کالم کے کالم سیاہ کئے، مولانا کی آمد کو غنیمت جان کر ان سے مذکورہ بالا مسئلہ کے علاوہ، دسمبر میں منعقد ہونے والے اجلاس کالی کٹ (کیرالہ) اور دوسرے موضوعات پر بھی گفتگو ہوئی جو نذر قارئین ہے۔

سوال: کانپور کے حالیہ اجلاس عاملہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے موقع پر یو این آئی کے حوالہ سے ایک معاصر انگریزی روزنامہ نے ایک مجلس میں تین طلاق اور مہر جیسے موضوعات کے شامل ایجنڈہ ہونے کی خبر شائع کی تھی، اس کی حقیقت کیا تھی؟

جواب: صحافتی بددیانتی کی ایک مثال تھی کہ ایک ایسی بات شائع کی جائے جس کی کوئی بنیاد نہ ہو، یو این آئی کے پٹنہ کے نمائندہ سے بھی میں نے پوچھا کہ اس خبر کا Soure آخر کیا ہے؟ اس لئے کہ اس قسم کی کوئی بات ہمارے ایجنڈہ میں شامل نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا

بورڈ کے ذمہ داران نے تردیدی بیانات دیئے۔صدر بورڈ نے تردید کی، جنرل سکریٹری بورڈ کی حیثیت سے میں نے تردید کی، ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے تردید کی۔ہم نے کہا کہ طلاق کا جو حکم شریعت کے مطابق ہے اس میں تبدیلی کرنے کا بورڈ مجاز ہے ہی نہیں اور نہ ہی اس قسم کی کوئی بات عاملہ کے اجلاس کے ایجنڈہ میں موجود ہے۔

سوال: دانستہ طور پر اس غلط فہمی کے تدارک کے لئے بورڈ نے کیا اقدام کیا؟

جواب: عاملہ کے اجلاس کے موقع پر ایک پریس کانفرنس بھی ہوئی اس میں جناب ایڈوکیٹ حاتم یوسف مچھالہ صاحب تھے، ڈاکٹر کلب صادق بھی تھے، میں بھی اس میں حاضر تھا۔میں نے پریس رپورٹروں کے سامنے بڑی وضاحت سے یہ بات کہی کہ نکاح اور طلاق کے اسلامی طریقوں اور ان کی حکمتوں پر دیانت داری سے غور کرنا چاہیے، جس طرح سے نکاح ایک اسلامی طریقہ ہے زوجین کے مابین بندھن کے قائم ہونے کا، اسی طرح طلاق بھی ایک طریقہ ہے کہ اگر خدانخواستہ زوجین میں نباہ کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو پھر طلاق اس پیچیدہ صورت حال سے نکلنے کا ایک راستہ ہے۔اور اس مشکل کا حل ہے۔یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حلال اور جائز کاموں میں طلاق کو نہایت ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔لیکن اگر انسانی سماج میں زوجین کے مابین ایسی ناچاقی کی بدترین صورت حال پیدا ہو ہی جائے کہ ان دونوں کے مابین علاحدگی ہی اس کا حل ہے نہ کہ مشکلات پیدا کرنے کی چیز۔آپ سروے کر لیجئے کہ آخر ہم مسلمانوں کے یہاں طلاق کی شرح ہے کتنی؟ ایک دو فیصد سے زیادہ نہیں ہے، ناگزیر اور پیچیدہ ترین صورت حال میں طلاق سماج کی ایک ضرورت بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض Customs میں طلاق نہیں تھا، عیسائی اور ہندو بھائیوں نے بھی طلاق کے سماج کی ایک ضروت ہونے کو تسلیم کیا اور اس کیلئے قانون سازی کی، ذہن سازی کی۔

اس پریس کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ طلاق کا جو کچھ بھی Ratio ہمارے یہاں ہے، ہماری کوشش برابر اس سمت میں ہو رہی ہے کہ اس کا تناسب گرے، طلاق کے

واقعات میں کمی آئے بلکہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔سچی بات یہ ہے کہ اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق کا (جن کو اسلام نے ان پر عائد کیا ہے) پاس و لحاظ رکھیں تو تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہی نہ ہو۔اس کے لئے ہم اصلاح معاشرہ کے جلسوں کے ذریعہ ذہن بنانے پر زور دے رہے ہیں۔دینی شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا مطالبہ ہے کہ مسلمان کُل کے کُل اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں ادخلوا فی السلم کافۃ کا مطالبہ ہے اسلام کا۔اصلاح معاشرہ کے علاوہ ہماری تحریک کا ایک اہم حصہ جا بجا دارالقضاء کا قیام بھی ہے۔مسلمان اپنے مسائل شریعت کی روشنی میں حل کرنے کا مزاج بنائیں اور ان کی رہنمائی کے لئے دارالقضاء موجود ہوں۔الحمد للہ بہار کی امارت شرعیہ ایک اچھی مثال ہے۔

سوال: امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کی اس سلسلہ میں اب تک کیا پیش رفت رہی ہے اور کون سے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں؟

جواب: الحمد للہ امارت شرعیہ کے تحت چالیس ذیلی دارالقضاء قائم ہیں، ان میں اب تک اٹھارہ ہزار مقدمات فیصل ہو چکے ہیں۔مکمل تحقیق اور بحث ومباحثہ کے بعد یہ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ فیصلے نافذ بھی ہوتے ہیں۔

سوال: امارت شرعیہ کے تجربات کی روشنی میں دارالقضاء کے نظام وقیام سے امت کو براہ راست کن فائدوں کے حاصل ہونے کا امکان ہے؟

جواب: دیکھئے بات صاف ہے۔مسلم پرسنل لا کے جو مسائل آتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان قضیوں میں فریقین مسلمان ہی ہوتے ہیں، دارالقضاء کا قیام ونظام اگر مستحکم ہو گیا تو انشاء اللہ امت کے اس مزاج کے بننے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہم اپنے باہمی نزاعات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو مانیں تسلیم کریں اور ان فیصلوں کو اپنے اوپر نافذ کریں۔

دارالقضاء کی ایک افادیت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں روپیہ پیسہ اور وقت دونوں کی بچت ہوتی ہے اور قضیہ بھی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں حل ہو ہی جاتا ہے اس

لحاظ سے تجربہ یہ بتاتا ہے کہ دارالقضاء کے نظام وقیام سے سب سے زیادہ فائدہ اورنفع عورتوں کوملتا ہے۔اس میں سہولت بھی ہوتی ہے، وقت اور پیسوں کی بچت بھی ہوتی ہےاور انصاف بھی مل جاتا ہے۔

دارالقضاء کے قیام ونظام سے طلاق کے مسئلہ پر قابو پانا بھی آسان ہوسکتا ہےافہام وتفہیم سے بھی باہمی نزاعات حل ہوجایا کرتے ہیں۔

سوال: بات خواتین کی آئی ہےتو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جہیز اورتلک کے مسئلہ میں عورتیں دہرامعیاراپناتی ہیں جب وہ بیٹے کی ماں ہوتی ہےتو وہ جہیز کا مطالبہ کرتی ہےاور وہی ماں جب ایک بیٹی کی ماں کی حیثیت سے سماج کے سامنے آتی ہےتو وہ سادگی کی بات کرتی ہے؟

جواب: یہ درست ہےاور مسئلہ کاحل ذہن سازی ہے کہ جہیزاورتلک جیسی رسموں کے خلاف ذہن بنائے جائیں، میں کہتا ہوں کہ معاشرہ سے ۷۵ فیصد خرابی دور ہوجائے، اگر معاشرہ دوچیزوں کا پابند ہوجائے۔پہلی چیز ہے کہ نکاح سادگی سے ہو،شادی سادی ہواور دوسری چیز یہ ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے حقوق کا پاس ولحاظ کریں، بورڈ علماء کرام، دانشوروں اورامراء طبقہ سے خصوصیت کے ساتھ یہ درخواست کرتا رہا کہ وہ طاقت واستعداداورصلاحیت کے باوجوداپنے گھرانوں میں نکاح کی تقریبات میں سادگی کا مظاہرہ کریں اورخدانخواستہ کوئی نزاع پیداہوہی جائےتو مفتی اوردارالقضاء سے رجوع کریں۔

سوال: خبر ہے کہ دسمبر میں انشاءاللہ مسلم پرسنل لابورڈ کا اجلاس کالی کٹ میں منعقد ہوگا؟

جواب: لکھنؤاجلاس کے موقع پر کیرالہ والوں نے یہ دعوت رکھی تھی کہ بورڈ کا اجلاس عام کیرالہ میں ہو۔ان کی یہ دعوت قبول کرلی گئی ہےاورانشاءاللہ ۲۴/۲۵/۲۶ر دسمبر کوکالی کٹ میں بورڈ کا اجلاس عام ہوگا اورمجلس عاملہ کا اجلاس اس کے ایک قریبی مقام منجیری میں ہوگا۔

سوال: اس اجلاس میں کون سے امور زیر بحث آئیں گے؟

جواب: ایجنڈہ تو اب تک طے نہیں ہے، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کی قیادت میں استقبالیہ کام کرے گی، البتہ جوامکانی مسائل ہیں ان میں سے یہ مسائل زیرغور آسکتے ہیں۔اصلاح معاشرہ کے کاموں کا جائزہ نیز ان قوانین کا جائزہ جوموجود ہیں مثلا Shariat Application Act مسلم مطلقہ کا قانون (شاہ بانو کیس) دفعہ ۱۲۵، نفقہ مطلقہ،غرض کہ مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین کا جائزہ لیا جائے گا۔

سوال: بورڈ کی صدا کوعوام کی سطح اور عام طبقہ کی صفوں تک پہنچانے کے لئے بورڈ کے پیش نظر کیا خاکہ ہے؟

جواب: ایک صالح مسلم معاشرہ کی تشکیل وتعمیر بورڈ کا مشن ہےاور یہ مشن اس وقت مشن نہیں بن سکے گا جب تک کہ بورڈ کے پیغام سے ایک عام آدمی اورایک عام مسلمان پوری طرح واقف نہ ہو۔اس کے لئے بورڈ ملت کے تمام طبقات تک اپنے پیغام کوپہنچانے کی کوشش کرے گا۔خواتین کا طبقہ،نوجوانوں کا طبقہ سب تک بورڈ کی آواز پہنچنی چاہئے، اس کے علاوہ اسلام اکرام انسان کوسکھاتا ہےساری مخلوق خدا کا کنبہ ہےاس لئے ہم اپنے ہم وطن بھائیوں میں بھی پھیلی ہوئی معاشرتی برائیوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔صالح مسلم معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کا خواب ادھورااوراس کا یہ مشن ناتمام رہے گا اگر ہم بحیثیت خیر امت ایک صالح انسانی معاشرہ کے لئے صدق نیت اورصدق دل سے کوشاں نہ رہیں۔

شرعی عدالتیں سرکاری عدالتوں کی ضد نہیں ہیں!

جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا سید نظام الدین صاحب سے انٹرویو

حال میں دارالقضاء اور دارالافتاء کے سلسلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک وفد نے وزیراعظم منموہن سنگھ سے ملاقات کی تھی، اس کی تفصیلات کیا ہیں اور اس سے کیا امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں، اس پر جناب امین الدین شجاع الدین نے ندوہ میں مولانا نظام الدین جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی آمد پر سہ روزہ دعوت کے لئے انٹرویو لیا، ذیل میں اسے پیش کیا جارہا ہے۔

س:- حال ہی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک وفد نے وزیراعظم منموہن سنگھ سے جو ملاقات کی تھی، اس کی تفصیلات کیا ہیں اور وزیراعظم پر اس کے کیا تاثرات مرتب ہوئے؟

ج:- ایک ایڈوکیٹ کے ذریعہ سے سپریم کورٹ میں دارالقضاء اور دارالافتاء کے خلاف عرضی داخل کرکے انہیں غیر آئینی قرار دیتے ہوئے ان پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس میں دارالعلوم دیوبند، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور سات ریاستوں کو فریق بنایا گیا ہے۔

پہلے تو وزیراعظم کے سامنے فتوی کی حقیقت کو واضح کیا گیا، یہ دراصل مذہبی معمولات میں رہنمائی کا طریقہ ہے، اس میں سوال کے مطابق مفتی سوال کرنے والے کو جواب بتادیتا ہے، عمل کرنا نہ کرنا اس کی ذمہ داری ہے، مفتی کا کام شریعت کی روشنی میں صحیح رہنمائی کردینا

ہے اور قاضی کا کام باضابطہ تحقیق کرنا ہے، قاضی پوری تحقیق کے بعد فیصلہ کرتا ہے، وہ محض مدعی یا مدعی علیہ کے بیانات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ گواہوں اور تحقیق کے جتنے ذرائع ممکن ہوسکتے ہیں، انہیں استعمال کرتا ہے، اس طرح سے اس کا فیصلہ ماننا شرعی اعتبار سے ہر مسلمان پر لازم ہوتا ہے لیکن چونکہ ہمارے پاس قوت نافذہ نہیں ہے، اس لئے مسلمان اپنے جذبۂ ایمانی کی بنیاد پر خود اس فیصلہ کو نافذ کرتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی جذبہ کو ابھارا جائے تاکہ ایک مسلمان اسے خود پر نافذ کرے اور اگر وہ نہ کرے تو ہم اسے کچھ نہیں کرسکتے، یہ سلسلہ جب سے یہاں مسلمان ہیں تب سے یہاں موجود ہے، وزیراعظم کو بتایا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں امارت شرعیہ کا جلسہ ہوا اور سب سے پہلا شعبہ دارالافتاء کا قائم ہوا، پھلواری شریف کے مرکزی ادارے کے علاوہ اس کی چالیس شاخیں ہیں، اب تک ۱۹۰۰۰ قضایات کے فیصلے ہوچکے ہیں اور ہر سال دو ہزار مقدمات دارالقضاء میں آتے ہس، مقدمہ کے فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک فریق نے امارت شرعیہ کے فیصلہ کے بعد عدالت سے رجوع کیا لیکن دارالقضاء کا وہ فیصلہ اتنا پائدار اور مستحکم تھا کہ جج نے اس فیصلہ کو بحال رکھا، ان دارالقضاء کے فیصلوں سے زیادہ تر غریبوں، مظلوموں اور عورتوں کو فائدہ پہنچتا ہے، یہ باتیں وزیراعظم پر واضح کی گئیں جن سے انہوں نے بڑی حد تک اتفاق کیا اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات اس ملک میں ہوتی آئی ہے لیکن بات جب عدالت میں آئی ہے تو اس کو ضرور دیکھنا چاہئے، مرکزی حکومت بھی اس میں فریق ہے، اس لئے وزیر قانون کو اس کی طرف متوجہ کرنا چاہئے تاکہ ان کے اور ہمارے درمیان رابطہ رہے اور جواب میں یکسانیت رہے، ہم نے ان سے کہا کہ اس سلسلہ میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے، وزیراعظم نے یقین دلایا کہ ہم آپ کے ساتھ ضرور تعاون کرتے رہیں گے، انہوں نے وزیر قانون کو بھی متوجہ کردیا کہ یہ لوگ جب آپ سے ملیں تو آپ ان کے ساتھ تعاون کریں، اس لحاظ سے وفد ایک حد تک وہاں سے مطمئن ہوکر لوٹا، وزیر قانون سے بھی ملاقات ہوئی، جناب اسعد الدین اویسی، اس معاملہ کے وکیل جناب عبدالرحیم قریشی اور

جناب ظفریاب جیلانی وغیرہ بھی وزیر قانون سے ملاقات میں شامل تھے، اس کے بعد وفد واپس ہوگیا، اب جواب داخل کرنے کے لئے تیاری ہورہی ہے اور جواب داخل کیا جائے گا، ریاستوں کو بھی جواب داخل کرنا ہے، مختلف ریاستوں میں مختلف پارٹیوں کی حکومتیں ہیں، اس طرح یہ مسئلہ چلتا رہے گا، البتہ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہم اس بات کو واضح کرسکیں گے کہ فتوی کیا ہوتا ہے؟ دارالافتاء کیا ہے؟ دارالقضاء کیا ہے؟ یہ سرکاری عدالتوں کے خلاف ہرگز نہیں ہے بلکہ ہمارے اس نظام کی وجہ سے سرکاری عدالتوں کا بوجھ کم ہوتا ہے، جو مقدمہ سول عدالتوں میں دس سال میں فیصل ہو پاتا ہے وہ مقدمہ ہمارے یہاں چھ سات ماہ میں فیصل ہوجاتا ہے، یہاں وقت کی بربادی، ایمان کی بربادی، پیسہ کی بربادی نہیں ہوتی، اس لئے کہ لوگ ایمانی جذبہ سے آتے ہیں، بہرحال وزیراعظم منموہن سنگھ سے ہماری ملاقات بڑی حد تک اطمینان بخش رہی، اب اس کے بعد عدالت کا مسئلہ ہے۔

س:- غالبًا سب سے پہلے مولانا ابواللیث صاحب اصلاحیؒ نے فرمایا تھا کہ دفعہ ۴۴ کے جس حصہ میں یونیفارم سول کوڈ کی بات کہی گئی ہے، اس حصہ کو حذف کردیا جانا چاہئے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے تاکہ مسلم پرسنل لاء پر مسلسل لٹکتی ہوئی تلوار کا سلسلہ ختم ہو؟

ج:- پورے بورڈ کا یہ موقف رہا ہے کہ دفعہ ۴۴ جس میں یونیفارم سول کوڈ کو ملک میں نافذ کرنے کی بات کہی گئی ہے، اسے ناقابل عمل قرار دیا جائے، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دفعہ ۴۴ میں اور باتیں بھی شامل ہیں، مثلاً اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ملک میں شراب بندی نافذ کی جائے، گاندھی جی کی رائے یہی تھی، اسی طرح دفعہ ۴۴ میں یہ بھی شامل ہے کہ پانچ برس سے گیارہ برس تک کے بچوں کو مفت تعلیم دی جائے، لیکن ان باتوں کو تو زیادہ آشکارا نہیں کیا گیا، البتہ یونیفارم سول کوڈ کے سلسلہ میں بڑا واویلا مچایا جاتا رہا، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۰ء کے بعد اس مسئلہ کو کافی اچھالا گیا کہ مسلم پرسنل لاء میں عورتوں کے حقوق کی حق تلفی ہوتی رہتی ہے، لیکن ۱۹۷۰ء میں لے پالک بل بھی پاس ہوگیا اور وزیر

قانون نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ یونیفارم سول کوڈ کی طرف یہ ایک قدم ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آج تک یونیفارم سول کوڈ کی تعریف نہیں کی جاسکی، جب ہندو کوڈ بل بنا تو یہ کہا گیا کہ اسی طرز کا یونیفارم سول کوڈ ہوگا، یونیفارم سول کوڈ ہے کیا؟ ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہوں اسے وہاں کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا آج تک جواب نہ دیا جاسکا، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے کہا کہ دفعہ ۴۴ میں جو نکات ہیں ان سے مسلم پرسنل لاء کو مستثنی کردیا جانا چاہئے اور جو لوگ چاہتے ہیں، ان پر نافذ کیا جانا چاہئے، اس پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم یونیفارم سول کوڈ کہاں نافذ کررہے ہیں، وزیراعظم نے بھی یہ بات کہی ہے لیکن چونکہ دستور میں یہ دفعہ موجود ہے، اس لئے مختلف فرقہ پرست سیاسی پارٹیاں یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کو وقتاً فوقتاً چھیڑتی رہتی ہیں، اس لئے ہمارا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کو سول کوڈ سے مستثنی قرار دیا جائے۔

س:- دارالقضاء کے قیام اور اس کے فروغ کے لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ اپنے طور پر کس طرح کی کوششیں کرتا رہا ہے، اس سلسلہ میں کس طرح کے مسائل درپیش ہیں؟

ج:- مسلم پرسنل لاء بورڈ اس سلسلہ میں کافی کوشاں ہے، دارالقضاء کے لئے تین چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے گویا اس کے تین عناصر ہوتے ہیں: (۱) جس جگہ دارالافتاء قائم کیا جارہا ہے اس کا صحیح انتخاب (۲) اس کی کچھ ذمہ داری مقامی حضرات کو اپنے اوپر لینا، مثلاً ایک دارالقضاء قائم کرنے کے لئے ۱۵۰۰۰ روپے کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر مکان بھی لینا پڑے تو خرچ میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اس لئے مقامی لوگوں کو اس کی ذمہ داری لینی پڑتی ہے، بورڈ کی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ وہ ازخود پیسہ دے کر اسے مختلف جگہوں پر قائم کرے (۳) تیسرا عنصر ہے قاضی، قاضی تربیت یافتہ ہونے چاہئیں اور اس حد تک تو ہمارے یہاں نظم ہے کہ امارت شرعیہ میں تدریب افتاء کا نظم ہے، وہاں ان کی تربیت کی جاتی ہے اور جہاں ضرورت پیش آتی ہے وہاں انہیں بھیجا جاتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے ادارے ہیں جہاں نظام قضا کی تربیت دی جاسکتی ہے، البتہ ایک بات ضرور

ہے کہ قاضی کی عملی تربیت تو ایسی جگہ ہی ہوسکتی ہے جہاں مدعی، مدعی علیہ آتے ہوں، جرح ہوتی ہو، گویا اس کی عملی شکل موجود ہو، یہ نظام ہر جگہ نہیں ہے، اس لئے جہاں پہلے سے دار القضاء قائم ہے، مثلاً امارت شرعیہ مالیگاؤں، آسام وغیرہ تو یہاں قاضی کی تربیت کا نظم ہو تو زیادہ اچھا ہے، تدریب سب سے زیادہ ضروری ہے کہ جرح کس طرح ہوئی، قاضی نے کیا فیصلہ صادر کیا، گواہان کس طرح پیش ہوئے، فیصلہ ہوا تو کن کن نکات کو شامل کیا گیا، اپیل کو کون سنے گا، ہمارے یہاں اپیل کی سماعت کا نظام قائم کردیا گیا ہے، کبھی اپیل سننے کے لئے بنچ بنادی جاتی ہے اور مرحلہ در مرحلہ سماعت اپیل کا سلسلہ قائم ہے، الحمد للہ لوگ اس سے مطمئن ہیں اور فیصلہ کو تسلیم کرتے ہیں۔

س:- مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کردینے کا مسئلہ اگرچہ پرسنل لاء بورڈ کے دائرہ کار میں نہیں آتا لیکن یہ مسئلہ ملک وملت کا مسئلہ ہے، پارلیمنٹ کا مسئلہ ہے، اس لئے اس سلسلہ میں آپ کا موقف کیا ہے؟

ج:- جس بل کے تحت مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی درجہ دیا گیا ہے اور اس کا قانون بنا افسوس کہ اس میں کچھ نقص ہے، اس لئے اس سلسلہ میں عدالت سے رجوع کیا جائے یا پھر پارلیمنٹ اس کو بل کے ذریعہ درست کرے، لیکن بہرحال اس کا اقلیتی کردار ہر قیمت پر بحال ہونا چاہیے ورنہ یہ فیصلہ ناانصافی پر محمول کیا جائے گا اور مسلمانوں میں مایوسی اور انتشار پیدا ہوگا۔

س:- جہاں تک اہانت رسول ﷺ کا مسئلہ ہے تو بجا طور پر مسلمان احتجاج کرتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان مشتعل ہوکر اپنی سہل انگاری کا ثبوت دیتے ہیں اور جذباتیت کے نتیجہ میں اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں، آخر مسلمان دشمن کی اس چال کو کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ جان چکا ہے کہ مسلمان سہل انگار اور جلد اشتعال قبول کرنے والا ہے؟

ج:- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت من اللہ اور عند اللہ جو کچھ ہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا، مگر کچھ لوگ اوچھی حرکتیں کرتے ہیں، حرکتوں کا مقصد مسلمانوں کو مشتعل کرنا ہوتا ہے، اگر ہم ایسے موقعوں پر سڑکوں پر اتر آئیں اور تصادم کر بیٹھیں یا باہم ہی متصادم

ہوجائیں، مثلاً ڈنمارک میں چھپے کارٹون کے احتجاج کے موقع پر دکانیں بند کرانے کے سلسلہ میں فسادات ہوئے، ایسے موقعوں پر جب جلوس سڑکوں پر آجاتا ہے تو مجمع قابو میں نہیں رہتا، ایسے موقعوں پر وہ جوش میں ہوتے ہیں اور سنجیدہ بات نہیں سنتے، ہمارا موقف تو یہ ہے کہ ہم اس کی ضرور مذمت کریں لیکن سڑکوں پر نہ آئیں، ایسی حالت میں جبکہ ہم مجرم کو سزا نہیں دے سکتے، مسلمان تو حضرت عیسی علیہ السلام، حضرت موسی علیہ السلام سمیت تمام پیغمبروں کی عظمت کرتے ہیں، لیکن دیگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نہ کریں تو یہ کونسی انصاف کی بات ہے؟ اس وقت مغربی دنیا طاقت کے نشے میں چور ہے، ہمیں ایسے سنجیدہ اور باوقار مسلکوں میں احتجاج کے لئے ایکشن کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے، جب تک ہم یہ صلاحیت پیدا نہیں کریں گے تب تک مغربی دنیا ہمارے زبانی احتجاجوں سے کوئی اثر قبول کرنے والی نہیں ہے، ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ حالات پیدا ہورہے ہیں اور کیا تدابیر ہوسکتی ہیں، جن سے واقعی تدارک کیا جاسکے۔

(سہ روزہ دعوت دہلی: ۱۶-اپریل ۲۰۰۶ء)

ملت کو حوصلوں کے ساتھ مسائل کا مقابلہ کرنا چاہیے!

سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر

مولانا محمد ولی رحمانی سے ایک انٹرویو

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری اور نائب امیر شریعت بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے گزشتہ دنوں جب ندوۃ العلماء لکھنؤ کا دورہ کیا تو اس موقع پر دعوت کے لئے یہ گفتگو جناب امین الدین شجاع الدین نے کی، جسے انٹرویو کی شکل میں یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

س:- ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم کردیا ہے ،اس پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

ج:- یہ فیصلہ مختلف لحاظ سے دوررس اثرات رکھتا ہے، پہلی چیز تو یہی ہے کہ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ پیش آئی اور یہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے ختم کردینے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک علامت ہے مسلم یونیورسٹی کے ایم اے او کالج سے یونیورسٹی بننے تک کے مختلف مراحل ہیں، جب عزیز پاشا کے معاملہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو مجروح کردیا گیا تو اس کے لئے ایک طویل لڑائی لڑی گئی جس کے نتیجہ میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ بنا اور مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال ہوا، پارلیمنٹ نے اپنا فیصلہ سنایا اگر چہ حقیقت دیر سے تسلیم کی گئی لیکن اس فیصلہ کو بھی ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کے تحت کالعدم قرار دیا گیا، میں یہ نہیں کہتا کہ فیصلہ غلط تھا لیکن قانون سازی کے ادارہ سے ایک طویل عرصہ تک وابستہ رہنے کی وجہ سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پارلیمنٹ میں اقلیتی کردار کو بحال کرتے وقت جو اس کا پس منظر رہا جو بحث ہوئی، جو طریقہ اپنایا گیا

ان سب چیزوں کو نظر انداز کر کے ہائی کورٹ نے ایک نقطہ Stablish کو بنیاد بنا کر یہ فیصلہ کیا ہے، جب کہ قانونی تقاضے صرف لفظوں سے پورے نہیں ہوتے، قانون سازی کی تاریخ، قانون کی تاریخ اور قانون سازی کے فیصلے اور حکومت اور دانشوروں کا نقطہ نظر یہ ساری چیزیں ایکٹ کے پس منظر میں رہا کرتی ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پس منظر میں بھی رہی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے فیصلہ کرنا انصاف کے تقاضوں کو مثالی طور پر پورا کرنے کے مطابق نہیں ہے۔

س:- ملت اور پارلیمنٹ کو اس سلسلہ میں کیا موقف اپنانا چاہئے؟

ج:- یہ مسئلہ صرف ملت کا نہیں ہے بلکہ خود پارلیمنٹ کا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ ایک حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے پارلیمنٹ نے جن بنیادوں پر فیصلہ کیا قانون سازی کے معاملہ میں سپریم کورٹ ایک سپریم ادارہ ہے، ہائی کورٹ قانون سازی کے معاملہ میں بالادست نہیں ہے، پارلیمنٹ نے اس قانون کو پاس کیا تھا اور ایک لمبی مدت کے بعد ایک ایکٹ بنا تھا، طویل بحث ہوئی تھی، ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ پر بحث ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ اس نتیجہ پر پہنچی کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قائم کردہ ہے، چنانچہ ایک ایکٹ بنا، حاصل یہ کہ پارلیمنٹ نے جو حق دیا تھا عدالت نے اسے ختم کردیا، چنانچہ یہ مسئلہ صرف ملت کا نہیں بلکہ پارلیمنٹ کا ہے کہ کیا قانون سازی کا کام اس ملک میں عدالتیں کیا کریں گی، یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ عدالتوں کا دائرہ کار ہے کیا؟ قانون سازی یا قانون کی تشریح، یہ بات بہت واضح سی ہے کہ عدالت کے فیصلہ میں ایک اندوہناک فقرہ لکھا ہوا ہے، ان دفعات کے تحت پالیمنٹ کو یہ فیصلہ لاگو نہیں کرنا چاہئے تھا یا ان کو کرنے کا حق نہیں ہے، اس قسم کی بات کہی گئی ہے تو پھر بات تو یہ ہوئی کہ پارلیمنٹ فیصلہ کرنے سے پہلے سپریم کورٹ یا ہر ایک عدالت سے فیصلہ کرالیا کرے کہ اس قانون کو لاگو کیا جائے یا نہیں، یہ چیز بہر حال خطرناک ہے، قانون سازی کے سلسلہ میں پارلیمنٹ سپریم باڈی ہے کورٹس ان فیصلوں کی تشریح یا تطبیق تو کرسکتی ہے لیکن کورٹ کا کوئی دائرہ کار قانون سازی کا نہیں ہے، میں یہ بھی

کہنا چاہوں گا کہ دستور کے ایک جملہ کے مطابق کورٹ کو قانون سازی کا اختیار ایک حد تک دیا گیا ہے لیکن وہ ایمرجنسی کے حالات کے لئے ہیں لیکن جو لوگ دستور اور اس کے نکات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک دور کے حالات ہیں ان کو عام حالات کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

س:- آندھرا پردیش میں مسلمانوں کو ملازمتوں میں جو ۵ فیصد ریزرویشن دیا گیا تھا اسے بھی عدالت نے ختم کر دیا، اس پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

ج:- جو فیصلہ آندھرا پردیش میں ہوا ہے وہ بالکل ٹیکنکل بنیادوں پر ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ جو بل لایا گیا ہے اس میں کہیں جھول ہے جس کا فائدہ اٹھایا گیا ہے، آندھرا پردیش حکومت کی نیت اگرچہ صحیح رہی ہو، میں نیت پر حملہ نہیں کرتا لیکن جو بل لایا گیا ہے اس میں کہیں جھول ہے، جو طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہئے تھا آندھرا پردیش حکومت نے اسے اختیار کیا لیکن قانون دانوں کا اور کورٹ کا یہ خیال ہے کہ اسے اور واضح ہونا چاہئے تھا، دراصل معاشی و معاشرتی پسماندگی پر ریزرویشن ہو سکتا ہے اور مسلمان ان دونوں اعتبار سے پسماندہ ہیں اور اس بنیاد پر انہیں ریزرویشن مل سکتا ہے، اس فیصلہ پر سرکاری ایجنسیاں بھی پہنچی ہیں، سماجی لحاظ سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی بعض صوبوں میں ان کی پسماندگی بڑھ رہی ہے، اس لحاظ سے وہ معاشی لحاظ سے پسماندہ ہیں ان کو ریزرویشن مل سکتا ہے، کوئی قانونی دشواری نہیں ہے، اگر مقدمہ صحیح انداز اور رُخ پر ہو تو آندھرا پردیش حکومت کو کامیابی مل سکتی ہے۔

س:- ایران کے سلسلہ میں امریکہ نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے، اس پر آپ کا کیا تاثر ہے؟

ج:- جہاں تک امریکہ کا سوال ہے جب سے امریکہ واحد سپر پاور بنا ہے تب سے اس کی چال بدل گئی ہے، جو لوگ آج امریکہ کی نگاہ میں دہشت گرد ہیں، کل وہی لوگ امریکہ کو عزیز تھے، ان کے عزیز رہے، ان کے اشاروں پر بہت سے کام کئے گئے اور آج ان ہی کو آگے لایا جا رہا ہے، دہشت گرد کہا جا رہا ہے حتیٰ کہ اسلامی دہشت گردی کا عنوان بھی دیا جاتا رہا ہے، یہ

باتیں طاقت کے نشہ میں بش، انتظامیہ اور امریکہ کے کچھ لوگ کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا، کوئی بھی انسان دہشت گرد ہو سکتا ہے، دنیا میں مختلف ملکوں میں لوگ دہشت گردی کر رہے ہیں، برما میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے خود امریکہ نے لاکھوں لوگوں کو قتل کیا ہے، ایران اور افغانستان کے اندر دہشت گردی اور اسلامی دہشت گردی کے نام پر جو بات پوری دنیا میں کہی جا رہی ہے اور واویلا مچایا جا رہا ہے اس میں یہ دیکھنا چاہئے کہ کتنے افراد نام نہاد دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے گئے اور کتنے آدمی امریکہ اور اس کی توپوں اور تفنگوں سے مارے گئے، ان کی تعداد لاکھوں سے اوپر ہوگی، امریکہ نے ان پر جو بمباری کی ہے جب کہ امریکہ کے مقابلہ میں کون سی اندھا دھند بمباری کی گئی ہے اور دہشت گردوں نے اس سے استعمال کیا ہے، میں دہشت گردوں کی حمایت نہیں کرتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس لفظ کا صحیح انطباق کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ بش اور اس کی انتظامیہ ہے، یہ بالکل دادا گیری ہے کہ امریکہ تو سارے ہتھیار بنائے اور دوسروں سے کہے کہ فلاں ملک نہیں بنا سکتا، ہندوستان اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو اس کے اندر بھی قدغن لگائی جا رہی ہے، اگر ہندوستان کا کوئی وزیر الگ رائے دیتا ہے، تو اسے وزارت سے الگ ہونا پڑتا ہے، استعفیٰ دینا پڑتا ہے، یہ تو بدترین قسم کی دادا گیری ہے کہ جمہوری ملکوں میں جمہوریت میں دخل اندازی کی جائے۔

ایران ایک جمہوری ملک ہے، وہاں صدر چنے گئے، انتخابات ہوئے وہ ملک اس بات کے لئے آزاد ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لئے جو چاہے کرے، انسانی حقوق کے اعتبار سے اگر وہ کچھ غلطی کر رہے ہیں تو حقوق انسانی کے ادارے ہیں وہ اس بات کا جائزہ لیں، امریکہ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان ملکوں کے اندر مداخلت کرے۔

جس طرح بحیثیت ہندوستانی ہم اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ ہندوستان کے معاملہ میں وہ مداخلت کرے، کشمیر میں دہشت گردی کی بات کی جاتی ہے ہم اس کے مخالف ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ نہ تو انصاف کی بات ہے اور نہ شرافت کی، نہ اسلام اس کی تائید کرتا ہے نہ اسلام کے تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں، نہ انسانی قدروں کا پاس و لحاظ ہی ہے، بش

اوراس کی انتظامیہ نے اپنی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس صدی کی بدترین تصویر ہے اوراس صدی کی نہیں بلکہ پچھلی کئی صدیوں کی بدترین تصویر ہے۔

س:-حماس کی کامیابی کو آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ج:-حماس کی کامیابی بہرحال کامیابی کا ایک پہلو اور نمونہ ہے، اصل میں مسئلہ حماس کا نہیں ہے، یہ عالمی سطح کی ایک اقتصادی جنگ ہے، حماس کے مقابلہ میں بہت ہی ٹرینڈ لوگ ہیں، یہ لڑائی توپ وتفنگ سے لڑی جارہی ہیں، وہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور بہت ہی معیاری قسم کے دہشت گرد ہیں، ان کے پیچھے امریکہ کی طاقت ہے، جو میرے خیال میں دہشت گردی کی علامت ہیں، اس لئے ان کو شکست دینے کے لئے مزید تنظیم اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

س:-عمرانہ کے معاملہ کو اس طرح اُچھالا گیا، اس میں میڈیا کے ساتھ مسائل کو بھی دخل ہے، اس سلسلہ میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

ج:-جہاں تک عمرانہ کیس کا معاملہ ہے، یہ بالکل واضح ہے کہ چونکہ عمرانہ مسلمان، اس کے شوہر مسلمان، اس کے سسر مسلمان اس لئے ہنگامہ آرائی کی گئی، میں نے ایک ٹی وی انٹرویو میں یہ بات کہی تھی کہ میرے نزدیک ایک عمرانہ نہیں، دو عمرانہ ہیں، ایک عمرانہ کا نام عمرانہ ہے اور دوسری عمرانہ کا نام گوری آڈوانی ہے، اس نے رٹ پٹیشن میں کہا ہے کہ ان کے سسر نے ان کو ذہنی طور پر اور جسمانی طور پر پریشان کیا ہے، جسمانی ٹارچر کا مطلب بہت واضح ہے، اس کے لئے کسی ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، دوسری عمرانہ کے معاملہ میں جو بہت پڑھی لکھی ہیں اور انگلینڈ میں وکالت کرتی ہیں، ان کے بارے میں مسلم گھرانہ کی بات تھی، اس لئے اس پر ہنگامہ مچادیا گیا جس دن یہ کیس ہوا ہے اسی دن مرزاپور کے گاؤں میں ایک کیس ہوا ہے جس کی نوعیت یہ رہی کہ ایک چھوٹے بھائی نے اپنے بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کئے تو اس گاؤں والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں بھائی اس عورت کے ساتھ رہیں گے اور وہ دونوں اس عورت سے تعلقات رکھیں گے اور میاں بیوی کے تعلقات رکھیں گے، اگر سسر کا بہو کے ساتھ تعلق غیر قانونی ہے تو چھوٹے اور بڑے

بھائی ایک عورت سے تعلق قائم کرنا اتنا ہی غیر قانونی ہے، شرمناک ہے، بہرحال یہ فیصلہ کردیا گیا اور ایسے شرمناک فیصلے پر کہیں بھی اس ملک کے اندر گرمی نہیں آئی، کہیں انسانی قدروں کے زوال سے ہمارے اخبار والے پریشان نہیں ہوئے، ٹی وی والوں کا رُخ مرزاپور کے گاؤں والوں کی طرف نہیں ہوا، اسی نوعیت کا کیس پنجاب میں پیش آیا کہ ایک نابالغ لڑکی کا تعلق ایک لڑکے سے ہوگیا، اس گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ لڑکی بالغ نہیں ہوجاتی ہے تب تک اس لڑکے کے ساتھ اس کے گھر میں رہے گی اور پھر جب بالغ ہوجائے گی تو جہاں چاہے شادی کرے، یہ حادثہ بھی ہندوستان میں ہوا اور ظاہر سی بات ہے کہ یہ معاملہ عمرانہ کیس سے کسی طرح کم نہیں تھا، لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ کوئی ایک بار زنا کرے تو اسے برسوں زنا کرنے کی اجازت مل جائے، لیکن اس کے باوجود یہ گاؤں ٹی وی والوں کی توجہ اور سرگرمی کا مرکز نہ بن سکا اور نہ اس واقعہ کی گونج سنائی دی، ہندوستان میں زرد تہذیب کے جو اثرات ہیں وہ ذہنوں اور دل ودماغ میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ مسلم گھرانوں میں پیدا ہوتا ہے تو سبھوں کو انسانی قدریں انسانیت اور اخلاق سب کچھ نظر آنے لگتے ہیں، جب کہ دوسروں کے گھرانہ میں جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو انسانی اقدار اور اخلاق کچھ نظر نہیں آتا، معاملہ تو صاف ہے کہ عمرانہ کیس کو اچھالا گیا، وہ معاملہ اندوہناک تھا جیسا کہ اخبار نے اسے شائع کیا، ورنہ اس کی دوسری جہت یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ ہوا ہی نہیں تھا بلکہ وہ جائداد کی تقسیم اور فروختگی کا مسئلہ تھا اور ایک سوچی سمجھی سازش تھی کہ بیٹے اور بہو نے خود اپنے باپ اور سسر کو متہم کیا اور اسے پریشان کیا، یہ ایک واضح بات ہے لیکن اگر وہ پہلی والی بات جو میڈیا کے ذریعہ پھیلی اگر وہ صحیح بھی ہے تو میڈیا والے اس وقت کہاں رہ جاتے ہیں جب اس قسم کے واقعات دوسرے گھرانوں میں ہوتے ہیں۔

دوسری بات کہ جہاں تک ہمارے بعض علماء نے مسلک کی بیساکھیوں کی اس موقع پر بات چھیڑی کہ میرے یہاں حل موجود ہے، یہ انتہائی عجیب وغریب بات ہے، سارے شور شرابے اسلام کے خلاف ہورہے ہیں، انہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ سارے مسائل اسلام کے لئے کھڑے کئے جاتے ہیں، اس مسلک اور اس مسلک اور اس طریقہ اور اس طریقہ کو نہیں

دیکھا جاتا اور اس کا بین ثبوت عمرانہ کیس ہے کہ اس کیس کے بعد ایک مرحلہ آیا کہ عدالت میں دار القضاء اور دار الافتاء کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا، دار القضاء کے خلاف جو مقدمہ دائر کیا گیا اس میں تو یہ نہیں دیکھا گیا کہ دار القضاء کس مسلک کا ہے، اس مقدمہ کے دائرہ کرنے میں عمرانہ کیس سے حوصلہ ملا ہے اب جب ایسے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا حل میرے مسلک میں موجود ہے تو انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ یہ کیس اسلام کے خلاف جارہا ہے، کسی ایک مسلک کے خلاف نہیں ہے، انہیں تو سہارا چاہئے تو ایسے سہاروں کے ذریعہ وہ اسلام پر حملہ کرتے ہیں، وقتی طور پر کسی اخبار میں آجائے گا کہ فلاں مسلک میں اس کا حل موجود ہے لیکن جب لاٹھی چلتی ہے تو اسلام پر لاٹھی چلتی ہے اور سارے مسلک والے اس کی زد میں ہوتے ہیں۔

س:- مدارس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن کیا بات ہے کہ آخر مسئلہ مدارس کے ان طلباء کا ہے جن میں مستقبل کی طرف سے مایوسی وافسردگی محسوس کی جاتی ہے؟

ج:- مدارس کے کارنامے اپنی جگہ، ان کی افادیت مسلم، نیز غریبوں تک مفت تعلیم پہنچانے کا سب سے موثر اور سب سے بڑا Network، اس وقت مدارس ہی ہیں، یہ بات اپنی جگہ ایک واقعہ ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ پہلے جن حوصلوں کے ساتھ طلباء مدارس میں بھیجے جاتے تھے، ان کے سرپرست بھیجتے تھے اور جن جذبات وحوصلہ مندی کے ساتھ بھیجتے تھے اور بچے خدمت دین کی نیت سے آیا کرتے تھے، افسوس کہ ان حوصلوں اور جذبات میں انحطاط آگیا ہے، دوسرا بڑا عنصر یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں انہیں کیا کرنا چاہئے، یہ منزل ان کی متعین نہیں ہوتی ۹-۱۰ یا ۱۲ سال عربی زبان اور دینیات وہ پڑھتا ہے اور جب اس طویل مدت کے بعد نیا سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں نے امتحان دے دیا، اب مجھے کیا کرنا چاہئے، یہ بات بڑی افسردگی کی ہے کہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی منزل کیا ہے، اس کی منزل متعین ہونی چاہئے، یہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ اس کی منزل متعین کریں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اساتذہ سبق تو پڑھادیتے ہیں لیکن اس کی منزل نہیں

بتاتے اور اگر بتاتے ہیں تو پلاتے نہیں، چنانچہ ذہن الجھ جاتا ہے، فراغت کے بعد مجھ سے کوئی پوچھتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ اصل منزل ہے: خدمت دین، چاہے جس انداز سے ہو، جس راستہ سے ہو، خدمت دین کی کرنی ہے، جہاں تک تعلق ہے اس پروپیگنڈہ کا کہ مدارس کے فضلاء کا مالی مستقبل مجروح ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملک کے اندر ایک کروڑ سے زیادہ اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم یافتہ بیکار پڑے ہیں، جو لوگ مدارس کے مولویوں کی بیکاری کا رونا روتے ہیں وہ لوگ ایک درجن بھی ایسے مولویوں کی نشاندہی نہیں کرسکتے کہ وہ بیکار ہیں اگر تھوڑی سی بھی صلاحیت ہے تو مصروف ہوجاتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کی تعلیم پر لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں، بیکار پڑے ہیں، حد یہ ہے کہ بڑے بڑے Toppers ان میں ہیں کلکتہ میں ٹیکسی ڈرائیور ہیں اور وہ اپنا کام اس سے چلا رہے ہیں، مولویوں کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی مالی حالت مجروح ہوتی ہے، یہ آنسو پونچھنے والی بات تو ہوسکتی ہے، خدمت والی نہیں ہوسکتی، جہاں تک مولویوں کی بات ہے تو ان کو یہ بات سمجھنی چاہئے خصوصاً نئے فارغین کو کہ وہ اپنی صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کریں، اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں اور نئے زمانہ کے تقاضوں سے اپنی صلاحیتوں کو ہم آہنگ کریں، میرے خیال میں اس سلسلہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ لسانی ہے، وہ زبان فہمی کی ہے، مزاج فہمی کی ہے اور زبان دانی کا جو خلا ہے اس سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں، مدارس کے فارغین کو بھی اور مدارس کے ذمہ داروں کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہئے، مدرسہ کی وادی میں وہی آئے جو اس وادی پرخار سے گزرنا چاہتا ہو، کوئی آبلہ پا اس وادی پرخار میں نہ آئے، مدرسہ والوں کے لئے اللہ نے فقیر کا ٹائٹل چن لیا ہے، یہاں فقراء سے مراد علماء ہیں تو جب اللہ نے اس ٹائٹل کو چن لیا ہے، مولویوں کے لئے تو انہیں بھی اس تاج کو بڑے فخر اور حوصلہ کے ساتھ سر پر رکھ لینا چاہئے۔

س:- آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی اصلاح معاشرہ کمیٹی کے کنوینر ہیں، اس سلسلہ میں اب تک کیا پیش رفت ہوئی اور آپ کے سامنے اس کا لائحہ عمل کیا ہے؟

ج:- اصلاح معاشرہ کی تجویز تو پاس ہوگئی، بڑی مفصل تجویز ہے اور بڑی نازک ذمہ

داری ہے، کچھ جلسے ہوئے ہیں جن میں ہندو مسلمان سب ہی شریک ہوئے ہیں، میں نے اہتمام بھی کیا ہے ایسے جلسوں کا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ہمارا سب سے پہلا ہدف خود مسلم معاشرہ ہے، جس میں بہت سی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں، فضا کے نہ ہونے کی وجہ سے اور ہندوستانی معاشرہ کے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے، اس سلسلہ میں پہلی کامیابی یہ ہے کہ ملک میں یہ عنوان مقبول ہوگیا ہے اور گھر گھر پہنچ گیا ہے، اب مدرسوں کے جلسے ہورہے ہیں تو ان میں بھی عنوان اصلاح معاشرہ کا ہوتا ہے، جماعتوں کے جلسے ہوتے ہیں تو ان میں بھی عنوان اصلاح معاشرہ کا ہوتا ہے، تو ایک کمی کا احساس ہر طرف پیدا ہورہا ہے اور کمی کا احساس اگر پیدا ہوجائے تو اصلاح کا جذبہ بھی آہستہ آہستہ پیدا ہوجاتا ہے، دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مسائل میں تخفیف، جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں انہیں دور کرنا ہے، اس کے لئے بہر حال صرف تحریروں اور تقریروں سے کام نہیں چل سکتا، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحت اصلاح معاشرہ کمیٹی کی یہ ذمہ داری ہونی چاہئے کہ وہ گاؤں گاؤں اپنے تنظیمی ڈھانچہ کو مضبوط کرے، ایسے لوگوں کو آمادہ کریں جو گرفت کرسکیں کہ یہ غلط کام ہے، بہار میں یہ کام چلا ہے اور اس کے بڑے اچھے ایجابی اثرات پڑے ہیں اور آپ یقین کیجئے کہ مجھے تو حیرت ہورہی ہے کہ اللہ تعالی نے اس تحریک میں دم رکھا ہے، گاؤں تک کی یہ صورت حال ہے کہ شادی میں اسراف اور غلط کاریاں، جہیز کی بڑھتی حدیں اور فخر و مباہات کی چیزیں لمبی لمبی بارات ان میں بعض مقامات میں ۴۰ فیصد تک کمی آئی ہے، تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، آج کل کیسٹوں کا دور ہے لوگ سنتے ہیں چوپالوں میں بیٹھ کر، مسجدوں میں بیٹھ کر، اس کے اثرات پڑرہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تنظیمی ڈھانچہ کو کھڑا کیا جائے تاکہ ایک ایسی جماعت تیار ہوجائے جو برائیوں کے اور خاص طور پر ان برائیوں کے خلاف جو ہمارا ہدف ہیں ان کے خلاف بول سکیں اور اقدام کرسکیں، سمجھا بجھا سکیں، وقت پر اگر فائدہ ہوا تو انشاء اللہ اس کا فائدہ ہوگا، اخلاص اور حق کی بات کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

(سہ روزہ دعوت دہلی ۴ مارچ ۲۰۰۶ء)

ہم سیاسی بے پناہی کے عالم میں ہیں!

سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر، وسابق ڈپٹی چیئر مین لیجسلیٹیو کونسل بہار

مولانا محمد ولی رحمانی سے ایک ملاقات

مدارس کے خلاف مہم اور گجرات فسادات کی خبریں ان دنوں اخبارت میں چھائی رہی، اس سلسلہ میں ملی قیادت کا کیا موقف ہے؟ اسے جاننے کے لئے مولانا محمد ولی رحمانی کا ایک انٹرویو۔

س:- مدارس کے خلاف منصوبہ بند مہم جوئی کی آپ کے نزدیک کیا وجوہات ہوسکتی ہیں؟ اس کے تدارک کے لئے ملت کو کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہئے؟

ج:- مدارس کے خلاف مرکزی حکومت جان بوجھ کر محاذ آرائی کررہی ہے، مرکزی حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ مدارس خدمات کے تسلسل کا نام ہے اور وہ انسٹی ٹیوشن ہے جو Continued Process میں رہتا ہے، مرکزی حکومت ان سارے سوتوں کو خشک کردینا چاہتی ہے جہاں سے ملت کو زندگی کا پیغام ملتا ہے، ملی زندگی کو افراد ملتے ہیں اور مسلسل خدمت کا تیار ڈھانچہ ملتا ہے، اسی لئے مرکزی حکومت نے بغیر کسی ثبوت کے مدارس پر دہشت گردی کا الزام لگایا، عالمی دہشت گرد تنظیموں سے Funding کا الزام لگایا، مدارس میں فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے والی تعلیم کا الزام لگایا جبکہ یہ سب کام مرکزی حکومت کی مادر مہرباں R.S.S کرتی رہی ہے، غیر ملکی فنڈ کا معاملہ اور انکم ٹیکس کے دفتر سے کئے گئے سوال کے نتیجے میں انکم ٹیکس افسر کا جو حشر ہوا ہے، اخباری طبقہ اسے جانتا ہے اس کا مدارس سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے، میں نے وزیر اعظم سے براہ راست گفتگو میں کہا تھا کہ آپ کی وزارتی رپورٹ مدرسوں کو

دہشت گردی کا اڈہ کہہ رہی ہے، آپ ایک مثال ماضی کی نصف صدی کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ پیش کردیں اور اگر ابھی پیش نہ کرسکتے ہوں تو منگوالیں اور پھر مجھے بھی بلالیں میں آج تک وزیراعظم صاحب کی طلب کے انتظار میں ہوں، ستم یہ ہے کہ جس نے دہشت گردی کبھی کی نہیں، اس پوری جماعت کو دہشت گرد کہا جارہا ہے اور جو بار بار اپنے دہشت گرد ہونے کا اعلان کرچکا ہو وہ مرکزی حکومت کا رکن رکین اور ہماری مرکزی وزارت کا وزیر دفاع ہے، ایک طرف وزارتی گروپ کی رپورٹ وزارت داخلہ کی Standing Commitee کی ۸۸ویں رپورٹ مدارس کے بارے میں دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی بات کرتی ہے اور فروری ۲۰۰۱ء میں وزیر داخلہ اڈوانی نے پارلیمنٹ میں تحریری بیان دیا کہ کسی مدرسہ کے خلاف دہشت گردی کی کوئی رپورٹ نہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ اسی فروری میں group of ministers کی رپورٹ مکمل ہوئی تھی جس کے چیئرمین اڈوانی تھے، پھر مارچ یا اپریل ۲۰۰۲ء میں State Minister Home Affairs نے پارلیمنٹ میں ایک سوال کا تحریری جواب دیتے ہوئے کہا کہ کسی مدرسہ کے خلاف کوئی متعین چارج نہیں ہے اور نہ دہشت گردی کی کوئی رپورٹ، اور اسی مہینہ مرکزی وزارت داخلہ نے صوبائی حکومتوں کو یہ سرکلر بھیجا کہ مدارس پہ کڑی نگاہ رکھی جائے اور انہیں وزیر باتدبیر صاحب نے حیدرآباد میں پریس کانفرنس کے ذریعہ مدارس پر کڑی نگاہ رکھنے کی گزارش کو دہرایا، یہ پارلیمنٹ کے اندر کچھ اور، پارلیمنٹ کے باہر کچھ اور، اور وزارت داخلہ کا سرکلر، یہ چیزیں مرکزی حکومت کے جھوٹ کو واضح کرتی ہیں۔

جب وزارت داخلہ کی کمیٹی کی میٹنگ ہورہی تھی اور اس میں خاص طریقہ پر سرحدی علاقہ میں مدارس میں منظّم دہشت گردی کی سازش کا حصہ کمیٹی کے سامنے آیا تو کمیٹی کے رکن جناب غلام محمود بنات والا کی جرح و بحث پر اڈوانی صاحب نے گفتگو یہاں ختم کردی کہ سرحدی علاقے کے مدارس سے مراد ہندوستان کی سرحد کے اندر کے مدارس نہیں ہیں بلکہ نیپال میں موجود سرحدی علاقے کے مدارس مراد ہیں، فیصلہ کیجئے کہ اس ''حسن جواب'' پر کون نہیں مسکرائے گا!

یہ مدارس کا اسلامی اخلاق اور کردار ہے، دینی تہذیب اور اخلاقی تربیت ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ملک کے طول وعرض میں مدارس کے اندر ۳۰۲ اور ۳۰۷ کے پچاس کیا پانچ کیس بھی نہیں ہوئے ہیں، ان پرسکون اور خدمت گزار اداروں کو دہشت گردی کا مرکز قرار دینا بدترین قسم کی علم دشمنی اور وطن دشمنی ہے، میں یہ بھی یاد دلاؤں کہ جب یوپی میں بی جے پی کی حکومت تھی تو تمام تھانوں کو وزارت داخلہ سے یہ ہدایت بھیجی گئی تھی کہ مسجدوں پر، مسجد میں آنے جانے والوں پر خاص نگاہ رکھی جائے، یہ بھی دراصل ملت کی زندگی کا Continued Process ہے، اسی لئے مرکزی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ملی زندگی میں ان چھوٹے چھوٹے کارگزار اداروں کو شبہ اور نفرت کے دائرہ میں لاکر ان کی کارکردگی کو منجمد کردیا جائے، یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے ایک چیلنج ہے جس کا حل فراست، تدبر اور مسلسل عمل سے دیا جاسکتا ہے، میرے خیال میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اپنے حلقہ کے M.L.A اور M.P اور سیاسی رہنماؤں سے رابطہ بڑھایا جائے اور انہیں حکمت و تدبر کے ساتھ مدرسہ آنے، دیکھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع دیا جائے، اسی طرح ہندی اور انگریزی اخبارات صحافیوں اور نمائندوں سے بھی رابطہ ضروری ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی جو بہت بڑا اقدام ثابت ہوسکتی ہے یہ ہے کہ مسلک و مشرب کے فرق کو تھوڑی دیر کے لئے بھول کر ملکی سطح پر نہ تو صوبائی سطح پر مدارس کی تنظیم قائم ہونی چاہئے تاکہ سب مدرسہ والے نرم گرم میں برابر کے شریک اور سختیوں کو یکساں جھیلنے والے بن سکیں، اور یہ مشترک سرمایہ اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ آنے والے دنوں میں خدمت انجام دیتا رہے۔

میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ دوسرے مسلک کو اپنائے مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ دوسرے مسلک والے کو اپنا سمجھئے۔

س:- حال میں مسلم پرسنل لاء سے متعلق اورنگ آباد بنچ کا فیصلہ آیا ہے، جس سے تشویش پیدا ہوئی ہے، عدالت کی راہ سے مداخلت کی جو شکلیں سامنے آرہی ہیں اس پر آپ کا ردعمل؟

ج:-کورٹ کی جانب سے ایسے فیصلے آتے رہتے ہیں جو مذہب کے خلاف ہوتے ہیں، میں نے جو کچھ قانون پڑھا ہے سمجھا ہے اور جتنی کچھ ۲۲ سال تک قانون سازی کی ہے ،اس تجربہ کی بنیاد پر کورٹ کے بہت سے فیصلوں کو کم علمی پر محمول کرتا ہوں اور قانون سے ناواقفیت کی دلیل مانتا ہوں، آئین اور دستور یا قانون کا کوئی آئٹم مذہب کو پامال کرنے کے لئے نہیں آیا مگر کورٹ ایسے فیصلے کر رہا ہے جو مذہبی روایات کے خلاف ہیں، ابھی چند دنوں قبل ہندو مذہب سے متعلق بھی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہندو مذہب میں مداخلت ہے اور کورٹ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، اسی طرح جس Judgement کی طرف آپ کا اشارہ ہے یعنی ممبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ کا فیصلہ تو اس فیصلہ میں جج صاحب ''مفسر قرآن'' بھی بن گئے ہیں انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں کا مطلب بھی نکالنا شروع کر دیا ہے اور اس نکالے ہوئے مطلب کی اسلامی حیثیت بھی Declare کر دی جب کہ جج صاحب کو قانون شریعت اور قرآن مجید سے کوئی واقفیت نہیں، ان بیچاروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں میں کتنے مکاتب فکر ہیں، انہوں نے اپنے Judgement میں تحریر فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں تین Schools of Thought ہیں، ایک شیعہ دوسرے سنی، تیسرے 'مجتہد' Muzthahid اب یہ مجتہد کونسا مکتب فکر ہے، ان جج صاحب کو کون سمجھائے؟ مگر ان کا مبلغ علم تو معلوم ہو گیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ کیفیت اکثر و بیشتر ناواقفیت اور کورٹ کے سامنے پوری صورت حال کو صحیح طریقہ پر نہیں رکھنے کی وجہ سے ہوئی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بعض ججوں نے اپنے مخصوص خیالات کو جان بوجھ کر فیصلے کا حصہ بنا دیا ہے جس نے مختلف قسم کے مسائل اس ملک میں پیدا کئے ہیں، ان فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ میں طویل قانونی جدوجہد کی لازمی ضرورت ہے، ساتھ ہی مختلف صوبوں میں Jugdes قانون دانوں اور علماء کے درمیان سمینار اور آزادانہ تبادلہ خیال کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں، ساتھ ہی ہم سبھوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس ملک میں قانونِ شریعت پر عمل کی ذمہ داری نہ کورٹ کی ہے، نہ

غیر مسلموں کی ہے، یہ صرف اور صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، ہمیں اپنے معاملات کو آپس کی گفت وشنید سے طے کرنا چاہئے، خاندان کے بڑے یا محلّہ کے ذمہ دار کی سرپرستی کو قبول کرتے ہوئے۔

س:- گجرات کے فسادات کو انصاف پسند طبقہ نے 'نسل کشی' تعبیر کیا آپ کے نزدیک گجرات جیسے سانحہ کے پسِ پشت منصوبہ بند مذموم مقاصد کو ناکام بنانے کے لئے ملت کو کون سا لائحہ عمل اپنانا چاہئے؟

ج:-نفرت کی آبیاری اس ملک میں ایک عرصہ سے ہو رہی ہے، آر، ایس، ایس نے بہت منظّم اور مرتب طور پر یہ مسلم دشمنی کی مسلمانوں سے نفرت اور اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش کر رکھی ہے اور وہ تدریجاً اس کام میں کامیاب ہیں اور نہ صرف آر، ایس، ایس بلکہ تقریباً تمام سیکولر جماعتیں بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت اپنے سیاسی مفاد کے لئے مسلم دشمنی کا سہارا لیتی رہی ہیں، مسلمانوں کی ایک بڑی کمی یہ ہے کہ وہ اپنی ملی ذمہ داریوں کو دوسروں پر اعتماد کرتے ہوئے دوسروں کے حوالہ کر دیا کرتے ہیں، اور خود تسلسل کے ساتھ کسی سیاسی، سماجی، اقتصادی پروگرام کو ملت کا کام سمجھ کر اور اپنی ذاتی ترجیح بنا کر نہیں کیا کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم ''سیاسی بے پناہی'' کے عالم میں ہیں اور اللہ کی دی ہوئی بہت ساری نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اپنی ناسمجھی، پلاننگ کی کمی، مسلسل کام نہ کرنے کے جذبہ کی وجہ سے گجرات کے سانحہ کے بعد بہت سارے حلقہ میں مسلمان اپنے آپ کو مجبور اور بے سہارا محسوس کرتے ہیں۔

میرا احساس ہے کہ ایک صاحب پیغام امت کے لئے جتنے سرمایہ، جتنے علم وعمل اور جتنی توانائی کی ضرورت ملی زندگی کے لئے ہوسکتی ہے، اس سے بہت زیادہ نعمتیں اللہ تعالی نے اپنے کرم سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے حوالہ کر رکھی ہے، کمی ہے تو ایماندارانہ تجزیہ اور غور وفکر کی، دردمندی کی، پلاننگ کی اور مسلسل کام کی۔

جہاں تک گجرات کا تعلق ہے تو گجرات کا حادثہ بڑا اندوہناک، ملک کے لئے بڑا

شرمناک لیکن مسلمانوں کو صحیح سمت میں لے جانے والا ہے، ہزار دو ہزار افراد کو دنیا سے غیر طبعی طریقہ پر چلا جانا افسوسناک ضرور ہے مگر یہ حادثہ دل خراش اور انسانیت سوز اس وقت زیادہ محسوس ہوتا ہے جب انسانیت سوز حرکتوں کو قابل فخر کارنامہ قرار دے کر لوگ سڑک پر پھیلی انسانیت کے خون پر 'سفر عظمت' اور 'سفر فخر' کیا کریں، مودی نے جس ڈھٹائی، بے حیائی اور تمام انسانی قدروں کو پامال کرتے ہوئے جو طریق عمل اختیار کیا ہے، وہ جارحیت پسندوں میں احساس ندامت اور احساس شرم کو مٹادے گا بلکہ ان کے سروں پر غرور کا سودا، ان کے دلوں میں نفرت کا جذبہ اور بھی ابھار دے گا، گجرات کے واقعہ نے یہ بتا دیا ہے کہ انسان بے چارہ ہے، انسانیت بے چاری ہے، قانون خاموش تماشائی ہے اور رائے عامہ کا وقار واعتبار صرف شریف لوگوں کے لئے ہے، اس لئے جب تک انسانیت سوز حرکتوں کے مجرم خود اپنے لئے واضح خطرہ محسوس نہیں کریں گے حالات نہیں بدل سکتے، انسانیت کی دہائی اور سیکولرزم کی تھپکیاں اور محبت کے میٹھے بول معصوموں کے زخم کا مرہم تو بن سکتے ہیں، ظالموں کے عزائم کو توڑ نہیں سکتے اور ہمارا وطن عزیز ہزاروں سال سے ایک اصول کو اچھی طرح جانتا ہے کہ لاٹھی اور بھینس کا رشتہ ہمیشہ کام آتا ہے۔

مسلمانوں کو منطق و فلسفے عقلی امکانات اور فرضی قانونی دباؤ سے الگ ہو کر اپنے اندر وہ تنظیمی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے جو جارحانہ تہذیب اور جارحیت کی منطق کا عملی جواب ہو سکے۔

(بانگ حرا لکھنؤ، ستمبر تا نومبر ۲۰۰۲ء)

اصل مسئلہ نقشۂ کار کا نہیں، افرادِ کار کا ہے!

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تاسیسی رکن

جناب مولانا برہان الدین سنبھلی سے ایک انٹرویو

مولانا برہان الدین سنبھلی مسلم پرسنل لا بورڈ سے روز اول سے وابستہ ہیں، ایک بڑے عالم دین کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت مسلم ہے، اسی طرح پرسنل لا بورڈ سے ان کی نہ صرف وابستگی ہے بلکہ وہ بورڈ کے دائرہ کار اور اس میں پیش آنے والے مسائل سے بھی واقف ہیں، پرسنل لا بورڈ کے دائرہ کار اور اس میں پیش آنے والے مسائل پر ان سے لیا گیا ایک انٹرویو۔

س- حالیہ اجلاس پرسنل لاء بورڈ کس حد تک کامیاب رہا اور اس قدر بڑے پیمانہ پر منعقد شدہ اجلاس کے اثرات مقامی طور پر کیا مرتب ہوئے؟

ج:- مسلم پرسنل لاء بورڈ کا حالیہ اجلاس احمد آباد (منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۵ء) فی الحقیقۃ انتخابی اجلاس تھا، جس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تمام عہدیداروں (بشمول ایک صدر، ۴ نائبینِ صدر، ۴ سکریٹری، ایک خازن اور ۴۵ رکنی مجلس عاملہ نیز ۴۹ میقاتی ممبران) کی مدت عہدہ ختم ہو چکنے کے بعد نئے سرے سے تمام عہدیداران کا انتخاب کرنا اصل کام تھا، یہ کام نہایت نازک اور اہم تھا، مگر خدا کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے نہایت خوش اسلوبی اور بغیر کسی خاص اختلاف کے انجام پا گیا فالحمد لله على ذلك، حالانکہ ان جیسے مناصب کے لئے بسا اوقات تنظیموں اور جماعتوں میں نزاعات واختلافات ہونے اور بعض دفعہ جدال و قتال کی نوبت آجانے کے واقعات بھی نادر نہیں ہیں، اس بناء پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ اجلاس سابقہ اجلاسوں کی طرح بلکہ

بعض اعتبار سے ان سے بھی بڑھ کر بہت کامیاب رہا، اجلاس اور بورڈ کی سب سے بڑی خوش نصیبی اور کامیابی یہ ہے کہ اس بار بھی اسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی صدارت وقیادت کا شرف حاصل رہا، حالانکہ اس بار مولانا مدظلہ نے صحت ومشاغل نیز ضعف کی بنیاد پر معذرت فرمانے کا ارادہ کیا تھا، مگر ہم خوردوں کی درخواست قبول فرما کر بورڈ کی صدارت قبول کرنا منظور فرمالیا، علاوہ ازیں شرکاء کی تعداد اور مسلمانوں کے مختلف الافکار والعقائد نمایاں افراد کی شرکت ونمائندگی اگر کسی اجلاس کے لئے معیار کامیابی ہوسکتی ہے تو اس معیار سے بھی یہ اجلاس بے حد کامیاب رہا، کیونکہ ایسی کامیابی شاید ہی کسی اور تنظیم یا جماعت کے اجلاس کے حصہ میں آئی ہو یا آتی ہو! پھر ایسے مختلف بلکہ متضاد افکار کے حامل لوگوں کا متفقہ طور پر (یا قریب با تفاق کے درجہ میں) نتائج اور فیصلوں تک پہنچنا اجلاس کی نمایاں کامیابی کی مزید علامت ہے۔

اجلاس کے بہت سے اچھے اثرات ملکی اور مقامی طور پر صاف محسوس کئے گئے، مثلا ایسے صوبہ میں کہ جہاں مسلم دشمن پارٹی (بی جے پی) کی حکومت ہو، اور جس جگہ کے مسلمان آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے شکار بن کر جان و مال کی تباہیوں سے دوچار ہوتے رہتے ہوں، وہاں ان کا مزید حوصلہ بلند ہوا، ان کے اندر سے احساس کمتری اگر تھا تو نکل گیا اور خود اعتمادی کا ایک نیا دور شروع ہوا، جس سے آئندہ ایسے مفید وجرأت مندانہ اقدامات کرنے کے لئے ان میں مزید حوصلہ پیدا ہونے کی قوی امید ہے، جو پہلے ہی سے دینی جذبات وخدمات میں ممتاز رہے ہیں، جس کا اظہار اس اجلاس کے موقعہ پر بھی ہوا۔

س-اجلاس احمد آباد میں کون سے اہم اور قابل ذکر فیصلے کئے گئے؟

ج:-جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، قابل ذکر اور اہم فیصلوں میں بورڈ کے ذمہ دارانہ عہدوں کیلئے صحیح اور اہل افراد کے انتخاب کا فیصلہ ہے، نیز ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منانے کا بھی فیصلہ اس کے تفصیلی نقشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''اہم فیصلہ'' کہے جانے کا مستحق ہے۔

س-ایک خیال یہ بھی ہے کہ یکساں سول کوڈ کی بات کرنے والوں کے سامنے مسلم پرسنل لاء کی نافعیت اور افادیت کو پیش کیا جائے تا کہ اس طرح یونیفارم سول کوڈ میں ان

اسلامی قوانین کو بھی شامل کر لینے کی ایک صورت پیدا ہو جائے، اس نظریہ کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج:-اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب اب سے تقریباً بیس سال قبل یعنی بورڈ کے قیام سے کوئی دو سال بعد ہی راقم الحروف نے اپنی کتاب ''معاشرتی مسائل'' کے مقدمہ میں دے دیا ہے، بلکہ یہ پوری کتاب ہی اس سوال کا گویا علمی یا قلمی جواب ہے (تفصیل تو اس کتاب میں دیکھنی چاہئے) مختصر یہ کہ یہ کام نہایت ضروری اور بورڈ کے قیام کے بنیادی اغراض و مقاصد میں شامل رہا ہے کہ شرعی قوانین (بالخصوص وہ عائلی قوانین جنہیں سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے) کو اپنی اصل شکل میں ایسے اسلوب کے اندر جس میں موجودہ ذہنوں کی رعایت ہو پیش کیا جائے، تو منصف مزاج اور حقیقت پسند تمام لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی انشاءاللہ۔ بحمدللہ مذکورہ کتاب اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی اور اس کا ایک قرینہ ہے کہ مختصر عرصہ میں ہند و پاک کے اندر اس کے نصف درجن اڈیشن (جن میں تین چار اڈیشن ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں) کا شائع ہو جانا معلوم ہے (غیر معلوم کتنے ہیں ان کی تعداد اللہ علیم ہی جانتا ہے)۔

اس سوال کے دوسرے حصہ ''اسلامی قوانین کا ''یونیفارم سول کوڈ'' میں شامل کیا جانا'' کے بارے میں میرا جواب یہ ہے کہ اس کا یہاں مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں کیونکہ ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کا مسئلہ کسی ضرورت یا عملی تقاضہ کی بناء پر نہیں اٹھایا گیا بلکہ وہ درحقیقت اس متعصبانہ اور تنگدلانہ ذہنیت کی پیداوار ہے جو پورے ہندوستان کو ایک ہی رنگ (بھگوے رنگ) میں ڈوبا دیکھنا چاہتی ہے، اس محرک کے ہوتے ہوئے اکثریت کا اسلامی قوانین کو اپنانے کا خیال خوش فہمی یا ناواقفیت پر مبنی ہونے کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

س-مہاراشٹر اسمبلی میں ایک سے زائد شادی پر پابندی اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو چھ ماہ کی قید جیسے قوانین اور متبنی کے تعلق سے قوانین کے نفاذ کی جو بات کہی جارہی ہے، ان پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

ج:- جو ردعمل ہر حساس اور باحمیت مسلمان کا ہونا چاہئے، جس کا اظہار بہت سے لوگوں نے پریس و دیگر ذرائع ابلاغ سے کر بھی دیا ہے، وہی احقر کا بھی ہے، جسے مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مداخلت فی الدین اور آئین میں دلائی گئی یقین دہانیوں کی روح و منشاء کے سراسر خلاف ہے۔

س- بورڈ کے پیش نظر وہ کون سے نتائج وعواقب ہیں جو متبنی بل کے باعث پیدا ہوں گے؟

ج:-تقریباً دس سال پہلے یہ مسئلہ اس سے زیادہ پُر زور و پُر شور طریقہ سے اٹھایا جا چکا ہے، اس وقت اس کو اٹھانے والی خود مرکزی حکومت (کانگریس) تھی، اس وقت پرسنل لاء بورڈ نے اس کے خلاف دلائل و براہین کے ذریعہ حکومت کو قائل کر کے اس تجویز کو واپس لینے پر مجبور یا آمادہ کر دیا تھا، اس قانون (متبنی قانون) سے شریعت کے ایک نہیں بہت سے قوانین متاثر بلکہ مسخ ہو جائیں گے، مثلاً وراثت، محرمیت، حجاب، ولایت کے قوانین بالفاظ دیگر اس سے بہت سے حرام حلال اور حلال حرام ہو جائیں گے، ظاہر ہے کہ یہ اتنی سنگین بات اور شریعت میں ایسی مداخلت ہے جس کا حق کسی بھی انسان کو نہیں، حتی کہ علمائے مجتہدین اور اجماع امت کو بھی نہیں چہ جائے کہ غیر مسلموں کو۔

س- بورڈ کے کئے گئے سابقہ فیصلوں میں ایک اہم فیصلہ ''دارالقضاء'' کے قیام کا بھی تھا، اس پر پریس نے حسب توقع کافی واویلا بھی مچایا، اس سمت میں عملی طور پر کس حد تک کامیابی ہوئی، کیا آپ اعداد وشمار کی روشنی میں بتانا پسند فرمائیں گے کہ ملک کے طول وعرض میں کتنے دارالقضاء قائم ہیں اور ان میں کتنے مقدمات فیصل ہوئے؟

ج:- میرے پاس پورے ملک کے صحیح اعداد وشمار نہیں، البتہ جہاں جہاں دارالقضاء قائم ہوئے (ان میں لکھنؤ کا مرکزی دارالقضاء بھی ہے) وہاں بالعموم ان کا استقبال کیا گیا اور اسے پسندیدہ قدم قرار دیا گیا، اگرچہ علماء کے ایک حلقہ کو ایسے دارالقضاء کے قاضیوں کے اختیار فسخ نکاح میں فقہی و شرعی اشکالات بھی ہیں، جنہیں پوری طرح رفع نہیں کیا جا سکا

ہے، پھر جس درجہ کے علماء کی قاضی کے اہم منصب کے لئے ضرورت ہے ان کی کمی بھی اس راہ میں مانع بن رہی ہے، شاید انہی اسباب سے اتنے دارالقضاء ابھی تک قائم نہیں ہو سکے ہیں جتنی کہ ضرورت ہے، علاوہ ازیں دارالقضاء سے صادر شدہ بعض فیصلوں کو سرکاری عدالتوں میں چیلنج کیا جانا بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کا سامنا بعض قاضیوں کو کرنا پڑتا ہے، اس کے حل کی تدابیر بھی کی جانا ضروری ہیں۔

س- کیا بورڈ کا کوئی مرکزی دفتر بھی ہے جہاں سے اس پورے نظام پر قابو پایا جا سکے اور اگر ہے تو کیا وہ متحرک اور فعال ہے کیا ایسے افراد کی ٹیم بورڈ کے پاس موجود ہے جو خالصۃً بورڈ کے کاموں کی نگرانی کریں؟

ج- بورڈ کے قیام کی ابتداء سے ہی اس کے ''جنرل سکریٹری'' کی قیام گاہ ہی ''بورڈ کا مرکزی دفتر'' رہی ہے، چنانچہ آج بھی ایسا ہی ہے، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ''بورڈ'' کی اہمیت اور اس کے مقاصد کی گیرائی و گہرائی کو دیکھتے ہوئے دفتری عملہ ناکافی ہے، اور ایسے اہل افراد کار جو ہمہ وقت خدمات انجام دے سکیں بہت کم ایسے ہیں، اس کا ایک سبب مادی وسائل کی کمی بھی ہو سکتا ہے۔

س- پرسنل لا بورڈ کا جب قیام عمل میں آیا تھا تو عام مسلمانوں کو مختلف مکاتب فکر کے علماء کا اتحاد اور ان کے ساتھ دانشوروں کے اجتماع پر بڑی مسرت ہوئی تھی، اس لحاظ سے بورڈ کی آرزوؤں پر کس حد تک پورا اتر رہا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے کیا آثار ہیں؟

ج- فی الجملہ یہ صورت حال بورڈ کے قیام سے لے کر اب تک بحمد اللہ قائم ہے، جو امت کی موجودہ روش کو دیکھتے ہوئے (کہ قدم قدم اختلاف وٹکراؤ کی فضا ہے) بجائے خود اہم کامیابی ہے، مستقبل کا حال اللہ عالم الغیب کے سوا اور کسے معلوم ہو سکتا ہے، البتہ ہماری دعا یہی ہے کہ یہ صورت حال برقرار رہے۔

س- پرسنل لا بورڈ کی تشکیل غالباً ۱۹۷۲ء میں عمل میں آئی، آج اس کے قیام کو تقریباً ۲۳/ برس ہو رہے ہیں، ان ۲۳/ برسوں میں پرسنل لا بورڈ کو (جن مقاصد کے تحت وجود

میں آیا تھا) کس حد تک کامیابی ہوئی، دفاعی کوششوں کے علاوہ بورڈ کے پاس ایسا لائحہ عمل بھی ہے جسے اقدامی کہا جاسکے، اور ایسی ٹھوس کوششیں ہوسکیں جن سے ان مذموم کوششوں کا قلع قمع ممکن ہو؟

ج- بورڈ کے قیام (۱۹۷۳ء نہ کہ ۱۹۷۲ء) کے بعد اب تک کی کامیابیوں میں حکومتی سطح پر اہم بات منوانا، مثلاً متبنی بل قانون سے استثناء، نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں دفعہ کے اندر جزوی تبدیلی، پھر سپریم کورٹ کا فیصلہ آجانے کے بعد اس کی مدت کم یا ختم کرنے کے لئے بل لانا اور کورٹ میں منظور ہوجانا وغیرہ شامل ہیں۔

ایجابی کامیابیوں میں اسلام کے عائلی قانون پر ایسا لٹریچر وجود میں آجانا بھی ہے جس سے بڑی حد تک غلط فہمیاں دور ہوجائیں اور ہر منصف مزاج کے لئے اسلامی قوانین کا سب سے زیادہ بہتر ہونے کو تسلیم کرلینا آسان ہوجائے۔ اس بارے میں راقم الحروف کی مذکورہ کتاب (جو بورڈ کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اسی کی تحریک پر لکھی گئی تھی) کے علاوہ خود بورڈ کے سکریٹریٹ کی طرف سے متعدد چھوٹے بڑے کتابچے (متعدد زبانوں میں) شائع ہوئے اور دوسرے علماء اور وکلاء وفضلاء نے مضامین اور کتابچے لکھ کر شائع کئے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کوششوں کی افادیت کے باوجود ان سے "مسلم پرسنل لاء" کے خلاف ہونے والی مذموم کوششوں کا قلع قمع نہیں ہوسکا، غالباً یہاں ہو بھی نہیں سکتا کیوں کہ یہ کوششیں کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کم عناد پر زیادہ مبنی ہیں۔

س- جے پور اجلاس کے اہم فیصلوں میں ویمن سیل اور میڈیا واچ کمیٹی کا قیام تھا، اس سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی؟ کیا اس پر آپ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

ج:- میرے علم میں اس کی تفصیلات نہیں۔

س- فقہ اسلامی کی تدوین کے فیصلہ کے سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی؟

ج:- فقہ اسلامی کی تدوین بالفاظ صحیح "مسلم پرسنل لاء کے دائرہ میں آنے والے شرعی قوانین کی دفعہ وار تدوین" کا کام بحمد للہ مکمل ہوچکا ہے، جس پر راقم الحروف سمیت متعدد

علماء کی کئی سال تک محنت وصلاحیت خرچ ہوئی ہیں، اب اس کی اشاعت کا کام باقی ہے، جو کثیر اخراجات (تقریباً ڈھائی لاکھ روپئے) کا متقاضی ہے، نیز اس کے مختلف زبانوں خاص طور پر انگریزی میں ترجمہ کا اہم اور ضروری کام ہونا رہ گیا ہے۔

س- مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلم سماج اسلامی معاشرتی قوانین پر عمل پیرا ہوجائے، اس مقصد کے پیش نظر اصلاح معاشرہ کی مہم بھی چلائی گئی، اس کے سلسلہ میں کس حد تک کامیابی ہوئی، اور اسے مزید موثر بنانے کے لئے بورڈ کے سامنے کیا لائحہ عمل ہے؟

ج:- افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عملاً سب سے کم کامیابی (جو تقریباً نفی کے برابر ہے) اسی مقصد میں ہوئی بورڈ کے سامنے متعدد طریقے ہیں جن میں سے ایک "تحفظ شریعت ہفتہ" منانے جیسے اقدامات ہیں۔

س- نازک گھڑیوں میں بورڈ کی طرف ملت اسلامیہ ہند بڑی امید کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، بابری مسجد کی بازیابی کی کوششوں کے موقع پر مسلمانوں نے بڑی امیدیں وابستہ کیں، لیکن خود لیڈروں کی صفوں میں جو شرمناک انتشار ہوا، بابری مسجد کا المناک سانحہ پیش آیا اور پھر مسلمانوں پر فسادات کی صورت میں قیامت صغری ٹوٹ پڑی، ان سب مواقع پر بورڈ کی حکمت عملی اور سرگرمیاں کیا رہیں؟

ج:- بابری مسجد کا مسئلہ ابتداء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے دائرہ میں نہیں تھا، لیکن اس مسجد کے شہید کئے جانے کے معاً بعد مسلمانان ہند جس صورت حال سے دوچار ہوئے (کہ اس موضوع کو اٹھانے والی تحریکیں اور جماعتیں احساسِ شکست سے دوچار ہوکر میدان میں آنے سے کتراتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں اور مسلمانان ہند اپنے کو بے یارو مددگار خیال کررہے تھے) تو مجبوراً بورڈ نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا ممبر احقر بھی تھا، جو بورڈ کے مزاج اور طریقِ کار کے مطابق یعنی غیر جذباتی انداز میں (آج کی سیاسی تحریکوں کے طریقہ کے برخلاف) اقدامات کرے، چنانچہ فی

الجملہ اسی نہج پر کمیٹی نے کام کیا، اس نے قانونی لڑائی لڑنے پر دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں زیادہ توجہ دی، چنانچہ اس کے مثبت اثرات ظاہر ہوئے، مثلاً مسجد اور اس کے اطراف کی زمین کی ملکیت سے متعلق مقدمات جو پہلے سوخت کردئے گئے تھے، وہ بحال ہوگئے اور دفعہ ۱۴۳-اے کے تحت حکومت نے سپریم کورٹ سے رائے مانگنے کی جو درخواست کی تھی وہ خارج کردی گئی، اسے بورڈ کی (یا مسلمانوں کی) کامیابی کہا جاسکتا ہے، بلکہ واقف کار حلقوں نے یہی کہا بھی ہے۔

س- بابری مسجد کی شہادت کی بات چل پڑی ہے تو دو باتیں آپ سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے، جن کے سرے بورڈ سے ملتے ہیں، ایک تو یہ تاثر ہے کہ شاہ بانو کیس میں مسلمانوں کی تحریک کی کامیابی کے ردعمل میں مخالفین کی منہ بھرائی کے لئے مسجد کا تالا کھولا گیا، اس تاثر کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے اور اس تعلق سے دوسرا سوال یہ ہے کہ بابری مسجد کی بازیابی کے تعلق سے ایک عام مسلمان کوئی زیادہ پُر امید نہیں دکھائی پڑتا، اس حساس اور نازک مسئلہ میں مسلم لیڈروں کے جو بیانات آتے ہیں ان کی حیثیت فاتحہ خوانی سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی، اس کے متعلق ملت سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- پہلا تاثر بالکل غلط ہے اور بورڈ کے مخالفوں کی طرف سے پھیلایا گیا ہے، دوسرے تاثر کی فی الجملہ- بحالت موجودہ- حقیقت پسندی کہا جائے تو شاید بے جا نہیں ہوگا۔

س- ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے یہاں تک کہ عوام کا بھی یہ ذہن بن گیا ہے کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے، اس عوامی تاثر پر آپ عوام سے کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- اجتماعی قیادت (جو مسلم پرسنل لاء کی شکل میں مسلمانان ہند کو حاصل ہے) کو اگر قیادت کا نام دیا جائے تو یہ عوامی تاثر غلط ہے، ہاں اگر کسی شخص واحد کی قیادت کی نفی مراد ہو تو اس میں فی الجملہ صداقت کا پہلو ہے، یعنی اسے کلیۃً غلط نہیں کہا جاسکتا۔

س- ایک تاثر یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کے اکابرین وعمائدین کی پہلی صف تو موجود ہے مگر Second Line نہیں ہے، کیا اس میں واقعیت بھی ہے یا اسے محض ملت

کی یاسیت قرار دیا جائے اور اگر یہ امر واقعہ ہے تو اس کے لئے کیا کیا جانا چاہئے؟

ج:- ''پہلی صف'' کی موجودگی کا مطلب اگر ایسے دو ایک افراد (مثلاً حضرت مولانا علی میاں ندوی) کی موجودگی ہو، جن پر امت مسلمہ ہند کا معتد بہ درجہ میں اعتماد ہو (اور ایک دو فرد کو ہی ''صف'' کا نام دے دیا گیا ہو) تب تو پہلی صف کی موجودگی کی بات صحیح ہے، ورنہ اس کی صحت میں بھی کلام ہے، دوسری صف کی عدم موجودگی کی بات مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بحمد اللہ مختلف ملی میدانوں میں افراد کار لگے ہوئے ہیں اور مفید ثابت ہو رہے ہیں، جنہیں ''صف اول'' کے لائق اگر نہ بھی سمجھا جائے تو ''صف ثانی'' سے بھی انہیں باہر کھڑا ہوا سمجھنا شاید ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

س- مسلم پرسنل لاء ہی نہیں بلکہ اسلام پر اعتراضات کے لئے میڈیا جس انداز سے سرگرم عمل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اس لحاظ سے بورڈ کے پاس کوئی ٹھوس لائحہ عمل ہے، جس سے منظم مہم شروع کی جاسکے، اس کے لئے آپ کے اپنے پاس کیا خاکہ ہے؟

ج- بورڈ نے اپنے قیام کے ابتدائی دور میں ہی اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس میں علماء، وکلاء فضلاء مبصرین اور صحافی حضرات شامل تھے، لیکن افراد کار کو وقت نہ مل سکنے کی بناء پر اس مقصد میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، وہی کمیٹی- یا اسی طرح کی دوسری کمیٹی- ضرورت کے مطابق اوقات لگا کر کام کرے تو اس میں کامیابی کی خدا سے امید ہے۔

س- تحفظ شریعت ہفتہ منانے کا جو آغاز کیا گیا ہے اس میں کامیابی کے تعلق سے آپ کس حد تک پر امید ہیں، اس سے بورڈ کے قیام کے مقاصد کو کس حد تک تقویت ملے گی؟

ج- اصل مسئلہ نقشہ کار کا نہیں افراد کار کا ہے، اگر وہ میسر آجائیں تو انشاء اللہ کامیابی قدم چومے گی، اور پھر اس سے بورڈ کے مقاصد کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوگی، کیونکہ ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منانے کے لئے جو نقشہ کار مرتب کیا گیا ہے ان میں بہت سی باتیں بورڈ کے مقاصد میں شامل ہیں۔

(بانگ درا، لکھنؤ، نومبر ۱۹۹۵ء)

مسلم پرسنل لاء سے متعلق مرتب دفعہ وار کتاب

مجموعۂ قوانین اسلامی

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی سے ایک اہم گفتگو

شاہ بانو کیس ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے، مسلم پرسنل لا کے خلاف عدالت کے فیصلہ نے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا اور ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ایک ایسا مجموعۂ قوانین اسلامی ہو جو جج کے سامنے ہو اور ایک ریفرنس بک ہو، جس کو فیصلہ کے وقت سامنے رکھا جا سکے، اسی ضرورت کے تحت مجموعہ قوانین اسلامی کو مرتب کیا گیا تاکہ دارالقضاء و دارالافتاء بھی اس سے استفادہ کریں، پیش ہے مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کا انٹرویو جو اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالے گا۔

سوال: وہ کون سے عوامل ومحرکات تھے جو ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' نامی کتاب کی تدوین کا باعث بنے؟ مسلم پرسنل لاء سے متعلق ایسے مجموعۂ قوانین کی ضرورت کیوں کر محسوس کی گئی اور اس کتاب کی تدوین کے اصل محرک کون تھے؟

جواب: اس ضرورت کا احساس تو غالباً بہت پہلے سے تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب مسلم اپلیکیشن ایکٹ (مسلم پرسنل لاء ایکٹ) پاس ہوا تو اسی زمانہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لیکن چونکہ یہ کام بہت مشکل بھی تھا اور نازک بھی، غالباً اسی لئے ایسے منظم طریقہ سے اب تک نہیں ہو سکا تھا۔ خاص طور سے اگر چہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں (اس انداز میں تو نہیں) لیکن دوسرے انداز میں بہت کام کیا۔ جس وقت مسلم

پرسنل لاء کو قانونی حیثیت دی گئی تو یہ علماء کی بیدار مغزی تھی کہ اسی وقت یہ بات اصولی طور پر تسلیم کرالی گئی تھی کہ فیصلے شریعت کے مطابق ہوں گے اس میں جو کتاب بھی معتبر ہو وہ قابل استدلال ہو سکتی ہے (فقہ کی چند کتابوں کا ذکر بطور مثال تھا نہ کہ بطور حصر) لیکن شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں (۱۹۸۵ء کے اندر) ہندوستانی مسلمانوں کو ایک عجیب طرح کی صورت حال سے سابقہ پڑا اور وہ یہ کہ جج نے ایک غیر اسلامی فیصلہ اسلام کے نام پر کیا یعنی مطلقہ عورت کے لئے طلاق کے بعد تاعمر یا تا نکاح ثانی نفقہ لازم کیا اور اس کے لئے استدلال قرآن مجید کی آیت (للمطلقات متاع بالمعروف) کے لفظ ''متاع'' سے کیا اس طرح گویا جج نے مفسر کا کام انجام دیا، یہ ایک نہایت خطرناک بات تھی جس کا علماء پر غیر معمولی ردعمل ہوا اور وہ بہت فکرمند ہوئے کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ اگر اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کیا گیا اور یہ برقرار رہا تو ہر آیت قرآنی وحدیث کی تشریح ہر جج کر سکے گا، نماز کی تشریح، روزہ کی تشریح، مثلاً صوم کے معنی لغت میں امساک یعنی رک جانے کے آتے ہی ہیں، وہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد ''مون برت'' ہے یعنی نہ بولنا، زکوٰۃ کے معنی بڑھنے کے ہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد ''درخت اگاؤ'' مہم ہے......تو ہم انہیں اس قسم کی تشریح سے روک نہیں سکیں گے، اصل بات، جو بے چین کر دینے والی تھی، وہ یہی تھی، ان دنوں جب یہ تحریک چل رہی تھی اور حکومت سے مسلم پرسنل لاء کے ذمہ داروں کی گفتگو چل رہی تھی اس وقت اس ضرورت کا احساس شدید ہوا کہ اصلاً ججوں کو غلط فیصلہ کرنے کی گنجائش اس لئے ملتی ہے کہ ان کے سامنے کوئی منضبط قانون، مسلم پرسنل لا سے متعلق نہیں ہے۔ اگر معتبر طریقہ سے منضبط طور پر دفعہ وار قانون مرتب کر دیا جائے اور اسے کتابی شکل دے دی جائے تو پھر ججوں کو اس قسم کی غلط تشریح کا موقع نہیں ملے گا بشرطیکہ بدنیتی نہ ہو۔ اگر بدنیتی کا معاملہ ہے تو پھر مسئلہ کا کوئی حل نکالنا مشکل ہے لیکن اگر جج حق پسند ہے تو اس کے لئے گنجائش کم رہ جائے گی، اسی وقت تدوین قوانین اسلامی کا احساس شدت سے پیدا ہوا چنانچہ بورڈ کے اس وقت کے بیدار مغز جنرل سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ اور موقر صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس طرف توجہ فرمائی۔ فکرہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا

تھا اور تائید حضرت مولانا علی میاںؒ کی تھی کہ قانون اسلامی کا اس طرح کا کوئی مجموعہ تیار ہوجانا چاہئے۔ ایک بات اور عرض کردوں کہ خوش قسمتی سے مجھے بھی اس تحریک (شاہ بانو کے مقدمہ کے بعد چلنے والی تحریک) میں عملی طور سے شرکت کا موقع ملا ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک (یہاں تک کہ کشمیر بھی اس میں شامل تھا) اکثر حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے ساتھ اس سلسلہ میں میرا بھی جانا ہوا۔ شاہ بانو کیس کے پس منظر میں عوام تو اسے محض نفقہ مطلقہ سے متعلق تحریک سمجھ رہے تھے لیکن بیدار مغز علماء کے لئے اصل محرک وہی تھا جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا۔

سوال: ابتدائی مرحلہ میں ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی تیاری کے لئے کون سے عملی اقدامات کئے گئے، کون مؤقر علماء کرام اس اہم نازک علمی کام میں شریک رہے اور کیا جو ابتدائی خاکہ اس مجموعہ کے لئے تیار ہوا تھا، موجودہ کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' ان ہی خطوط پر تیار ہوئی؟ مؤقر صدر بورڈ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے رسم اجراء کی تقریب میں اس کتاب کو فتاویٰ عالمگیری سے مشابہ قرار دیا ہے فتاویٰ عالمگیری سے ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' نامی یہ کتاب کس معنی میں مشابہ ہے؟

جواب: جہاں تک کتاب کی ترتیب کا سوال ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا محرک تو وہ بات بنی جسکا تذکرہ آچکا ہے اس کی عملی شکل یہ ہوئی کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے پہلے تو کچھ افراد کو ذہن میں رکھا، سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب کو مونگیر بلایا تاکہ وہ ایک ابتدائی خاکہ تیار کردیں وقتاً فوقتاً مولانا رحمانیؒ اسی زمانہ میں مجھے بھی یاد فرماتے رہے، بالکل شروع میں ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ ہوائی جہاز سے پٹنہ اور وہاں سے مونگیر لے گئے تو جو ابتدائی خاکہ تیار ہوا تھا، اسے مجھے بھی دکھایا، میں نے اس وقت کچھ مشورے دیے، یہاں یہ بات بیان کرنا مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کام میں اس زمانہ کے جامعہ رحمانی کے مفتی نعمت اللہ صاحب کی محنتوں کو بھی بڑا دخل ہے، مفتی کی حیثیت سے اس موضوع اور اس کی جزئیات پر ان کا مطالبہ بڑا وسیع اور گہرا پایا، تو جب مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب اور مفتی نعمت اللہ صاحب کی

کوششوں سے ابتدائی خاکہ تیار ہوگیا، جس کے لئے وقتاً فوقتاً میرا بھی وہاں جانا ہوتا رہا تو اسکے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ کمیٹی اس ابتدائی خاکہ پر نظر ثانی کرے۔ اس کمیٹی میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب موصوف، دارالعلوم دیوبند وقف سے مولانا مفتی احمد علی صاحب مرحوم کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے میرا نام شامل تھا، مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب، ان کے علاوہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا نام بھی اس کمیٹی کے ممبران میں شامل تھا مگر مولانا نے چند میٹنگوں میں ہی شرکت فرمائی، پہلے تو اپنی مصروفیات کی وجہ سے اور بعد میں اپنی خرابی صحت کے باعث شرکت کا موقع انہیں بہت زیادہ نہیں مل پایا، راقم کو اس سلسلہ میں مونگیر اور پٹنہ میں کوئی آٹھ دس بار مقیم رہنا پڑا (کبھی کبھی ایک ہفتہ کبھی کم وبیش) لیکن وہ جو ابتدائی خاکہ تیار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں مجھے یہ بتا دینے میں تامل نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہے کہ اس ابتدائی مسودہ کا شاید کوئی ایک صفحہ بھی بعینہٖ باقی نہیں رہا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ یکجا دو چار سطریں بعینہٖ نہ رہ پائی ہوں اس کمیٹی کی محنت اور بحث مباحثہ کے نتیجہ میں ایک بالکل نئی چیز تیار ہوئی ہے اس لئے یہ کہنا کہ یہ کتاب جو منظر عام پر آئی ہے، اس ابتدائی خاکہ کا ہی چربہ ہے اور اس مسودہ کی تصویب ہے (جیسا کہ بعض اخبارات کی رپورٹنگ میں یہ بات آئی ہے) حقیقت سے عدم واقفیت کی بات ہے۔ ابتدائی مسودہ کی اصل شکل باقی نہیں رہ گئی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری سے یہ کتاب اس معنی میں مشابہ ہے کہ عالمگیری کو علماء کی ایک جماعت نے تیار کیا تھا اگر چہ ان علماء کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ اورنگ زیبؒ جیسے فقیہ اور فقیر منش بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی جس کا وجود مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی خوش نصیبی تھی اس کے بعد شاید نظر لگ گئی (مولانا گیلانی کے الفاظ میں) ایسا فقیہ بادشاہ جو روزانہ کے کاموں کو خود دیکھتا اور سنتا تھا اور اس میں ترمیم یا تصویب کی ضرورت پیش آتی تو وہ بھی کرتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کے بعد ایسی اجتماعی کوشش عائلی قوانین مرتب کرنے کے لئے نہیں ہوئی۔ تو موجودہ کتاب ''مجموعہ قوانین اسلامی'' علماء کی اجتماعی کوشش کے لحاظ سے فتاویٰ عالمگیری سے مشابہ ہے۔ لیکن دوسرے پہلوؤں، اور

نوعیت کے لحاظ سے بھی بہت فرق ہے، مثلاً عالمگیری پوری شریعت کے مسائل پر حاوی ہے اوراس کی ضخامت اس سے کوئی پچاس گناہ زیادہ ہے، اس کی تیاری میں علماء گرانقدر معاوضہ پاتے تھے اور مستقل اسی کام میں لگے رہتے تھے جب کہ مجموعۂ قوانین اسلامی نامی اس کتاب (جو صرف عائلی قوانین پر مشتمل ہے) کی تیاری میں شریک علماء نے یہ کام (دوسری اپنی اپنی مستقل مشغولیتوں کے ساتھ) رضا کارانہ طور پر ثواب کی نیت سے لوجہ اللہ کیا، مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی اصابت رائے کی یہ دلیل ہے کہ انہوں نے ہندوستان بھر سے منتخب علماء کو یہ کام تفویض کیا، یہ بات ان کی مردم شناسی اور فراست کو ظاہر کرتی ہے، وہ خود بھی ایک اچھے فقیہہ تھے اور اس کام کی انہوں نے سرپرستی بھی فرمائی اور بحثوں میں حصہ بھی لیا، لیکن بہرحال عالمگیر جیسی عظیم شخصیت کی بات دیگر تھی۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے انتقال کے بعد، ان کے صاحبزادے مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کے اہتمام میں تدوین کا کام جاری رہا اور اس کی بحثوں میں مولانا نے بھی حصہ لیا۔

سوال: مسلم پرسنل لاء سے متعلق مسائل پر کتابیں اور فتاویٰ موجود ہیں اس صورت میں کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کس لحاظ سے منفرد وممتاز ہے اور کن خصوصیات کی حامل ہے؟ اس کی افادیت ومقبولیت کے لحاظ سے ذمہ داران بورڈ اور آنجناب کس حد تک پرامید ہیں؟

جواب:۔ خدا کی ذات سے بہت امید ہے مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ سے متعلق ہندوستانی زبان میں (بلکہ غالباً کسی اور غیر عربی زبان میں بھی) اس قدر مرتب ودفعہ وار کتاب اب تک موجود نہیں تھی اگرچہ اس موضوع پر بہت سے معتبر لوگوں کی کتابیں موجود ہیں لیکن وہ انفرادی کوششیں ہیں پھر ان کتابوں میں اس ترتیب وضرورت کا لحاظ نہیں ہے جو عصری تقاضوں کو پورا کرے اور ایک عام قاری کے لئے نہیں، قانون دانوں کے لئے بھی سہولت واطمینان کا باعث بن سکے۔ موجودہ کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' میں ہر (متعلقہ موضوع سے متعلق) شرعی حکم دفعہ وار درج ہے اور ہر دفعہ کا نمبر دیا ہوا ہے جب کہ اس

موضوع پر دوسری کتابوں میں ایسا نہیں بلکہ دفعہ کے بجائے عموماً لفظ ''مسئلہ'' درج ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو ان میں باب کی ایسی تقسیم ہے اور نہ ہی عنوانات بعض کتابوں میں اتنے مفصل قائم کئے گئے ہیں بلکہ سلسلہ وار ایک کے بعد دوسری بات بیان کردی گئی ہے۔

موجودہ کتاب میں دفعہ کے تحت مسائل قانونی زبان میں بڑے احتیاط سے آگئے ہیں، ایسا اہتمام، سابقہ کتابوں میں بالعموم نہیں پایا جاتا پھر یہ کہ ہر مسئلہ کی دلیل وار اس کتاب کا حوالہ بھی اس کے حاشیہ پر دے دیا گیا ہے کتاب وسنت کے علاوہ اس کتاب میں ۴۰ سے زیادہ معتبر فقہی واصول فقہ کی کتابوں کے حوالہ جات دئے گئے ہیں۔

سوال: اخبارات کی رپورٹنگ سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعۂ قوانین اسلامی نامی کتاب میں فقہ حنفی کا لحاظ رکھا گیا ہے ایسے حالات میں جب کہ بدقسمتی سے مسلکی اختلافات کو بآسانی مخالفت کا رنگ دے دیا جاتا ہے، کیا یہ کتاب سب کے لئے قابل قبول ہوگی یا یہ کہ اس امر کا لحاظ کتاب کی ترتیب وتدوین میں رکھا گیا ہے؟

جواب: یہ بات اپنے اندر جزوی صداقت رکھتی ہے کہ اسے فقہ حنفی ہی کی کتاب کہا جائے، یہ مانا کہ اس کے اندر مسائل فقہ حنفی ہی کے زیادہ ذکر کئے گئے ہیں اور حوالے بھی اکثر فقہ حنفی ہی کی کتابوں سے زیادہ دئے گئے ہیں لیکن اس میں ایسے مسائل بھی شامل ہیں جو فقہ حنفی کی رو سے نہیں ملتی تھی جتنی کہ دوسرے کسی مسلک میں، اس لئے دوسرے مسلک سے بعض مسائل کا حل لیا گیا ہے، چنانچہ امام مالک کے مسلک سے متعدد مسئلے لئے گئے ہیں مثلاً مفقود الخبر کی بیوی کے مسئلہ کا حل، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی ایسا کیا گیا ہے اس لئے یہ بات کہ اس میں فقہ حنفی کا لحاظ ہے کلی طور پر صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان، جہاں اسی فیصد سے زیادہ حنفی مسلمان بستے ہوں، تو ظاہر ہے کہ مقدمات بھی اسی تناسب سے عدالتوں میں آئیں گے۔ اس کے علاوہ شاید آپ کے علم میں یہ بات ہوگی (اوپر بھی مختصراً تذکرہ آچکا ہے) کہ جب یہ قانون بنا تو اس میں اس کی گنجائش رکھی گئی کہ اگر فریقین کسی اور (غیر حنفی) مسلک کے ماننے والے ہوں تو عدالتی فیصلے میں فریقین کے مسلک کی رعایت کی جائے گی۔

سوال: بورڈ نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کروا کر اس کتاب کی افادیت ونافعیت کا دائرہ کار وسیع کردیا ہے بلکہ غالباً اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے پس پشت مقاصد میں سے اہم ترین مقصد قانون داں حلقوں کے ہاتھوں تک ایک معتبر ومستند مجموعۂ قوانین اسلامی پہنچانا تھا جو ریفرنس بک کا کام دے سکے اس لحاظ سے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی اہمیت اورنزاکت دونوں بڑھ جاتی ہے، چنانچہ اس کے انگریزی ترجمہ سے متعلق آنجناب کس حدتک مطمئن ہیں؟

جواب: چونکہ میں انگریزی زبان سے زیادہ واقف نہیں ہوں اس لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کس حدتک معتبر ہے البتہ یہ معلوم ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر طاہر محمود صاحب نے کیا ہے، میں ان کی ذات سے واقف ہوں، تقریباً ۲۵ برسوں سے میرے ان سے شخصی طور پر روابط ہیں وہ انگریزی اوراردو دونوں میں قانونی تعبیر کو سمجھنے اور قانونی زبان لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں دسترس حاصل ہے، ہندوستان میں ایسی شخصیتیں کمیاب ہیں جو بیک وقت اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتی ہوں کہ علماء کی اردو زبان بھی سمجھ لیتی ہوں اور قانونی احتیاط کو برتتے ہوئے اسے انگریزی میں لکھنے اور پیش کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہوں۔

ایسی شخصیتوں کی جو مختصر سی مختصر فہرست بن سکتی ہو تو اس فہرست میں ایک نام ڈاکٹر طاہر محمود کا بھی یقیناً شامل کیا جائے گا، اس وجہ سے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کے تعلق سے اطمینان ہے۔ رسم اجراء کے موقع پر بھی ایسے لوگوں نے جو انگریزی اور قانونی زبان سے واقف ہیں اور جنہوں نے اس کتاب پر جزوی یا کلی طور پر نگاہ ڈالی تھی انہوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ سپریم کورٹ کے اک ریٹائرڈ جج صاحب سے میری گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جہاں تک اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا تعلق ہے تو اس میں بات صحیح کہی گئی ہے اوراس کتاب کو قانونی حوالہ کے طور پر پیش کرنا غلط نہیں ہوگا۔

سوال: رسم اجراء کی رپورٹنگ میں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ اس کتاب کو مدارس میں شامل نصاب کئے جانے کی تجویز ہے، جناب والا کا تدریس سے بھی دیرینہ وگہرا تعلق

ہے اس کتاب کو شامل نصاب کئے جانے سے متعلق آپ کی رائے؟

جواب: اصل میں نصاب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اس لئے میرے نزدیک اسے شامل نصاب کئے جانے کی بات بہت زیادہ مناسب نہیں ہوگی، نصاب کی کتابوں کا ایک خاص نہج ہوتا ہے البتہ اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کی جاسکتی ہے وہ بھی کسی ماہر فن استاد کی رہنمائی میں مطالعہ ہو۔

سوال: اس کتاب کی اشاعت یا اس سے متعلق کوئی ایسی بات جو جناب والا کہنا چاہتے ہوں؟

جواب: ایک بات جو بار بار ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو قانونی حلقوں تک پہنچانے کی جس قدر ممکن ہو کوشش کی جائے وکلاء، ججوں، قانون دانوں تک زیادہ سے زیادہ اس کتاب کو پہنچایا جانا چاہئے۔ مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں میں اس کتاب کی اشاعت میرے نزدیک زیادہ اہمیت اور افادیت کی حامل ہوگی۔ اس کتاب کا اصل مقصد بھی یہی ہے البتہ عام مسلمانوں اور خاص طور پر طلباء کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، ہر ایک کے لئے اس کا مطالعہ ظاہر ہے کہ نفع سے خالی نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں کے پاس ان مسائل سے واقفیت کے لیے پہلے سے بہت سی کتابیں موجود ہیں، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے ممتاز علماء کے فتاویٰ موجود ہیں لیکن خالص قانونی زبان میں میرے علم میں صرف عائلی مسائل پر اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب کم از کم اردو میں موجود نہیں تھی، جسے ایسے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہو اور جس کی تیاری میں متعدد علماء نے اس قدر محنت کی ہو۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اس کتاب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (سابق صدر بورڈ) کا ایک بہت مفصل، مقدمہ، شامل ہے، جس میں بورڈ کے قیام کا پس منظر، مسلم پرسنل لاء کی حقیقت نیز اس کتاب کی تدوین کے پس منظر سے متعلق، اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سی قیمتی ومفید معلومات ہیں کتاب کے شروع میں ایک مختصر سا ''پیش لفظ'' بورڈ کے موجودہ صدر، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کے قلم سے بھی شامل ہے۔

(بانگ حراء لکھنؤ)

قوت اور طاقت میں آواز ہے!

نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب سے ایک ملاقات

قول وفعل کا تضاد وہ روگ ہے جس نے وعظ ونصیحت کی اثر پذیری کو زائل کردیا ہے، اس لئے راقم آثم سا ایک عام مسلمان جب کسی ایسے مقرر کو سنتا ہے جس کو قدرت نے جوہر خطابت سے متصف کیا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس مقرر کی اسٹیج کی دنیا اور عمل کی دنیا میں کس قدر مطابقت ہے۔ راقم الحروف کے لئے ڈاکٹر کلب صادق صاحب کو پہلی مرتبہ سننے کا اتفاق یکم دسمبر ۱۹۹۵ء کو ہوا، جب مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منایا جارہا تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف کے جمعہ کے خطبہ کا عنوان ہی مسلم پرسنل لاء اور اصلاح معاشرہ تھا، اگرچہ پرسنل لاء کے موضوع کے لحاظ سے اس میں حکومت کے لئے للکار بھی تھی اور اصلاح معاشرہ کے عنوان سے مسلم معاشرہ میں پائے جانے والے امراض پر چوٹ بھی، لیکن زبان اس قدر شستہ تھی گویا کوثر وتسنیم میں دُھلی ہو اور انداز اس قدر شائستہ کہ بات دل میں اترتی چلی جائے۔ لیکن اس شستگی اور شائستگی کی بدولت پیدا ہونے والی کیفیت راقم سطور کے لئے یادوں کی امانت نہ بن پاتی اگر اس کے کانوں نے خطیب کی زبان سے اسلامی احکامات کے لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود کو پابند سمجھنے اور اپنے اور اپنے خاندان کی حد تک اس پر سختی کے ساتھ عمل درآمد

کرنے کے اعلانات نہ سنے ہوتے۔

ایک دوسرے موقع پر اقلیتی تعلیمی کانفرنس میں ڈاکٹر موصوف کو سُنا، حاصل یہ تھا کہ مسلمانوں کے مسائل کی ڈور بُری طرح اُلجھ گئی ہے، اس ڈور کو سلجھانے کے لئے سِرا تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ سِرا تعلیم ہے، تعلیم کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے اس حسنِ بیان نے متاثر تو کیا ہی لیکن لکھنؤ اور علیگڑھ میں اُن کی سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی اداروں کی حُسنِ کارکردگی کا بھی جب علم ہوا تو دِل نے پکارا کہ یہ ایک عملی انسان ہیں۔

پھر گنّا سنستھان لکھنؤ میں اپنوں کا نہیں، بیگانوں کا ایک جلسہ ہوا اور بیگانوں میں بھی وہ جو اپنے کٹر پنتھی ہونے کے باعث بیگانوں میں بھی یگانہ ہیں، اس جلسہ میں سابق وزیر اعظم اٹل جی کی تقریر اسلام سے متعلق غلط فہمیوں اور مسلمانوں سے متعلق بدگمانیوں پر مبنی تھی، لیکن ان کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تقریر اور سامعین کے سوالات کے جوابات نے رخ ہی پلٹ دیا اور جلسہ کے اختتام پر سامعین نے اعتراف کیا کہ آج ان کی آنکھیں کھلیں، وہ اب تک اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے نہایت غلط فہمیوں کا شکار تھے۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب کا زبان و بیان پر عبور قابلِ ذکر بھی ہے اور قابل قدر بھی، جس کی بدولت زمانہ انہیں شوق سے سنتا اور مجمع ان کے لئے گوش برآواز رہتا ہے، لیکن جس امر نے ان کی شخصیت کو قابل رشک بنادیا ہے وہ ہے ان کا جذبۂ عمل، ملک و بیرون ملک کے طول وعرض میں تعلیمی و رفاہی ادارے ان کے اسی جذبۂ عمل کے مظہر ہیں۔ راقم سطور ان کی جوہر خطابت کا قائل تھا ہی، ان کے اس جذبۂ عمل نے اسے ان کی طرف مائل بھی کیا اور جی چاہا کہ ملت کے مسائل پر ان کے افکار وآراء سے آگہی حاصل کی جائے۔ یہ طلب شاید

طلبِ صادق تھی، چنانچہ ڈاکٹر فخرالحسن رضوی کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں حاضری ہوئی اور شدید مصروفیت کے باوجود موصوف نے انٹرویو کے لئے وقت عنایت فرمایا، جو ان کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین کرتے ہوئے ہمیں مسرّت ہورہی ہے۔

س:- جناب والا کے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اتحادِ ملت کے لئے وہ کون سی ٹھوس بنیادیں اور وہ کون سے واضح خطوط ہوسکتے ہیں جو ممکن العمل بھی ہوں اور جن کی بدولت ملت کا اتحاد پائیدار ثابت ہوسکے۔

ج:- جوابات سے تو مسائل پر انسان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہی ہے خود سوالات بھی سائل کی بصیرت اور مسائل پر گرفت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، آپ نے سوالات کا جو خاکہ میرے سامنے رکھا ہے اس سے ماشاءاللہ خود آپ کی اسلامی بصیرت اور مسائل پر گرفت کا اندازہ ہورہا ہے، ان میں کچھ سوالات تو ایسے ہیں جو حقیقتاً کسی تحقیقی مقالہ کا بہترین عنوان قرار پاسکتے ہیں۔

اتحادِ ملت سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ سوال عالمی تناظر میں ہے یا صرف برصغیر کی صورتحال سے متعلق ہے، عالمی پیمانہ پر صورتحال یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی زبردست اکثریت ایک امت کی شکل میں رہنا چاہتی ہے، لیکن وہاں کے سربراہ بالکل ہی دنیا پرست و دنیادار ہیں اور اسلام کے بجائے ان کی وفاداریاں یا تو دوسری طاقتوں سے ہیں یا دوسرے نظریات سے ہیں، ایسے افراد کے ہوتے ہوئے مسلمان حکومتوں کا ایک متحدہ بلاک بنانا ذرا مشکل ہی نظر آتا ہے۔

جہاں تک برصغیر ہندوپاک کا سوال ہے تو اس علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں کے اکثر وبیشتر اختلافات دین کی اساس اور بنیادی مسائل پر نہیں ہیں، یہ بنیادی عقائد اس قدر محکم ومتفق ہیں اور قرآن کریم اور سنت متواترہ میں تو ان کو اسقدر واضح طور پر بیان کردیا گیا ہے کہ سوائے جہّال اور بالکل ہی بے بصیرت افراد کے ان عقائد میں کوئی اختلاف پیدا کر

ہی نہیں سکتا، اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہوجائیگا کہ زیادہ تر اختلاف ان امور پر ہوتا ہے جن میں یا تو اسلام کا شائبہ نہیں ہوتا یا پھر ان کی ضمنی حیثیت ہوتی ہے، یہ مسئلہ کئی پہلوؤں پر محیط ہے، جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے تو یہاں تو مسلمانوں میں اختلاف مسلکی بھی ہے، برادریوں کا بھی ہے، سیاست کا بھی ہے، جہاں تک فرقہ وارانہ اختلافات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اگرچہ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ شیعوں اور سنیوں میں اختلاف ہے، لیکن جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، میں نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے کہ اللہ کے فضل سے شیعوں اور سنیوں میں اتنا زیادہ اختلاف نہیں ہے جتنا خود اکثریتی فرقہ کے دوگروہوں میں جن کا میں نام لینا نہیں چاہتا، اختلاف بلکہ دشمنی پائی جاتی ہے، یہ نہایت تشویش کی بات ہے، چنانچہ جتنی بھی ہندوستان گیر تنظیمیں ہیں، ان میں شیعہ تو شریک ہوتے ہیں، لیکن اکثریتی فرقہ کے ایک طبقہ کو دوسرے کے ساتھ شامل کرنا بہت ہی مشکل ہوجاتا ہے اور بہت سی دشواریاں سامنے آتی ہیں، بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ جہاں انسان آتا ہے وہاں اختلاف پیدا ہوتا ہے اور جہاں اللہ آتا ہے وہاں پر اتحاد پیدا ہوجاتا ہے، تو دین اصل میں بنایا ہوا ہے اللہ کا اور فرقے بنائے ہوئے ہیں انسانوں کے، تو دین کے جو بنیادی اصول ہیں یعنی اللہ کی وحدانیت مطلقہ اور نبوت اور معاد، ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، لہٰذا ان ہی بنیادوں پر ملت کو متحد ہوجانا چاہئے، کوئی بھی فرقہ یا گروہ جو ان تین عقیدوں کو ماننے والا اور تسلیم کرنے والا ہو اسے دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنا چاہئے، اور مسلکی اختلاف کو ضمنی حیثیت دینا چاہیے، اسی کے ساتھ برادریوں کے بھی اختلافات ہیں، یہ ابھی تو ہمارے سامنے بھرپور طریقہ پر نہیں آرہے ہیں، لیکن ان اختلافات سے فائدہ اٹھانے والے عناصر موجود ہیں جو ان اختلافات کو ہوادے رہے ہیں، لہٰذا ان برادریوں کے جو اختلافات یا پیشوں کے اعتبار سے اختلافات ہیں، اسلامی فکر سے دور ہونے کی وجہ سے بعض پیشوں سے متعلق افراد کو عام مسلمان نیچ اور پست تصور کرتے ہیں، قبل اس کے کہ یہ ناہمواریاں سنگین اور Serious ہوجائیں انہیں ختم کرنے کی فکر کرنا چاہئے۔

اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو تین خاص باتیں ہیں جن کی بنیاد پر قرآن کریم میں انسان کو انسان پر فضیلت دی گئی ہے، ورنہ بقیہ لحاظ سے انسان برابر ہیں، ان تین باتوں میں ایک تقوی ہے، ایک علم ہے اور ایک جہاد ہے، یہ چیزیں وہ ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت دیتی ہیں، باقی اس کے علاوہ نسل ہو یا پیشہ ہو یا رنگ ہو، ان سب کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے، اگر ہم قرآن کے ان اصولوں پر عمل کریں تو مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ملت میں بہت حد تک اتحاد قائم ہو جائے گا، اسی کے ساتھ ایک گذارش یہ ہے کہ الحمد للہ ہندوستان میں اتنے اختلافات نہیں ہیں لیکن پاکستان کی صورتحال بڑی تشویشناک ہے، وہاں تو ہر قسم کے اختلاف ہیں، فرقہ وارانہ اختلاف ہے، لسانی اختلاف ہے، صوبائی اختلاف ہے اور پھر لوگ اختلافات میں اسقدر متشدد ہیں کہ ان کی وجہ سے اسلام کی تصویر بہت زیادہ بدنما ہو رہی ہے، اس کی طرف ہمیں خاص توجہ کرنا چاہئے، میں پاکستان کے مسلسل سفروں سے اس بات کا تجربہ رکھتا ہوں کہ وہاں بھی صرف Initiative لینے کی ضرورت ہے، کراچی میں جیسا کہ آپ کو اطلاع ہوگی کہ اب سے دو تین سال پہلے تک شیعہ سنی فسادات ہوتے رہتے تھے، لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے، میں نے وہاں کے ممتاز سنی علماء جسٹس تقی عثمانی صاحب، مولانا رفیع عثمانی صاحب، مولانا سید محمد بنوری صاحب وغیرہم سے فریاد کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس کو روکئے مجھے بہت خوشی ہے کہ یہ حضرات ایک چٹان بنکر کھڑے ہو گئے اور اس کی وجہ سے الحمد للہ کم سے کم کراچی کی حد تک فرقہ وارانہ فسادات ختم ہو گئے اور سازگار فضا پیدا ہو گئی، کچھ عرصہ پہلے جب میں کراچی گیا تھا، تو وہاں لاہور سے ایک اسکالر تشریف لائے ہوئے تھے، واقعی اسکالر ہیں وہ اس میں کوئی شک نہیں، ڈاکٹر غلام مرتضی ملک صاحب، انہوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں اور مدینہ یونیورسٹی میں طویل عرصہ تک استاد رہے ہیں، میں نے اُن سے کہا کہ کراچی کا مسئلہ تو الحمد للہ حل ہو گیا، اب آپ اگر تعاون کرنے کو تیار ہوں تو ہم آپ مل کر پنجاب میں مسئلہ کا حل دیکھیں، تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے خلوص اور فراخدلی

سے فرمایا کہ وہ اس سلسلہ میں پورا پورا تعاون کرنے کو تیار ہیں، میں کوشش کر رہا ہوں کہ انشاء اللہ ہم لوگ موقع نکال کر پنجاب کا دورہ کریں اور وہاں کے حالات کو بھی درست کرنے کی کوشش کریں۔

س:- ملت کی تعمیر کی صدا ہر پلیٹ فارم سے سنائی دیتی ہے، آپ کے نزدیک اس کے لئے رہنما خطوط کیا ہو سکتے ہیں اور ان میں سے جناب والا کی ترجیحات کون سی ہیں؟

ج:- اس سلسلہ میں مجھے جو بات مختصر عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ انسان بنا ہے جسم اور روح سے اور اسی جسم اور روح کے کمال کا نام ہے اسلام، حدیث میں وارد ہوا ہے کہ علم دو قسم کے ہیں، علم الادیان اور علم الابدان، وہ تمام مادی چیزیں جو انسان کے جسم سے تعلق رکھتی ہیں علم الابدان کے تحت آجاتی ہیں، اور وہ تمام چیزیں جو مثالی روح سے تعلق رکھتی ہیں علم الادیان کے تحت آجاتی ہیں، تو ایک طرف تو ہمیں پہلی ترجیح دینا چاہئے تعلیم کو، پھر عصری تعلیم کو اور عصری تقاضوں کے تناظر میں دینی تعلیم کو، اور عصری تعلیم کے ذریعہ سے ہم مسلمانوں کی مادی ضروریات یا مطالبات کی تکمیل کر سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ صحیح اور مطابق وقت دینی تعلیم سے روحانیت کو سنبھال سکتے ہیں، اسی طرح سے ایک جامع پروگرام بنایا جا سکتا ہے۔

تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اسلام خلاصہ ہے اس بات کا کہ انسان کا اللہ سے کیا ربط ہونا چاہئے اور انسان کا کائنات سے کیا ربط ہونا چاہئے اور انسان کا انسان سے کیا ربط ہونا چاہئے، تو انسان کا اللہ سے یہ ربط ہونا چاہئے جیسا کہ خود لفظ اسلام سے ظاہر ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں بغیر کسی شرط و Condition کے اپنے آپ کو سپرد کر دیں اور صرف اس کی کوشش کریں کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کی مرضی اور مشیت کیا ہے، اس کی مرضی اور مشیت کے مطابق عمل کرنے کی تا حد امکان کوشش کریں، جہاں تک کائنات کا تعلق ہے تو کائنات کے سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر اس کے بالکل برعکس ہے، یعنی ہمیں اپنے آپ کو اللہ کے قبضہ و اختیار میں دے دینا چاہئے، اس لئے کہ اس کائنات میں اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، یہ گران

لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئیں جن کے ہاتھوں میں آ رہی ہیں جن کو نہ تو اللہ کا خوف ہے اور نہ انسانیت کی ہمدردی ہے، تو وہ اس کائنات کو تباہ و برباد کر دیں گے، اس لئے خالق کا خوف اور خلق کی محبت رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں اس دنیا کی باگ ڈور آنا چاہئے، اور جہاں تک انسانوں کی باہمی روابط کا تعلق ہے تو انہیں برابر و برابری کے اصول پر استوار ہونا چاہئے، یہ ہے اسلام کی بنیادی تعلیم، تو اللہ کے لئے ہم اپنے آپ کو Surrender کر دیں، کائنات کے اوپر قبضہ کر لیں اور اسلامی اخلاق و کردار کے ذریعہ سے ہم بنی نوع انساں کے درمیان اخوت و مساوات قائم کر کے ظلم و عدوان کے ہر نشان کو مٹا دیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا خلاصہ تین چیزوں میں ہوتا ہے، ایک عبادت جس سے عبد و معبود کا رابطہ رہے اور دوسرے تعلیم، عصری تعلیم جس کے ذریعہ اللہ کی اس دنیا پر اللہ کے بندوں کا قبضہ ہو نہ کہ شیطان کے بندوں کا اور تیسرے انسان کا رابطہ اخوت و مساوات کی بنیاد پر استوار رہے، میرے خیال میں یہی وہ اہداف ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملت کی تعمیر کا خاکہ بنایا جانا چاہئے۔

س:- پرسنل لاء بورڈ نے اصلاحِ معاشرہ اور شرعی عدالتوں کی جو صدا لگائی ہے، وہ کس حد تک مؤثر ثابت ہوئی؟ کہا جاتا ہے کہ بات تجاویز اور جلسوں سے آگے نہیں بڑھتی، ان تجاویز کو خصوصاً اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے کیا کیا جانا چاہئے؟

ج:- میرے خیال میں جلسوں کا اثر پڑتا تو ہے، اب یہ کہ اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ ہمیں توقع تھی، دار القضاء بھی کچھ قائم ہوئے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ قضاء کا معاملہ شریعت میں آسان نہیں ہے، اس میں بصیرت افروز افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک طرف فقہ پر عبور رکھتے ہوں اور دوسری طرف حالاتِ حاضرہ سے بھی واقفیت رکھتے ہوں، حالاتِ حاضرہ پر جن کی نظر ہو تو میرے خیال میں چوں کہ مناسب افراد اس کے لئے نہیں مل پا رہے ہیں اس لئے دار القضاء کی اسکیم میں اتنی کامیابی نہیں ہو پا رہی ہے جتنی کامیابی ہونا چاہئے، لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر دار القضاء کھلے ہیں اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو خاصہ فائدہ

بھی ہو رہا ہے، اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں سب سے بنیادی بات جو قرآن مجید نے ارشاد فرمائی وہ ہے ﴿تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان قضاۃ، مسلمان ائمہ مساجد، نکاح پڑھنے والے افراد اور مسلمان علماء اس بات کا سختی سے عہد نہ کر لیں کہ کسی بھی ایسی رسم یا تقریب میں وہ شرکت نہیں کریں گے جس میں کوئی غیر شرعی رسم انجام دی جا رہی ہو، جب تک وہ یہ عہد نہیں کر لیتے ہیں اس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو پائے گا، اسی کے ساتھ ساتھ خود ان کو بھی یہ بات طے کرنا ہوگی کہ وہ معاذ اللہ قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق نہ بن جائیں ﴿يأيها الذين آمنوا لم تقولون مالا تفعلون﴾ جو وہ فرماتے ہیں، پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوں، میں بہت ہی شرمندگی اور ندامت کے ساتھ لیکن مجبوراً یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں کم سے کم شادی بیاہ کی حد تک میں نے خود اسلامی احکام پر سختی سے عمل کیا ہے اور عمل کروں گا انشاء اللہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری لڑکی کی شادی میں (جسے ماشاء اللہ چار سال ہو چکے ہیں) کسی قسم کی غیر اسلامی رسم نہیں ہوئی حالانکہ میری ایک ہی لڑکی ہے لیکن میں آپ کو پھر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جہیز کے نام پر میں نے اپنی لڑکی کو صرف ایک قرآن مجید، ایک رحل اور ایک مصلی دیا تھا، اس کے علاوہ بچی جب میرے گھر سے رخصت ہوئی ہے تو اس کے کانوں میں چاندی کی ایک بالی بھی نہیں تھی، اس کے جسم پر جو کپڑے تھے، اس کی قیمت ساڑھے تین سو روپے تھی اور یہ جوڑا بھی جو فراہم کیا گیا تھا وہ اس جہیز کی رقم سے فراہم کیا گیا تھا جو لڑکے کے نے شادی سے قبل دیا تھا، کسی قسم کی کوئی تقریب نہیں ہوئی، کسی قسم کی کوئی رسم نہیں ہوئی، بالکل خالص اسلامی طریقہ سے میری بچی کی شادی ہوئی، اس کے بعد میں نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں آئندہ سے نکاح کی اسی تقریب میں شرکت کروں گا جہاں لڑکے کی طرف سے یہ Declaration ہو کہ اس نے کسی قسم کے جہیز کا مطالبہ نہیں کیا ہے اور مہر کی رقم میرے ذریعہ سے نقد ادا کی جائے گی، اس طرح میں نے ولیمہ کے لئے بھی کہہ دیا ہے کہ میں ایسے کسی ولیمہ میں شرکت

نہیں کروں گا کہ جہاں سماج کے ایک طبقہ کو بُلایا جائے اور دوسرے طبقہ کو محروم رکھا جائے۔ لہذا کوئی بھی شخص اگر میرے پاس ولیمہ کا دعوت نامہ بھیجتا ہے تو اس کو ایک دعوت نامہ نہیں بلکہ اکیاون دعوت نامے بھیجنا ہوں گے جس میں ایک میرے لئے ہوگا اور پچاس غرباء و مسلمین کے لئے ہوں گے، یہ بات لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے اور بہرحال میں اپنی حدتک تو کررہا ہوں، اس طرح سے جو علماء ذمہ دار افراد ہیں اور جن کی بات مانی جاتی ہے وہ زبان کے بجائے اپنے عمل کو مبلغ بنائیں تو مجھے امید ہے کہ اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں بڑی حدتک کامیابی ہوسکتی ہے، ہمارے یہاں شادیوں میں دیکھئے، اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ MUSIC بہت زیادہ ہوتی تھی، گانا بجانا بہت ہوتا تھا، لیکن ہمارے فرقہ کے علماء نے طے کرلیا کہ جہاں میوزک ہوگی، وہاں ہم نکاح نہیں پڑھیں گے، چنانچہ شادیوں کے موقعہ پر میوزک ہمارے فرقہ سے تقریباً ختم ہو چکی ہے، تو ایک شے پر اگر روک لگ سکتی ہے تو اس طرح سے اگر علماء یہ طے کرلیں کہ اگر کوئی بھی غیر اسلامی رسم ہوگی تو ہم وہاں نہیں جائیں گے، تو اس کے خوشگوار اثرات ضرور مرتب ہوں گے، اس میں چھوٹے اور بڑے کی تفریق نہیں ہونا چاہئے، چاہے کوئی کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو، اسے شریعت کے قانون کی زد میں آنا چاہئے، شریعت سے بڑا کوئی انسان نہیں ہے، مجھے امید ہے کہ اگر اس پر عمل ہوا تو انشاءاللہ کافی حدتک اس کے مفید نتائج سامنے آئیں گے۔

س:- بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کے بعد ملت نے ایک کروٹ لی تھی، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری قیادت نے ملت کی اس بیداری سے فائدہ اٹھایا، کیا اس سانحہ کے اثرات ہماری قیادت کے طرزفکر اور طرزعمل پر بھی مرتب ہوئے؟ اور یہ کہ بابری مسجد کی تعمیرنو کے سلسلہ میں ملت کو کس حدتک پرامید رہنا چاہئے؟ صدر ایران کے بابری مسجد سے متعلق بیان پر آپ کا کیا ردعمل تھا؟

ج:- جیسا کہ آپ کے سوالنامہ میں ہے بابری مسجد کی شہادت، آپ نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ بابری مسجد انہدام! تو شہید کی جو صفت قرآن مجید نے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ شہید

مرتا نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ شہید کی شہادت ہی سے ملتوں میں زندگی پیدا ہوتی ہے، یہی صورتِ حال ہے جو بابری مسجد کے سانحہ شہادت سے ہمارے سامنے آئی کہ مسجد تو شہید ہوگئی لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ملت کو اس سے ایک نئی زندگی مل گئی اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور میں سمجھتا ہوں کہ قیادت نے بھی بہرحال اس موقع پر صحیح رول Play کیا اور کم ازکم مسلمانوں کو متحد کرنے میں ان کو آنے والے خطرات سے ہوشیار کرنے کے سلسلہ میں تعلیم کی اہمیت، اخلاق کی اہمیت، عقائد کی اہمیت پیدا کرنے کے سلسلہ میں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں اچھا کام کیا، خاص طور پر آل انڈیا ملی کونسل نے مجاہدالاسلام قاسمی صاحب کی زیرقیادت اس فریضہ کو ادا کرنے کی مستحسن کوشش کی۔

اب یہ کہ ہم کو تو ہر منزل پر یہ سمجھنا چاہئے کہ کام بہت اچھا نہیں ہوا، اس سے بہتر ہوسکتا تھا، یہ بات الگ ہے، لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ ضرور ہوا اور اس کے نتائج بھی ہمارے سامنے آئے اور اس کا ثبوت یہ ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس الیکشن میں جتنی بھی سیاسی پارٹیاں تھیں وہ مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر اپنے مفادات کے لئے اپنے شکنجہ میں لینا چاہتی تھیں، لیکن مسلمانوں نے عام طور سے اچھے سیاسی شعور کا ثبوت دیا، ان کے ووٹ زیادہ بکھرنے بھی نہیں پائے، متحد طور پر اور مستقل طریقے پر ان کے ووٹ پڑے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ باتیں تو بہت اچھی ہوئیں۔

اب یہ کہ بابری مسجد کی تعمیرنو کے سلسلہ میں ملت کو کس حدتک پُرامید ہونا چاہئے، تو بات یہ ہے کہ قوموں کی تاریخ صدیوں پر محیط ہوتی ہے، دنوں پر محیط نہیں ہوتی، قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿وتلك الأيام نداولها بين الناس﴾ ہمیشہ زمانہ ایک سا نہیں رہتا، بدلتا رہتا ہے، ہمیں رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن بہرحال اگر آج کسی مسلمان کو موت آتی ہے تو اس سے بابری مسجد کی تعمیر کے بارے میں سوال نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کام فی الحال ہماری طاقت سے باہر ہے، البتہ ملت کی تعمیر کے بارے میں ضرور

سوال ہوگا جواب بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے، باقی یہ کہ مسجد تو مسجد ہی رہتی ہے چاہے وہاں پر کچھ بھی بنا دیا جائے، صبح قیامت تک یہ پلاٹ مسجد ہی کے حکم میں رہے گا، اس پر احکام مسجد نافذ رہیں گے۔

صدر ایران کے بیان کا وہ مقصد نہیں تھا جسے اخبارات نے پیش کیا کیونکہ ایران کا اس سلسلہ میں موقف بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی لچک اور کوئی لوچ نہیں ہے، میں ادھر دو مرتبہ ایران گیا اور ہر مرتبہ رہبر انقلاب آیت اللہ خامنہ ای سے ملاقات ہوئی، دونوں مرتبہ انہوں نے یہی فرمایا کہ بابری مسجد کسی صورت سے بننا چاہئے اور بابری مسجد کی شہادت کے باعث مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

س:- اس ملک کی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لئے ملت کو کون سا لائحہ عمل اپنانا چاہئے؟

ج:- دیکھئے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اکثریت کی آواز ہوتی ہے اور اقلیت کی کوئی آواز نہیں ہوتی، اس سے میں اتفاق نہیں کرسکوں گا، میں سمجھتا ہوں کہ قوت اور طاقت میں آواز ہوتی ہے، اکثریت اور اقلیت سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، اس کی بہترین مثال امریکہ کے یہودی ہیں جو امریکہ میں تین فیصد ہیں لیکن یہ کہ کوئی بھی پارٹی یا وہاں کا president ان کے خلاف یا ان کے مفادات کے خلاف نہ آواز اٹھا سکتا ہے اور نہ کوئی کام کرسکتا ہے، تو ہمارا بھی یہاں پر اسی پر زور ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے سترہ کروڑ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ قوی بنانے کی کوشش کریں، قوی بنانے کے لئے ایک تو مادی وسائل ہیں اور دوسرا دینی وسیلہ ہے، مادی وسائل کی بات لے لیجئے تو جس قوم کے پاس جتنی زیادہ تعلیم ہوتی ہے، اور جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے، اتنی ہی وہ قوم قوی ہوتی ہے، اسی طرح مذہبی اعتبار سے جس کے پاس جتنا ایمان قوی ہوتا ہے، اتنی ہی زیادہ وہ قوم قوی ہوتی ہے، دونوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں، دولت اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے لئے اگر آپ دیکھیں تو امریکہ کے یہودی موجود ہیں اور اگر ایمان کے لحاظ سے آپ

دیکھیں تو آپ کے سامنے ایران موجود ہے جس نے صرف ایمان کی طاقت پر امریکہ سے ٹکر لی، ایران ایک ایسا ملک ہے جو کسی صورت سے سر جھکانے کو تیار نہیں ہے، تو یہاں بھی ہمیں مسلمانوں کو قوی بنانا ہوگا، میں سمجھتا ہوں کہ ان تینوں باتوں کا Combination ہو کہ مسلمانوں کے پاس دولت بھی ہو، اسلام نے دولت پرستی کی ممانعت کی ہے، دولت مندی کی ممانعت نہیں کی ہے، اس فرق کو ہمیں سامنے رکھنا چاہئے، دولت مند ہونا دوسری بات ہے اور دولت پرست ہونا دوسری بات ہے، اسی کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم پر ہمارا پورا زور ہونا چاہئے، مغرب کے بنائے ہوئے جدید تعلیم کے Curriculum اور نصاب میں یہ صفت رکھی گئی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ اللہ کی نعمتوں سے تو انسان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے مگر اللہ کا نام اس میں کہیں نہ آنے پائے، ہمیں جو Curriculum بنانا ہے وہ اس طرح کا ہو کہ اللہ کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھائیں اور اس کے پس منظر میں الوہیت کا اور اس کی رحمتوں اور نعمتوں کا اور اس پر عقیدہ بھی ہمارے نظروں کے سامنے رہے جیسا کہ میں عرض کروں گا کہ ایران والوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے لئے جو نیا نصاب مقرر کیا ہے اسے ایک نئے طریقہ سے مرتب کیا ہے، اس کی خصوصیت مغرب کے تیار کردہ نصاب کی خصوصیت کے بالکل برعکس ہے، یعنی یہ کہ ان کے ہاں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیش رفت ہو رہی ہے لیکن کسی منزل پر بھی خالق کے نظریہ کو وہ پس منظر سے جانے دینا نہیں چاہتے۔

حاصل یہ کہ دین اور دین کے ساتھ ساتھ تعلیم اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مالی استحکام، یہ تین چیزیں وہ ہیں جو ملت کو ہر لحاظ سے مستحکم بنا سکتی ہیں، مستحکم قوم کسی بھی ملک کی ضرورت بن جاتی ہے اور کوئی بھی ملک اپنی ضرورت کو نظر انداز کرنے پر تیار نہیں ہوتا، ہماری آواز اس وقت موثر ہوگی جب ہم اخلاقی علمی اور مالی لحاظ سے مضبوط و مستحکم ہو کر اس ملک کی ضرورت بن جائیں گے۔

س:- ہمارا ملک کرپشن اور دوسرے بہت سے امراض کا شکار ہو چکا ہے، ایک دردمند

محبِ وطن ہونے کے ناطے آپ ان مسائل پر کس انداز سے سوچتے ہیں اور آپ کے نزدیک ان امراض کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟

ج:- جہاں تک کرپشن کا سوال ہے، یہ صرف ہمارے ملک ہی کا مسئلہ نہیں ہے ﴿ظھر الفساد فی البر والبحر﴾ ساری دنیا میں کرپشن پھیلا ہوا ہے اور چونکہ میں یورپ وامریکہ میں جاتا رہتا ہوں تو میں جانتا ہوں کہ وہاں بھی کرپشن پھیلا ہوا ہے، البتہ یہ اور بات ہے کہ یہاں چونکہ غربت ہے لہذا کرپشن کا تناسب یہاں تھوڑا کم ہے، وہاں چونکہ دولت زیادہ ہے اس لئے کرپشن کا تناسب وہاں ذرا اونچا ہے، تاہم یہاں پر اللہ کے فضل سے دوسرے قسم کے کرپشن نہیں ہیں، اس کی بہت سے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ اس وقت امریکہ اور یورپ کا کیا حال ہے؟ امریکہ اور یورپ میں پیسہ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا کرپشن بہت زیادہ پھیل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا علاج صرف اور صرف ایک ہے ، اگرچہ کہ وہ علاج بہت مشکل ہے لیکن اس کے سوا اس کا کوئی اور علاج ہے نہیں، اور وہ ہے صرف اور صرف تقوی کا پیدا ہوجانا اور خوفِ خدا کا پیدا ہوجانا، خوفِ خدا اور تقوی اسلام میں نماز اور روزہ کی طرح کوئی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے اور ملکہ ہے جو انسان کی پوری زندگی میں ایک طرح کا Discipline اور اخلاقی نظم وضبط پیدا کردیتا ہے اور بے اعتدالیاں ختم ہوجاتی ہیں۔

س:- دنیا کے نقشہ پر پیش آنے والی تبدیلیوں پر بھی آپ کی گہری نگاہ ہے، عالمی سطح پر اسلام پسندی کو دہشت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایران کے انقلاب کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا، اس ذہنیت کے پسِ پشت کون سے عوامل کارفرما ہیں اور مسلمانوں کو اس الزام کا دفاع کس طرح کرنا چاہئے؟

ج:- صورتحال یہ ہے کہ سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد مغرب کو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ایک دشمن کو تو فرضی طور پر گڑھنا ہی تھا، تو انہوں نے اسلام کو اپنا دشمن گڑھ لیا ہے، اب اس پر اور تو کوئی الزام لگ نہیں سکتا، چونکہ اسلام کی تعلیمات میں جہاد

بھی شامل ہے تو وہ حضرات اس بات پر پردہ ڈالتے ہیں کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے کہ جنگ اور جہاد میں کیا فرق ہوتا ہے، جنگ دہشت پسندی ہوتی ہے، جہاد میں دہشت پسندی کا سوال ہی نہیں، جہاد کے اصولوں کو اگر دیکھا جائے تو میدانِ جہاد میں ایک مسلمان کا مقابلہ دشمن سے کم ہوتا ہے، اپنے نفس سے زیادہ ہوتا ہے، جتنی پابندیاں اور سختیاں اس میں ہیں کہ نہ عورت پر ہاتھ اٹھنے پائے اور نہ بچہ پر، ایک مسلمان سپاہی جب میدانِ جہاد میں آتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں اس طرح سے بندھے ہوتے ہیں کہ جیسے وہ جہاد کرتا ہے، یہ خود ایک مسئلہ ہے، لیکن یہ کہ ان سب کو نظر انداز کر کے وہ جہاد کو جنگ قرار دیتے ہیں اور جنگ کو دہشت پسندی میں گویا تبدیلی کردیتے ہیں، ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا کا جو سب سے زیادہ دہشت پسندی اور دہشت گرد ملک ہے وہ بالکل ایماندار اور شریف اور گویا کہ مَلَک بنا ہوا ہے، اس طرح مسلمانوں میں اگر کچھ لوگ دہشت پسندی کرتے ہیں تو اول تو صحیح بات یہ ہے کہ اسلام کا تو اصول ہی ہے کہ ﴿ولا تزر وازرة وزر أخرى﴾ کہ ایک کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاسکتی، تو یہ صحیح نہیں ہے کہ بے خطا انسانوں کو مارا جائے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ملک یہ کہہ رہا ہے، خود اس ملک کے Crimes کیا ہیں، جن کو دہشت پسند کہا جاتا ہے، یہ مارتے ہیں تو ایک دو تین چار دس آدمیوں کو مار دیتے ہیں، لیکن جو ان پر دہشت پسندی کا الزام لگا رہا ہے، وہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے ذخیرے اپنے پاس رکھے ہوئے ہے اور ان کو استعمال بھی کرچکا ہے اور اس پر تیار ہے کہ اگر اس کے مفادات کو نقصان پہنچا تو وہ اس بات کی بالکل فکر نہیں کرے گا کہ کئے لاکھ آدمی مرتے ہیں، کئے کروڑ آدمی مرتے ہیں، ان کے مفادات محفوظ رہیں بس، باقی انسانیت کا خون بہتا ہے بہا کرے، تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قرآن کا اصول تو یہی ہے ﴿ولا تزر وازرة وزر أخرى﴾ یہ بات تو صحیح ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کن حالات کی بناء پر انسان دہشت پسند ہوجاتا ہے، جب Frustration حد سے زیادہ بڑھتا ہے، ظلم حد سے زیادہ بڑھتا ہے، اس وقت انسان

دہشت پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے، لہٰذا ہم جہاں دہشت پسندی کی مکمل طور سے مذمت کرتے ہیں وہیں ان عوامل کی بھی سختی کے ساتھ مذمت کریں گے، بعض جگہوں پر مسلمانوں میں اتنا Frustration اور اتنی گھٹن ہے اور ان پر اتنا ظلم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے مذہب اور مسلک کے خلاف کوئی کام کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں تو وہ اگر قابلِ مذمت ہیں تو جن کے حد سے بڑھے ہوئے ظلم کی وجہ سے ایسے امور انجام دیئے جاتے ہیں، وہ لوگ بھی قابل مذمت ہیں، مسلک جعفری کے لحاظ سے اگر چور چوری کرتا ہے تو اس کی سزا بے شک یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص حالات ایسے پیدا کردے کہ چور چوری کرنے پر مجبور ہوجائے تو یہ ہمارے نقطۂ نظر سے اسلامی عدل کا تقاضا یہ ہے کہ چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں بلکہ جس نے ایسے حالات پیدا کردئے اس کے ہاتھ کاٹ دئے جائیں، تو اسی طرح سے یہاں پر ہم کو دیکھنا پڑے گا کہ بے شک دہشت پسندی کو اسلام پسند نہیں کرتا ہے، لیکن دہشت گردی کی سزا اس کو بعد میں دی جائے گی جو دہشت کرتے ہیں، اس سے پہلے ان کو سزا دی جائے گی جن کی وجہ سے ایک انسان دہشت گردی پر مجبور ہوجاتا ہے۔

س:- ایران کے انقلاب کو وقوع پذیر ہونے میں ایک مدت گزر چکی ہے، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت کی تبدیلی عوام کے قلب و ذہن میں بھی مثبت تبدیلی کا باعث بنتی ہے، وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جنہیں آپ انقلاب کا ثمرہ کہہ سکتے ہیں؟

ج:- اس سلسلہ میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ حکومت کے ذریعہ سے دین کبھی نافذ نہیں کیا جاسکتا، البتہ جب ایک قوم واقعی دیندار و دین شناس ہوجائے تو اس کے ذریعہ دینی حکومت قائم کی جاسکتی ہے، میں بہت افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ پاکستان اور ایران میں یہی فرق ہے کہ پاکستان میں حکومت کے ذریعہ سے دین نافذ کیا جارہا ہے، اس لئے وہاں ناکامی ہورہی ہے، جو لوگ نافذ کررہے ہیں ان میں خود اسلام کس حد تک ہے؟ لیکن ایران میں یہ ہوا کہ تقریباً چالیس سال تک حقیقی علماء لوگوں کو مسلمان بناتے رہے اور جب

وہ مسلمان بن گئے اور اسلام پر ان کا عقیدہ مستحکم ہوگیا تب انقلاب آیا، میں انقلاب کے پہلے بھی برابر وہاں گیا اور انقلاب کے بعد بھی برابر جارہا ہوں، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کوئی خرابی نہیں ہے یا کسی طرح کا کرپشن نہیں ہے، وہاں کچھ کمزوریاں بھی ہیں، کہیں کرپشن بھی دکھائی دیتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اب تک عوام پر کم از کم دین و مذہب کی Grip بہت زیادہ مضبوط ہے، ان میں بیداری بھی ہے، ان میں دینی بصیرت بھی ہے، مصائب اور مشکلات کے باوجود ان کی سب سے پہلی ترجیح اسلام کی اور انقلاب کی حفاظت ہے، لہٰذا میں تو کافی پُر امید ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ جو بات میں نے دیکھی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں پر لوگ اسلام کو جدید زمانہ کے ساتھ ساتھ لے کر چل رہے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ جدید زمانہ کو اپنا امام قرار دے رہے ہوں بلکہ وہ جدید زمانہ میں بھی اپنا ایک قائدانہ رخ اختیار کئے ہوئے ہیں، دینی مسائل میں اجتہاد سے بھی وہاں پر خاصہ کام کیا جارہا ہے، جو بات میرے لئے سب سے زیادہ قابل اطمینان ہے وہ یہ کہ وہاں پر جہاد کی اسپرٹ اس وقت بھی موجود ہے لیکن یہ کہ جہاد اب میدان جنگ میں نہیں ہورہا ہے، یہ جہاد انڈسٹری میں ہورہا ہے، تعلیم میں ہورہا ہے، دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم دونوں میں وہ لوگ جو کام کررہے ہیں، وہ واقعی قابل ستائش ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ جو بات میں نے دیکھی ہے، خاص طور سے اس دفعہ کہ وہاں جو بھی دینی کام ہورہا ہے وہ صرف اسلام کو پیشِ نظر رکھ کر ہورہا ہے، چنانچہ وہاں جو ابھی نیا اسلامک کمپیوٹر سنٹر کھلا ہے اس میں جتنے بھی اسلامی فقہی مسالک ہیں ان سب کے ہی مسائل و احکام کو انہوں نے کمپیوٹرائزڈ کردیا ہے، اس میں فقہ مالکی بھی ہے، فقہ حنفی بھی، فقہ حنبلی بھی ہے، فقہ جعفری بھی ہے، فقہ ظاہری بھی ہے، فقہ شافعی بھی، جتنے بھی فقہی مسالک ہیں ان کو انہوں نے ایک ہی کمپیوٹر پروگرام میں جمع کردیا ہے کہ کوئی انسان تحقیق کرنا چاہے تو اس کو ایک لمحہ میں علم ہوجائے کہ ایک مسئلہ کے متعلق جو مختلف فقہی مسالک ہیں ان کے مسائل کیا ہیں اور ان کی بنیاد کیا ہے، ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جن کی عمر چالیس پینتالیس سے متجاوز ہیں اور گورنمنٹ کے دفاتر

میں ہیں، ان میں تو مجھے کہیں کہیں Corruption دکھائی دیتا ہے، لیکن نئی نسل جو نکل کر آ رہی ہے ان میں کہیں کرپشن دکھائی نہیں دے رہا ہے، جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پرانے لوگ ہیں وہ پرانے نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں اور نئی نسل نئے نصاب کی تربیت یافتہ ہے، تو ہمارے ہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق پر اتنا ہی زور ہے، اس لئے یہ بچے ماشاء اللہ کرپشن سے پاک ہیں، یہ باتیں خوش آئند ہیں، اللہ کرے کہ جہاں جہاں بھی اسلامی حکومتیں ہیں، ان سب جگہوں پر یہ صورت سامنے آئے۔

س:- ہند و پاک میں شیعہ سنی فسادات کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں اور ان کے سدّ باب کے لئے کون سی تدابیر اپنائی جا سکتی ہیں؟

ج:- جہاں تک کراچی کی بات ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا، جسٹس تقی عثمانی صاحب، مولانا رفیع عثمانی صاحب، حکیم محمد سعید صاحب، مولانا بنوری صاحب ان حضرات کے بھرپور تعاون کے نتیجہ میں (تعاون کیا بلکہ اصل کام تو انہوں نے ہی کیا، میں تو ان کے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا) اس وقت کراچی کی حد تک تو شیعہ سنّی فساد ختم ہو چکا ہے، میں نے اس سلسلہ میں جب مولانا رفیع عثمانی صاحب اور جسٹس تقی عثمانی صاحب سے بات چیت کی تو اس انٹرویو میں تو گنجائش نہیں کہ وہ ساری گفتگو پیش کر سکوں، انہوں نے ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک شیعہ سنی فسادات کی جو تاریخ بتائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ سنی فساد پاکستان میں اسی وقت ہوتا ہے جب وہاں اسلامی نظام کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو گورنمنٹ شیعہ سنی فساد کرا کے لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ کی طرف سے ہٹا دیا کرتی ہے، انہوں نے ڈیڑھ گھنٹہ میں تفصیل سے مستقل تاریخ بیان کی تو وہاں کا مسئلہ تو ختم ہو چکا لیکن جیسا کہ میں عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے دوسرے گوشوں میں خاص طور سے پنجاب میں شیعہ سنی مسئلہ بھی درپیش ہے، ویسے تو لسانی اختلافات صوبائی اور دوسرے بھی، بے شمار تعصّبات وہاں پر کام کر رہے ہیں، اب جہاں تک مسئلہ ہے شیعہ سنی اتحاد کا تو اول تو میں نے عرض کیا کہ بدقسمتی سے پاکستان اور ہندوستان میں شیعہ سنی اختلافات تو ہیں ہی

لیکن اس سے زیادہ اکثریتی فرقہ کے دو گروہ میں جو اختلافات ہیں وہ بھی کچھ کم شدید نہیں ہیں، اور وہاں بھی اس قسم کے فسادات ہوتے رہتے ہیں، آپ غور کریں کہ شیعہ سنی جھگڑے کی ابتدا لکھنؤ میں کس بناء پر ہوئی؟ جی ہاں، یہ میں آپ کی خدمت میں ذرا سا عرض کر دینا چاہتا ہوں، مجھے بہت ہی افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑ رہی ہے، جو کچھ میں نے پڑھا اور سنا ہے اس لحاظ سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ لکھنؤ میں شیعہ سنی جھگڑے کی بنیاد دو ایسی چیزوں کی بناء پر ہوئی کہ جن پر عمل کی اجازت نہ شیعہ فرقہ میں ہے اور نہ سنی فرقہ میں، یہ عجیب و غریب بات ہے، مسلک شیعہ کے اعتبار سے شیعہ حضرات کے ائمہ اطہار ہوں یا ان کے مجتہدین یا ان کے مفتی حضرات ہوں، بغیر ادنیٰ خوف و تردّد کے یہ بات میں کہہ سکتا ہوں کہ ائمہ اطہار کی احادیث اور اس وقت کے بھی جو ہمارے سارے مراجع ہیں، آپ جانتے ہیں کہ شیعوں میں مجتہد اور تقلید والا مسئلہ ہوتا ہے، ہم زندہ مجتہد کی تقلید کرتے ہیں تو اس وقت ایران و عراق میں ہمارے جتنے بڑے بڑے مجتہدین ہیں ان سب کا متفق علیہ فتوی ہے کہ کسی شیعہ کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے یا کرے کہ جس سے دوسرے فرقہ سے وابستہ کسی مسلمان بھائی کی ادنی دل آزاری ہوتی ہو، یہ تو ہے شیعوں کے ہاں کا فتوی، اسی کے مقابلہ میں سنی حضرات کے ہاں کی مجھے اطلاع ہے، بیشک ان کو اپنے بزرگوں کی مدح وثناء کا، ان کی تعریف و توصیف کا حق حاصل ہے، لیکن یہ کہ جلوس مدح صحابہ تو میرے خیال میں دنیا میں کہیں نکلتا نہیں ہے اور نہ اس کی مسلک سنت میں اجازت ہے، اس کو بدعت تصوّر کیا جاتا ہے، جیسا کہ میں نے اکثر بڑے بڑے سنی علماء سے دریافت کیا تو جلوس مدح صحابہ کی اجازت سنی حضرات کے ہاں نہیں ہے اور شاہراہ عام پر ایسی باتیں کرنا جس سے سنیوں کی دلآزاری ہو اس کی شیعوں کے ہاں اجازت نہیں ہے، تو جھگڑا جو شروع ہوا لکھنؤ میں تو ایک طرف ناسمجھ شیعہ افراد تھے جنہیں اس پر اصرار ہوا کہ ہم شاہراہ عام پر ایسی باتیں کریں گے جس سے سنیوں کی دلآزاری ہو، دوسرے اس وقت کی جو سُنی لیڈر شپ تھی اس نے یہ مطالبہ کیا کہ ہم جلوس مدح صحابہ نکالیں گے، سب چیزیں آپ کے سامنے ہیں کہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ جس کی نہ تو شیعوں کے ہاں اجازت ہے اور نہ سنیوں

کے یہاں اجازت ہے، اس پر گویا کہ جھگڑے کی بنیاد ہوئی اور اس وقت بھی جو جھگڑا چل رہا ہے وہ اسی بناء پر چل رہا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کی کوئی فقہی اور علمی بنیاد نہ اس فرقہ میں ہے اور نہ اس فرقہ میں، ایک بے بنیاد بات ہے کہ جس پر جھگڑا ہو رہا ہے، تو اگر دونوں طرف کے ذمہ دار علماء بیٹھ کر اس مسئلہ کو طے کر دیں تو الحمدللہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن بہر حال ایک چنگاری تو خاکستر میں موجود ہے ہی، جو کسی وقت خدانخواستہ ایک بے تکی صورت اختیار کر سکتی ہے، تو قبل اس کے کہ ایسی کوئی بے تکی صورت پیدا ہو، اگر ذمہ دار علماء بیٹھ کر اس مسئلہ کو طے کر دیں کہ بھئی جب ایک چیز کی آپ کے یہاں اجازت نہیں ہے تو اسے وجہ نزاع کیسے بنایا جا رہا ہے، اسے تو ختم کیا جانا چاہئے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا، دوسری بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تقریروں سے زیادہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے، پھر میں مجبور ہو رہا ہوں، یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں ہرگز بھی یہ بات نہیں کہتا، لیکن میں مجبوراً یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے جب لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد ہوا تو میں کسی اور جذبہ کے تحت نہیں بلکہ میں اپنا فریضہ سمجھتا تھا کہ فرقہ پرست افراد کی زد سے بلا امتیاز مسلک مسلمانوں کو بچانا چاہئے، یہ میرا فریضہ ہے اور میں اس فریضہ کو جس حد تک انجام دے سکتا تھا، میں نے اسے انجام دیا، سنی محلوں میں جا جا کر میں ان کی حفاظت کی کوشش کی، ان کو پولیس کے مظالم سے بچانے کے لئے جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں نے کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہر حال ایک بہت ہی اچھی فضا پیدا ہو گئی اور سنی حضرات نے میری جو ناچیز خدمات تھیں اس کی ضرورت سے زیادہ قدر بھی کی، تو اس طرح سے بہت ضروری یہ بات ہے کہ شیعوں پر وقت پڑے تو سنی حضرات ساتھ دیں اور سنیوں پر وقت پڑے تو شیعہ حضرات ساتھ دیں، تو اس طرح باہمی اعتماد کی جو فضا پیدا ہو گی، وہ سب سے بڑھ کر اس سلسلہ میں معاون ہو سکتی ہے۔

س:- ماہنامہ ''بانگ درا'' کے ذریعہ ملت کے نام آپ کا پیغام؟

ج:- یہ جو جوابات میں نے دئے ہیں، یہی میرا پیغام ہے، میرا پیغام صرف یہ ہے کہ ہم کو ہوشیار ہونا چاہئے اور مثبت انداز میں سوچنا چاہئے، قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ملتوں کا

زوال کیسے ہوتا ہے، ملتوں کا عروج کیسے ہوتا ہے، قرآن کے پیغام کو اپنے سامنے رکھیں اور وہ چیزیں کہ جن سے قوموں کا عروج ہوتا ہے، انہیں اختیار کریں اور جن سے زوال ہوتا ہے، انہیں ترک کریں، اسی میں انشاءاللہ ہماری دنیا اور آخرت کی بھلائی ہوگی۔

(بانگ درا لکھنؤ، مارچ ۱۹۹۷ء)

شیعہ سنی فسادات کا دھبہ اب اس شہر کو لگنے نہ پائے!

مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب سے ایک ملاقات

لکھنؤ اس لحاظ سے ایک ایسا شہر ہے جہاں شیعہ سنی آپس میں متصادم ہوجاتے ہیں، اس کے پس پشت سیاسی مقاصد بھی ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو ٹھیک سے سمجھا جائے، اس قضیہ کے ایک فریق شیعہ رہنما ڈاکٹر کلب صادق بھی ہیں، ہم نے ان سے سنی شیعہ قضیہ کے متعلق ایک تفصیلی گفتگو کی، جو نذرِ قارئین ہے۔

س:۔تقریباً بیس برسوں کے بعد لکھنؤ میں ''شیعہ سنی قضیہ'' کے ایک بار پھر موضوع بحث بن جانے اور نتیجہ میں دونوں فریقوں کے مابین چند ایک ناخوشگوار واقعات کے پیش آجانے کی فوری وجوہات آپ کے نزدیک کیا ہوسکتی ہیں؟ اس قضیہ کے ڈانڈے سیاست سے بھی ملائے جارہے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

ج:۔اللہ کا شکر ہے کہ لکھنؤ کا ایجی ٹیشن شیعہ سنی مسئلہ نہیں بننے پایا، میں نے پوری یوپی کا دورہ کیا، معلوم ہوا کہ تمام یوپی اور خود لکھنؤ میں بھی (جب میرے بھتیجہ کلب جواد صاحب کو گرفتار کیا گیا) تو شیعوں کے دوش بدوش سنی حضرات بھی ہزاروں کی تعداد میں نکل کر آگئے، یہی صورت حال میرٹھ میں، سہارنپور میں، مظفر نگر میں، بلند شہر میں اور تمام مقامات پر جہاں جہاں بھی احتجاجات ہوئے، رونما ہوئی، اللہ کا شکر ہے کہ بیک فائر ہوگیا، کوشش تو یہ تھی کہ سنی شیعہ آپس میں لڑ جائیں......اللہ کا شکر ہے کہ اس کے برعکس نتیجہ سامنے آیا اور باہمی تصادم کے بجائے ان میں اور اتحاد پیدا ہوگیا......مسلمانوں کو یہ احساس ہوگیا

ہے کہ ہم کو لڑانے کے لئے یہ ساری سازشیں رچی جارہی ہیں۔ لکھنؤ کا موجودہ ایجی ٹیشن تو شیعہ سنی مسئلہ تھا ہی نہیں بلکہ شیعوں کا جو بھی مطالبہ تھا، وہ گورنمنٹ سے تھا، یہ ''شیعہ بمقابلہ گورنمنٹ'' تھا نہ کہ ''شیعہ بمقابلہ سنی''...... یہ مسئلہ خالص مذہبی نوعیت کا تھا، اب یہ دوسری بات ہے کہ بعض فرقہ پرست پارٹیوں نے اس کا سیاسی استحصال بھی کرلیا ہو۔

س:۔شہر لکھنؤ جس کی تہذیب وثقافت کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے، وہیں اس کا داغدار پہلو شیعہ سنی فسادات بھی ہے، اس قضیہ کے پس پشت کوئی سازش تو نہیں ہے؟ اس کا یہ پہلو بھی کس قدر مضحکہ خیز بلکہ معنی خیز ہے کہ اس پر وہ لوگ اظہار تشویش کریں جن کی مسلم دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ آخر ہم منفی بنیادوں پر متحد ہونے کے بجائے مثبت بنیادوں پر ایک کیوں نہیں ہوجاتے؟

ج:۔سیاسی چالیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ ان کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے، سنی شیعہ فساد میں یقینی طور پر پہلے انگریزوں کا اور اب اسلام دشمن سیاسی طاقتوں کا ہاتھ ہے، اس بات کو مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے...... مقامی فرقہ پرست طاقتیں ہی نہیں بلکہ تمام طاغوتی طاقتیں اس مسئلہ کو سرفہرست رکھے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں میں آپس میں اتحاد نہ ہونے پائے، اس کے لئے وہ تفرقہ انگیز عناصر کو FINANCE بھی کررہے ہیں، سازشیں کررہے ہیں، ایک دوسرے کو ابھار بھی رہے ہیں، لوگوں کو خرید بھی رہے ہیں، لوگ بک بھی رہے ہیں، سنی بھی بک رہے ہیں اور شیعہ بھی بک رہے ہیں، جس کی مجھے اطلاع ہے، یہ تیز طرار لوگوں کا عالم ہے، رہ گئے سادہ لوح افراد تو ان میں اور طاغوتی شکاریوں میں رابطہ کی نوعیت شیر اور ہرن کی ہے کہ شیر ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وہ شکار کرے اور ہرن ہے ہی اس لئے کہ اس کا شکار کیا جائے......مسلمان اس وقت بالکل ہرن کی پوزیشن میں ہیں کہ جو چاہتا ہے ان کو ابھار کر اور جذباتی بنا کر شکار کر لیتا ہے، دشمن طاقتوں کا ایک مؤثر حربہ یہ ہے کہ اسلام میں جو دو فرقے ہیں شیعہ اور سنی...... ان کو آپس میں لڑایا جائے......مگر ہم کو کیا کرنا چاہئے، جیسا کہ آپ نے کہا کہ ہم کو مثبت بنیادوں پر متحد ہوجانا چاہئے......لیکن تمنائیں

دوسری چیز ہوتی ہیں اور واقعیت دوسری چیز......واقعیت یہ کہ ابھی تو ہم منفی بنیادوں پر ہی متحد ہوتے ہیں، بابری مسجد کی شہادت کے بعد یہ ردعمل ضرور ہوا کہ مسلمان بہت حد تک متحد ہوگئے اور ان کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہندوستان میں ہمارے بقاء کی اور کوئی صورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ کم از کم ہم متحد رہیں......لیکن اصل بات وہی ہے کہ مسلمانوں کو مثبت بنیادوں پر متحد ہوجانا چاہئے، مثبت بنیادیں اسلام کے تین بنیادی عقیدے ہیں، پہلے توحید مطلق، دوسرے نبوت و رسالت اور تیسرے عقیدۂ معاد......عقیدہ یوم آخرت، ان تین بنیادوں کے علاوہ مثبت بنیادیں کون سی ہوسکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمان ان اصولوں پر متحد ہوجائیں اور دوسرے فروعی مسائل کو نظر انداز کئے رہیں تو اس طرح امت کی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

س:- آپ نے کہیں فرمایا ہے کہ ہمارا فیصلہ ہے کہ شاہراہ عام پر تبرا سے گریز کیا جائے گا، تو یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تبرا سے شاہراہ عام پر ہی گریز کیوں اور گھروں اور علاقوں میں گریز کیوں نہیں؟ تبرا کہیں ہو، وہ تو دل آزاری کا سبب بنے گا ہی۔

ج:- شاہراہ عام پر تبرا سے گریز کا جہاں تک سوال ہے، تو دراصل ہم سے مطالبہ ہی یہ کیا گیا کہ شاہراہ عام پر تبرا نہ پڑھا جائے، اسی کا ہم نے جواب دیا کہ شاہراہ عام پر تبرا نہیں پڑھا جائے گا، اس لئے کہ کوئی بھی مذہب کسی دوسرے فرقہ کی دلآزاری کی اجازت نہیں دیتا اور ہمارے ائمہ اطہار کی اس سلسلہ میں خاص ہدایات بھی ہیں اور اسی پر ہمارے تمام علماء کے فتاوی بھی ہیں، نظریاتی اختلاف اپنی جگہ پر ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "اکرموا کریم کل قوم" اس بناء پر ہر قوم کی بزرگ شخصیات کا احترام کرنے پر ہم مجبور ہیں۔

س:- عزاداری اور تبرا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ائمہ اہل بیت کی طرف سے اس کی ہدایت ہے؟ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر تبرا ائمہ اطہار کی ہدایات کا نتیجہ ہے تو پھر اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق مجتہدین کرام کو کیوں کر حاصل ہوسکتا ہے؟

ج:- اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں تک عزاداری کا تعلق ہے تو عزاداری کے سلسلہ میں ہمارے یہاں ائمہ طاہرین کے اتنے زیادہ ارشادات ہیں کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے، اور بہر حال ہمارا اپنا ایک فقہی مسلک ہے، ہمارے جتنے بھی فقہاء گذرے ہیں ابتدا سے لیکر آج تک ان سب نے بالاجماع عزاداری پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اس پر پوری پوری کتابیں موجود ہیں اور یہ ہمارے یہاں کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے اور اسی لئے عزاداری شیعوں کے رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ ہر چیز جب آگے بڑھتی ہے تو اس میں کچھ چیزیں قابل اصلاح ہوجاتی ہیں تو عزاداری میں بھی کچھ چیزیں قابل اصلاح ہیں اور ان کی اصلاح ہونی چاہئے، لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض کررہا ہوں کہ بدقسمتی سے عزاداری کے ذریعے شیعوں کو جو پیغام ہندوستان میں دیا جانا چاہئے تھا وہ ہم نہیں دے سکے، اس کے اپنے اسباب ہیں، اس کا اپنا پس منظر ہے، لیکن ایران میں جو انقلاب آیا ہے اس میں عزاداری کا سب سے بڑا ہاتھ ہے، اس لئے کہ انہوں نے عزاداری کے ذریعے اسلام کی راہ میں جان قربان کردینے کا سبق سکھایا۔۔۔اس لئے ایرانیوں نے اسلام کی راہ میں زبردست قربانیاں دیں اور انقلاب بپا ہوا، انہوں نے اپنے وقت کے یزید کے خلاف جو محمد رضا شاہ پہلوی کی شکل میں موجود تھا ایک عظیم انقلاب بپا کیا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ محمد رضا شاہ پہلوی کے ساتھ تو سپر طاقتیں لگی ہوئی تھیں تو انقلاب رضا شاہ پہلوی کے خلاف نہیں تھا، بلکہ تمام سپر طاقتوں کے خلاف تھا، بہر حال عزاداری کی شرعی بنیاد ہے، اس کے لئے بہت زیادہ تاکید ہے، بہت زیادہ روایات ہیں، اس کا سلسلہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جاملتا ہے، اس قسم کی بعض روایتیں ہمارے برادران اہل سنت کی کتابوں میں بھی مل جاتی ہیں تو یہ کوئی فرضی چیز نہیں ہے، بلکہ خالص دینی شرعی چیز ہے، تبرا کا مسئلہ بڑا نازک ہے، اس لئے کہ جب لفظ سفر کرتے ہیں تو ان کے معنی میں اکثر تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں، تبرا کے ساتھ بھی یہی ہوا، اس کے معنی کچھ تھے اور عوام میں اس کے معنی کچھ اور سمجھ لئے گئے، تبرا کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب آدمی

ایک نظریہ کو مانے گا تو دوسرے نظریہ کو نہیں مانے گا، جو آدمی کمیونزم کو مانے گا وہ سرمایہ دارانہ نظام کو نہیں مانے گا، اسی طرح جو سرمایہ دارانہ نظام کو مانے گا وہ کمیونزم کو نہیں مانے گا، تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام میں دو نظریے چلے، ایک خلافت کا نظریہ اور ایک امامت کا نظریہ، ہم امامت کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں، اس لئے ہم خلافت کے نظریہ کو نہیں مانتے...... بات صرف اتنی ہے کہ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، ان معنوں میں تبرا ہر مذہب ہر مسلک اور ہر نظام کا جزو لاینفک ہے، لیکن تبرا کے معنی گالی قرار دینا غلط ہے، گالی ایک غیر اخلاقی چیز ہے جو صاحب خلق عظیم کے کلمہ گویوں کے شایان شان نہیں۔

س:- اخبارات اس قضیہ کے حل کے سلسلہ میں ایک فارمولہ کو آپ کی طرف منسوب کر رہے تھے، اس کے بعد امریکہ کے سفر سے واپسی پر آپ کی جانب سے بھی اس سلسلہ میں کچھ اسی قسم کے اشارات ملے کہ دونوں فرقوں کے لئے قابل قبول حل پر مشتمل ایک فارمولہ انشاء اللہ پیش کیا جائے گا، کیا آپ اپنے اس فارمولہ پر روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے!

ج:- جی ہاں! یہ فارمولہ میرے ذہن میں ہے اور میں اس پر گفتگو کرنا بھی چاہتا تھا مگر مشکل یہ پیش آئی کہ دو پلیٹ فارم ایسے ہیں جن پر مسلمان اعتبار کرتے ہیں ایک مسلم پرسنل لاء بورڈ، ایک آل انڈیا ملی کونسل...... مسلم پرسنل لاء بورڈ کے دستور میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے مسئلہ میں دخل اندازی نہیں کرسکتا، البتہ ملی کونسل کے ذریعہ میں نے چاہا کہ یہ مسئلہ زیر غور آئے، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے اس میں کافی دلچسپی لی اور مولانا عبد العلیم فاروقی صاحب کو انہوں نے بلایا بھی، ان سے گفتگو بھی ہوئی، مجھ سے بھی گفتگو ہوئی، لیکن قبل اس کے کہ میں اس فارمولہ کے متعلق کچھ عرض کرتا کچھ ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ مجھے اس فارمولہ کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا موقع نہیں مل سکا، پھر بھی میں نے اس کا خاکہ تحریری شکل میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کو دے دیا ہے اور وہ ان کے پاس بطور امانت محفوظ ہے۔

س:- جلوس محمدی کے تعلق سے اس تاثر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ یہ شوشہ سنی فرقہ کے ذہن کو جلوس مدح صحابہ کی طرف سے موڑنے کی ایک کوشش ہے اور اسی طرح بعض فروعی مسائل میں پائے جانے والے ان کے مابین اختلاف سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے؟

ج:- اصل میں جلوس محمدی لکھنؤ میں اٹھتا تھا، ۱۹۳۶ء تک اٹھتا رہا، تو جلوس محمدی قدیم ہے اور جلوس مدح صحابہ بعد کا ہے، جب اس کو اٹھانے کی کوشش کی گئی تو ہم نے اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ خود جلوس میں شامل سنیوں نے اس پر اعتراض کیا، اس پر آپس میں جھگڑا ہوا، آپس کے جھگڑے کی وجہ سے وہ بند ہوگیا، اس کا ریکارڈ خود اہل سنت حضرات کے ایک گروپ دو رکنی سرکاری کمیٹی کے سامنے پیش کیا ہے، لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء تک جلوس محمدی برابر اٹھتا رہا اور وہی لوگ اس کو دوبارہ اٹھانا چاہتے ہیں، بہرحال اگر وہ اٹھانا چاہیں گے تو اس پر ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ جلوس مدح صحابہ کے تعلق سے وضاحت ضروری ہے، ایک شئ ہے مدح صحابہ اور دوسری چیز ہے جلوس مدح صحابہ...... مدح صحابہ کا حق سنی حضرات کو اخلاقی اعتبار سے حاصل ہے، قانونی اعتبار سے حاصل ہے اور مذہبی اعتبار سے بھی حاصل ہے، لیکن میں نے اہل سنت کے چوٹی کے علماء کرام سے جن کے میں نام تو نہیں لے سکتا اس لئے کہ "المجالس بالامانة" جلوس مدح صحابہ کے بارے میں دریافت کیا تو ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ جلوس مدح صحابہ شرعی اعتبار سے بدعت ہے، تو دونوں میں فرق ہے، مدح صحابہ ایک الگ شئ ہے، اور جلوس مدح صحابہ ایک الگ شئ ہے، مدح صحابہ پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ معاہدہ کے مطابق یہ جارحانہ اور دل آزار نہ ہو، مدح صحابہ ہو رہی ہے میلادوں میں ہو رہی ہے، سب طرف ہو رہی ہے، ۶۹ء اور ۷۴ء میں شیعہ سنی معاہدوں میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ سنی حضرات کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی مدح وثناء کا حق حاصل ہے مگر ایسے انداز سے کہ جو دوسرے فرقہ کے لئے دلآزار نہ ہو، اب مسئلہ یہ ہے کہ جلوس مدح صحابہ پر شیعہ حضرات کو اتنا زیادہ

اعتراض کیوں ہے،تو میں عرض کروں گا کہ اعتراض کا سبب وہی ہے جو سنی حضرات کو جلوس عزاداری پر ہے،اس لئے کہ سنی حضرات کو جلوس عزاداری پر کوئی اعتراض نہیں ہے،ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جلوس عزاداری میں کچھ ایسی باتیں کہی جاتی ہیں کہ جس سے ہماری دلآزاری ہوتی ہے،اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے،یہی مسئلہ جلوس مدح صحابہ کا ہے، مجھے یہ بات بڑی اذیت کے ساتھ کہنا پڑ رہی ہے کہ جلوس مدح صحابہ کے نام سے جو جلوس اٹھتے ہیں ان میں جو اشعار پڑھے جاتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ انہیں خود معتدل مزاج سنی بھی شاید برداشت نہ کر سکیں،ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا ہے کہ شیعہ اسے برداشت نہ کر سکیں نکل آئیں اور جھگڑا فساد ہو، یہاں تک کہ بعض اوقات ان اشعار سے اہل بیت کی توہین کے پہلو بھی نکلتے ہیں،تو میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں،وہ بھی ایک طرح کا تبرا ہی ہوتا ہے،مناسب ہے کہ ہر مسلمان اپنے مذہب کے لحاظ سے مستند مذہبی امور انجام دے ،اس قید کے ساتھ کہ نہ شیعہ ایسی کوئی بات کہیں جو سنی حضرات کی دلآزاری کا سبب بنے اور نہ سنی کوئی بات کہیں کہ جس سے شیعوں کی دلآزاری ہوتا کہ اصل اصول وحدت اسلامی پر ضرب نہ پڑنے پائے۔

س:-حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی سے متعلق اخبارات میں آپ کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی کارکردگی آپ کے لئے اطمینان بخش نہیں ہے،اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج:- جی ہاں، کمیٹی کی کارکردگی سے میں اس لئے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں کہ اول تو کمیٹی کے کام کرنے کی رفتار بہت زیادہ سست ہے،،بہت آہستہ روی سے کام کر رہی ہے،دوسرے یہ کہ کمیٹی بہرحال گورنمنٹ کی بنائی ہوئی ہے،اس لئے سرکاری پالیسی سے ہٹ کر تو وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور آپ کو معلوم ہے کہ کمیٹی کا فیصلہ جب آئے گا بی ایس پی کی گورنمنٹ جا چکی ہوگی اور بی جے پی کی حکومت آ چکی ہوگی،آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ فیصلہ کس قسم کا ہوگا،میرے خیال میں تو،خدا کرے میرا خیال غلط ہو،وہ فیصلہ اسی قسم کا ہوگا کہ جس قسم کا فیصلہ ہندوستان سے چلتے وقت انگریز کر گئے تھے،کشمیر کے شوشہ کی شکل میں کہ

جب تک ہندوستان اور پاکستان برقرار رہیں،آپس میں لڑتے رہیں،شیطان کے کان بہرے مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں کمیٹی ایسا فیصلہ نہ کردے کہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے وہ فیصلہ اسلام کے دو فرقوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عداوت کا سبب بن جائے،اس سے میں متوحش ہو رہا ہوں۔

س:- یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ یہ قضیہ عدالت میں ہے تو مسئلہ عدالت میں ہو اس کے لئے عوامی سطح پر احتجاج کے کیا معنی؟ پھر گزشتہ دنوں جلوس عزاداری کے مقابلہ کے لئے جو طریقے احتجاج کے اپنائے گئے وہ خصوصاً ہماری مائیں اور بہنیں سڑکوں پر آگئیں تو اس سے ہماری شبیہ بیگانوں کے سامنے اچھی نہیں بنی۔

ج:- جی، یہ مسئلہ آیا تھا، سرکاری کمیٹی میں اگر عدالت میں کوئی مسئلہ چل رہا ہو اور فریقین آپس میں کوئی بات طے کرلیں اور مصالحت نامہ عدالت میں داخل کرادیں تو مقدمات واپس ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی بڑی مشکل نہیں ہے،اب رہی یہ بات کہ مائیں اور بہنیں سڑکوں پر آگئیں تو اسے آپ یوں ملاحظہ فرمائیں کہ تین شیعہ نوجوانوں نے خودسوزی کرلی،خودسوزی ظاہر ہے کہ اسلام میں جائز نہیں ہے،لیکن جیسا میں نے عرض کیا کہ شیعہ عزاداری کے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ مسلسل بیس سال کی گھٹن اور Frustration کا نتیجہ تھا کہ وہ انتہائی اقدام تک پہنچ گئے، ایسا ہی اقدام عورتوں کی طرف سے بھی ہوا،عورتوں کے اس اقدام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ خالص مذہبی مسئلہ ہے،ابھی تک تاریخ میں کسی سیاسی مسئلہ کے لئے شیعہ یا سنی عورتیں سڑکوں پر نہیں آئی تھیں،تو یہ جو ہمارے سنی حضرات ہیں ان کو یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ شیعہ جب تک شیعہ ہیں جب تک ان کا شیعیت سے برائے نام بھی رابطہ رہے گا تو عزاداری کے بغیر رہنا اور اس کا تصور کرنا ان کے لئے مشکل بات ہوگی اور مجھے جو الجھن ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس گھٹن اور Frustration سے فرقہ پرست طاقتیں کہیں فائدہ نہ اٹھالیں اور ابھی تک ہم لوگوں کا جو کنٹرول ہماری کمیونٹی (Community) کے اوپر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کنٹرول ختم ہوجائے، وہ وقت

میرے لئے بڑی بدنصیبی کا وقت ہوگا اور پھر اس کے بعد جو باتیں سامنے آئیں گی وہ منفی ہونگی اور منفی باتوں کے نتائج منفی ہوتے ہیں، شرعی مجبوری یہ ہے کہ انسان موت کی دعا نہیں کرسکتا لیکن میری تمنا یہی ہے کہ اگر ایسا وقت آنے والا ہے کہ پھر ایک مرتبہ لکھنؤ میں شیعہ سنی جھگڑا ہونے والا ہو تو اس سے پہلے اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے، اس کے علاوہ اور میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

س:- اس قضیہ سے متعلق ایک رائے یہ بھی ہے کہ دونوں جلوسوں پر پابندیاں برقرار رہیں، اس لئے کہ ان دونوں کی غالباً شرعی حیثیت نہیں ہے اور ان کے نکلنے سے امن عامہ میں خلل کے قوی اندیشے ہیں، اس پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

ج:- اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ جلوس عزاداری کی ہماری فقہ کے لحاظ سے شرعی بنیاد ہے، اب یہ علماء اہل سنت طے کریں کہ جلوس مدح صحابہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جہاں تک جلوس عزاداری کا سوال ہے تو اب Frustration اس منزل پر ہے کہ اگر جلوس نہیں اٹھے گا تو ہر سال سرکار کو زبردست ایجی ٹیشن کا سامنا کرنا ہوگا اور میرے ذہن میں جو خاکہ ہے وہ بھی یہی ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو کہ جلوس پر پابندیاں برقرار رہیں تو میری کوشش یہی رہے گی کہ یہ مسئلہ صرف شیعہ بمقابلہ گورنمنٹ رہے، شیعہ بمقابلہ سنی نہ بننے پائے، میں اس کے لئے جتنی بھی صلاحیتیں ہیں ان کو آخری حد تک استعمال کرنے کی کوشش کروں گا۔

س:- کوئی ایسی بات جو سوالنامہ میں نہ آسکی ہو اور آپ کہنا چاہتے ہوں۔

ج:- دیکھئے یہ موقع ضد کا نہیں ہے، شیعہ فرقہ اور سنی فرقہ کے مقامی رہنما اگر مسئلہ حل نہیں کر پا رہے ہیں تو لکھنؤ کے باہر کے علماء کا یہ فریضہ ہے کہ فریقین کو بلا کر سمجھائیں اور ترجیح اول اس بات کو دیں کہ اس شہر میں اب کسی بھی قیمت پر شیعہ سنی فساد نہ ہونے پائے اور کوئی نہ کوئی ایسا فارمولہ نکال لیا جائے کہ ہر فرقہ اپنے مستند مذہبی رسوم یوں انجام دے کہ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہونے پائے، میں تو اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اور اسے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرے نزدیک ترجیح اول اس بات کو ہے کہ شیعہ سنی فساد کا دھبہ اب اس شہر کو نہ لگنے

پائے اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کا قتل نہ ہونے پائے، ایک مسلمان کا ہاتھ دوسرے مسلمان پر نہ اٹھے، میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح طیب و طاہر کس قدر کرب و بے چینی میں ہوگی اور شیطان اور شیطان کی جو پارٹیاں ہیں ان کے دل کس قدر خوش اور مسرور ہوں گے، میں بانگ درا کے ذریعہ یہی پیغام دینا چاہتا ہوں، ہندوستان کے سارے سنی شیعہ علماء کو کہ وہ سمجھ لیں کہ ایک آتش فشاں ہے جس سے ہم بہت قریب ہوتے جارہے ہیں، یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے اور آتش فشاں کے پھٹنے کے بعد اگر آپ آگ بجھانے کے لئے آگے بڑھیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا، متعدد راستے ایسے نکل سکتے ہیں کہ جن سے ہمارے درمیان کوئی ٹکراؤ نہ ہو، ان پر غور کر لیا جانا چاہئے، متضاد مطالبات کے بجائے دونوں فرقوں کا نظریہ ایک ہونا چاہئے کہ آپس میں ٹکراؤ نہ ہو، یہی میرا پیغام ہے اور یہی میں اللہ کی بارگاہ میں صبح و شام نماز کے بعد دعا کیا کرتا ہوں، اللہ نے اس دعا کو سن لیا تو شاید آخرت میں جو سزا ملنے والی ہے اس میں کچھ کمی ہو جائے گی۔

س:- لکھنؤ میں حالیہ شیعہ سنی قائدین کے مابین ہونے والے مذاکرات سے آپ کس حد تک پر امید ہیں؟

ج:- اب تک جو مذاکرات ہوئے ہیں ان میں ایک مثبت پہلو سامنے آیا ہے، اس سے پہلے جو مذاکرات ہوتے تھے اور ان میں جو تلخ ماحول ہوتا تھا کم از کم وہ تلخ ماحول نہیں پایا جاتا اور لوگ ایک دوسرے سے احترام اور خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں اور دونوں ہی پارٹیاں یہ چاہتی ہیں کہ کسی صورت سے کوئی ایسا حل نکل آئے کہ لکھنؤ دوبارہ فسادات کی لپیٹ میں نہ آنے پائے، لیکن بہرحال میرا اپنا نظریہ یہی ہے کہ ہم تحاکم الی الطاغوت کے بجائے قرآن مجید کو اپنا حکم قرار دے کر اور قرآن مجید نے جو اصول بتائے ہیں ان ہی کی روشنی میں ہم کوئی نہ کوئی فارمولہ نکال لیں اور اگر فریقین قرآن مجید کی پابندی کا عہد کریں تو یقیناً ایسے فارمولے نکل سکتے ہیں جن کی روشنی میں ایک منصفانہ اور مثبت حل

سامنے آسکے اور جس سے انشاءاللہ فسادات کا ہمیشہ ہمیش کے لئے خاتمہ ہوسکے۔

س:- خواتین اور مسجد میں ان کی نماز با جماعت کا مسئلہ ان دنوں خبروں میں ہے، اس سلسلہ میں یہ کہا جارہا ہے کہ اس سے مسائل اور مفاسد پیدا ہوں گے، اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟ ویسے خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دینے کے سلسلہ میں آپ کے پیش نظر کون سی باتیں رہیں؟

ج:- اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ کہنی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل میں میڈیا کے رول سے ہمیں بہت زیادہ ہوشیار رہنا چاہئے، مسجد میں عورتیں نماز پڑھ سکتی ہیں یا نہیں یا نماز جمعہ میں عورتیں شرکت کرسکتی ہیں یا نہیں، یہ خالص فقہی مسئلہ ہے، اس میں دو عالموں کی رائے میں اختلاف ہوسکتا ہے، دو مفتیوں کی رائے میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے یہ کوئی جھگڑا نہیں ہے، لیکن میڈیا کی یہ کوشش ہے کہ وہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے اختلاف رائے کو بھی ایک جھگڑے اور DISPUTE کی شکل میں پیش کرے، یہ ان کی ایک بہت بڑی سازش ہے جو ہمیشہ سے چل رہی ہے اور مجھے بہت افسوس ہے کہ بیان دینے کے شوقین حضرات اس سازش سے بے خبر رہتے ہیں اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ جس سے میڈیا کو اپنا رول PLAY کرنے میں بہت آسانی ہوجایا کرتی ہے۔

جہاں تک اس کا سوال ہے کہ اس سے کیا مسائل پیدا ہوں گے تو میرا خیال ہے کہ مسائل اور مفاسد نہیں پیدا ہوں گے، بلکہ میں نے نماز جمعہ میں عورتوں کو شرکت کرنے کی اجازت دی ہے (دعوت نہیں دی ہے) وہ صرف اس وجہ سے کہ مسائل اور مفاسد کو روکا جاسکے، چونکہ میرا نظریہ ہے کہ ایک طرف مغربی تہذیب ہے کہ جس نے عورتوں اور مردوں کو رفیق کے بجائے فریق بنادیا ہے، ایک دوسرے کا اور اس سے امریکہ اور یورپ میں جو مسائل پیدا ہورہے ہیں وہ نظروں کے سامنے ہیں، دوسری طرف اسلامی شریعت نہیں بلکہ مسلم معاشرہ ہے جس نے عورتوں کو ان کے فرائض اور ان کے حقوق سے آگاہ نہیں کیا ہے جس کی بنا پر وہ سکنڈ گریڈ مسلمان ہوکر رہ

گئی ہیں، میرا مقصد نماز جمعہ میں عورتوں کو شرکت کی اجازت دینے کا یہ ہے کہ یہی ایک وہ نماز ہے جس میں خطبہ دیا جاتا ہے اور میں خطبہ کے ذریعہ سے عورتوں کو ان کے فرائض سے بھی آگاہ کروں گا، اور ان کے حقوق سے بھی آگاہ کروں گا، حقوق سے اس لئے آگاہ کروں کہ وہ یہ سمجھیں کہ اسلام نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے، ان کے حقوق کی پوری پوری نگرانی کی گئی ہے اور فرائض سے اس لئے آگاہ کروں گا کہ اچھی نسلیں مسلمان ماؤں کی گود سے پرورش پاکر ملت کو فراہم ہوسکیں، ایک بات اس سلسلہ میں یہ کہی جاتی ہے کہ ایران کا ماحول کچھ اور ہے اور یہاں کا ماحول کچھ اور ہے، یہ بات میرے خیال میں صحیح نہیں کہی جاتی ہے، اس لئے کہ انقلاب سے قبل ایران کا جو ماحول تھا وہ ہندوستان کے ماحول سے ہزار گنا بدتر تھا، وہ تو بالکل پیرس ہورہا تھا، لیکن وہاں کے علماء وہاں کا ماحول بدل سکتے ہیں، ہم یہاں کا ماحول کیوں نہیں بدل سکتے، ماحول بھی ہم بدلیں، اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو نماز جمعہ میں شرکت کی اجازت بھی دی جائے تاکہ اسلام نے ان کو جو حقوق دئے ہیں اور ان کے جو فرائض بتلائے ہیں ان سب سے وہ آگاہ ہوسکیں، لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ میں یہ بات عرض کروں کہ یہاں بھی میڈیا ایک اچھا خاصا رول PLAY کررہا ہے، پہلی مرتبہ جب نماز جمعہ ہوئی ہے تو مجھے بالکل اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ کیمرہ مین وہاں گھس آئے ہیں مسجد بہت بڑی ہے میں بیچ میں کھڑا ہوا تھا، عورتیں ایک گوشہ میں تھیں مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں کیا صورت حال ہورہی ہے، بہرحال آپ جانتے ہیں کہ کیمرہ مین تو ڈائنا کے پیچھے پڑکر اس کی جان لے سکتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ عورتیں بے چاری نماز پڑھ رہی ہیں اور میرا منھ قبلہ کی طرف ہے اور کیمرہ مین بہت دور میری پشت پر کھڑا ہے تو مجھے کیا خبر کہ وہاں کیا ہورہا ہے، عورتیں بھی انہیں نہیں روک سکتی تھیں، اس لئے جب کیمرہ کا Flash ہوا تب عورتوں کو معلوم ہوا کہ ہماری تصویر کھینچی گئی ہے تو جو کچھ ہوا، لاعلمی میں ہوا اور میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کی بنا پر ہوا، لیکن اس کے بعد میں نے سختی سے کہہ دیا ہے کہ کوئی فوٹو گرافر یا کوئی کیمرہ مین مسجد کے اندر داخل نہیں ہوسکتا ہے۔

س:- آیت اللہ خامنہ ای کا ایک فتوی جو جلوس عزاداری اور اماماڑوں سے متعلق

شائع ہوا ہے اس پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

ج:- اس سلسلہ میں اکرام علی صاحب کا مضمون ٹائمز آف انڈیا میں آیا تھا، وہ میرے پاس تشریف لائے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مجھے اس فتوی پر شدید شک ہے، لہذا آپ جب تک اس کی ایران سفارت خانہ سے تصدیق نہ کرالیں، آپ اسے شائع نہ کیجئے گا، یہ میں نے ان سے کہہ دیا تھا وہ ایران سفارت خانہ کو فون کر کے اس کی تصدیق کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے سفارت خانہ سے رجوع نہیں کیا، دوسروں سے پوچھا، کسی نے کہا صحیح ہے کسی نے کہا غلط ہے، لیکن انہوں نے اسے شائع کر دیا، اتفاق کی بات ہے کہ پرسوں ایران کلچر ہاؤس سے جو میگزین نکلتا ہے راہ اسلام اس پر میری نگاہ پڑ گئی، اس میں آیت اللہ خامنہ ای کا وہ فتوی ہے جو انہوں نے دیا ہے اور جو ان کی دستخط اور مہر کے ساتھ ہے اس میں انہوں نے تمام مروجہ مراسم عزا کی بجا آوری پر زور دیا ہے، البتہ قمع زنی کا ذکر اس میں نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک قمع زنی صحیح نہیں ہے تو ٹھیک ہے یہ ایک مجتہد کا فتوی ہے جو ان کی تقلید کرتے ہیں ان کے لئے پابندی ہے، جو دوسرے علماء کی تقلید کرتے ہیں ان کے لئے پابندی نہیں ہے، جہاں تک اس پمفلٹ کا تعلق ہے تو بعد میں مجھے خیال آیا کہ چند سال پہلے جب میں ایران میں تھا تو اس قسم کا پمفلٹ لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر پورے ایران میں تقسیم ہوا تھا اور بعد میں اس کی تردید ہوگئی تھی کہ ایسا کوئی فتوی آیت اللہ خامنہ ای نے نہیں دیا ہے، میں وہاں موجود تھا جب ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ پریس پکڑ لیا گیا جس نے یہ فتوی شائع کیا تھا، اس طرح کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور اس کے لئے ہمارا غیر ذمہ دارانہ رویہ مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

(بانگ درا، لکھنؤ، جولائی، اگست ۱۹۹۷ء)

کمزور قومیں ہمیشہ خود احتسابی سے بچتی رہتی ہیں!

مولانا ڈاکٹر کلب صادق سے ایک ملاقات

ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت کا تصور جب بھی آتا ہے تو اس مختصر سی فہرست میں مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب کا نام نامی اسم گرامی ذہن کے پردہ پر ضرور ابھرتا ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ مولانائے محترم کی جامعیت ہے اور جامعیت بھی اس لحاظ سے کہ ایک طرف مولانائے موصوف سنی شیعہ اتحاد کے نقیب و علم بردار ہیں، اسی کے ساتھ وہ دینی و عصری تعلیمی اداروں کے بانی و روح رواں بھی ہیں، ان کی تقریر دلپذیر کا یہ عالم ہے کہ ان کے بعض جملے غالب کے مصرعوں کی طرح زبان زد ہو جاتے ہیں، مسجد کا منبر ہو یا عوامی نوعیت کا جلسہ، مولانا کی مختصر و جامع تقریر گھنٹوں کی تقاریر پر بھاری ہوتی ہے، علی سیمناری، یونٹی کالج اور خصوصیت کے ساتھ ارا (Era) میڈیکل کالج کے قیام کو قوم وملت مولانائے محترم کے زریں کارناموں کے طور پر مدتوں یاد رکھے گی، قیادت کے منصب پر فائز افراد کے لئے موصوف کی وسعت فکری و بالغ نظری حالات حاضرہ سے باخبری، عزم صمیم، توکل خداوندی کی بدولت مثالی درجہ کی حامل ہے، اکرام انسان کا فلسفہ تو سب بیان کرتے ہیں لیکن مولانا نے عملاً اسے برت کر دکھایا ہے، چنانچہ ان کا یونٹی کالج ہو یا ارا میڈیکل کالج، وہاں سے استفادہ کرنے والوں میں مذہب وملت اور مسلک ومشرب کی کوئی قید نہیں

ہے،ان کی اس نوعیت کی خدمات کا فیض ملک کی سرحدوں سے بھی پرے
ہے اور بیرون ملک میں بھی انسان اورانسانیت کے ایک سچے مخلص
خدمت گذار کی حیثیت سے ان کی ایک شناخت ہے،پیش خدمت ہے
مولانائے محترم کاایک مختصرانٹرویوجس کے مطالعہ کے بعدانشاءاللہ قارئین
کرام بھی راقم کے درج بالا تاثر کی تائید فرمائیں گے،ویسے قارئین کو
اتفاق واختلاف دونوں کاحق ہے۔

س:- جناب والا ایک مدت سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر ہیں، بورڈ میں اکثر اس کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے کہ مختلف مسالک کے ارکان بورڈ کے فیصلوں سے متعلق اپنے فقہی مسلک کے مطابق اختلاف ظاہر کرتے ہیں،جس کا بجاطور پرانہیں حق ہے،البتہ عوام میں اس کا جو پیغام اور Message جاتا ہے اس کے اثرات مثبت نہیں ہوتے،جب کہ بورڈ مسلمانان ہند کا متفقہ پلیٹ فارم سمجھا جاتا ہے،اس سلسلہ میں واقعی اور حقیقی معنوں میں بورڈ کی آواز یا فیصلہ کومتحدہ آواز یا فیصلہ ثابت کرنے کے لئے کیا کیا جانا چاہئے؟

ج:- ہر مسلک کے انسان کواپنے مسلک کے فیصلہ کے اظہار کا حق ہے،لیکن بورڈ کے پلیٹ فارم سے جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہ بحیثیت مسلمان کے کیا جاتا ہے اور بورڈ کا فیصلہ متفقہ ہوتا ہے،البتہ بورڈ کے اجلاس میں کبھی کبھی زیادہ پرجوش ارکان کی طرف سے کچھ ایسے خیالات کا اظہار ہوتا ہے کہ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی ترجمانی کا ان کے علاوہ کسی دوسرے کوحق حاصل نہیں ہے،یہ بات مناسب نہیں ہے مگر چونکہ بورڈ کوتائید الٰہی حاصل ہے،اس لئے دوسرے فریق ایسے مقام پر انتہائی نرمی اور متانت کا مظاہرہ کرتے ہیں،جس سے بات بڑھنے نہیں پاتی،لیکن بجائے خود یہ طریقہ مناسب نہیں ہے،میں نے دیوبند کے کسی بزرگ عالم کے بارے میں یہ پڑھا ہے کہ ان کی پوری زندگی مسلکی مباحثوں میں گزری تھی مگران کے ایک رفیق کا بیان ہے کہ ان کی زندگی کے آخر زمانہ میں خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھے ہیں اوراپنے وقت کے ضائع ہوجا

نے پرانتہائی شرم وندامت کا اظہار کررہے ہیں،میں نے جب ان کے علمی مباحث کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اسی کا تو رونا ہے کہ ساری زندگی ایسے مباحث میں گزرگئی،جو میری نظر میں صواب ہوں مگر ان میں خطا کا احتمال بہرحال ہوتا ہے یا دوسرے فریق کا نقطۂ نظر جس کو ہم نے خطا ثابت کیا وہ بہرحال متحمل صواب ہوگی۔

س:- بورڈ میں اگرچہ اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی لیکن یہ تو ہوا کہ کچھ نئے بورڈ پرسنل لاء کے نام پر ہی وجود میں آگئے،اسے مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اضطراب کا نام دیا جائے یا محض سیاسی کرتب بازیاں کہہ کر دل کوتسلی دے لی جائے۔

ج:-مسلمانوں میں اس مسئلہ میں جو بے چینی پائی جاتی ہے وہ برمحل نہیں ہے،بورڈ کا کوئی نمائندہ بورڈ سے الگ نہیں ہوا،خواتین نے جو بورڈ بنایا ہے وہ ناقابل تذکرہ ہے، بریلوی حضرات نے جو بورڈ بنایا ہے اسے خود بریلوی حضرات میں مقبولیت حاصل نہیں ہے ،اس لئے کہ جس محترم بزرگ نے یہ بورڈ بنایا ہے ملک کا مسئلہ تو الگ رہا،خود ان کے شہر میں ان کے عقیدت مندوں کی تعداد بہت ہی کم ہے،اب رہ گیا شیعہ پرسنل لاء بورڈ کا مسئلہ،یہ بورڈ بہرحال کسی حد تک متحرک ہے،مگر خاصا عرصہ پہلے میری اس بورڈ کے صدر محترم مولانا اطہر صاحب سے ملاقات ہوچکی ہے جس میں انہوں نے صراحت سے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس بورڈ کے نام کا ایک جزء پرسنل لاء بھی ہو،مگر دراصل اس بورڈ کا دائرہ کار صرف شیعوں کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے کوششوں تک محدود رہے گا،امت مسلمہ کے مشترکہ مسائل میں ہم نہ صرف یہ کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے موقف کی تائید کریں گے بلکہ عملی طور پر اسے تقویت بھی دیں گے،اسی لئے میں نے اس مسئلہ کو پرسنل لاء بورڈ کے بھوپال کے اجلاس میں گفتگو کا موضوع قرار نہیں ہونے دیا کہ یہ بورڈ پرسنل لاء بورڈ کے متوازی بورڈ نہیں ہے،اطہر صاحب نے جو کچھ مجھ سے کہا اس پر وہ مکمل طور پر عمل بھی کررہے ہیں،چنانچہ بابری مسجد کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ صدفی صد بورڈ سے اتفاق کرتا ہے۔

س:-ادھر کچھ مدت سے جناب والا کے مذہبی معاملات میں بیانات کچھ اس نوعیت کے

آرہے ہیں جو اکثریت ہضم نہیں کر پارہی ہے، مثلاً فیملی پلاننگ سے متعلق بیان، ایک مصلح کو تو مخالفت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے مگر کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ آپ اپنے مختلف فیہ بیانات سے متعلق کچھ اہم نکات پیش فرمادیں جو عوام کے لئے اطمینان کا باعث بن سکیں۔

ج:- میری سب سے بڑی مشکل ہمارے میڈیا کا مسلم مسائل سے ناواقف ہونا ہے، اور کبھی کبھی بد دیانت ہونا، میری طرف ایسی باتوں کو منسوب کر دیتا ہے جو میں کہتا ہی نہیں ہوں، میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا، جس کا کتاب و سنت میں کوئی تذکرہ نہ ہو، میں نے جب بھی بیان دیا ہے اس میں برتھ کنٹرول کا لفظ استعمال کیا ہے، فیملی پلاننگ کا نہیں کیا، میں میڈیا کو اس طرف متوجہ بھی کر دیتا ہوں کہ فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول میں فرق ہے، مگر وہ میری باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور فیملی پلاننگ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول میں جہاں اور بہت سے فرق ہیں، اس میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ فیملی پلاننگ کے تحت اسقاط حمل کرایا جاسکتا ہے، جب کہ شریعت اسلامیہ میں سوائے چند انتہائی ہنگامی صورتوں کے اسقاط حمل یعنی قتل اولاد کی اجازت نہیں ہے، برتھ کنٹرول کی مخالفت کے بارے میں سب سے زیادہ مستحکم کتاب میرے مطالعہ کی حد تک مولانا مودودیؒ کی ہے، مگر اس کتاب کا جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے، سارا زور اس بات پر ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب رزق اس کے ہاتھ میں ہے تو ہمیں بچوں کی پیدائش پر کسی طرح کا روک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے، مولانائے مرحوم کا فرمانا بالکل صحیح ہے مگر یہ دنیا عالم اسباب ہے، اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو روزی روٹی کے علاوہ بھی بہت سے حقوق لے کے پیدا ہوتے ہیں اور اگر ایک انسان اسے سمجھتا ہے کہ وہ صحت، تعلیم اور تربیت وغیرہ سے متعلق ان بچوں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کر سکے گا تو پھر یہ مسئلہ ﴿لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا﴾ کے تحت آجاتا ہے، اسلام کا پورا نظام حیات عدل پہ قائم ہے اور یہ بات خلاف عدل ہے کہ کسی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری عائد کی جائے۔

برتھ کنٹرول کی ایک شکل عزل ہے، تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے اس پر عمل کیا اور کسی نے اس سے روکا بھی نہیں، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ اس بات کو بے شک قتل کہا جاسکتا ہے، مگر مانع حمل تدابیر کو قتل نہیں قرار دیا جاسکتا، دونوں کے حکم میں فرق ہے جیسے مرغی کے انڈے کو تل کر سب کھاتے ہیں مگر چوزے کو زندہ تل کر نہ کوئی کھاتا ہے نہ کھا سکتے ہیں۔

س:- عالمی سطح سے متعلق کچھ سوالات ہیں جن میں اولیت ایران کی موجودہ قیادت سے متعلق ہے، موجودہ صدر ایران احمدی نژاد صاحب کے جرأت مندانہ بیانات سے جہاں ایک طرف خوشی ہوتی ہے وہیں خدشہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی دشمن اور طاقتور عالمی قوتوں سے ٹکراؤ کے نتائج خدانخواستہ ملک کو پیچھے لے جاسکتے ہیں، اس خیال پر آپ کا تاثر کیا ہے؟

ج:- احمدی نژاد صاحب کی طرف جو بیان منسوب کیا گیا ہے، اس کے دو Version ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے کہا کہ اسرائیل کو مٹ جانا چاہئے، اگر انہوں نے واقعی یہی بات کہی ہے تو یہ تدبیر خلاف ہے، دوسرا Version یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ صہیونیت کا خاتمہ ہونا چاہئے، صہیونیت کسی قوم کا نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک نقطۂ نظر کا نام ہے، جو انتہائی جارحانہ انداز کی ہے، ایسی تمام تحریکوں کو بے شک B.J.P بجرنگ دل، لشکر طیبہ اور حزب المجاہدین کی طرح یقیناً ختم ہوجانا چاہئے، اس لئے کہ یہ ساری ہی تحریکیں بے گناہوں کے خونوں کی ذمہ دار ہیں، جس کی کسی مہذب سوسائٹی میں جگہ نہیں ہے۔

س:- سونامی طوفان ہو یا زلزلہ، اگرچہ یہ قدرت کا تازیانہ عبرت اور قہر الٰہی سے ہی تعبیر کئے جاسکتے ہیں، لیکن ان دونوں قہر میں کچھ ایسی باتیں بھی میڈیا میں آرہی ہیں جو سپر طاقت کی منصوبہ مند شرارت کی طرف نشان دہی کر رہی ہیں، آپ کے نزدیک اس خیال میں کتنی صداقت ہوسکتی ہے، نیز یہ کہ امت عالمی سطح پر سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ممتاز مقام حاصل کرنے کی طرف کب متوجہ ہوگی اور اس سلسلہ میں جو پیش رفت ہو رہی ہے، اس

سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں، اور مزید کیا کیا جانا چاہئے؟

ج:- میں اپنے خیالات میں آزاد ہوں، مگر میں دوسروں کو اپنی رائے سے پورا پورا حق اختلاف دیتا ہوں اور ان کے اس حق کا پورا احترام کرتا ہوں، کمزور قومیں ہمیشہ سے خود احتسابی سے بچتی رہتی ہیں اور ہر مصیبت کی ذمہ داری کسی دوسرے پر ڈالنے کے لئے جستجو کرتی رہتی ہیں، بے شک معبود برحق ارحم الراحمین ہے، مگر حقیر کی نظر میں معبود دو جرموں کو معاف نہیں کرتا، ایک ظلم دوسرے جہالت، ظالموں کے تختے کیسے پلٹے گئے، اس کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے، آفات ارضی و سماوی یا عصری زبان میں جسے Natural Disaster کہا جاسکتا ہے یہ سب ہماری جہالت کی سزا ہے، کسی زمانہ میں چیچک، طاعون اور کالرا کو عذاب الٰہی قرار دیا جاتا تھا جب کہ یہ سب ہماری جہالت کی سزائیں تھیں، ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں نے مرض بعد میں پیدا کئے، دوائیں پہلے پیدا کی ہیں۔

مگر جب بیماریوں کے علاج کے لئے دواؤں کی جستجو نہ ہو بلکہ گنڈے تعویذوں اور منتروں وغیرہ سے کام لیا جائے تو غلط راستہ پر چلنے کا غلط انجام سامنے آئے گا، یہ امراض ناقابل علاج نہ تھے، میڈیکل ریسرچ سے علاج نکل آیا اور یہ بیماریاں صفحۂ ارضی سے ناپید ہوگئیں، طوفانوں اور زلزلوں وغیرہ کے بھی پوشیدہ اسباب ہیں، جس دن سائنس ان اسباب کی کھوج نکال لے گی انشاء اللہ اس کے دفعیہ کی صورت بھی سامنے آجائے گی، اب رہ گئی عصری علوم میں مسلمانوں کی پس ماندگی، تو اس میں نعوذ باللہ نہ قرآن کی خطا ہے اور نہ سنت کی، مگر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو صدی شروع ہوچکی ہے اس میں اگر مسلمانوں نے عصری علوم اور ٹیکنکل علوم میں اور مہارت حاصل نہیں کی تو شدید اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ان کا وجود صفحۂ ارضی سے مٹ جائے اور جو مذہب بیزار قومیں سائنس وٹکنالوجی میں آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں، اگر ان کی یہ بے لگام ترقی اسی طرح جاری رہی تو انشاء اللہ پوری دنیا کا خاتمہ بالخیر ہوجانا یقینی ہے۔

س:- احقر پھر ہندوستان ہی کی طرف لوٹنا چاہے گا، یہاں ایک سلسلہ ہمارے علماء

کے فتووں کا ہے، اس سلسلہ میں ایک پہلو تو مختلف معاملات میں شرعی پنچایتوں کو عدالت کے متوازی قرار دینے کا سامنا آرہا ہے، اس سلسلہ میں مفتیان کرام کو کون سی روش اپنانی چاہئے؟

ج:- علمائے کرام کو آج کل کے زمانہ میں فتاوی دینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، خاص طور پر ایک فرق انہیں ضرور ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے اور وہ فرق ہے مسئلہ اور قضیہ کا، مسئلہ کے سلسلہ میں چاہے وہ بہت زیادہ احتیاط نہ کریں، مگر قضیہ کے سلسلہ میں وہ اس وقت تک فتوی صادر نہ فرمائیں جب تک کہ تمام فریقوں کے بیانات لے کر صورت حال کی پوری تحقیق نہ فرمالیں، اگر یہ احتیاط پیش نظر رکھیں گے تو مجھے امید ہے کہ شریعت کو بدنام کرنے کی میڈیا کی شرارت رنگ نہ لاسکے گی۔

س:- جناب والا یونٹی کالج، علی سیمناری جیسے تعلیمی اداروں کے ساتھ میڈیکل کالج کے بھی روح رواں ہیں، اس طویل تعلیمی خدمات کے دوران برادران وطن اور ملت میں تعلیمی بیداری اور دلچسپی کے سلسلہ میں جناب والا کے تجربات ومشاہدات کیا ہیں؟

ج:- میرا ایک تجربہ خاص طور پر میڈیکل کالج کے قیام کے بعد یہ ہے کہ ﴿ومن يتوكل على الله فهو حسبه﴾ میڈیکل کالج اور اس سے ملحقہ اسپتال کے سلسلہ میں بدعنوان بیوروکریسی، خود غرض نیتاؤں اور فرقہ پرست عناصر کی طرف سے جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں ان کے بیان کے لئے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے، مگر یہ صرف تائید الٰہی تھی کہ ان ساری رکاوٹوں کو عبور کرکے میڈیکل کالج اور اسپتال اللہ کے فضل سے اور ہر قوم کے مخلص افراد کے تعاون سے بن گیا اور اللہ کے فضل سے ٹھیک بنا، اس کی تاسیس سے ملت مسلمہ میں ایک خاموش سگنل یہ ضرور گیا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے، صرف مضبوط ارادے، صحیح منصوبہ بندی اور سب سے بڑھ کر معبود برحق پر توکل ہونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

(ماہنامہ بانگ حرا لکھنؤ دسمبر ۲۰۰۵ء)

مسلمانوں کے آثار اور ان کی شناخت مٹانا

ایک صہیونی سازش!!

فلسطین کے موضوع پر مولانا کلب جواد سے ایک گفتگو

معروف شیعہ عالم مولانا کلب جواد نقوی نہ صرف ایک عالم کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں اور اتحاد بین المسلمین کے پرزور حامی و مؤید ہیں، بلکہ ان کا آشیانہ مسالک و مذاہب سے پرے بھی ہے، اس لئے کہ وہ انسانیت کے بھی خواہ، بلا لحاظ تفریق مذہب وملت غریبوں اور حاجتمندوں کے ہمدرد و ہم نوا ہیں، ان کی اس ہمدردی و ہم نوائی میں وہ اپنی توانائی، اپنی بالغ نظری اور قوت عمل کو بروئے کار بھی لاتے ہیں، قبلۂ اول مسجد اقصیٰ کے انہدام کی خبروں اور فلسطینیوں پر اسرائیلی بربریت و وحشیانہ کارروائی نیز امریکہ کی پشت پناہی نے مسلمانان عالم کو کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے، مولانا کلب جواد نہ صرف اس مسئلہ کو اس انٹرویو میں موضوع بنایا بلکہ وہ عالمی تناظر میں بھی ملت اسلامیہ کے مسائل کو دیکھنے اور سلجھانے کی دعوت بھی دیتے ہیں، چنانچہ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم نے ایک دو سوال ہندوستانی سیاست سے متعلق بھی کر لئے ہیں، امت جسد واحد ہے اور اسے ان حالات میں جبکہ دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے، مسائل پر پوری بصیرت سے غور کرنے اور اس سے آگہی کی ضرورت ہے تاکہ وہ جان سکے کہ کڑیوں سے کڑیاں ملتی ہیں۔

س:- اسرائیل سے متعلق جناب احمدی نژاد نے جو جرأت مندانہ بیان دیا ہے، اس پر جناب والا کا تاثر کیا ہے؟

ج:- آپ کا سوال ہے کہ ایران کے صدر احمدی نژاد صاحب نے اسرائیل سے متعلق جو جرأتمندانہ بیان دیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، کیوں کہ انہوں نے جس اسلامی جرأت کا مظاہرہ کیا اسے حقیقت بیانی پر محمول کیا جاسکتا ہے اور جس بات کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اس بات کا انہوں نے برملا اظہار کر دیا ہے کہ اسرائیل اسلام کے خلاف ایک سازش ہے، مسلمانوں کے خلاف ایک کینسر اور شیطان ہے جس کو ختم ہو جانا چاہئے، یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور زبردستی مسلمانوں پر اسرائیل کو تھوپا گیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ اگر آپ کو یہودیوں سے ہمدردی تھی تو انہیں جرمنی میں جگہ دیدیتے، روس میں اتنے بڑے علاقے خالی پڑے ہوئے ہیں، وہاں ان کو بسایا جاسکتا تھا، کیا ضروری تھا کہ مسلمانوں کے دل میں بسا دیا جائے، سینوں میں ان کو بسا دیا جائے، تو یہ مسلمانوں کے خلاف بالکل گہری سازش ہے جو اسلام دشمن طاقتوں نے رچی ہے۔

س:- 'ہر کمالے را زوالے' کے اصول کے تحت کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ کے زوال کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے ہیں؟

ج:- جی ہاں! آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح سے کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا، روس کے سلسلہ میں کہ کس طرح اتنا بڑا پاور وہ اس طرح تباہ و برباد ہو جائے گا، دیکھئے قدرت نے اسے کس طرح تباہ و برباد کیا، تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ امریکہ کے تباہی کے آثار بھی قریب ہیں، قدرت کو سب پسند ہے مگر غرور پسند نہیں، تو جس طرح سے فرعون ختم ہوا، نمرود ذلیل ہوا، جس طرح سے ہامان کو قدرت نے ذلیل کیا، جس طرح سے ابوجہل وابولہب رسوا ہوئے، تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ انشاءاللہ امریکہ بھی رسوا و ذلیل ہوگا، اور انشاءاللہ اسلامی طاقتوں کو غلبہ حاصل ہوگا۔

س:- عالمی پیمانے پر مسلمان ابتلاء وآزمائش میں مبتلا ہیں، البتہ فلسطین جیسے علاقے ظلم و بربریت کو مدت سے بری طرح سے سہہ رہے ہیں، کیا یہ نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو

مایوسی وافسردگی میں مبتلا کردینے کی سازش تو نہیں ہے؟ اور امریکہ واسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف آواز بلند کرنا کیا انسانیت کے نام لیواؤں کا فریضہ نہیں ہے؟

ج:- یہی افسوس ناک مسئلہ ہے، ہم تو سمجھتے ہیں کہ فلسطینی مایوسی کے عالم میں ہیں، کیونکہ امریکہ بھی اسرائیل کا سپورٹ کررہا ہے۔

ابھی دیکھئے آپ کہ ایک ہزار فلسطینی برسوں سے جیلوں میں سڑرہے ہیں اوراس کے لئے امریکہ نے آج تک کچھ نہیں کیا اور ایک اسرائیلی فوجی پکڑلیا گیا تو جنگ تھوپ دی گئی، بمباری ہورہی ہے، شہر برباد کئے جارہے ہیں، بے گناہ لوگ مارے جارہے ہیں اوراس کے لئے Resolution پیش ہوا تو امریکہ نے اسے ویٹو کردیا کہ یہ اسرائیل کا حق ہے، یعنی ایک سپاہی کے لئے سیکڑوں بے گناہوں کو ماردینا یہ اسرائیل کا حق ہے، تو یہ ہے امریکہ کا انصاف اور یہ ہے امریکہ کی عدالت!

جنوں کا نام خرد پڑ گیا اور خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو پرانی مثل تھی کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اس مثل کی عملی نظیر ہم کو اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہے کہ امریکہ واسرائیل طاقت کے بل پر ظلم وستم کررہے ہیں، اور ظلم کی حمایت کررہے ہیں، مظلوموں کو کچل رہے ہیں، ظالموں کے خلاف آواز بلند کرنا ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کا فریضہ ہے۔

س:- فلسطینی کاز کے لئے مختلف تنظیمیں عرصہ سے برسرپیکار رہی ہیں اور ہیں، بلاشبہ ان کا مقابلہ بڑی طاقتوں سے ہے، لیکن کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ فلسطین کے کاز کے لئے لڑنے والوں سے بھی کچھ غلطیوں کا ارتکاب ہوا؟

ج:- جی! اس میں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ فلسطینی قیادت مایوسی کا شکار ہوگئی تھی اور یاسر عرفات بہرحال انہوں نے تمام زحمتیں برداشت کیں لیکن وہ آخر میں مایوسی کا شکار ہوگئے اورانہوں نے آخر میں امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈالدئے اوراس سے فلسطینی کاز کو بڑا

نقصان پہنچا ہے، عرب ممالک تو ان میں بھی زیادہ تر فلسطین کے حامی ہیں لیکن اندرونی طور پر اور دل کے ساتھ ہم تو نہیں سمجھتے ہیں کہ وہ فلسطین کے صحیح معنوں میں حامی ہوں، کیوں کہ یہاں تک رپورٹ ہے کہ بہت بڑی رقمیں بعض عرب ممالک (جن کا میں نام نہیں لینا چاہتا) اسرائیل کو دیتے ہیں تاکہ اسرائیل ان پر حملہ نہ کرے۔

س:- قبلہ اول بیت المقدس کو کمزور کرنے کی کوششوں کی خبریں آرہی تھیں، اب خاکم بدہن مسجد اقصی کی شہادت کی منصوبہ بندی کی خبریں ہیں، اس دلدوز خبر کو آپ کس عینک سے دیکھتے ہیں؟

ج:- وہ تو پرانی سازش ہے، اس سے پہلے بھی سنا تھا ہم نے کہ کھدائی مسجد اقصی کے آس پاس ہورہی ہے تاکہ بنیادیں کمزور ہوجائیں اور وہ خود بخود گرجائے، یہی سازش ہندستان میں بھی ہوئی، یہاں اسی طرح کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے جو آثار ہیں اور جو عمارتیں ہیں وہ سب رفتہ رفتہ ختم ہوجائیں، یہی آر ایس ایس کی سازش ہے، یہی اسرائیل کی سازش ہے۔

یہی عالمی پیمانہ پر سازش ہے کہ مسلمانوں کے جو آثار ہیں اور نشانات ہیں، وہ ختم ہوجائیں، لہٰذا یہاں بھی اس طرح کی سازشیں رچی جارہی ہیں، متھرا کی فائل کھول دی گئی اور اس کے اثرات آپ دیکھ لیں کہ تاج محل پر پڑرہے ہیں اور وہ پتھر اب ایسا پتھر نہیں رہا جیسا کہ پہلے تھا، تو یہ سازشیں ہر طرف ہیں، لکھنؤ میں بھی آپ دیکھ لیجئے کہ لاکھ کوششیں کہ جو رومی دروازہ ہے اس میں سے کوئی ٹرک، ہیوی ٹرک نہ گزریں لیکن ابھی تک اس میں سے بھاری بھرکم ٹریفک گزریں گی اور اس میں Crack دراڑیں پڑگئی ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ایک انٹرنیشنل سازش ہے، اس میں آر ایس ایس بھی شریک ہے، اسلام دشمن طاقتیں اس میں شریک ہیں، یہ سب مسلمانوں کے آثار اوران کی علامتیں ختم کردینے کے آثار ہیں۔

س:- ابتلاء وآزمائش، ظلم وبربریت اور شک وشبہ کی موجودہ فضا نے عام مسلمانوں کو مایوس کررکھا ہے جب کہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ مسلمانوں پر آج سے کہیں زیادہ سخت

حالات آئے، لیکن وہ عارضی ثابت ہوئے اور اسلام کو دبانے کی جتنی کوشش کی گئیں وہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آیا، اس موقع پر یا ان حالات میں آپ مسلمانوں سے کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- ﴿لاتقنطوا من رحمة الله﴾ اللہ کی رحمت سے مایوسی نہیں ہے، آپ دیکھئے کہ بنی اسرائیل کتنے دنوں زحمتیں برداشت کرتے رہے، کتنے چیر دئے گئے، کتنے مار دئے گئے، آخر میں ان کو فتح ہوئی اور فرعون جو تھا وہ ڈوب گیا، نمرود نے کتنے ظلم وستم کئے، آخر میں مچھر کے ذریعہ اس کو نیست ونابود کر دیا گیا، اسی طرح عرب میں کتنے ظلم وستم ہو رہے تھے لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے آواز بلند کی اور کس طرح سے دشمنوں کو شکست ہوئی، بہر حال وقت تو لگتا ہے، کبھی کبھی افراد کے امتحان ہوتے ہیں، کبھی کبھی پوری قوم کے تو اس وقت افراد کے بجائے قوموں کے امتحانات ہو رہے ہیں، اب جب کہ ملت اسلامیہ کا امتحان ہو رہا ہے تو انہیں ثابت قدمی کا ثبوت دینا ہوگا اور ثابت قدمی ہی سے انشاء اللہ ان کو فتح ہوگی۔

س:- یہود ونصاریٰ کے باہمی اختلافات کی ایک تاریخ رہی ہے، لیکن مسلم دشمنی میں وہ صف آرا ہیں، کیا مستقبل قریب میں اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ یہود ونصاریٰ کے باہمی مراعات مسلم دشمنی پر غالب آجائیں گے؟

ج:- دیکھئے الکفر ملة واحدة وہ تو ہے ہی اپنی جگہ پر، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، ان کے باہمی اختلاف ہوسکتے ہیں، آپس میں وہ لڑ سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے خلاف یہ سب متحد ہیں اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں ہوتی ہیں، انہیں یہ مل جل کر کرتے ہیں، ان کے آپسی مفادات جیسے کی نوعیت کچھ ایسی ہے، جیسے چوروں میں مال کے بانٹنے میں لڑائی ہوسکتی ہے لیکن وہ چوری میں اتفاق واتحاد رکھتے ہیں، تو بس ایسا ہی مسئلہ ہے کہ ان میں آپس میں مال بانٹنے میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن مسلمانوں کے خلاف سازشیں بڑی زبردست ہو رہی ہیں اور مسلم دشمنی کے معاملہ میں وہ متحد ہیں، صرف یہ نہیں کہ فلسطین ہی میں سازشیں ہو رہی ہیں، بلکہ پوری ملت اسلامیہ اور عالم اسلام میں سازشیں ہو رہی ہیں، اس سازش کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑایا

جائے، ان کا اتحاد ختم کیا جائے، یہ بہت ہی خطرناک سازش ہے، پاکستان میں بھی اور یہی کام عراق میں بھی کیا جا رہا ہے، عراق میں آپ دیکھیں کہ وہاں کی مسجدوں میں بم پھٹ رہے ہیں اور مقدس مقامات کے اوپر بم پھٹ رہے ہیں، بازاروں میں بم پھٹ رہے ہیں، اگر حکومت کے خلاف احتجاج مقصود ہے تو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ احتجاج کیجئے لیکن مسجدوں میں بیٹھنے والے نمازیوں نے کیا کیا، یہ بازار میں بچے اور عورتیں اور بے گناہ لوگ چل رہے ہیں، ان کی کیا خطا؟ تو وہاں بم پھٹتے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں مر رہے ہیں، تو مقصد یہی ہے کہ عالم اسلام میں انتشار بپا ہو جائے اور مسلمان آپس میں دست بگریباں ہو جائیں، ایک دوسرے کا خون بہانے لگیں، یہ بہت تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے، مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ ملوث افراد بظاہر مسلمان ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ وہ واقعی مسلمان ہیں بلکہ وہ جو بھی ہوگا اسلام دشمن طاقت کا ایجنٹ اور آلہ کار ہوگا۔

س:- امریکہ کی غنڈہ گردی، اسرائیل کی ننگی جارحیت اور دنیا کے دوسرے ممالک میں مسلمانوں پر آزمائش کی اس گھڑی میں عالم عرب کے ۵۵ سے زائد ممالک کی مجرمانہ خاموشی کو مفاد پرستی اور خود غرضی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- بات اصل میں یہ ہے کہ عالم عرب کے حکمراں اپنے اقتدار کو دیکھ رہے ہیں، وہ اپنی کرسی کے وفادار ہیں اور اسلام کے اور مسلمانوں کے وفادار نہیں ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دشمنوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، آپ دیکھیں کہ عراق کے بہانے پوری سازشیں جو ہوئیں کہ پہلے تو یورپ وامریکہ نے عراق کو آمادہ کیا کہ وہ ایران پر حملہ کرے اور تباہی وبربادی پھیلائے، پھر عراق کو آمادہ کیا کہ وہ کویت پر حملہ کرے، مگر جب کویت پر قبضہ کروا دیا تو پھر امریکہ کویت کے بہانہ وہاں پہنچ گیا، اس وقت اس کی لاکھوں فوجیں خلیج میں موجود ہیں، اگر آپ دیکھیں تو حقیقی معنوں میں پورا عالم اسلام انہوں نے گھیر رکھا ہے، بحرین میں ان کا اڈہ ہے، مسقط میں ان کا اڈہ ہے، کویت میں ان کا اڈہ ہے، ترکی میں ان کا اڈہ ہے، افغانستان میں

ان کی فوجیں ہیں، عراق میں ان کی فوجیں ہیں، چاروں طرف سے انہوں نے عالم اسلام کو گھیر رکھا ہے، ان کی حکومتوں کو چونکہ خطرات ہیں، لہذا ایک لفظ کوئی حکمراں بول نہیں رہا ہے، تمام مسلمان امریکہ کے مخالف ہیں، لیکن حکمراں جو ہیں وہ خوف زدہ ہیں، بجائے اس کے کہ وہ اللہ سے خوف زدہ ہوں، وہ امریکہ سے خوف زدہ ہیں۔

س:- حادثات وسانحات کے رونما ہوتے ہی بلا تحقیق، بلا تاخیر و بلا تامل کسی نہ کسی مسلم تنظیم کا نام اس حادثہ سے جوڑ دیا جاتا ہے، یہ انصاف پر مبنی نہیں ہے، اس غیر ذمہ دارانہ عمل پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- دیکھئے ہم نے اسی لئے ابھی بیان دیا ہے، ابھی ہم نے کہا ہے کہ حکومت کے بیانات، پولیس کے بیانات یہ ہمارے لئے قابل اطمینان واعتماد نہیں، بلکہ اس کے لئے ہم تو چاہتے ہیں کہ سنٹرل گورنمنٹ اس کے لئے ایک ہائی لیول پر کمیٹی بنائے اور اس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل ہوں، پڑھے لکھے ہائی لیول کے لوگ شامل ہوں، اس میں جس میں مسلمان بھی ہوں، ہندو بھی ہوں، سکھ ہوں، عیسائی ہوں، ایک کمیٹی بنے اور وہ ان واقعات کی تحقیق کرے اور پوری رپورٹ دے کیونکہ پولیس اپنا دامن بچانے کے لئے کوئی بھی نام لے لے تو ہمیں کیا پتہ کہ وہ نام صحیح ہے یا غلط؟ ہم تو نہیں سمجھتے کہ ان کی بات پر زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ اپنا دامن بچانے کے لئے بھی نام لے سکتے ہیں۔

س:- دنیا کا المیہ ہے کہ وہ مسائل کو مذہبی عینک سے دیکھتی ہے اور انسانی مسئلہ کی حیثیت سے اسے پیش نہیں کرتی، اسرائیل کی فلسطین ولبنان میں بربریت اور امریکہ کے عراق پر حملہ کو کیا اس عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا؟

ج:- جی ہاں! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسرائیل بے انتہا ظلم کر رہا ہے اور انسانیت کو اپنے پیروں تلے روند رہا ہے اور اس کے بعد ہم تو سمجھتے ہیں کہ جس کے بھی دل میں کبھی انسانیت کا درد ہے، رحم ہے، جذبۂ ہمدردی ہے، اس کو ظلم و بربریت کی مخالفت کرنا چاہئے، احتجاج کرنا چاہئے کیونکہ اس وقت ان مقامات پر وحشیانہ کارروائیاں ہورہی ہیں، وہ

انسانیت کے خلا میں ان کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہئے کہ ان کا مذہب کیا ہے، دین کیا ہے، دھرم کیا ہے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ کام انسانیت کے خلاف ہورہا ہے لہذا انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ظلم کی جو اسرائیل کر رہا ہے اس کی مخالفت کی جائے، جہاں بھی ہو صرف اسرائیل کی بات نہیں کہیں بھی ظلم ہو، کہیں بھی بے گناہوں کو مارا جارہا ہو، جہاں بھی بچے یتیم ہورہے ہوں اور عورتیں بیوہ ہورہی ہوں، تو احتجاج کرنا چاہئے، وہ انسانیت مخالف ہے اور ایسی کارروائیوں کی مذمت انسانی بنیادوں پر ہونا چاہئے۔

س:- آپ نے سیاسی اتحاد بین المسلمین کے سیاسی وژن قائم کرنے کی نیت سے جو پی ڈی ایف (پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ) بنائی ہے، وہ اپنوں اور غیروں کے نزدیک موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ اتحاد کے نام پر اس کا نتیجہ انتشار ہی کی صورت میں سامنے آئے گا، اس پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

ج:- دیکھئے اصل میں یہ ہے کہ ۵۸-۵۹ سال سے تو یہ ہورہا ہے کہ مسلمان متحد نہ ہونے پائیں، ہر کمیونٹی ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ متحد ہو، سوائے مسلمانوں کے، ادھر مسلمان متحد ہوئے ادھر ہنگامہ ہوجاتا ہے کہ آپ کے متحد ہونے کے نتیجہ میں فلاں قوم متحد ہوجائے گی، آپ متحد ہوجائیں گے تو یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا، یعنی آپ آپس میں لڑتے ہی رہئے، آپ کو اتحاد کا حق حاصل نہیں ہے اور نہ آپ اپنے حقوق حاصل کرسکتے ہیں، آپ غلام بنے رہئے بس، تو اسی کی آواز بلند کی گئی ہے کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آئیں، ایک جگہ جمع ہوں، سب تنظیمیں جمع ہوں، علماء جمع ہوں، یہ ایک کوشش ہے، اب دیکھئے کہ کہاں تک کامیابی ہوتی ہے کیونکہ ابھی تو ابتداء ہے، لہذا ابھی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں کتنی کامیابی ہوگی لیکن یہ ایک کوشش ہے، کوئی یہ نہ کہے کہ صاحب! کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی، لہذا ہم نے ایک قدم بڑھایا ہے، ہم نے ابتداء کی ہے اب ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کی بیداری اور بیدار مغزی پر محمول ہے اور علماء سے مسلمانوں کی وفاداری پر موقوف ہے کہ وہ سیاسی پارٹی کے وفادار ہیں یا اسلام اور مسلمانوں کے وفادار ہیں، اسی پر ہماری کامیابی کا

انحصار ہے، ہم تو پرامید ہیں کہ انشاء اللہ مسلمان ہمارا ساتھ دیں گے، مشکلیں تو بہر حال ہیں کیونکہ ۵۹ سال سے اس نوعیت کی کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی اس لحاظ سے یہ بالکل نیا قدم ہے، تو اس میں ظاہر ہے کہ فوراً کامیابی تو نہیں مل جائے گی، کوئی ایک دم سے معجزہ ہوجائے اور کامیابی مل جائے، بلکہ اس کے لئے سخت محنت کرنی ہوگی، کوشش کرنی ہوگی، لوگوں کو بیدار کرنا ہوگا اور ان سے کہنا ہوگا کہ بھئی! کب تک وہ دوسروں کے غلام بنے رہیں گے، سیاسی غلام بنے رہیں گے، نوکریاں دوسروں کی کرتے رہیں گے اور یہی آپ دیکھئے یہ مثال آپ کے سامنے موجود ہے کہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہورہی ہے کہ کورٹ نے آرڈر بھی کردیا ہے کہ معلم اردو B.D.C کے برابر ہے، ان کو نوکریاں ملنی چاہئیں لیکن آج تک نہیں مل رہی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ محض ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے، وہ وفادار اپنی حکومت کے ہیں، اپنی پارٹی کے ہیں، مسلمانوں کے نہیں۔

(روزنامہ جدید عمل لکھنؤ: اتوار ۲۳ - جولائی ۲۰۰۶ء)

اس ملک میں اللہ کا دین مغلوب
اور اس کے ماننے والے مجبور و بےبس ہیں!

ملی پارلیمنٹ کے قائد
جناب راشد شاذ سے ایک ملاقات

گذشتہ مہینوں راقم سطور کو جناب راشد شاذ کی ملی پارلیمنٹ کے اجلاس پٹنہ میں شرکت کا اتفاق ہوا، اس موقع پر ہندوتو کے نقیب ہفت روزہ پانچ جنیہ سے لے کر ایک زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے مسیحا سمجھے جانے والے سید شہاب الدین تک نے ملی پارلیمنٹ کو ہدف ملامت بنایا، اس سفر میں ایک طرف ملتِ اسلامیہ ہند کے موقر علماء و دانشوروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ملی پالیمنٹ کے سلسلہ میں ان کے ناخوشگوار تاثرات سامنے آئے تو دوسری طرف پریس نے اسے ایک فتنہ سے تعبیر کیا، ''اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش'' کی اس صورتِ حال نے مجھے ترغیب دلائی کہ اس کے قائد کے سامنے یہ اشکالات رکھے جائیں اور ملی پارلیمنٹ کے اس ''معمہ'' کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ ذیل میں وہ سوالات و جوابات پیش خدمت ہیں، ضروری نہیں کہ جناب راشد شاذ کے ان افکار و آراء سے کلی طور پر اتفاق کیا جائے اور نہ ہی اس انٹرویو کی اشاعت موجودہ پارلیمانی الیکشن سے کوئی مناسبت رکھتی ہے، بانگِ درا میں انٹرویو کا ایک سلسلہ جاری کیا گیا ہے اور یہ انٹرویو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور بس!

س:- اپنے سیاسی بل میں آپ نے مسلمانوں کو متحد ہو کر سیاسی پارٹیوں کے نہیں بلکہ مسلمانوں کے حقیقی نمائندوں کو پارلیامنٹ میں نمائندگی دینے کی بات کہی ہے، اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ملی پارلیامنٹ عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اگر نہیں، تو اس صورت میں کیا سبیل نکل سکتی ہے؟

ج:- ہم نے بہت غور کیا اور اپنے تئیں اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی کہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے امکانات تلاش کئے جا سکیں لیکن ایک طویل غور وفکر کے بعد بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ موجودہ سیاسی نظام میں بحیثیت امت تو کجا بحیثیت ایک عام قوم کے بھی ان کے سیاسی حقوق کا تحفظ یا ایک مستحکم سیاسی قوت کی حیثیت سے ان کا اُبھرنا بعید از امکان ہے، بات یہ ہے کہ موجودہ سیاسی ڈھانچہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس میں قیامت تک بھی مسلمانوں کو ایک قوت کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔

پھر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ سیاسی انصاف کا عین تقاضا ہے کہ ہر مذہبی گروہ کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کے سلسلے میں اسے آزادی ملنی چاہئے، موجودہ ڈھانچے میں مسلم نمائندوں کی نامزدگی غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کی ہائی کمان کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، یعنی بنیادی طور پر پارلیامنٹ میں پہنچنے والا ہر مسلمان (استثناء چند مسلم جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے) غیر مسلموں کا نامزد کردہ نمائندہ ہوتا ہے جنہیں غیر مسلم سیاسی پارٹیاں اپنے مفادات کے میزانیے کی روشنی میں نامزد کرتی ہیں، اب عامۃ المسلمین سے یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں مختلف نامزد کردہ امیدواروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو، بات بہت سادہ سی ہے کہ کفار کے ذریعہ نامزد کردہ لوگ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں۔

مسلم سیاسی بل میں ہم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جانا چاہئے جس کے لئے جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر متناسب نمائندگی کی بات کہی گئی ہے، گویا ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوک سبھا کی ۱۱۹ نشستوں پر ملک گیر سطح پر رائے شماری کے

ذریعہ مسلمان اپنے حقیقی نمائندے منتخب کر سکیں، مسلم سیاسی بل سیاسی انصاف کے قیام کی ایک کوشش ہے، گزشتہ پچاس سال کی سیاسی تاریخ چونکہ بدترین سیاسی ناانصافی کی تاریخ ہے جس میں مسلمانوں کو ان کے تناسب کے اعتبار سے کبھی نمائندگی نہیں مل سکی، اب بھلا جو نظام حکومت نصف صدی تک سیاسی انصاف دینے میں ناکام رہا ہو اس کے مزید جاری رکھنے کا کیا جواز ہے، ہم جبر بھری اس صورت حال کو یکسر تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔

رہی عملی سیاست کی بات تو ہم اس میں اس وقت تک کیسے حصہ لے سکتے ہیں جب تک کہ کھیل کے بنیادی اصول پھر سے طے نہ کر لئے جائیں۔ موجودہ صورت حال میں الیکشن کے نظام کو بدلے بغیر اس میں حصہ لینا ہمیں کسی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔

س:- یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پایا جاتا ہے، اس صورت میں آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک ایک ووٹ ایک ہی جھولی میں پڑے گا؟

ج:- ہمیں یہ ہرگز توقع نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کا ایک ایک ووٹ ایک ہی جھولی میں ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور نہ ہم اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ کو بٹور کر مشرک سیاسی پارٹیوں میں سے ہی کسی ایک کی جھولی میں ڈال دیں بلکہ ہم تو ایک ایسی جھولی کی تلاش میں ہیں جس میں ووٹ ڈالنا ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کا سبب بنے، ہم مسلمانوں کو کفر کی قیادت میں نہیں بلکہ اسلام کی قیادت میں متحد کرنا چاہتے ہیں، موجودہ صورت حال میں جب مسلمانوں کے لئے کافر پارٹیوں میں سے ہی کسی ایک کو ووٹ دینا ہو، ہمارے لئے یہ امر قطعاً بے معنی ہے، ان کا ووٹ منتشر ہو یا متحد، اِس جھولی میں پڑے یا اُس جھولی میں، یاد رکھئے کہ اگر ہمارے ووٹ سے نظام کفر کو مزید تقویت ملتی ہے اور موجودہ صورت حال مزید برقرار رہنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ہر ووٹ سے خدا اور اس کے رسول ﷺ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں، ہم تو ایک ایسی صورت حال پیدا کرنے کے لئے اٹھے ہیں جس میں ہمارا ہر ووٹ اور ہر عمل کفر کے بجائے اسلام کے استحکام کا باعث بنے گا۔

س:-آپ کی جانب سے آویزاں پوسٹرز اور دعوت ناموں سے یہ تأثر قائم کیا جارہا ہے کہ آپ علماء بیزار ہیں، اس جملہ کو طبقہ علماء پر حملہ سے تعبیر کیا جارہا ہے کہ ''علماء نے جوتیاں سیدھی کی ہیں''، علماء کے حلقے کی ناراضگی کو مول لے کر کیا ملت کا کوئی کام خصوصاً اتحاد واتفاق کا کام ممکن ہوسکتا ہے؟ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا رشتہ علماء سے منقطع کرنے کی منصوبہ بند کوششیں ہورہی ہیں، ملی پارلیامنٹ کو اسی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

ج:-میرے خیال میں یہ تاثر صحیح نہیں ہے کہ ہم علماء بیزار ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ خود ملی پارلیامنٹ میں علماء اور فارغین مدارس کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، رہے وہ لوگ جنہوں نے قال اللہ اور قال الرسول کے حوالے سے بدترین دنیاداری کی مثالیں قائم کی ہیں اور جن کی کوششوں کا مقصد نظام کفر سے چند مراعات کے حصوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم ان بازاری اور سرکاری علماء سے یقیناً امت کو چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں اور ان سے ہم اپنی برأت اور بے زاری کا اعلان کرتے ہیں، جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ حلقۂ علماء کی ناراضگی مول لے کر امت کے اِحیاء کا کام نہیں کیا جاسکتا تو ایسا سمجھنا غلط ہے، خدا کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کی موجودگی کے بعد کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں کو اللہ کے کلمے کی بلندی سے روک سکے یا نظام کفر کی تابعداری پر زیادہ دنوں تک مطمئن رکھ سکے۔

الحمد للہ کہ رسول ﷺ کی محبت اور خدا کی کتاب کی عظمت ہر مسلمان کے دل میں کچھ اس طرح رچی بسی ہے کہ وہ اس راہ میں کسی بھی دھوکے کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں سوادِ اعظم نے علماء سوء کے خلاف بغاوت کی ہے، رہے وہ مسند نشیں جو اپنی خالص مادی دوڑ دھوپ اور حصولِ دنیا کی کوشش کو روحانی حوالے سے آج بھی مستند کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور جو اعلائے کلمۃ الحق کی ہر کوشش کو علماء کے خلاف منصوبہ بند سازش بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تو انہیں اس سازش پر تفصیل سے روشنی ڈالنی

چاہئے اور ان کی کڑیوں کو تفصیل سے بے نقاب کرنا چاہئے، موجودہ دور میں جب اطلاعات کی بہتات ہے اور جب ہر شخص کے لئے ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کو سمجھنا ممکن ہے، محض مبہم الزامات سے کام نہیں بنے گا، رہی یہ بات کہ ملی پارلیامنٹ مسلمانوں کا رشتہ علماء سے منقطع کرنے کی منصوبہ بند کوشش کررہی ہے تو اس بات کے تو ہم بھی قائل ہیں کہ یقیناً ان علماء سے ہم مسلمانوں کا رشتہ منقطع کرنا چاہتے ہیں، جنہوں نے اپنا رشتہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے منقطع کر کے کافر ومشرک حکمرانوں سے بنا رکھا ہے۔

س:-ہندوستان میں ملی مفادات کے لئے کام کرنے والی مختلف سیاسی و نیم سیاسی جماعتیں وتنظیمیں ہیں، کیا آپ کو ان میں سے کسی ایک سے بھی اتفاق نہیں ہے؟ ان ساری تنظیموں کی موجودگی میں ایک نئی تنظیم بنانے کی آپ کو کیوں ضرورت پیش آئی، اس کی انفرادیت، اس کے مقاصد اور اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟

ج:-ہندوستان میں اسلام کی سربلندی کے لئے جو جماعتیں سرگرم ہیں ان میں سے ہر ایک سے کسی نہ کسی سطح پر اتفاق ضرور ہے کہ ہم ان کے کاموں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، البتہ ان ساری تنظیموں کی موجودگی کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اسی ملک میں اللہ کا دین مغلوب اور اس کے ماننے والے مجبور و بے بس ہیں جس سے اس بات کا جواز فراہم ہوتا ہے کہ محض موجودہ تنظیموں کے کاموں کو نگاہِ تحسین سے دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، ملی پارلیامنٹ کا مختصر سا قافلہ اسی ضرورت کے پیش نظر وجود میں آیا ہے، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ روزِ اول سے ہم نے ملی پارلیامنٹ کو ایک تنظیم بنانے سے گریز کیا ہے، اس کے برعکس ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک متحدہ فورم تشکیل دے سکیں، ایک ایسا ایوان تشکیل دے سکیں جسے عامۃ المسلمین اپنی پارلیامنٹ کا نام دے سکیں، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہاں مختلف مسالک اور جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں، بوڑھے بھی ہیں، نوجوان بھی، عمر رسیدہ خواتین بھی ہیں اور کم سن لڑکیاں بھی، جدید دانش گاہوں

سے فارغ لوگ بھی ہیں اور سکہ بند علماء بھی، اپنے انداز کا یہ خود بہت اہم تجربہ ہے جس میں امت کے مختلف دھڑوں اور مختلف طریقۂ فکر رکھنے والے لوگوں کو بنیادی ایجنڈے پر جمع کیا گیا ہے، اللہ کا فضل ہے کہ اس دائرۂ کار کو وسیع کرنے میں اور امت کو ایک وحدت کے طور پر برتنے میں ہمیں حوصلہ افزاء تجربات ہوئے ہیں اور ایک عوامی تحریک برپا کرنے کے سلسلے میں اپنی کوششوں پر اعتماد پیدا ہوا ہے۔

س:-ملی پارلیامنٹ کے قیام سے لے کر اب تک اس کی نمایاں خدمات کون سی ہیں، اس کا دائرۂ کار کیا ہے، آپ کے پوسٹر میں بوسنیا اور چیچنیا میں مہم جوئی کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں ہم خصوصیت کے ساتھ جاننا چاہیں گے کہ وہاں آپ کی خدمات کس نوعیت کی رہیں اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج:-ملی پارلیامنٹ نے اب تک اپنی کارگزاریوں کی کوئی رپورٹ شائع نہیں کی ہے اور نہ ہی اس طریقۂ کار کو ہم اپنے مزاج سے ہم آہنگ سمجھتے ہیں، اگر گاہے بہ گاہے کہیں کسی مہم جوئی کا تذکرہ آ گیا تو صرف اس لئے کہ عامۃ الناس کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ صرف تاریخ کی کتابوں میں نہیں بلکہ واقعات کی موجودہ دنیا میں بھی مختصر سے گروہ کی کوششوں کو اللہ نے اپنی نصرت سے نوازا ہے، اس بارے میں کوئی تفصیلی تبصرہ ہم فی الوقت مناسب نہیں سمجھتے، البتہ اندرون ملک ہمارا یہ احساس ہے کہ مسلمانوں کو ایک نئے انداز سے دعوتِ فکر دینے کے سلسلے میں قدرے پیش رفت ہوئی ہے اور مضطرب دلوں میں عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ موجودہ نظامِ جبر کو اُلٹ پھینکنا ناممکن نہیں۔

س:-آپ کے اپنے خطبہ سے جو نظریہ سامنے آتا ہے، وہ حکومتِ الٰہیہ کا ہے، لیکن اس سمت میں جس تنظیم نے کوششیں کی ہیں اس کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کام کیا جائے تاکہ دعوت کے امکانات بھی رہیں اور فسطائی قوتیں مزید زور نہ پکڑیں، ان تجربات کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:-میں اس تنازعہ میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کسی تنظیم کا نقطۂ نظر پہلے کیا تھا اور اب کیا

ہوگیا ہے، آیا وہ اپنے پہلے مرحلے میں دعوتِ حق کے علمبردار تھے یا نئی پالیسی کے نتیجہ میں ہوگئے ہیں، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول سے بیعت کے بعد ہم کسی اور کو امت کی قیادت حوالے نہیں کر سکتے، اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کے بعد ہم کسی اور ازم سے اپنی وفاداری استوار نہیں کر سکتے، خواہ یہ سیکولرزم ہو یا ڈیموکریسی اور یہ کہ خواہ سیکولر ڈیموکریسی کی خوبصورت تشریح کیوں نہ وجود میں لے آئی گئی ہو۔ حالات کا جبر کتنا ہی سخت ہو ہم بیک وقت کفر اور اسلام دونوں سے خوشگوار تعلقات نہیں رکھ سکتے۔

مسلمان کی حیثیت سے قرآن کے مطابق زندگی گزارنا اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا نیز ایک ایسی صورت حال پیدا کرنا جس میں قرآنی زندگی جینا آسان ہو، ہمارا بنیادی فریضہ ہے، ہم اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے، ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ قرآن اس ملک کے مسلمانوں کے لئے بھی کتاب ہدایت ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یا جماعت یہ کہتی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں سیکولر ڈیموکریسی ہی مناسب طریقۂ زندگی ہو سکتی ہے اور اس کے ذریعہ فاشزم پر قابو پایا جا سکتا ہے تو میرے نزدیک وہ صریح کفر کا ارتکاب کرتی ہے، ہمیں رہنما اصولوں کے تعین میں ہمیشہ محتاط ہونا چاہئے، یہ صحیح ہے کہ ہم راتوں رات کسی نظام کو نہیں بدل سکتے لیکن ایمان کی رو سے ہم ایک لمحے کے لئے بھی اسے اپنے ایمان کا جز نہیں بنا سکتے، یہ خوب جان لینا چاہئے کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی دوسرا ازم ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ ایسا کرنے میں خدا اور اس کے رسول سے کی گئی ہماری بیعت ٹوٹ جاتی ہے۔

س:- کفار و مشرکین کی اصطلاحات استعمال کرنے سے کیا امتِ دعوت اور مدعو قوموں میں بُعد نہیں پیدا ہوگا اور ہمارے اس رویّہ سے کیا ہم اپنے لئے دعوت کے امکانات کو ختم نہیں کر دیں گے؟

ج:- کفار و مشرکین کی اصطلاح قرآنی اصطلاح ہے، قرآن معاشرے کو امتِ کفر اور امتِ اسلام میں بانٹتا ہے، البتہ امتِ کفر کے لئے ہمیشہ یہ گنجائش رہتی ہے کہ وہ اپنے کفر سے تائب ہو کر اللہ کی بندگی میں داخل ہو جائے، قبولِ اسلام کے بعد سابق کافر مستند مسلمان

ہوجاتا ہے، آپؐ کے عہد میں بھی ایسا ہی ہوا، کفار ومشرکین کی اصطلاح جب بھی استعمال کی گئی لیکن اس سے دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہ آئی، البتہ یہ ضرور ہوا کہ کفار ومشرکین کو یہ احساس ہوگیا کہ ہم کوئی اورنہیں رب کائنات کے باغی ہیں، قرآن کی نظر میں ہم وہ لوگ ہیں جوسخت ترین عذاب کے مستحق ہیں، ایک بدترین ناکامی اور ابدی خسارہ ہمارا منتظر ہے، مکروہ عمل کی شدت کے احساس نے ان میں سے بعض کو اپنے عمل پر نظر ثانی کا موقع دیا اور بعض کفر پر مزید مستحکم ہوگئے، یہی وہ قرآنی رویہ ہے جو قرآنی اصطلاحات کے استعمال سے تشکیل پاتا ہے اور جس نے قرن اولی میں سخت سے سخت گیر کافر کو بھی اسلام کے سلسلے میں ایک ابدی عذاب کے ڈراوے کے پیش نظر اپنے رویے پر نظر ثانی پر مجبور کیا ہے، اس کے برعکس موجودہ فدویانہ اور ملتجیانہ رویہ دراصل کفار ومشرکین کو ان کے گناہوں کی شدت کا احساس نہیں ہونے دیتا اور ہم انہیں یہ باور کرانے میں ناکام رہتے ہیں کہ وہ اللہ کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے دور رہ کر کس شدید گناہ کے مرتکب ہورہے ہیں۔

س:- بعض ملی تنظیموں کے تجربات یہ بتاتے ہیں کہ جذباتیت نے نہ صرف یہ کہ ان مخلص افراد کی توانائیوں کو ضائع کردیا بلکہ ملت کو ان کوششوں سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، ملی پارلیامنٹ کے متعلق بھی اسی قسم کی جذباتیت کی باتیں کی جارہی ہیں، آپ اس سلسلہ میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟

ج:- نااہل اور بےعمل مسلمانوں کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ وہ کسی انقلابی تحریک کو جذباتی اُبال بتاکر اس کی قدر و قیمت کو کم کردیں، اول تو جذباتی ہونا ایک منفی پہلو نہیں ہے، یعنی اسلام کو مظلوم دیکھ کر اور آخری رسول ﷺ کی امت کی تذلیل دیکھ کر اگر کسی مسلمان کے دل میں اس نظام کو الٹ پھینکنے کے جذبات پیدا نہ ہوں تو اسے اپنے ایمان پر شک کرنا چاہئے، آپؐ سے زیادہ بردبار اور متحمل شخصیت کس کی ہوگی لیکن آپؐ کی سیرت میں ایسے بےشمار مواقع دیکھنے کو ملتے ہیں، جب آپؐ کے چہرے پر جذبات کی شدت پیدا ہوتی ہے، اللہ کے لئے آپ غصہ بھی کرتے ہیں اور محبت بھی، اس سلسلے میں بےشمار مثالیں

پیش کی جاسکتی ہیں، یعنی دین کو مظلوم دیکھ کر حمیتِ اسلامی کا عین تقاضا ہے کہ آپ غصہ ہوں اور آپ کے جذبات برانگیختہ ہوجائیں، البتہ کسی انقلابی تحریک کے لئے اس حمیتِ اسلامی کو کمالِ احتیاط کے ساتھ برتنا ایک کامیابی سے دوچار کردیتا ہے، رہے وہ لوگ جو خود کو جذباتی نہیں سمجھتے یا اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل پر ان کے جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے اور ان پر ایک پرسکون دانشوری کی فضا طاری ہے اور پھر بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق اس امت سے ہے جس میں اسلام کے معمولی استہزا یا رسول کی شان میں تضحیک کے جملے حضرت عمرؓ کو اپنی تلوار بےنیام کردینے پر مجبور کردیتے تھے تو انہیں چاہئے کہ اپنے اس رویہ کا ازسرنو جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں ان کا ٹھنڈا ٹھنڈا دانشورانہ اسلام زیادہ معتبر ہے یا حضرت عمرؓ کا جذباتی والہانہ اظہارِ وارفتگی۔

س:- آپ کے نزدیک مسلمانوں کے بنیادی مسائل کیا ہیں، ان میں آپ کے نزدیک ترجیحی مسائل کون سے ہیں، آزادی کے بعد سے ملت اسلامیہ کی تاریخ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی سطح پر اپنی توانائیوں کو لگانے کے بجائے دینی، معاشی اور تعلیمی محاذوں پر لگانا چاہئے، اس کے متعلق آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

ج:- سیاسی میدان میں سخت پسپائی کے بعد گزشتہ چند سالوں سے ہمارے درمیان یہ رجحان پرورش پاتا رہا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی محاذ پر اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے تعلیمی اور معاشی محاذ پر جدوجہد کرنی چاہئے، بظاہر اس بات میں بڑا وزن معلوم ہوتا ہے اور تعلیمی تحریک کے متوالے مسلسل یہ تاثر دینے کی کوشش کررہے ہیں کہ اسکولوں اور مدارس کے قیام سے ہندوستانی مسلمانوں کا ماضی دوبارہ لوٹ آئے گا، میرے خیال میں یہ ایک جزوی حقیقت ہے، معاشی اور تعلیمی سرگرمیاں سیاسی دنیا سے بےتعلق نہیں رہ سکتیں، اور محض تعلیمی اداروں کا جال بچھانا امت کے لئے نشأۃ ثانیہ کے دروازے نہیں کھول سکتا، ہاں البتہ اگر یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہو تو سیاست سے فوری طور پر کنارہ کشی کا مشورہ دیا جاسکتا ہے، خاص طور پر ایک ایسی سیاست سے جو گزشتہ پچاس سالوں

میں مسلمانوں سے انہیں کچھ دینے کے بجائے ان سے بہت کچھ چھینتی رہی ہے، البتہ امت کی کسی بھی شیرازہ بندی میں آپ کو سب سے پہلے طے کرنا پڑے گا کہ اس ملک میں آپ امتِ مسلمہ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں، آخر وہ کیا کچھ ہے جس کے حصول کے لئے آپ دینی، معاشی اور تعلیمی سطح پر ایک منظّم جدوجہد کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں، پھر امت مسلمہ کے لئے کسی مقام کے تعین کے سلسلے میں آپ کے پیش نظر وہی کچھ ہونا چاہئے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے لئے طے کر دیا ہے، یعنی آپ کے تعلیمی ادارے نظام کفر کو مستحکم کرنے کے لئے کارپرداز تیار کرنے پر قناعت کرتے ہیں تو یہ کوئی ایسا اعلیٰ مقصد نہیں جسے ہم کوئی ملی جدوجہد بتائیں، البتہ اگر آپ کا مقصد ان تعلیمی اداروں سے ایسے دل ودماغ کی تیاری ہے جو مستقبل میں اس ملک میں قرآنی نظام انصاف قائم کرسکیں تو اس کے لئے آپ کو ابھی سے راہ متعین کرنی ہوگی، پھر ہر معاشی اور تعلیمی جدوجہد ایک اسلامی انقلابی جدوجہد بن جاتی ہے، البتہ ہندوستان میں تعلیمی اور معاشی ترقی کا مجوزہ نعرہ کسی اسلامی مستقبل کے احساس سے خالی اور یکسر نابلد ہے، ہمیں اس بارے میں فکرمند ہونا چاہئے۔

س:- ملک کے موجودہ نقشہ میں سیاسی سطح پر علیحدگی پسندی کی بات کرنے کو غیر دانشمندی سمجھا جارہا ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، ساتھ ہی ملت کے نام پر اتحاد کی دعوت نے ہم مسلمانوں کو متحد نہیں کیا، البتہ اغیار کو منفی بنیادوں پر ہی سہی متحد ضرور کردیا، ملی پارلیامنٹ کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے اسی خدشے کا اظہار کیا جارہا ہے، آپ اس سلسلہ میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- ملک کو ازسرِ نو ایک نئے سیاسی جغرافیے کی بنیاد پر منظّم کرنا دراصل موجودہ سیاسی نظام میں بعض بڑی خامیوں پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے، اسے علیحدگی پسندی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ہم نے ملک کو ۲۱۲ ریاستوں کے وفاق میں تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی ہے، تاکہ ہر چھوٹی ریاست زیادہ منظّم طریقے سے ترقیاتی منصوبوں پر عمل کرسکے، انتظامی امور کے سلسلے میں بڑے ضلع کو چھوٹے چھوٹے ضلعوں میں منقسم کرنا کوئی نئی سیاسی بدعت نہیں ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں

کہ ملک مسلسل انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کی طرف جارہا ہے، وہ لوگ جن کے حقوق نصف صدی سے تلف ہوتے رہے ہیں اور جو مسلسل ظلم وجبر کے شکار ہیں، جن کے اندر احساس محرومی کا لاوا پھٹا چاہتا ہے، ان کے غیض وغضب سے بچنے کے لئے انصاف کی بنیاد پر ایک ایسا خاکہ تشکیل دیا جائے جو اس ملک کو متحد اور قائم رکھ سکے، ۱۲۲ تہذیبی ریاستوں کا وفاق جو مستقبل کے ہندوستان کے لئے ہماری تجویز ہے، ہر تہذیبی اکائی کو ریاستی سرپرستی عطا کرتی ہے اور متعلقہ ریاستوں میں ہر تہذیب کو پھلنے پھولنے کے وافر امکانات مہیا ہوجاتے ہیں، یہ ایک ایسی اسکیم ہے جو مختلف تہذیبی اکائیوں میں پرورش پارہے احساسِ محرومی کو ختم کرسکتی ہے۔

یہ عجیب مذاق ہے کہ دانشمندی کی ہر اسکیم کو ہمارے نام نہاد دانش مند غیر دانشمندی سمجھتے ہیں اور ظلم وجبر کی موجودہ صورت حال میں گھٹ گھٹ کر جئے جانے کو عین کار دانشمندی سمجھا جاتا ہے، پھر یہ بھی عجیب دلیل ہے کہ ہم اس لئے اپنے اتحاد کی کوشش نہ کریں یا اپنی صفوں کو درست نہ کریں کہ ہمارے اس عمل سے دشمن متحد ہوجائیں گے، جو لوگ ملی پارلیامنٹ کی انقلابی دعوت سے اندیشوں کا شکار ہیں انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خطرات سے ہی امکانات کا ظہور ہوتا ہے، بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب موجودہ نظامِ جبر ہر لمحے آپ کے گرد اپنا گھیرا سخت کرتا جارہا ہو محض خاموش بیٹھا رہنا یا اندیشوں کا اظہار کرنا آپ کو کب تک زندگی کی مہلت دے سکتا ہے۔

س:- ملک کے علماء یا ملی قائدین، برادران وطن اور پریس نے آپ کے پٹنہ اجلاس اور خود ملی پارلیامنٹ کے وجود وقیام کو کن نگاہوں سے دیکھا ہے؟

ج:- علماء وقائدین، کفار ومشرکین اور ہندو پریس ملی پارلیامنٹ کے انقلابی ایجنڈے سے قدرے متوحش ہیں، ملی قیادت جو رسول اللہ ﷺ کے پیغام سے نابلد نہیں وہ اس بات سے انکار تو نہیں کرتی کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں، البتہ ان کے دل ودماغ ابھی اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ ان باتوں کو اس ملک میں کیسے برتا جاسکے گا، کفار ومشرکین غضبناک ہیں اور سیاسی بازی گر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو ان کی اصل حیثیت کا احساس دلایا گیا تو ان

پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا، کچھ اسی رویے کا اظہار ہندو پریس نے کیا ہے اور انگریزی کے قومی اخبارات میں اسی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، البتہ ہم ابھی تک عام لوگوں کو یہ باور نہیں کرا پائے ہیں کہ ملی پارلیامنٹ کا سیاسی ایجنڈا عام باشندگان ملک کے لئے بھی نظامِ رحمت ثابت ہوگا اور وہ تمام لوگ جو موجودہ نظامِ کفر کی فتنہ سامانیوں کے شکار ہیں ان کے لئے ہمارے پاس علاج موجود ہے، ہمیں یہ احساس بھی عام کرنا ہے کہ ہم کسی مخصوص قوم کے خلاف نہیں اور یہ کہ ہماری تحریک ہندو مخالف نہیں ہے، ہم تو صرف ایک پیغام لے کر اٹھے ہیں جس میں ہر ذی روح کے لئے سکون و رحمت کا سامان موجود ہے، میرے خیال میں ہمارے پیغام کا یہ پہلو ابھی بہت تشنہ ہے۔

س:-آپ ''بانگ درا، لکھنؤ'' کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ ہند کو کون سا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج:-گزشتہ دنوں بانگِ درا میں چند ایسے مضامین میری نظر سے گزرے جس کی بناء پر میں اس رسالے کو انقلابی اسلام کا نمائندہ سمجھتا ہوں، یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور محترم علماء کے حلقے سے ایک ایسا رسالہ شائع ہو رہا ہے جو مصالحت کی نہیں بلکہ عزیمت کی دعوت دیتا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ رسالے کے اس رنگ کو برقرار رکھے اور مستقبل میں ملتِ اسلامیۂ ہند کو ان صفحات سے نئے ہندوستان کی تعمیر کا حوصلہ بخشے، مجھے توقع ہے کہ مولانا سلمان ندوی اور ان کے حلقے سے امت کو انقلابی قیادت ملنے کی جو توقع ہے وہ یقیناً پوری ہوگی اور آنے والے دنوں میں برادرم امین الدین شجاع الدین صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ صاحبانِ عزیمت کے لئے چراغِ راہ بن سکے گا۔

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ: مئی ۱۹۹۶ء)

اگر اوقاف کا نظام درست ہو جائے تو

ملت قرض دینے کی پوزیشن میں آ جائے گی!

پروفیسر نثار احمد فاروقی سے ایک ملاقات

مادرِ علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مہمان خانہ شفا خانہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کی وجہ تسمیہ بظاہر یہ ہوسکتی ہے کہ اس عمارت کے چند کمرے اسپتال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن بیشتر کمرے وہ ہیں جہاں ملک و بیرون ملک سے آنے والے مہمانانِ گرامی قیام فرماتے ہیں۔ ندوہ اور پھر قبلہ دیدہ و دل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سی قد آور اور مقناطیسی شخصیت کی بدولت یہاں سب ہی کھنچے چلے آتے ہیں، ان میں میدانِ علم و ادب کے شہسوار بھی ہوتے ہیں، اور حق و معرفت کے متلاشی بھی...... یہاں آنے والوں میں شاہ بھی ہوتے ہیں اور گدا بھی، وہ صاحب اقتدار بھی کہ حکومتیں جن کی زیرنگیں ہیں اور وہ صاحب دل بھی کہ عوام کے دلوں پر جن کی حکومت ہے، آنے والوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سینہ میں ملک و ملت کا درد ہوتا ہے اور وہ اس درد کا درماں ڈھونڈنے یہاں آتے ہیں، اس لحاظ سے اگر اس مہمان خانہ کا نام شفا خانہ پڑ گیا ہے تو اس میں حیرت و استعجاب کیوں کر!

یہاں دل و دماغ دونوں کی غذا کا سامان میسر ہے...... غرضیکہ سب آتے ہیں اور اپنے اپنے دامن کے بقدر گلشن گلشن کھلے پھولوں کو چن کر چلے

جاتے ہیں، مگر یہ تمنا لے کے کہ پھر آئیں اور اور بار بار آئیں، یہاں کی ادا ہی نرالی ہے، علم وحکمت کے ساتھ محبت وشفقت کی یادوں کی خوشبو ان کے دل ودماغ میں رچ بس جاتی ہے اور ''آنے والا'' یہاں سے چاہنے والا'' بن کر جاتا ہے...... ایسے ہی چاہنے والے دانشوروں کی فہرست میں ایک نام جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) کا بھی ہے۔

۳۱/مارچ ۱۹۹۸ء کو پروفیسر صاحب موصوف ''ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور اردو تحریک'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کے لئے لکھنؤ تشریف لائے تو ان کا قیام ندوہ ہی میں رہا۔ راقم سطور کی کوشش ہوتی ہے کہ ندوہ کے شفاخانہ میں قیام پذیر مہمانان گرامی سے ملاقاتیں کروں اور ان سے پوچھوں کی ملت کے درد کی دوا کیا ہے؟

چنانچہ ۳۱/مارچ کی شب جب پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دیکھا کہ وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہیں، اس حال میں مخل ہونا گویا فکر وخیال کے تسلسل کو توڑنا ہے جو یقیناً بڑا جرم ہے لیکن ڈاکٹر صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے تو حوصلہ بڑھا اور جی چاہا کہ زبان وقلم، علم وادب اور تحقیق وجستجو کی دنیا کے اس شہ سوار سے کچھ اس دنیا کے متعلق بھی پوچھوں جسے ملت اسلامیہ ہند کہتے ہیں۔

بات مدارس سے شروع ہوئی، مدارس پر اغیار کی جو نگاہیں ہیں اس کا ذکر آیا، گذشتہ چند برسوں میں حکومتی سطح کے اقدامات اور پالیسیوں کا تذکرہ ہوا، یہ سب کچھ مدارس کے تئیں غیروں کی نیتوں کو بھانپنے کے لئے کافی ہے، ان حالات میں اندیشوں اور مضمرات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف نے اس پس منظر میں فرمایا'' ......حضرت مولانا علی میاں کی قدآور شخصیت کا وجود مسعود صرف ندوہ کے لئے نہیں بلکہ تمام تر مدارس کے لئے ایک شجر سایہ دار کی مانند ہے، اللہ رب العزت ان کے سایہ کو دراز تر فرمائے، ان کا وجود گویا مضبوط

سپر اور حصار ہے۔ لیکن ضرورت ہے اس بات کی کہ مدارس اسلامیہ ان اندیشوں کو نہ صرف محسوس کریں بلکہ اپنے دفاع اور حفاظت کے لئے فیڈریشن بنائیں، اپنے مشترکہ مسائل کے لئے صف بندی کریں، دنیا طاقت کی زبان جانتی ہے اور اتحاد طاقت کا دوسرا نام ہے، اپنی حفاظت ودفاع کے لئے مدارس کی شیرازہ بندی وقت کا اہم تقاضہ ہے، یہ فیڈریشن خطرات ومضمرات کا جائزہ لے، ان کے لئے پیش بندیاں کرے، اور تدبیریں اختیار کرے...... ورنہ کون نہیں جانتا کہ ایک طرف تو دیومالائی تہذیب کی بالادستی اور اس رخ سے ننھے اور معصوم بچوں کی ذہن سازی کے لئے یورش ہورہی ہے تو دوسری طرف ایمان وعقائد کی حفاظت کے لئے قائم شدہ مدارس ومکاتب پر یلغار کی جاری ہے، چنانچہ یہ وقت اپنی بساط بھر کچھ کر گزرنے کا ہے۔''

پروفیسر فاروقی صاحب گویا تھے اور میں محسوس کررہا تھا کہ ہمارے مختلف نظام (مثلاً مدارس کا نظام، مساجد کا نظام، زکوۃ کا نظام وغیرہ) کی حکمت، ان کی افادیت واہمیت اور ان کے روبہ عمل ہوجانے کی صورت میں پیدا ہونے والے حیرت انگیز نتائج پر جس قدر اغیار کی نگاہ ہے، شاید خود ہماری اپنی بھی نہیں ہے، الا ماشاءاللہ۔

آج ہم اور کوئی نیا منصوبہ نہ بنائیں، بلکہ جو کچھ بنا بنایا نظام ہے بس اسی کو مرتب کرلیں تو ہمارے ادبار کو اقبال سے بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ وہ بنیادی کام ہیں جس میں کسی طاغوت سے تصادم کا بھی خطرہ نہیں...... ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کے بغیر کئے جانے کا یہ کام بڑا صبر آزما اور وقت طلب ہے اور شاید اسی لئے اس سمت میں کوئی نمایاں منظم ومرتب اور سنجیدہ کوشش دکھائی نہیں پڑتی۔

بہرحال میں نے پروفیسر فاروقی کو چھیڑ دیا تھا ملی مسائل سے متعلق ان کے زخم گویا ہرے ہوگئے تھے۔ وہ کہتے رہے۔ ''آج ہمیں عیسائیت کے لئے سرگرم عمل مشنریوں اور قادیانیت کا پرچار کرنے والوں سے شکوہ ہے۔ آپ نے اپنے پرچہ میں ڈاکٹر نفیس احمد صاحب کا مضمون شائع کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ آگرہ کے اطراف واکناف میں کس طرح ارتداد پھیل رہا ہے ہمارے وہ بھائی جن کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہے، ان

کے لئے ملازمت اور مال و دولت میں کس قدر کشش ہوسکتی ہے، اس کا اندازہ ایک عام شخص بھی لگا سکتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان حالات میں ہمارا اپنا کیا فرض بنتا ہے۔ بیت المال کے نظام کو قائم کرنے اور اسے مؤثر بنانے کی شدید ضرورت ہے۔ حیرت ہے کہ وہ ملت معاشی پریشانی اور بدحالی کی تصویر بنی ہوئی ہے جس کی تعلیمات میں زکوۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان اقوال کو یاد کیجئے جن میں آپ نے زکوۃ کے نظام کو منظّم و موثر بنانے پر خاصا زور دیا ہے۔ اسی طرح ایک مسئلہ اوقاف کا بھی ہے۔ اس طرف سے بھی بڑا تساہل وتغافل ہوا ہے۔ افسوس کہ ہندوستان کے طول وعرض میں موجود ہمارے اکثر اوقاف نہایت مفاد پرست ہاتھوں میں ہیں، ملت کی تعمیر وبقا کی فکر سے انہیں دور دور کا علاقہ نہیں۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بہت سی پرشکوہ اور عالیشان عمارتیں اس زمین پر کھڑی ہیں جو قبرستان ہوا کرتی تھی اور جہاں ہمارے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ برا ہو رشوت ستانی کا، برا ہو حرص ولالچ کا اور ان مفاد پرست ظالم ہاتھوں کا کہ اوقاف جن کے شکنجوں میں ہیں۔ اگر اوقاف کا نظام درست ہوجائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ملت قرض دینے کی پوزیشن میں آجائے گی، بہرحال اوقاف کا نظام بھی فوری اور بھرپور توجہ کا طالب ہے''۔

پروفیسر فاروقی صاحب اوقاف اور اس کی آمدنی سے ملت کی تعمیری کاموں کی طرف متوجہ کر رہے تھے اور میرا ذہن گلبرگہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے نام نامی سے منسوب ٹرسٹ کی جانب جارہا تھا، غالبا ہندوستان کا اس طرز کا یہ واحد ٹرسٹ ہے جو اپنے ذرائع آمدنی سے ملت میں تعلیم کی اشاعت کا قابل قدر وقابل رشک کام کر رہا ہے اور ملک میں موجود دوسرے بہت سے اوقاف کے لئے مشعل راہ ہے۔ پروفیسر صاحب دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتے چلے جارہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ ان محققین و دانش وروں میں سے نہیں ہیں جن کا مطالعہ محض ذہنی جمناسٹک کے لئے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت خالص عملی باتوں کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے فرمایا...... ''ہم نے ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرف سے غفلت برتی ہے، وہ ملت

جو داعیانہ کردار نبھانے کے لئے برپا کی گئی ہو، اس کا زبانوں سے اس درجہ کا تغافل دنیا میں خسارہ کا باعث تو ہے ہی آخرت کی گرفت کا بھی بن سکتا ہے۔ برادران وطن سے اجنبیت کا ماحول اور باہمی غلط فہمیوں کا ماحول آخر زبانوں سے بے اعتنائی برتنے ہی کا تو نتیجہ ہے ورنہ دین فطرت کی تعلیمات میں اس قدر کشش ہے کہ کہ بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ جب بھی برادران وطن کے سامنے سیرت رسول اکرم اور محاسن اسلام کو پیش کرنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ ان میں طلب موجود ہے اور تشنگی پائی جاتی ہے۔ میں آپ سے South Indian Churches Association کنیا رکماری میں منعقدہ ایک سیمنار کا اپنا ایک تجربہ بیان کروں۔ تمام مذاہب کے علماء ودانشور اس میں موجود تھے۔ موضوع تھا ''سماجی برائیوں کو روکنے میں مذہب کا کردار'' غیر مسلموں کے مجمع میں انگریزی زبان میں اس موضوع پر مقالہ کے لئے میں نے طے کیا کہ اس میں صرف قرآن پاک کے حوالہ جات ہوں، اسلام کی روشنی میں سماجی برائیوں کے استیصال کے لئے جو حل پیش کیا گیا، خدا کا شکر ہے کہ وہ نہایت موثر رہا اور دیگر مذاہب کے علماء و دانشوروں نے برملا اعتراف کیا کہ اسلامی تعلیمات جیسی عظیم اور پر حکمت نعمت سے ہماری کما حقہ واقفیت نہیں۔ تو ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ رب العالمین اور رحمۃ للعالمین کے پیغام کو بنی نوع انسان تک پہنچانے کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں بھی ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ ایک موقع پر ریڈیو کے لئے ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' کے عنوان سے ایک فیچر تیار کرنے کا اتفاق ہوا، میری کوشش رہی کہ اس میں غیر مسلموں کے تاثرات کو پیش کیا جائے، آپ یقین کریں کہ پروگرام کی ریکارڈنگ کے وقت میں نے دیکھا کہ اس کا ہندو آپریٹر فیچر سن رہا تھا، اور رو رہا تھا نبی کریم کی سیرت پاک سے اس قدر گہرا تاثر کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تو قرآن کا پیام اور سیرت خیر الانام کو علاقائی زبانوں میں مؤثر انداز میں آپ پیش کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے کس قدر حیرت انگیز اور دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

دیر ہو رہی تھی، اس لئے میں موضوع کو بدلتے ہوئے دینی پرچوں کے متعلق ان کا تاثر جاننا چاہا تو انہوں نے فرمایا ''ان سب کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ ہے لیکن ان کے

متعلق میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ صرف ماضی کی داستانیں نہ سنائیں، حال کی باتیں بھی بتائیں اور مستقبل کے امکانات اور خدشات سے بھی ملک وملت کو آگاہ کریں‘‘۔

گھڑی پر نظر پڑی تو ۳۱؍مارچ کو شروع ہونے والی گفتگو کا سلسلہ یکم اپریل میں داخل ہو چکا تھا، میں نے اجازت چاہی نکلا تو سناٹا تھا، تھوڑی دور آگے بڑھا تو ایک سیٹی کی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا، دیکھا کہ ندوہ کے صدر دروازہ پر چند چوکیدار ہوشیار وخبر دار کھڑے تھے۔ میں نے سوچا کہ ملت کو اگر قلعہ سے تعبیر کیا جائے تو اس کی حفاظت ونگرانی کی فکر رکھنے والے اور جاگنے والے مخلص سپاہی کتنے نکل سکیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ملت ایسے بے لوث سپاہیوں سے آج بھی خالی نہیں ہے۔ ان کو اور ان کی کوششوں کو منظّم ومرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

(ماہنامہ بانگ دراء، لکھنؤ مارچ اپریل ۱۹۹۸ء)

تعلیم اور تعلیمی ادارے

متوازن نظام تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا!

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم وچانسلر انٹگرل یونیورسیٹی

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی سے ایک ملاقات

{نوٹ: یہ انٹرویو ۲۰۰۱ء میں لیا گیا تھا، اس وقت انٹگرل ایک انسٹی ٹیوٹ تھا، اب ماشاء اللہ وہ یونیورسٹی بن چکا ہے، ہم نے اس انٹرویو کو اصل شکل میں برقرار رکھا ہے}

جناب مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی مدظلہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نام ہے اسلامی وعربی دنیا کی ایک ایسی معروف ومعتبر شخصیت اور شہاب ثاقب کا جو عربی زبان وادب، تعلیم وتربیت اور صحافت وخطابت کے افق پر کئی دہائیوں سے نہ صرف روشن ہیں بلکہ جن کی ذات سے اکتساب فیض کرنے والوں کی ایک کہکشاں ہے جو مختلف میدانوں میں اپنی روشنی بکھیر رہی ہے، ندوہ کے شعبۂ ادب عربی کو نیک نامی، شہرت اور امتیازی شان حاصل ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، مولانائے محترم کے حصہ میں نہ صرف اس شعبہ کے گیسوؤں کے سنوارنے کی سعادت آئی بلکہ وہ اس کے صدر وروح رواں بھی رہے، اور ان دنوں وہ اہتمام کے جلیل القدر منصب پر فائز ہیں۔

ان کی کتاب زندگی کا ایک روشن باب فرض شناشی، کام کی دھن اور اسے کمال کے ساتھ تکمیل تک پہونچانے کا مزاج ہے، اس میں نہ موسم کی شدت مانع بنتی ہے، نہ صحت کی خرابی حائل ہوتی ہے، اور چونکہ وہ محض ایک

ادیب وخطیب ہی نہیں، معلم ومربی بھی ہیں، اس لئے بجا طور پر وہ اپنے شاگردوں اور ماتحتوں میں بھی وقت کی پابندی اور جذبہ فرض شناسی کو دیکھنے کی تمنا اور آرزو رکھتے ہیں......ندوہ کے منصب اہتمام پر فائز ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی ان دردمندانہ آرزوؤں کو بروئے کار لانے کے مواقع ہاتھ آئے، چنانچہ ڈسپلن کو قائم کرنے کے لئے انہوں نے عملی اقدامات بھی کئے......تاکہ طلبہ اور ان کا ماتحت عملہ نظم وضبط، پابندئ وقت اور فرض شناسی کا خوگر بن جائے اور ان کے ہاتھوں میں وہ کلید آجائے جس سے کامیابیوں کے دروازے کھلتے ہیں۔

ندوہ قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کا نقیب وداعی رہا، مولانائے محترم نہ صرف ندوی الفکر ہیں بلکہ اس فکر کے ترجمان بھی ہیں......اس ترجمانی کے لئے موصوف نے صرف تحریر وتقریر کافی نہیں سمجھا بلکہ عمل کی اس دنیا میں اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا، مولانائے محترم کا قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ آف انٹگرل ٹیکنالوجی (اور اب یونیورسٹی) لکھنؤ زبان حال سے اس کی شہادت دے رہا ہے اور اپنے بانی کی اوالوالعزمی کی داستان سنا رہا ہے۔

ذیل کی سطروں میں لیا گیا انٹرویو موصوف کے مختلف میدانوں کی خدمات کے تجربات ومشاہدات اور تاثرات پر مبنی ہے، جس میں ان میدانوں میں کام کرنے والوں کی بڑی رہنمائی موجود ہے، امید کہ یہ انٹرویو نگاہِ شوق سے پڑھا جائے گا اور قارئین کو دعوت وفکر وعمل دینے کا باعث بنے گا۔

سوال: انسٹی ٹیوٹ آف انٹگرل ٹیکنالوجی کے قیام کے پس پشت کون سے اغراض ومقاصد کارفرما تھے؟ ان مقاصد میں انسٹی ٹیوٹ کس حد تک کامیاب رہا اور آئندہ کے پیش نظر کیا منصوبے اور اہداف ہیں؟

جواب: آپ جانتے ہیں کہ بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ سے عام مسلمانوں میں مایوسی وافسردگی کی لہر دوڑ گئی تھی، آزمائش کی اس گھڑی میں ضروری تھا کہ یاس وحسرت کی ان کیفیات سے ملت کو نجات کے لئے لائحہ عمل طے کیا جاتا، بابری مسجد کی شہادت اپنے پہلو میں مسلمانوں کے لئے مایوسی کے ساتھ بیداری کا پیغام بھی لائی تھی، اور ملت اسلامیہ کو احساس ہوگیا تھا کہ اس ملک میں آبرومندانہ زندگی جینے کے لئے انہیں عملی جدوجہد کرنی ہوگی، اس کے لئے تعلیمی میدان سے بہتر کوئی دوسرا میدان نہیں ہوسکتا تھا جو ان کے شعور کو بھی جگائے اور انہیں برادران وطن کے شانہ بشانہ چلنے کا سلیقہ وحوصلہ بھی بخشے۔

ہم نے بھی اس رخ پر سوچنا شروع کیا کہ اس کی عملی شکل کیا ہو، ہم نے محسوس کیا کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کا عصری خصوصاً ٹکنیکل تعلیم کا، ٹیکنالوجی کا کوئی پرائیویٹ ادارہ نہیں ہے، سائنس وٹکنالوجی نے دنیا کو جس انقلاب سے روشناس کرایا ہے، اس سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں، چنانچہ ٹکنالوجی کے ادارہ کے قیام کو ہم نے وقت کی عین ضرورت (Need of the Hour) سمجھا تا کہ اس ادارہ کے طلبہ تعلیمی ومعاشی ہر دو اعتبار سے خود اپنے لئے بھی اور ملک وملت کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکیں۔

لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک ادارہ کے قیام کا ارادہ محض ارادہ کر لینے سے پورا نہیں ہوا کرتا، پھر اس صورت میں جب کہ ہمارے پاس ظاہری اسباب ووسائل بھی نہ ہوں! لیکن بنام خدا ہم نے فیصلہ کیا کہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جائے، اس ادارہ کے قیام کو ہم دینی ضرورت بھی سمجھتے تھے اور ملک وملت کی یہ تعلیمی ضرورت تو تھی ہی، اس لئے کہ شمالی ہند میں ہمارا اپنا ٹکنالوجی کا Full Fledge College Degree نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا مرحلہ آراضی کے حصول کا تھا، اس کے لئے مناسب زمین کی تلاش شروع ہوئی، فیض آباد روڈ، موہن لال گنج کانپور روڈ وغیرہ پر زمینات دیکھی گئیں، مگر انشراح نہ ہوا، بالآخر کرسی روڈ پر ہمارے ایک مسلمان بھائی کی دس بیگھ زمین

دیکھی تو بہت پسند آئی، یہ لکھنؤ سے ۱۳ر کیلومیٹر فاصلہ پر واقع ہے، اللہ کی نصرت شامل حال رہی اور یہ مرحلہ اولی طے ہوا، اس وقت کے گورنر یوپی جناب موتی لال وورا نے کالج کے لئے ایک کروڑ کی رقم منظور کی، جس سے تعمیرات کا کام آسان ہوگیا، Non Approval کے مسائل تھے، الحمدللہ وہ بھی حل ہوئے، چونکہ ہمارا منصوبہ ایک انجینئرنگ کالج کے قیام کا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ All India Institute of Technology سے اس کی منظوری حاصل کی جاتی، اس کے لئے فوری طور پر پچاس لاکھ روپئے بطور F.D جمع کرنا ضروری تھا، ان معاملات میں غیب سے اللہ کی نصرت کا ہم نے مشاہدہ وتجربہ کیا، الحاق کے لئے پہلے آگرہ یونیورسٹی سے گفت وشنید کا سلسلہ رہا، آخرکار فیض آباد یونیورسیٹی (رام منوہر لوہیا یونیورسیٹی، فیض آباد) سے الحاق ہوگیا، یہاں بھی F.D کے لئے ایک خطیر رقم درکار ہوئی، ان دنوں U.PTechnical University سے یہ ادارہ تسلیم شدہ ہے اور اسی سے اس کا الحاق ہے، اللہ کی تائید ونصرت اور اہل خیر حضرات کے تعاون سے الحمدللہ یہ مراحل طے ہوتے گئے۔

ادارہ کے لئے اور ہم سب کارکنان کے لئے بھی یہ سعادت واعزاز کی بات رہی کہ اس ادارہ کا سنگ بنیاد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھا، ۳ر نومبر ۱۹۹۳ء کو یہ تاریخی اور یادگار تقریب منعقد ہوئی جس میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ، (موجودہ ناظم ندوۃ العلماء) بھی تشریف رکھتے تھے۔

ہمارا پہلا قدم ایک اسکول کا تھا، تعلیمی میدان میں جو تجربات ملک کے مختلف حصوں میں کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں ہم نے یہ ناگزیر سمجھا کہ ہائی اسکول وبارہویں تک کی تعلیم بھی ہمارے ادارہ کے ماتحت ہو اور ہمارے Campus میں ہو تاکہ Engg.Degree College کے لئے ہمیں طلبہ بھی فراہم ہوتے رہیں اور ہمارے کالج کی Feeding ہوتی رہے، الحمدللہ یہ اسکول بھی بحسن وخوبی چل رہا ہے۔

البتہ ایک حل طلب مسئلہ ہمیں درپیش ہے، اور وہ ہے ہمارے ادارہ کو اقلیتی کردار

(Minority Character) کا مسئلہ،جس کے حاصل ہوجانے کے بعد ہم اپنے ادارہ میں پچاس فیصد مسلم طلبہ کو داخلہ دینے کے مجاز ہوں گے،اس سمت میں اول روز سے کوششیں کیں،قانونی دشواریاں کھڑی کی گئیں،ان دنوں یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں ہے،اللہ ہی کارساز ہے،اور انشاءاللہ وہی ہماری کوششوں کو بارآور کرے گا......اس سے قطع نظر ہمارے ادارہ کے حصہ میں گورنمنٹ کے اپنے کوٹہ اور Proceedure کے مطابق جو طلبہ آئے ہیں ان میں مسلم طلبہ کی تعداد پہلے سے بہتر ہے،مائناریٹی کیریکٹر مل جانے کے بعد انشاءاللہ مسلم طلبہ کا تناسب ستر فیصد ہوجائے گا۔

ماشاءاللہ اس ادارہ نے کم وقت میں ترقی کی منزلیں طے کی اس کے ڈائرکٹر سید وسیم اختر صاحب اور اسٹاف کی حسن کارکردگی کا اس میں بڑا دخل ہے،ان دنوں پانچ ٹریڈ چل رہے ہیں: Information Technology,Electronics,Architecture, Computer Science کے شعبہ جات ہیں،آلات ووسائل سے لیس ان سب کے اپنے Workshops ہیں،آئندہ سال انشاءاللہ ہمارا پہلا بیچ (Batch) فارغ ہوجائے گا۔

ماشاءاللہ ہمارا عملہ تقریبا سو افراد پر مشتمل ہے،۱۵ر لاکھ کا ماہانہ بجٹ ہے،اسٹاف کی تنخواہیں بھی خوب ہیں،تاکہ وہ یکسوئی،مستعدی اور لگن سے کام کرسکیں،طلبہ کے داخلہ کے لئے Paid Seats بھی ہیں اور Freeship بھی ہے،فیس سے آمدنی کے علاوہ اہل خیر کا تعاون بھی ہمارے شامل حال ہے۔

سردست ادارہ میں 600 طلبہ زیر تعلیم ہیں،ایک ہاسٹل کیمپس میں بھی ہے اور شہر میں بھی اس کا نظم کیا گیا ہے،طالبات کے ہاسٹل کا بھی نظم علیحدہ ہے اور الحمدللہ معقول ومحفوظ نظم ہے،ادارہ کی چار بسیں ہیں جو طلبہ واسٹاف کو لاتی لے جاتی ہیں۔

اس طرح ایک قلیل مدت میں ادارہ نے الحمدللہ ایک طویل سفر طے کرلیا ہے اور انشاء اللہ اسے بہت دور اور آگے تک کا سفر کرنا ہے،بس اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔

سوال: بات ٹکنالوجی کی ہورہی ہے،آپ انٹگرل کے بانی وروح رواں کے علاوہ

عالمی شہرت یافتہ ادارہ کے منصب اہتمام پر بھی فائز ہیں،ایک حلقہ کی طرف سے مدارس میں عصری وفنی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا جارہا ہے،اس سے متعلق آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب: متوازن نظام تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا،بس اس لحاظ کے ساتھ کہ جدید نافع،ضرورت کے مطابق ہو،توازن برقرار رہے اور مدرسہ کی روح پر منفی اثرات نہ مرتب ہوں،ندوہ نے یہی فکر دی،ماشاءاللہ جے پور کے جامعۃ الہدایۃ نے اس سلسلہ میں اور اس سمت میں پیش رفت کی ہے،اور مدارس کو ایک راہ دکھائی ہے......میں تو کہتا ہوں کہ ارباب جامعہ کو رب کریم ہمت وحوصلہ اور وسائل دے کہ اس سے آگے بڑھ کر ایک عظیم ٹکنیکل ادارہ کی بنیاد ڈالیں،جس کا اپنا مائناریٹی کیریکٹر ہو اور جس سے ملک وملت کے نونہال اکتساب فیض کرسکیں،راجستھان کی یہ ایک تعلیمی وملی ضرورت بھی ہے،خدا کرے کہ یہ ضرورت بھی جامعہ کے زیر سایہ پوری ہو اور اس کی کوئی منظّم ومنصوبہ بند صورت وسبیل نکل آئے۔

سوال: تعلیم وتربیت لازم ملزوم ہیں،تربیت کے بغیر تعلیم کا تصور ناقص ہے،اس مسئلہ کا ایک حل اقامتی درسگاہوں کا قیام بتایا جاتا ہے،مگر اس تاثر پر آپ کا کیا ردعمل ہے کہ عموماً مدارس میں اگرچہ ہاسٹل کی سہولت موجود ہے مگر اس کے باوجود وہ 'تربیت' کے مقصد کو کماحقہ پورا نہیں کرپارہے ہیں؟ آپ کے نزدیک اس کی وجوہات کیا ہوسکتی ہیں؟

جواب: اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تربیت کے بغیر تعلیم بے روح ہے،ناقص ہے،غیر مفید وغیر مؤثر ہے،لیکن اس کی وجوہات بھی ہیں،اس کام کے کرنے والوں اور اس کا بیڑہ اٹھانے والوں کے سامنے جو عملی دشواری آتی ہے وہ ہے مناسب افراد کی کمی یا عدم دستیابی ...... ظاہر ہے کہ تربیت کا کام آسان نہیں،یہ کام جگرکاوی چاہتا ہے، دردو سوز اور تڑپ چاہتا ہے،خود موم کی طرح پگھل کر دوسروں کے لئے روشنی فراہم کرنے کے حوصلہ کا طالب ہے......مربی کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ خود بلند اخلاق وکردار کا مالک ہو،اس کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو، بلکہ اس کا عمل اور کردار ہی طلبہ کے لئے دعوت

فکروعمل بن جائے، اس کا کردار ہی زبان بن جائے......قحط الرجال کے اس دور میں ان کی صفات کے حامل اتالیق ملتے کہاں ہیں؟

ع ڈھونڈے انہیں کوئی چراغ رخ زیبا لے کر

والا مسئلہ ہے، تجربہ بتاتا ہے کہ اگر اتالیق میں سو فیصدی تقوی ہو، تب کہیں جا کر اس کے ۲۵ فیصد اثرات طلبہ پر مرتب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس کا ایک پہلو موجودہ ماحول اور اس کے عمومی منفی اثرات بھی ہیں، خارجی اثرات مدارس کی چہار دیواری کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتے، وہاں سے اٹھنے والے طوفان اور آلودگیاں مدارس کے ان 'جزیروں' کو بھی متاثر کر ہی دیتی ہیں، اس لئے اس مسئلہ پر اجتماعی حیثیت سے بھی غور کیا جانا چاہیے اور سماج کی تعلیم و تربیت سے بھی جوڑ کر اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے بھی اقامتی اسکول کا تصور پیش کیا تھا لیکن اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو اپنے اندر معلم و مربی دونوں کی صفات کا حسین امتزاج رکھتے ہوں، ورنہ مدارس کی عمومی دینی فضا کے باوجود کوتاہیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے، طلبہ کا درجہ سے غیر حاضر رہنا، نمازوں میں کوتاہی برتنا جیسی ناگوار باتوں کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے......خدا کا شکر ہے کہ ندوہ نے اس طرف توجہ دی ہے، ہم نے اس کے لئے بہت سے عملی اقدامات بھی اٹھائے ہیں، ڈسپلن اور نظم وضبط قائم کرنے کی تدابیر کی گئی ہیں، الحمدللہ اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں، لیکن ہم اس کامیابی پر راضی نہیں ہیں، ہماری خواہش ہے کہ ڈسپلن سو فیصد ہو اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا، ذہن سازی کا بلکہ افراد سازی کا کام یہاں سے ہو اور دین وملت اور علم وادب کو ندوہ سے سپاہ تازہ فراہم ہوتی رہے، بساط بھر کوششیں ہم کر رہے ہیں اللہ ہی انہیں نتیجہ خیز وبارآور بنانے والا ہے۔

سوال: درس وتدریس اور معلّمی سے آپ کی وابستگی دیرینہ ہے، آپ کے نزدیک

ایک معلم کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟

جواب: ایک سچا معلم وہ ہے جو سچے کوئلہ کی طرح سلگنا جانتا ہو، جس کے دل میں یہ درد و کسک ہو کہ طلبہ کو اس سے نفع پہنچے، اس کے طرز عمل سے طلبہ کے دلوں میں اس کے لئے عظمت ومحبت کے سوتے پھوٹ پڑیں، اور دلوں کی گہرائیوں سے وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ استاد کی ذات سے اس کے علم سے، اس کی کتاب زندگی سے انہوں نے اکتساب فیض کیا ہے، اس کی افادیت ونافعیت کی طلبہ گواہی دے رہے ہوں، اور اس کے ممنون کرم ہوں، طلبہ کو وہ اپنے طرز عمل سے باور کرادے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے، ان کا دشمن نہیں، وہ ان سے ہمدردی رکھتا ہے، اور ایک مشفق باپ کی مانند وہ اپنے طلبہ کو اپنے سے زیادہ کامیاب وکامران دیکھنے کی آرزو اور حوصلہ بھی رکھتا ہو......معلم کے لئے صرف علم ہی کافی نہیں ہے، اسے ان صفات کا حامل بھی ہونا چاہیے، اس کے علاوہ وقت کا پابند ہو، ناغے نہ کرتا ہو، فرض شناس ہو، اور معلّمی کو کار پیمبری سمجھتا ہو، معلم کی مثال ایک ایسے طبیب کی ہے جو ضرورت پڑنے پر عمل جراحی سے بھی گریز نہیں کرتا، اس عمل میں بھی مریض کی بھلائی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔

سوال: مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ سے آپ کی وابستگی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے جو خود ایک اعزاز ہے، اس ذات بابرکات کی کچھ یادیں اور کچھ باتیں؟

جواب: اللہ نے مولاناؒ کو سوز دروں سے نوازا تھا، وہ علم وعشق کا حسین امتزاج تھے، ان پر اس بات کا غلبہ رہتا اور یہ فکر انہیں تڑپائے رکھتی کہ اللہ کے بندوں کے دلوں میں اللہ کا یقین کیسے اتارا جائے، ایک بے قرار ہستی تھی اور ان کے ہر عمل سے یہ احساس واضطراب ترشح ہوتا تھا، میرے نزدیک جامعیت وربانیت ان کی بنیادی خصوصیات تھیں، ان کے یہاں علم وعمل کی جامعیت تھی، اخلاق ویقین کی جامعیت تھی، اور پھر ان صفات میں توازن تھا......رضائے الٰہی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی، ہر کام میں اسی کو ملحوظ رکھا اور اس سے کبھی غافل نہ ہوئے، اسلام کی سربلندی اور امت کی سرخروئی کی آرزو بھی کی اور اس کے لئے کوششیں بھی، صحت ساتھ نہ دیتی

تھی لیکن اس مردمومن نے کبھی ہمت نہ ہاری اور دین وملت کے لئے اپنے ناتواں جسم کو تھکایا، دین کے معاملہ میں کبھی مداہنت سے کام نہ لیا۔

اعلاء کلمۃ اللہ کا جب بھی موقع آیا تو بنا نگ دہل وہی کہا جو دین کی روح کے عین مطابق ہو، دین وملت اور انسانیت کے لئے ان کی فکرمندی دیکھتے ہی بنتی تھی اس کے سفینہ نوح تیار کرنے کی فکر وکوشش میں لگے رہے......دنیا سے وہ دامن بچاتے رہے لیکن ان کے قدموں پر رہی کیسے کیسے اور کتنے بڑے بڑے اعزاز وایوارڈ ملے لیکن ان کی خطیر رقمیں تقسیم کردیں، اللہ کی راہ میں لٹادیں، ان کی زندگی کا ایک ایوارڈ ایک کروڑ بیس لاکھ روپئے کا تھا، ایسی باتیں نادرالوجود ہیں، فلک برسوں پھرتا ہے تب خاک کے پردہ سے حضرت مولانا جیسا انسان وجود میں آتا ہے......اللہ نے انہیں اعزاز بخشا اور وہ عزت بخشی جو شاذ ہی ملتی ہے اور جس کا نظارہ کرنے کا چشم فلک کو کم ہی موقع ملتا ہے۔

الحمدللہ حضرت مولانا سے ۱۹۵۲ء سے میری وابستگی رہی، یاد آتا ہے کہ مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ تو میری سکریٹری شپ کی ذمہ داری نبھا سکتے ہیں، حضرت مولانا کے اندرون ملک وبیرون ملک بہت سے اسفار میں مجھے شریک سفر ہونے کی سعادت ملی، ۱۹۶۹ء میں حضرت مولانا کی معیت میں مجھے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سفر کی سعادت میسر آئی، ترکی کے سفر میں بھی ساتھ رہا، مدینہ کے سفر میں مولانا معین اللہ ندوی مرحوم بھی شریک سفر تھے، ۱۹۷۲ء کے بیرون ملک کے اسفار میں بھی شریک رہا، ۱۹۶۹ء کے سفر کی ڈائری بھی میں نے رقم کی ہے، ان کی آہ سحرگاہی اور اپنے رب کے حضور دعاومناجات کی گھڑیوں اوران کیفیات کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، میری آنکھوں نے دیکھا ہے کہ حضرت مولانا بادشاہان وقت اور ارباب اقتدار سے کس جرأت وبے باکی سے گفتگو فرماتے تھے، شان استغناء کے ساتھ حکام سے ان کی گفتگو دعوت وحکمت اور موعظت ونصیحت پر مبنی ہوا کرتی تھی......میں نے حضرت مولانا کو عوام سے، خواص سے، علماء وصلحاء سے، ادباء وشعراء سے، حکام وبادشاہوں سے غرض مختلف طبقوں سے ملتے دیکھا ہے، کلمواالناس علی قدر عقولہم کا

منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا......عربی زبان وادب سے شغف ولگاؤ کی ان ترغیب کے پس پشت یہی جذبہ تھا کہ قرآن فہمی وحدیث فہمی کی راہیں کھلیں اوران کا ذوق پیدا ہو، ادب اسلامی کی ان لگائی ہوئی صدا میں یہی جذبہ کارفرما تھا فخر وانبساط کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا کے بہت سے خطوط بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

سوال: عربی زبان وادب کی خدمات کا بھی آپ کا ایک طویل ریکارڈ رہا ہے، ہندوبیرون ہند آپ اس کے مستقبل کے تئیں کس حدتک پرامید ہیں؟ عربی زبان سیکھنے والوں کے لئے آپ کیا مشورے دینا چاہیں گے؟

جواب: عربی زبان وادب کو اجاگر کرنے میں ندوہ نے پہل کی، اورالحمدللہ اب صورت حال یہ ہے کہ تمام مدارس میں اس کے مستقل شعبے قائم ہیں، پہلے عربی ایک کتابی زبان سمجھی جاتی تھی، ندوہ نے یہ باور کرایا کہ عربی زبان ایک زندہ زبان ہے، اس اہمیت وافادیت اور معنویت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پڑھنا اور سیکھنا چاہیے......اب تو صورت حال یہ ہے کہ غیر مسلم بھی اسے سیکھ رہے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ کتاب وسنت سے شغف کے بغیر عربی زبان کے صحیح لطف اورلذت کا احساس ممکن نہیں ہوسکتا۔

دنیا جانتی ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے، ۱۹۸۴ء میں جزائر فیجی کا سفر مجھے پیش آیا، عربی زبان جاننے کی وجہ سے مجھے وہاں کوئی دقت پیش نہیں آئی، میرا احساس ہے کہ اگر کوئی عربی زبان جانتا ہو تو اسے دنیا کے بڑے حصہ میں اسفار میں زبان کے مسئلہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، عالمی سطح پر عربی زبان کی اہمیت وافادیت کو دنیا تسلیم کرتی ہے۔

ہندوستان میں عربی زبان کی افادیت کے تصور کو مزید اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، بہت سے مدارس میں عربی زبان کا شعبہ قائم ہے، مگر ایسے شعبہ مزید توجہ ومحنت کے متقاضی ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عربی زبان کے جاننے اور سیکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، انگریزی داں طبقہ بھی اس طرف مائل ہورہا ہے۔

عربی زبان وادب کے طلبہ سے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ وہ اس میں تعمق پیدا کریں

اورامتیاز حاصل کریں، ظاہر ہے کہ امتیاز کا حصول بغیر محنت وجانفشانی کے ممکن نہیں، ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اہل زبان کی بھی صحبتیں اٹھائی جائیں ورنہ اس میدان کے جوتجربہ کار اساتذہ ہوں ان سے استفادہ کیا جائے۔

سوال: ایک منصوبہ کے تحت مدارس اسلامیہ کو متہم کیا جارہا ہے، آپ کے نزدیک اس کے مضمرات کیا ہوسکتے ہیں؟

جواب: مدرسہ کی خاک سے انسان اٹھتے ہیں، مردم گری وانسان سازی کا کام مدارس میں انجام پاتا ہے، انسانیت کا سبق یہاں پڑھایا جاتا ہے، مگر افسوس کہ تاثر اس کے برعکس دیا جارہا ہے کہ مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں، اور افسوس اب تو یہاں تک کہا جانے لگا ہے کہ سب سے بڑا خطرہ مدارس کا وجود ہے۔

یہ ایک ایسا الزام اور بہتان ہے کہ جو الحمدللہ کبھی ثابت نہیں کیا جاسکا، مسلمان توطبعاً صلح پسند اور صلح جو ہوتا ہے، اس کا دین اسکی تعلیم دیتا ہے، اسلام سلامتی اور امن وآشتی کا پیغام دیتا ہے، کچھ تو غلط فہمیاں ہیں، مسلمانوں اور اسلام سے متعلق......مثلاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ مدارس مسلمانوں کو یہ پڑھاتے ہیں کہ چار نکاح کرو اور آبادی میں اضافہ کرتے چلے جاؤ......اور کچھ تو عناد وبغض ہے......کاش کہ ہم انہیں سمجھا پائیں کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات اور دستور حیات ہے اور انسانیت کے درد کا درماں اسلام ہی کے پاس ہے، ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے پھر مدارس کی تاریخ جنگ آزادی کے لئے دی جانے والی قربانیوں سے بھری پڑی ہے، جس سے صرف نظر کیا جارہا ہے۔

سوال: ملت اسلامیہ کے سامنے مسائل کی فہرست ہے، آپ کے نزدیک اس کا بنیادی مسئلہ کیا ہوسکتا ہے؟

جواب: شریعت اسلامی پر یقین کامل میں کمی، جیسا کہ شریعت کا حق ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو مطلوب ہے......افسوس کہ ملت میں شریعت پر اس درجہ کا یقین نہیں پایا جاتا ہے......امت میں یہ یقین جگانے اور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ شریعت

پر یقین اور اس پر عمل درآمد میں ہی ہماری فلاح وکامیابی مضمر ہے، اسلام ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس میں ہماری ہی نہیں ساری انسانیت کے مسائل کا حل موجود ہے، ''ادخلوا فی السلم کافۃ'' کا مسلمان بحیثیت امت عملی مظاہرہ کریں، تو ان شاء اللہ مسائل کافور ہوجائیں گے۔

باطل خوب سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے اسلام ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس کے خلاف اور اس کے ماننے والوں کے خلاف پروپیگنڈہ بھی اسی احساس کا نتیجہ ہے، اس باد مخالف کا رخ بھی ہم اس صورت میں موڑ سکتے ہیں، جب ہم اپنے کردار سے اس پروپیگنڈہ کو بے حقیقت ثابت کردیں......!

سوال: طویل مدت سے آپ ''البعث الاسلامی'' جیسے مؤقر جریدہ کے مدیر ہیں، صحافت کے میدان میں اخلاقیات کے زوال پر آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب: جب صالح مقاصد پیش نظر نہ ہوں اور مقصدیت کی سچی روح فنا ہوجائے تو اس صورت میں اخلاقیات کا انحطاط پذیر ہونا لازمی ہے، صورت حال یہ ہے کہ اب اس سے وابستہ افراد کے پیش نظر ذاتی اور مادی فوائد ہیں اور اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اخبار نویسی بھی کرتے ہیں، تحریروں میں غیر جانبداری اور حق کی طرف داری کی توقع اس صورت میں کیونکر ممکن ہے؟ جبکہ صحت مند صحافت، ذاتی فوائد ومصالح سے بہت بلند ہوتی ہے، اس میں صداقت کی روح کارفرما ہوتی ہے، اس میں اشتعال نہیں بلکہ اعتدال ہوتا ہے، تو جب تک صحافت حق کی طرف داری کا فریضہ انجام نہ دے، وہ صحت مند اور تعمیری صحافت کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔

سوال: مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے اساتذہ وطلبہ کے نام آپ کا پیغام؟

جواب: طلبہ اپنے اندر مقصدیت پیدا کریں، افسوس کہ مقصدیت کی روح مضمحل ہوتی جارہی ہے، مقاصد بلند ہوں، بلند عزائم ہوں، طلبہ داعیانہ صفات کے حامل بنیں،

اعلاء کلمۃ اللہ اور شریعت کا نفاذ جیسے اعلیٰ مقاصد پیش نظر رکھیں اور پھر اس لحاظ سے صحیح سمت میں محنت و کوشش کریں۔

اساتذۂ کرام یہ نکتہ فراموش نہ کریں کہ ہمارے اسلاف کی زندگیاں اپنے طلبہ کے لئے مثالی اور قابل تقلید ہوا کرتی تھیں، مدارس کے مقاصد کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے کہ طلبہ و اساتذہ سب مقصدیت کی روح سے سرشار ہو جائیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم شاد کام نہ ہوں...... یہاں بھی اور آخرت میں بھی......اور اصل ٹھکانہ تو آخرت ہی ہے!!

(ماہنامہ ہدایت جے پور)

دینی و عصری علوم کے دو دھاروں کو ملایا جائے!

حضرت شاہ محمد فضل الرحیم مجددی (جے پور) سے ایک گفتگو

جامعہ ہدایت جے پور مدارس کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے، اس کے اولوالعزم بانی نے عصری و دینی علوم کے دو دھاروں کو ملانے کی عملی تدبیر بتائی، تو لیجئے جامعہ الہدایۃ جے پور کی تاریخ اس کے امیر حضرت مولانا شاہ محمد فضل الرحیم مجددی کی زبانی۔

سوال: وہ کون سے حالات و خیالات تھے جن کی بدولت حضرت شاہ عبدالرحیم مجددیؒ کو جامعۃ الہدایۃ کی سنگ بنیاد رکھنے کا خیال آیا اور ضرورت محسوس کی؟

جواب: اصل میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ ہمارے پیر و مرشد اور والد و سرپرست و مربی آپ کے دادا مرحوم حضرت شاہ ہدایت علیؒ کا ایک دیرینہ خواب تھا کہ کسی بھی تاریخی غلطیوں یا سماجی غلطیوں کے پس منظر میں دو دھارے الگ الگ ہو گئے ہیں، ان دھاروں کو آپس میں ملایا جائے، جبکہ ہماری قدیم اسلامی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دو دھارے کبھی الگ نہیں رہے، اسی لئے ایک شخص عالم دین بھی تھا اور ساتھ میں ماہر فلکیات بھی، کوئی جغرافیہ کا ماہر، تو یہ دو دھارے الگ الگ نہیں تھے۔

امت مسلمہ جو زوال کا شکار ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان دو دھاروں کو الگ الگ کر دیا گیا، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک تو یہ کہ جو دینی علوم سیکھے گا وہ دنیوی علوم سے بے خبر ہو گا اور اسی طرح جو دنیوی علوم سیکھے گا وہ دینی علوم سے بے خبر ہو گا، تو دونوں نظام الگ الگ ہیں، تو حضرتؒ کا خواب یہ تھا کہ نظام وہی کامیاب ہو سکتا ہے جس کا رشتہ

Economy سے جڑا ہوا ہو، ایک خاص بات یہ ہوئی کہ ۱۸۳۰ء میں انگریزوں نے ایک حکم نامہ نکالا اور اس حکم نامہ کے تحت راتوں رات مدارس کا رشتہ Economy سے توڑ دیا گیا اور یہ حکم آیا کہ اب سرکاری محکموں کی زبان فارسی نہیں ہوگی بلکہ انگریزی ہوگی، جب تک فارسی سرکاری زبان تھی تو مدارس کا رشتہ Economy سے جڑا ہوا تھا، وہ کیسے؟ مان لیجئے کہ عدلیہ ہے، تو عدلیہ کے سارے احکامات فارسی میں ہوا کرتے تھے، انتظامیہ کے اہل کار مدارس سے جایا کرتے تھے، سیاست کے ماہرین بھی مدارس کی کوکھ سے جنم لیتے تھے، زندگی کے ایک اہم گوشہ سے آپ کا رشتہ توڑ دیا گیا تو نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مدارس نے اپنی راہ بنائی، مدارس کے ذمہ داروں نے یہ سوچا کہ بھئی اب جو چیلنج ہے اور وہ اپنے وجود و بقاء کو بچانا یہ ایک بڑا چیلنج ہے، اس کے بعد یہ دونوں دھارے ایک دوسرے سے دور ہی ہوتے چلے گئے، حضرتؒ کا ایک خواب یہ تھا کہ عالم دین علوم عصریہ میں بھی ماہر ہو، یہ کہنا کہ ایسا نہیں ہوسکتا یہ غلط ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا، کہ مسلمانوں کے جو مدارس وجامعات ہیں ان کا رشتہ Economy سے جڑے، Economy سے نہیں جڑے گا تو ان بچوں کا مستقبل کبھی اچھا نہیں ہوسکتا، اور نمبر ۳ یہ کہ جو بچے مدارس میں دینی علوم حاصل کررہے ہیں اور وہ بچے جو عصری تعلیم حاصل کررہے ہیں وہ کسی طرح سے محروم نہیں رہیں۔

سوال: عام طور سے یہ تاثر ہے کہ مدارس میں عصری وٹکنیکل تعلیم سے ان کی روح متاثر ہوتی ہے اور اس مقصد سے مدارس ہٹ جاتے ہیں جو ان کے قیام کا بنیادی مقصد ہوتا ہے، اس پر آپ کا کیا تاثر ہے؟

جواب: یہ بات تو صحیح نہیں ہے کہ اگر مدارس میں عصری علوم پڑھائے جائیں گے تو مدارس اپنے بنیادی مقصد سے ہٹ جائیں گے، تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمارے مدارس وہ علوم بھی پڑھاتے رہے ہیں جن کو دنیوی یا عصری علوم کہا جاتا ہے اور اس میں ہمارے مدارس کے طلبا امام کا درجہ رکھتے تھے، لیکن افسوس کہ ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر ایسا

ہوتا ہے تو دینی شعبہ کا نظام متاثر ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے محتاط اندازہ میں دونوں علوم کو ایک ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔

سوال: جامعۃ الہدایۃ کے اولوالعزم بانی حضرت شاہ عبدالرحیم مجددیؒ کی وہ کونسی خصوصیات تھیں جس نے انہیں ایک ممتاز مقام پر لاکھڑا کیا تھا؟

جواب: حضرتؒ دو باتوں پر بہت توجہ دیا کیا کرتے تھے، اور یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کسی بڑے کام میں کامیابی کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے، جب انسان کسی کام کو شروع کرے خواہ وہ دینی کام ہو یا دنیوی کام، جب انسان عملی میدان میں قدم رکھتا ہے تو بڑے حالات ومسائل اور آزمائشیں آتی ہے، تو ان حالات میں انبیاء کرام والی سنت یعنی ثابت قدم رہنا کہ جو بھی حالات آئیں ان میں ثابت قدم رہوں گا، یہ عزم ہونا کامیابی کی پہلی شرط ہے، حالات سے گھبرا کر میدان چھوڑ کر جانے والوں کے قدم کامیابی نہیں چومتی، کامیابی ان ہی کے قدم چومتی ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں، حضرت میں یہ صفت الحمدللہ بدرجہ اتم موجود تھی، دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو مٹا کر کام کرنے کی کیفیت پیدا کریں، اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے ساتھ، میرا نام رہے یا نہ رہے، میں بے وقعت رہوں، لیکن میرا یہ کام اللہ کے نزدیک قبولیت پاجائے، اور اللہ اس سے امت کو فائدہ پہونچائے، یہ جذبہ جب تک بدرجہ اتم موجود نہیں ہوگا، کامیابی نہیں ملے گی، جاہ وجلال کرسی، مال، عظمت نہیں ملتی، ان کی دکھنے والی کامیانی عارضی ہوا کرتی ہے، دائمی اور ابدی کامیابی ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اخلاص کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ فلسفہ کا اصول ہے کہ امتزاج شیئین سے ثالث کا وجود ہوا کرتا ہے، اگر کسی مومن کے اندر اخلاص اور استقامت یہ دو خصوصیتیں جو انبیاء کے ہاں دکھائی دیتی ہیں اگر جمع ہوجائیں تو تیسری چیز اللہ خود بخود وجود میں لے آتا ہے اور وہ ہے کامیابی۔

سوال: ربانی پبلک اسکول بھی آپ کی کوششوں کا الحمدللہ ثمرہ ہے، اس کی پیش رفت اور مستقبل قریب میں اس کے منصوبوں کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: جب ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کی بڑی آبادی جنرل ایجوکیشن سے بہت دور ہے، اور جو لوگ جا رہے ہیں اسکولوں میں یہ لوگ اپنے کلچر سے الگ ہو رہے ہیں، یہ تصور ہے کہ ماڈرن اور جنرل ایجوکیشن اپنے ماحول میں دی جائے، دین کے مبادیات سے بھی واقفیت ہو اور ساتھ ہی ان کو معیاری تعلیم اپنے ماحول میں رکھ کر دی جائے، اس تصور کو سامنے رکھ کر الحمدللہ عبدالرحیم ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے، جتنے بھی اسکول چل رہے ہیں وہ مولانا عبدالرحیم ایجوکیشن ٹرسٹ کے تحت چل رہے ہیں، بہت سے ادارے ان شاء اللہ بنتے رہیں گے، لیکن ان سب کے پس پشت یہ تصور ہے کہ مسلمانوں کی آبادی والا علاقہ ہو سرکاری نصاب کے مطابق ان کو اپنے ماحول میں تعلیم دی جائے۔

سوال: آئی اے ایس، پی سی ایس اور جوڈیشیل مجسٹریٹ کے لئے بھی آپ کی زیر نگرانی کلاسیس چلتی ہیں، آپ اپنے تجربات کی روشنی میں اس سلسلہ میں طلبا نوجوانوں، تعلیمی اداروں اور ملت سے کیا کہنا چاہیں گے، اب تک کتنے طلبہ نے استفادہ کیا ہے؟

جواب: دیکھئے جب بابری مسجد کی شہادت ہوئی اور ہندوستان میں فرقہ واریت عروج پر پہونچ گئی، فرقہ وارانہ فسادات میں ہم نے دیکھا کہ وہ رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات میں جو مالی یا جانی نقصان ہوتا ہے وہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اگر فسادات رک جائیں تو کرفیو اور اس کے بعد کے حالات میں پولیس اور ان کے مظالم اور جھوٹے کیس بنائے جاتے ہیں، اور ان پر خود پولیس جھوٹے کیس بنا کر جیلوں میں ڈال دیتی ہے، عدالت میں وہ کیس نہیں لڑ پاتے، آخر سوال یہ ہے کہ پولیس اور Administration میں اتنا تعصب کیوں ہے؟ تو وجہ سمجھ میں آئی کہ ہمارا Interaction پولیس اور انتظامیہ سے ہے نہیں، اپنی آبادی کے لحاظ سے ہماری شرکت اور نمائندگی کا فیصد بہت کم ہے ان سے Interaction ہو وہ ہمارے اخلاق دیکھیں، ہمارا برتاؤ دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ مسلم افسران ہو تو یہ ممکن ہے تو ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے ساتھ Humiliation اور Discriminaition ہے کسی بھی Civil Society کے

Structure میں آبادی کے لحاظ سے تناسب ہونا چاہیے، ہم نے Survey کیا تو پتہ چلا کہ مسلمانوں کی نمائندگی اس حد تک گری ہوئی ہے کہ ۲رفیصد اور تین فیصد کے درمیان میں ویری کر رہی ہے، درمیان میں چل رہی ہے، تو ہم نے Long Term حل اور ایک Short Term حل ڈھونڈا، مسلمانوں کو اس ملک میں جو بھی سماجی مسائل پیش آتے ہیں، اور ان کے سامنے جو چیلنج آتے ہیں، ان کو Face کرنے کے لئے، تو اس کے لئے ہم نے ایک طویل المیعاد اور ایک مختصر المیعاد حل پیش کیا، اور یہ بھی کہ ہندوستان کا جو دستوری اور جمہوری ڈھانچہ ہے اس کے اندر رہتے ہوئے اسی فریم ورک میں ہم کو کام کرنا ہے، Law & Order کے Above نہیں جانا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی طرح کی کوئی ناانصافی ہو Discriminaition ہو یا Humiliation ہو تو آپ Judiciary کا استعمال کریں۔

اور دوسرا کہ یہ Civil Structure میں آپ کی موجودگی اور شرکت ضروری ہے، جہاں بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں، پالیسیاں بنتی ہیں، جو پوری پوری ریاست اور ملک پر نافذ ہوتے ہیں، یہاں آپ کی موجودگی ضروری ہے، اگر موجودگی نہیں ہوگی تو نقصان اٹھانا پڑے گا، آپ کو اس کے خلا کی وجہ سے تو ہم نے Long Term Solution کے تحت ایک ادارہ قائم کیا علی گڑھ میں Cresent Academy For Civil Services تا کہ جتنی طرح کی Services ہیں ان تمام کے مقابلہ جاتی امتحانات کے تیاری کروائی جائے، ان کو امتحانات میں بٹھایا جائے اور وہ آئیں، اس میں مسلمان بھی آئیں، غیر مسلم بھی آئیں، جو غیر مسلم ہمارے یہاں پڑھے گا وہ ایک صاف ستھرا ذہن لے کر جائے گا، مسلمان پڑھے گا اس سے ہماری نمائندگی بڑھے گی، دونوں صورتوں میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے، اب تک الحمدللہ تقریبا ۸۰ کے لگ بھگ IAS اور PCS اور Judiciary میں ہمارے بچے آچکے ہیں، تقریبا ۱۴ر ریاستوں میں ہیں، اور ابھی جو Main کا رزلٹ آیا ہے ۲۰۱۱ء کا اس میں ۲۶ر بچے کامیاب ہوئے ہیں۔

سوال: سلسلہ مجددی سے بھی آپ کا اور آپ کے جلیل القدر آباء کا تعلق

رہا ہے،تصوف وخانقاہی نظام اخلاقی بگاڑ کو دور کرنے میں کس حد تک مؤثر رہا اور اس نظام کے مستقبل کے تعلق سے آپ کس حد پر امید ہیں؟

جواب: جہاں تک خانقاہی نظام کا تعلق ہے تو صحیح خانقاہی نظام میں جہاں اصلاح وتربیت ایک طالب حق کی ہوا کرتی تھی ان میں بہت کمزوری آئی ہے،اور جہاں تک سلسلہ نقشبندیہ کا تعلق ہے تو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اپنی ایک تحریر میں فرمایا ہے کہ اس ملک میں تقریباً پونے چار سو برس حضرات نقشبندیہ ہی کا غلبہ رہا ہے،لیکن ایک بات یہ ہے کہ دینی علوم کے ساتھ ہمارے مدارس میں تربیت کا نظام بھی ہو،اصلاح قلب کا اہتمام ہو،یہ چیز اگر بچوں کے اندر پیدا کردی جائے تو آج جو کوری کھیپ نکل رہی ہے مدارس سے،روحانی وراثت جو کسی نہ کسی شکل میں جڑی ہوئی ہے،آج بھی وہ لے کر نکلیں گے تو زیادہ فعال اور کارگر ہوں گے،اوران کے کاموں میں انشاء اللہ خیروبرکت بھی ہوگی،یہ بہت بڑا میدان ہے جس کی طرف خانقاہی نظام سے جڑے ہوئے لوگوں کو بھی اور مدارس سے وابستہ لوگوں کی بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہندوستانی کلچر اور برہمن کلچر میں فرق کرنا ہوگا!

لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر

پروفیسر روپ ریکھا ورما سے ایک گفتگو

برلا وامبانی رپورٹ ان دنوں ایوانوں سے لے کر اخبارات کے ذریعہ عوامی سطح تک موضوع بحث بنی ہوئی ہے،اس رپورٹ کے پسِ پشت تعلیم کے کیسری کرن کئے جانے کے علاوہ اور کون سے مضمرات اور خطرات ہوسکتے ہیں،اس موضوع پر مشہور دانشور و ماہر تعلیم محترمہ ڈاکٹر روپ ریکھا ورما (صدر شعبہ فلاسفی) سے ایک اہم گفتگو نذرِ قارئین ہے۔

س:-آپ کے نزدیک تعلیم کے بھگوا کرن کرنے کی حکومت کی کوششوں سے کیا عام طلباء کے حصول تعلیم کے جذبہ اور مواقعوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے؟

ج:- ہمارے سامنے دو رپورٹیں ہیں، ایک تو ہے امبانی و برلا کی رپورٹ جو A Policy Frame work for Reforms in education کے نام سے سامنے آئی ہے اور دوسری چیز ہے این سی ای آر ٹی کی،جس کو विद्यालयी शिक्षा के लिए राष्ट्रीय पाठयर्चा की रूप रेखा کا عنوان دیا گیا ہے،ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں اوران سے جو اشارے ملتے ہیں وہ ہمارے ملک کی سیکولر روح کے لئے خطرہ کی گھنٹی ہیں،اس سے تعلیم کے ہندوکرن یا بھگوا کرن کردئے جانے کی نشاندہی تو ہوتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی پالیسی عوام کے خلاف بھی ہے،مثلاً برلا وامبانی رپورٹ میں ہائر ایجوکیشن اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کی نجی کاری کی سفارش کی گئی ہے،جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم اور ٹکنیکل

تعلیم اس قدر مہنگی ہوجائے گی کہ ہمارے جیسے لوگوں کے لئے بھی اپنے بچوں کو ان کورسز میں داخلہ دلانا ممکن نہیں رہے گا اور ظاہر ہے کہ جب وہ اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکیں گے تو وہ اچھی ملازمت سے بھی محروم ہی رہیں گے، اس لحاظ سے تعلیم پر چند لوگوں کی اجارہ داری (Monopoly) ہوجائے گی تو گویا سماج کی عمومی تعلیم کے اعتبار سے یہ جن ورودھی پالیسی ہوئی تاکہ جس کے ذریعہ یہ سازش رچی جاسکے کہ وسائل پر قابض رہیں اور رہے باقی لوگ تو وہ اپنے ہاتھوں کی ریکھائیں دیکھتے رہیں یا دکھاتے رہیں، جب کہ ہمارے ملک کا جو دستور (Constitution) ہے وہ سماج کے سارے طبقات کو مساوی درجہ دینے کی بات کرتا ہے لیکن مذکورہ تعلیمی پالیسی تو اس روح کے سراسر منافی ہے۔

س:- اربابِ اقتدار کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہمارے پیشِ نظر ہندوستانی کلچر کا فروغ ہے، اس پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

ج:- دیکھئے ہندوستانی کلچر اور برہمن کلچر میں ہمیں فرق کرنا ہوگا، ہندوستانی کلچر ایک مختلف چیز ہے اور برہمن کلچر ایک بالکل دوسری چیز، اس رپورٹ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر ہندوستانی کلچر کا نہیں بلکہ برہمن کلچر کا فروغ ہے مذکورہ دو چیزوں کے علاوہ ایک بات اور ہے جو توجہ چاہتی ہے اور جس سے مسئلہ کی نوعیت اور واضح ہوجاتی ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (U.G.C.) نے دو طرح کے کورسز متعارف کرائے ہیں اور ان کی ہمت افزائی بھی کی جارہی ہے ایک کورس تو ہے کرم کانڈ کا اور دوسرا جیوتشی (Astrology) کا، پنڈت بنانے اور تیار کرنے کی سرکاری سطح کی یہ کوشش ہمارے ملک کے سیکولر ڈھانچہ سے میل نہیں کھاتی، ایسا کرنا تعلیم کا کیسری کرن کرنا ہوگا، فروغ انسانی کے وسائل کی وزارت نے Value Education پر بظاہر بڑا زور دیا ہے لیکن انہوں نے اس کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ تناؤ پیدا کرنے والا ہے، مثلاً سنسکرت سیکھنے سکھانے کی بات کی جارہی ہے، لیکن اصل مسئلہ سنسکرت زبان کا نہیں، اُس قدیم سنسکرتی اور تہذیب کا ہے جس پر فخر کرنے کو اصل دیش بھکتی کہا جارہا ہے اور اس تفاخر کو دیش سے محبت کا پیمانہ قرار دیا جارہا ہے۔

اس صورت میں وہ ہندوستانی کلچر کیسے محفوظ رہے گا جو ہمارے ملک کی شناخت اور خصوصیت ہے، ہمارا ہندوستانی کلچر جو صدیوں میں بنا ہے، وہ مجروح اور پامال ہوجائے گا، ہندوستانی کلچر کی تشکیل وتعمیر میں اسلام اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کا بھی رول رہا ہے، مسلمانوں کے اداروں، ان کی خدمت اور معاشرہ پر پڑنے والے ان کے اثرات کو سمجھے بغیر اور اس کا اعتراف کئے بغیر کیا ہندوستانی کلچر کو سمجھنے کی کوشش صحیح اور منصفانہ کوشش قرار دی جاسکتی ہے؟

مسلمانوں سے قطع نظر خود اونچی ذات کا ہندو جو برہا (बिरहा) گاتا ہے وہ بھی سنسکرت میں نہیں ہے، اس کلچر میں بڑی وسعت ہے، فراخدلی ہے، ساون کے مہینہ میں دیہاتوں میں درختوں پر جھولا جھولنے والی ننھی منی بچیاں جو گیت گاتی ہیں، وہ بھی ہمارے ہندوستانی کلچر کا حصہ ہے، لیکن ہندوستانی کلچر کے نام پر سنسکرت زبان کی بات کرنا امر واقعہ سے صرف نظر کرنا ہے، سنسکرت میں تو برہمنوں کے صرف Rituals ہیں۔

اس لئے ہمارا کہنا یہ ہے کہ کرم کانڈ کا وہ کورس اگر چلانا چاہتے ہیں تو اپنے طور پر چلائیں، سرکاری سطح سے اس کام کا کرنا بالکل مناسب نہیں ہے ورنہ پھر صرف کرم کانڈ اور پروہت بنانے کی بات کیوں کررہے ہیں، سرکاری سطح سے ہی پھر ایسے کورسز بھی چلائیے جس سے خالص مولوی اور خالص پادری بھی تیار ہوسکیں۔

تو حاصل یہ ہے کہ ہندوستانی کلچر برہمن وادی کلچر نہیں ہے، یہ دو مختلف کلچر ہیں، آدی واسی کلچر بھی ہندوستانی کلچر ہی ہے لیکن جب آدی واسی کلچر کو برہمن وادی کلچر نہیں مانا جاسکتا تو پھر برہمن وادی کلچر کو ہندوستانی کلچر کیسے ہوسکتا ہے؟

س:- اگر بالفرض مذکورہ ہندو کلچر پنپتا ہے تو آپ کے نزدیک ہندوستانی معاشرہ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

ج:- بالکل صاف بات ہے اس سے اونچی ذات اور نچلی ذات والوں کے مابین تناؤ اور نفرت کا ماحول بنے گا، اونچی ذات والوں کا ذہن کیسری رنگ میں رنگ جائے گا

Saffronised mind ہو جائے گا،نتیجہ میں وہ اپنے علاوہ سب کو غیر ہندوستانی سمجھنے لگیں گے،معاشرہ میں بسنے والے مختلف طبقات ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو کر رہ جائیں گے ،برہمن وادی کلچر کے سلسلے میں تاریخ گواہ ہے کہ اس نے انسانوں کو مظلومیت کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تو سوال یہ ہے کہ جب نتائج سامنے ہیں تو پھر اس روایت کو زندہ کرنا ملک کے حق میں کیسے ہو سکتا ہے؟

س:- برلا امبانی رپورٹ پر عمل درآمد کے نتیجہ میں آپ نے دو خطرات کی نشاندہی کی، ایک تو عام لوگوں کی تعلیم سے محرومی اور دوسرا یہ کہ تعلیم کا کیسری کرن۔۔۔۔لیکن موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں کرم کانڈ اور جیوتش کے کورسز چلائے جانے کی کوششوں کو ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے آپ کس نگاہ سے دیکھتی ہیں؟

ج:- ایسی کوشش سماج کو سائنٹفک سوچ سے دور کر دینے کی کوشش ہوگی جو ملک کے حق میں نہیں ہو سکتی، دوسرے لفظوں میں اسے جاہلیت کا فروغ کہنا غلط نہیں ہوگا، Astrology کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے متعارف کرانے والے خود اس مخمصہ میں رہے کہ اس کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو سائنس کی ڈگری تفویض کی جائے یا Arts کی Astrology یا جیوتش کا علم نہ تو سائنس کی فہرست میں آ سکتا ہے نہ Arts کی فہرست میں۔

(ماہنامہ بانگ حرا لکھنؤ: ستمبر ۲۰۰۱ء)

طلباء میں پائی جانے والی مایوسی کو دور کرنے کی ضرورت!

سابق وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی

پروفیسر منظور احمد سے ایک ملاقات

آگرہ یونیورسٹی کی داغ بیل ۱۹۲۷ء میں ڈالی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی کا حلقہ اور دائرہ کار کافی وسیع تھا، راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش اور پٹنہ جیسے دور دراز تک کے علاقوں کا یونیورسٹی سطح کا تعلیمی نظام الہٰ آباد یونیورسٹی سے وابستہ تھا چنانچہ اس بوجھ کو کم کرنے اور تعلیمی نظام کو مزید مؤثر بنانے کی غرض سے آگرہ یونیورسٹی کی بنا ڈالی گئی۔

اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد ۴؍نومبر ۱۹۳۳ء کو اس وقت کے وائس چانسلر سر نواب محمد احمد سعید خاں صاحب نے رکھا، آگرہ یونیورسٹی کے نامور فضلاء کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریۂ ہند جی ایس پاٹھک، سابق وزیر اعظم ہند چودھری چرن سنگھ، معروف مؤرخ ایشوری پرشاد اور گورنر برنی جیسی اہم شخصیات شامل ہیں۔

لیکن ادھر ایک عرصہ سے آگرہ یونیورسٹی جمود و تعطل کا شکار تھی، سابق گورنر اتر پردیش جناب رومیش بھنڈاری کو اس کا احساس ہوا چنانچہ انھیں ایسے کوہ کن کی تلاش ہوئی جو جوئے شیر لانے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جس میں بنجر زمین کو بھی سرسبز و شاداب اور گل و گلزار بنا دینے کا سلیقہ پایا جاتا ہو ان کی

نگاہ آئی پی ایس افسر جناب منظور احمد صاحب پر پڑی...... غالباً یو پی میں ایک آئی پی ایس کے کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کا یہ پہلا واقعہ تھا، مگر تین سال کی بحیثیت وی سی منظور احمد صاحب کی کارکردگی بتاتی ہے کہ خدا کو یہی منظور تھا کہ آگرہ یونیورسٹی کا جمود منظور احمد صاحب ہی کے ہاتھوں ٹوٹے، چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ اس قلیل مدت میں آگرہ یونیورسٹی نے ترقی کی منزلیں اس تیزی سے طے کی ہے کہ پروفیشنل اور ووکیشنل کورسز کے لحاظ سے آج وہ ملک کی ایک ممتاز یونیورسٹی تسلیم کی جارہی ہے۔

راقم کے سے طالب علم کے دل میں جمنا کے کنارے آباد اس شہر کی یونیورسٹی میں علم وفن کی گنگ وجمن بہا دینے والے کوہ کن سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہونا ایک فطری بات تھی، چنانچہ منظور احمد صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی اور بات چیت بھی...... جسے قارئین کی نذر کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے۔

وائس چانسلر منظور احمد صاحب ۱۹۴۲ء میں ہتھوا ضلع چھپرا میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں والدہ کے سایہ سے محروم ہوگئے، گھر میں ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول اور کالج گئے، سیاسیات (POLITICS) میں ایم۔اے کیا، بعد میں IPS میں منتخب ہوئے، لیکن شاید تعلیم وتدریس سے مناسبت اور علم کا ذوق ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کے والد ماجد بھی ایک ٹیچر اور معلم تھے، اور IPS ہونے سے قبل خود منظور صاحب بھی بہار یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، SSP اور SP ہونے کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کا سب کو اعتراف رہا اور اِن دنوں وی سی کی حیثیت سے وہ پھر میدان تعلیم سے وابستہ ہیں اس طرح علم کی نگری کو

یوسف گم گشتہ پھر ہاتھ آ گیا ہے۔

وہ قدرت کی طرف سے ایک حساس اور دردمند دل لے کر آئے ہیں، قوت فیصلہ کی نعمت بھی ان کے حصہ میں آئی ہے وہ ایک فعال وسرگرم اور متحرک وبیدار مغز شخصیت کے مالک ہیں۔

شہر آگرہ تاج محل کی بدولت بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے، تاج محل...... جو حسن ومحبت کی علامت اور مہر ووفا سے عبارت ہے! خدا کرے منظور صاحب کی سربراہی میں آگرہ یونیورسٹی بھی اسی درجہ کی نیک نامی اور شہرت پا جائے! ممتاز محل کی یاد میں بنے ہوئے تاج محل کی طرح...... علم وفن اور تعلیم وتحقیق کی دنیا کی ایک ممتاز یونیورسٹی!! آگرہ سے متعلق شخصیات غالبؔ ونظیر کی طرح سب پر چھائی ہوئی اور بے نظیر یونیورسٹی!!!

تو ملاحظہ فرمایئے جناب منظور احمد وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی سے ایک گفتگو......!

سوال: ایک ذمہ دار آئی پی ایس (IPS) افسر ہونے کے ناطے کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ملک میں آخر لاء اینڈ آرڈر Law & Order کی صورت حال اطمینان بخش کیوں نہیں ہے، ایک عام مہذب شہری پولس سے وحشت کھاتا ہے، اس صورت حال کی آپ کے نزدیک کیا وجوہات ہوسکتی ہیں؟

جواب: آپ کا یہ تاثر بجا ہے اور ملک کے ہر دیانت دار شہری کا بھی یہی تاثر ہے کہ ملک کی لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال اطمینان بخش نہیں ہے اس میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جو Enforcement Agencies ہیں، وہ خود پاک وصاف نہیں ہیں، اگر وہ صاف ستھری ہوں، ان کا مقصد ان کے پیش نظر ہو، ذہن صاف ہو تو مقصد کے حصول میں آسانی ہوسکتی تھی۔

دوسری وجہ ان کی تربیت اور ٹریننگ (Training) کی ناپختگی ہے، ٹریننگ کا وقت اور اس کی مدت کم ہوتی ہے۔ تیسری وجہ ان پر کام کا بوجھ زیادہ ہے، وہ Over Worked

ہیں، چوتھی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ ایسے قوانین جن کی نوعیت سماجی ہے انہیں بھی جرائم کی فہرست میں شامل کرکے ان کی ذمہ داری بھی پولس کے سر تھوپ دی گئی ہے مثلاً جہیز کا قانون ہے، تو جہیز کے معاملہ اصلاح کی ذمہ داری سماج کی ہونی چاہئے اور بھی اس قسم کے معاملات ہیں جن کی اصلاح میں سماج کا رول ہونا چاہئے اور یہ سماج کی ذمہ داری ہونا چاہئے، آپ قوانین زیادہ رکھیں گے تو ان کا نفاذ (Enforcement) مشکل ہوگا اس کے برعکس قوانین کم ہوں گے یا ان کا دائرہ کم ہوگا تو ان کا Enforcement بھی آسان ہوگا۔ ٹرافک کا معاملہ لائسنس ہے یا نہیں؟ اس کے لئے ایک خاص Agency ہے تو اس کو اپنا کام کرنا چاہئے، اسی طرح شراب کے معاملہ میں ہے، اکسائز کا ایک پورا شعبہ ہے، اسے اپنا کام کرنا چاہئے تو تقسیم کار ہونا چاہئے۔

لاء اینڈ آرڈر کی خراب صورتحال کی اس تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ملک میں پولس کو زیادہ اختیارات حاصل ہیں مثلاً بغیر کسی وارنٹ کے گرفتاری، بغیر کسی سبب بتائے کسی کو بہت دنوں تک گرفتار رکھنا۔ یہ سب انگریزوں کے وقت سے چل رہا ہے تو یہ اس قسم کے قوانین ہیں جو 'لاقانونیت کے قوانین' کہلائے جاسکتے ہیں جن کی وجہ سے ظاہر ہے کہ لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہوسکتے۔ لاقانونیت کے فروغ کے جو عوامل ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سماج میں انتقام (REVENGE) لینے کا جذبہ اور رجحان پرورش پارہا ہے چونکہ قانون انصاف دلانے میں ناکام رہتا ہے یا بدلہ نہیں لے پاتا جس کی وجہ سے از خود ہی بدلہ لینے کا رجحان پنپ رہا ہے اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ فلموں اور کہانیوں کے ذریعہ اس رجحان کی ہمت افزائی بھی ہورہی ہے۔

لاء اینڈ آرڈر کی ابتری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کا غریب طبقہ کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے کہ اس ملک کا دس پندرہ فیصد طبقہ نہایت آسائش کی زندگی گزار رہا ہے، اس طرح اس طبقہ میں احساس محرومی پیدا ہوا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ وہ اپنا حق چھیننے اور اپنا حصہ حاصل کرے۔

میڈیا اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے ایک عام شخص بھی اب یہ جانتا ہے کہ اس دس پندرہ فیصد طبقہ کا معیار زندگی کس قدر بلند ہے۔ تو اس کی وجہ سے بھی طبقاتی کش مکش پیدا ہوئی ہے جو بڑھ رہی ہے اور جرائم کی شکل میں سامنے آرہی ہے یہ اس افسوسناک پہلو کی ابتدا ہے اور اس کی شروعات ہے جو کسی انقلاب کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

سوال: لاء اینڈ آرڈر اور تعلیم دو مختلف کشتیاں ہیں، آپ ایک آئی پی ایس افسر رہے اور ان دنوں وی سی (V.C) کے منصب پر فائز ہیں، بظاہر ان متضاد یا کم از کم مختلف شغل کو آپ نے کیسے یکجا کیا؟

جواب: صوبہ اتر پردیش کے سات ضلعوں میں میں نے S.P اور S.S.P کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اس کے علاوہ یوپی کے دو اہم زون بریلی اور آگرہ میں بھی I.G کی حیثیت سے میں نے کام کیا، اس کے بعد Additionl A.G بھی رہا تو یوپی میں ایک پولس افسر کی حیثیت سے مجھ سے جو بن سکتا تھا وہ الحمدللہ میں نے کیا۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آیا جب ۱۹۸۵ء میں میں نے چاہا کہ تعلیمی میدان میں کچھ کام کیا جائے، چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت کے لئے میں نے خود کو پیش کیا اور ساڑھے تین سال تک وہاں رہا، ڈھائی پونے تین سال پنجاب وقف بورڈ میں خدمت کا موقع ملا وہاں Grass-root level پر گاؤں میں مدرسے اور اسکول قائم کرنے اور طلباء کے وظائف کے انتظام جیسے کام ہوئے، وہاں اقلیت کے پورے تعلیمی نظام کو از سر نو قائم کرنے کا یہ بنیادی نوعیت کا کام تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میرے اندر تعلیمی کاموں کی رغبت اور اس کا شغف ہوتا ورنہ میں D.I.G کے منصب پر تھا، مجھے کافی مراعات حاصل تھیں، آسانیاں اور آسائشیں تھیں، ان سب کو تج کر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ گیا، جس کے نتیجہ میں مجھے اور میرے خاندان کو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں، لیکن الحمدللہ تعلیم اور تعلیمی کاموں سے شغف نے مجھے حوصلہ دیا۔ اس طرح لاء اینڈ آرڈر کے میدان کے علاوہ تعلیمی میدان میں بھی الحمدللہ میں کام کرسکا۔

سوال: آگرہ یونیورسیٹی سے آپ کی وابستگی اور بحیثیت وی سی آپ کی ترجیحات کیا رہیں؟

جواب: آگرہ یونیورسٹی میں میرے آنے کی وجہ یہ بنی کہ لوگوں کا احساس تھا کہ اس یونیورسٹی کا حال ٹھیک نہیں ہے، یہ منجمد ہوکر رہ گئی ہے، ترقیاتی منصوبے ٹھپ ہو گئے ہیں، میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ترقیاتی منصوبوں ہی کے لئے بھیجا گیا تھا DEVELOPMENTAL PLAN PLANNING EXECUTION میرا BRIEF تھا، چنانچہ اُس وقت کے یوپی کے گورنر رومیش بھنڈاری نے مجھے آگرہ یونیورسٹی بھیجا۔

اس یونیورسٹی میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایسے کورسز کا اجراء کیا جائے جن کی ضرورت حال اور مستقبل میں سماج کو ہے، چنانچہ انجینئر نگ کالج کھولے اور آج الحمدللہ اس وقت یوپی بھر میں جتنے انجینئر نگ کالج ہیں، ان میں اکثر کا الحاق آگرہ یونیورسٹی سے ہے۔ اور نصف درجن سے کم تعداد کا تعلق یوپی کے دوسرے علاقوں سے ہے۔ جب کہ میرے یہاں آنے سے پہلے ایک بھی ENGG.COLLEGE یہاں نہیں تھا، اس کے علاوہ سائنس اور VOCATIONAL STREAMS کا اجراء ہوا۔ اس طرح اب صورت حال یہ ہے کہ آگرہ یونیورسٹی PROFESSIONAL COURSES سے شمالی ہند کی سب سے اچھی یونیورسٹی مانی جاتی ہے...... الحمدللہ یہ سب کچھ تین سال میں ہوا، اس سے پہلے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

یونیورسٹی کے کاموں کو سنبھالنے کے بعد میری کوشش رہی کہ اس کی معاشی حالت بہتر ہو، یونیورسٹی بڑی زبوں حالی کا شکار تھی، اس کے اپنے وسائل سے اس کی معاشی بہتری کی کوشش کی گئی اور اسی سے سارے کام ہوئے مثلاً نئے کورسز کا اجراء، نئی عمارتوں کی تعمیر، حتیٰ کہ نیا CAMPUS خریدا گیا، تیسرا CAMPUS ہم نے پورے اعتماد سے خریدا۔

اس کے علاوہ ثقافتی نوعیت کے کام بھی ہوئے مثلاً سورداس پر، غالبؔ پر، نظیر پر کام کئے گئے۔

سوال: تعلیم گاہوں اور یونیورسیٹیوں میں طلباء کے انتشار اور بدامنی کی کیا وجوہات ہیں...... کیا بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں میں بھی لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہوتا ہے؟

جواب: تعلیم گاہوں میں لاء اینڈ آرڈر کے پیدا ہونے کے دو سبب ہیں...... ایک تو یہ کہ بہت سارے طلباء ایسے ہوتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم اور HIGER STUDIES کے لائق ہی نہیں ہوتے، بس ان کو داخلہ مل جاتا ہے لیکن پڑھنا ان کا مقصد نہیں ہوتا، ان کا مطمح نظر کچھ اور ہوتا ہے۔

دوسرا سبب طلباء میں پائی جانے والی مایوسی ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ہم ہر سال دو لاکھ ۲۴ ہزار بچوں کے امتحان لیتے ہیں، اسے ہم جانتے ہیں اور طلباء بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اس تعداد میں سے بہ مشکل ۳۰/۲۵ طلباء کامیاب ہوں گے پھر بے روزگاری کا بھی ایک سنگین مسئلہ ہے...... تو تعلیم گاہوں میں لا اینڈ آرڈر کے مسئلہ کے پیدا ہونے کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ جو اپنے مستقبل سے مایوس ہوگا وہ شرارتیں کرے گا اور جو اپنے مستقبل کے سلسلے میں پُر امید ہوگا، وہ شرارتیں نہیں کرے گا۔

اس کا ایک پہلو نصاب کا بھی ہے، ہم طلباء کو جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ IRRELEVANT ہے، اس کا تعلق نہ تو طلباء کی ضرورتوں سے ہوتا ہے اور نہ حالات سے...... میں اکثر بی اے پاس کرنے والے طلباء سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے یہاں تین سال کا عرصہ گزارا، روپئے خرچ کئے، مجھے یہ بتادو کہ اس کے نتیجہ میں تمہاری شخصیت (PERSONALITY) پر کیا اثرات مرتب ہوئے یا یہ کہ تم نے کون سی نئی SKILL حاصل کی...... افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان طلباء میں سے اکثریت کا جواب مایوس کن ہی ہوتا ہے...... تو جب تک یہ صورتِ حال بنی رہے گی، تعلیم گاہوں میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی باقی رہے گا۔

یونیورسٹی میں لاء اینڈ آرڈر کے مسئلہ کی ایک وجہ اساتذہ کی گروپ بندی اور ان کے درمیان پائی جانے والی چپقلش بھی ہے، اس صورت میں اساتذہ اپنے مقاصد کے لئے

طلباء کو استعمال کرتے ہیں، وہ گروپ بندی چاہے سیاست کی بنیاد پر ہو، یا ذات پات کی بنیاد پر، اسکے نتائج منفی ہی ہوتے ہیں۔

تو دیکھئے، اصل مسئلہ TEACHERS کا ہے، اگر اساتذہ ٹھیک ہوں، وہ تعلیم و تدریس سے دلچسپی لیں، اپنے فن میں ماہر ہوں، تعلیم سے ان کا MORAL COMMITMENT ہو تو اس قسم کے مسائل پیدا نہیں ہوں گے مگر وہ جو فارسی کا شعر ہے کہ

گر ہمیں مکتب وہمیں مُلّا
کار طفلاں خراب خواہد شد

جہاں تک غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لاء اینڈ آرڈر کے مسئلہ کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہے تو وہاں کے طلباء کے پیش نظر مستقبل ہوتا ہے، وہاں کا طالب علم تعلیم گاہ میں پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے جاتا ہے اس لئے وہاں کی یونیورسٹیاں لاء اینڈ آرڈر کے مسائل سے پاک ہیں، البتہ وہاں کا سماج اس مسئلہ اور پریشانی سے دوچار ہے۔

سوال: ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل میں دو مسائل بنیادی نوعیت کے ہیں، ایک تو لاء اینڈ آرڈر سے متعلق یعنی حالات کے غیر معتدل (ABNORMAL) ہونے کا مسئلہ، جن میں تعمیری کام آسان نہیں ہوتا...... اور دوسرا تعلیم کا مسئلہ کہ مسلمانوں کا تعلیمی گراف بہت نیچے ہے، اس کی وجوہات اور اس کا حل؟

جواب: ہندوستانی مسلمانوں کے دو مسائل کا آپ نے ذکر کیا، ایک تو لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ یا ان کے لئے وقتاً فوقتاً حالات کے غیر معتدل ہو جانے کا مسئلہ، تو اس سلسلہ میں ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن میرا احساس ہے کہ یہ حالات جلد نہیں سدھریں گے، اس لئے مسلمانوں کو ان حالات میں زندہ رہنے کا فن سیکھ لینا چاہیے، حالات کی ابتری کے جو عوامل ہیں، وہ ہمارے قابو اور دسترس سے باہر ہیں۔

دوسری بات آپ نے کہی کہ مسلمانوں کا تعلیمی گراف بہت نیچے ہے، اصل میں اس کی ایک وجہ تو یہ بنی کہ مسلمانوں میں یہ خطرناک رجحان پیدا ہو گیا کہ تعلیم حاصل کرنا بیکار

ہے اگر ملازمت نہ ملے......جس نے بھی تعلیم کے رشتہ کو ملازمت اور روزگار سے جوڑنے کی کوشش کی، میرے نزدیک اس نے واقعی بڑا ظلم کیا......تعلیم بذاتِ خود مقصود ہے، اس کا مقصد ایک اچھا انسان بنانا ہے، اسلام کا نظریۂ تعلیم تو یہی ہے...... باقی رہی ملازمت اور دوسرے فائدے، تو یہ ضمنی ہیں، ایسا نہ ہوتا تو جناب رسول اللہ ﷺ کیوں فرماتے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

میں اس سلسلہ میں یہودیوں کی مثال دینا چاہوں گا، مدت دراز تک یہودیوں کو دنیا کے ہر ملک میں ملازمت سے دور رکھا گیا، سرکاری نوکریاں انھیں نہیں دی گئیں ان کو الگ تھلگ اور ISOLATE کر دیا گیا، یونیورسٹیوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے لیکن یہودیوں نے تعلیم سے اپنے رشتہ کو استوار رکھا، تعلیم سے اپنے رشتے کو منقطع نہیں ہونے دیا، ان کے یہاں دانشوری کی روایت قائم رہی، وہ تعلیم کے ہر میدان میں کام کرتے رہے، نتیجہ میں جب حالات ان حق کے میں سازگار ہوئے تو دنیا نے دیکھا کہ ہر فن کے ماہرین ان کی صفوں میں موجود تھے۔

تو میں مسلمانوں سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ تعلیم حاصل کریں اس سے بے پرواہ اور بے نیاز ہو کر کہ اس کی بدولت انھیں ملازمت ملتی ہے یا نہیں۔ انہیں اپنے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے اور ہر طرح کا علم، چاہے اسے دینی کہہ لیں یا عصری، حاصل کرنا چاہیے۔

میں علم کی اس تقسیم کا قائل نہیں ہوں، علم کی تقسیم کا یہ فلسفہ اور نظریہ عیسائیوں کی دین ہے اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ ان کے یہاں چرچ اور سائنس باہم دست و گریباں رہے، چرچ نے سائنس دانوں کو مجرم گردانا اور انھیں تختہ دار سے ہم کنار کیا، یہ ان کی روایت رہی اور اس کے نتیجہ میں ان کے یہاں علم مذہبی و عصری خانوں میں تقسیم ہو گیا، جب وہ یہاں حاکم بن کر آئے تو انھوں نے اپنا نظریۂ تعلیم ہم پر بھی تھوپ دیا، افسوس کہ ہم نے اسے قبول کر لیا، قرآن مجید نے تو ہمیں ہدایت دی ہے فاستبقوا الخیرات کی، کہ خیر کے کاموں میں ہم

سبقت لے جائیں اور عملی جد وجہد کے لئے تعلیم سے زیادہ بہتر میدان اور کیا ہوسکتا ہے، چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تعلیم کے میدان میں پیش رفت کریں اور اس میں سبقت لے جائیں۔

ایک بات اور ہے جس کا تعلق سماج کے اندازِ فکر سے ہے...... افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک SUB-INSPECTOR کی تو عزت کرتا ہے لیکن ایک سائنس داں کو توقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، اس لئے کہ اس کے پاس SUB-INSPECTOR کی سی AUTHORITY نہیں ہے، یہ پیمانہ درست نہیں ہے، معاشرہ کے اس اندازِ فکر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور اس کا یہ ذہن بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ پڑھے لکھے انسان کی عزت کرے اگر چہ معاشی طور سے بظاہر وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو...... ہمارا معاشرہ ایسے افراد کو عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھے جو علمی وفکری کام کرنے والے ہیں اور اتنا ہی نہیں، ان کے وقار اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ان کی گاہے بگاہے مدد بھی کرے...... اپنے طرز عمل اور طرز فکر میں تبدیلی لائے بغیر ہمارا معاشرہ کسی خوشگوار انقلاب سے ہمکنار نہیں ہوسکتا، اگر ہم نے ایسا کرلیا تو انشاء اللہ ہم ان خصوصیات کے حامل ہوسکیں گے جو قرونِ اولی کی خصوصیات تھیں اور نتیجہ میں ان کے مفید ثمرات سے ہمارا معاشرہ بہرہ مند ہوسکے گا۔

سوال: ہمارا ملک کدھر جارہا ہے؟ ملک کے حالات کی ابتری کی بنیادی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

جواب: دیکھئے، ایک عجیب بات ہے لیکن ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی آبادی کا چوتھا حصہ اور دنیا کے مسلمانوں کی آبادی کا نصف حصہ برصغیر میں رہتا ہے...... تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اِس قدر بڑی آبادی کی ترقی اور خوشحالی کی فکر اور کوشش ہوتی اور ان کے بنیادی مسائل پر توجہ دی جاتی...... ظاہر ہے کہ بنیادی مسئلہ معاشرہ کی خوشحالی اور اس کے باعزت زندگی گزارنے کا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ برصغیر میں اس بنیادی مسئلہ کو نظر انداز کردیا گیا

اور اتنی بڑی آبادی (جو دنیا کی آبادی کا چوتھائی حصہ ہے) کو فروعی مسائل میں الجھا دیا گیا، دراصل یہ مغرب کی چال ہے...... انگریز برصغیر سے چلا تو گیا لیکن وہ یہاں کی عوام کو مسائل میں الجھا گیا۔

نتیجہ میں اصل مسئلہ جذباتیت کی تہ میں دب گیا ہے، جذباتی نعروں اور مسئلوں میں برصغیر کو الجھا دیا گیا...... جب کہ میں غیر ممالک کو دیکھتا ہوں کہ وہاں تیزی سے ترقی ہورہی ہے تو کاش کہ کچھ ایسا کیا جائے، یہ جو GODIAN KNOT ہے، اسے کاٹ کر اپنی ترقی کی راہیں بنائی جائیں۔

سوال: ایک I P S افسر ہونے کی حیثیت سے بھی اور ایک VC کے منصب پر فائز ہونے کے ناطے بھی انتظامی امور سے آپ کا سروکار رہا آپ کے نزدیک ایک اچھے منتظم اور ADMINISTRATOR کو کن خوبیوں کا مالک ہونا چاہیے؟

جواب: ایک اچھے منتظم (ADMINISTRATOR) کی خصوصیت کے آپ کے سوال کا جہاں تک تعلق ہے تو میں اس کے جواب میں اقبالؔ کے لفظوں میں کہوں گا ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

جو میر کارواں ہوتا ہے چنانچہ اسے ان خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔

سوال: ایک اعلیٰ انتظامی افسر ہونے کے ناطے عام شہریوں کے نام...... ایک وی سی ہونے کی حیثیت سے طلباء کے نام...... اور ملّت کے ایک فرد ہونے کے ناطے ملّت کے نام آپ کا پیغام؟

جواب: شہریوں سے میں کہنا چاہوں گا کہ وہ جذباتیت سے پرہیز کریں، اپنے پیشِ نظر اعلیٰ مقاصد رکھیں جن میں بڑا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ ایک عام انسان باعزت وباوقار زندگی گزار سکے، وہ خوشحال ہو، اور وہ خود کو محفوظ ومامون تصور کرتا ہو، چاہے وہ پہاڑ کی چوٹی پر جنگل وبیابان میں بیٹھا ہو یا گنجان آبادی میں رہتا ہو، ہر آدمی ایسے پرُ امن ماحول کو بنانے

میں شامل رہے اور کوشش کرے۔

طلباء کے لئے یہ کہنا ہے کہ یہ دنیا نہایت تیزی سے بدل رہی ہے، علم کا میدان بھی تیز رفتاری سے تغیرات سے دوچار ہو رہا ہے اور دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ دنیا کا اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے انھیں بھی نہایت تیز رفتار بننا پڑے گا۔ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے انھیں سخت محنت و جانفشانی سے کام لینا ہوگا۔

ملّت کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ملّت نہایت پُر آشوب دَور سے گزر رہی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ مسلمانوں کی دنیا کی آبادی کا نصف حصہ برصغیر میں آباد ہے، اس حقیقت کو مسلمان ملحوظ خاطر رکھیں، اپنی اہمیت کو سمجھیں اور ایسا نقشہ کار بنائیں کہ ان کا مستقبل محفوظ ہو اور روشن ہو...... وہ غیر اسلامی رسم ورواج اور طرز فکر وطرز عمل کو چھوڑ دیں، ذات پات کے بندھنوں سے خود کو آزاد کریں، باہمی چپقلش کو تج دینے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں اور گروہ بندی، مذہبی فرقہ بندی سے خود کو پاک کریں۔ ایسے لوگ جو بظاہر کتنے ہی پارسا اور دین دار دکھائی دیتے ہوں لیکن اگر وہ مذہب کے نام پر مسلمانوں کو تقسیم کر رہے ہوں تو وہ ہمارے دشمن ہیں، ایسے لوگوں کو ہم پہچانیں اور انھیں الگ تھلگ کر دیں، مذہبی گروہ بندی کا مقصد ملّت کے حصے بخرے کرنا اور اسے کمزور کر دینے کے سوا کچھ نہیں۔

(بانگ درا، لکھنؤ، اکتوبر، نومبر ۲۰۰۰ء)

ماں، مادری زبان اور مادر وطن کو کبھی بھولنا نہیں چاہیے!!

اول وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری سے ایک ملاقات

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری مدت دراز سے سائنس کی دنیا کا ایک معتبر نام ہے، ۱۹۷۰ء میں جب ان کی عمر صرف ۲۸ سال تھی تو انہیں علم الحیوانیات میں اپنی تحقیق پر دنیا کی سب سے اعلیٰ ڈگری ''ڈاکٹر آف سائنس'' (D.Sc) عطا کی گئی تھی۔ ۱۹۶۴ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک لکچرر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور پھر ریڈر، پروفیسر، کوآرڈینیٹر، ڈین اور چیئرمین کے مختلف مناصب پر فائز ہوتے چلے گئے۔ موصوف نے اپنے مخصوص تحقیقی مضمون نماٹولاجی (Nematology) اور علم الحیوانیات کے مختلف موضوعات پر کم وبیش ۲۰ کتابیں تصنیف کیں، کئی مونوگرافس اور ۳۵۰ سے زائد اہم مقالات تحریر کئے۔ اپنے تحقیقی معیار کی بلندی کی وجہ سے وہ نہ صرف ہندوستان کی اہم سائنس اکیڈمیز (Science Academies) کے فیلو منتخب ہوئے بلکہ وہ بیرون ممالک کی کئی ممتاز اکیڈیمیوں سے بھی وابستہ ہیں، علم وتحقیق کے سلسلے میں وہ کئی ممالک میں طویل عرصہ تک قیام پذیر رہے برطانیہ میں وہ Common Wealth Agricultural Bureau International میں Principal Nematologist کے باوقار عہدے پر برسوں فائز رہے،

۹۱-۱۹۸۹ء میں Zoological Survey of India وزارت ماحول وجنگلات، حکومت ہند کی تقریباً سوسالہ تاریخ میں موصوف اس کے واحد مسلمان ڈائرکٹر بنائے گئے اور اپنی اس حیثیت سے حیوانیات سے متعلق تمام امور میں حکومت ہند کے مشیر رہے۔

صدر جمہوریہ ہند نے جنوری ۱۹۹۸ء میں جب انہیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا تو اس وقت وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی آف لائف سائنسز (Faculty of Life Sciences) کے ڈین (Dean) اور بیک وقت تینوں شعبوں زولاجی، میوزیولاجی اور وائلڈ لائف بیالوجی کے صدر کی حیثیت سے کام کررہے تھے اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے کے بعد پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری اردو دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئے، اس لیے بھی کہ وہ اس یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے جس کی تشکیل وتعمیر کا خواب اردو دنیا مدتوں سے دیکھ رہی تھی، اردو یونیورسٹی...... جس کا خواب سیدوالا گہر (سرسید احمد خاں) نے دیکھا تھا، اردو یونیورسٹی...... جس کے قیام کے ارمانوں کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے سینہ میں بسایا اور اس کے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں سجایا تھا، لیکن افسوس کہ تقسیم ملک کے المناک واقعہ نے اس گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اردو زبان کو متاثر کیا مگر طوفان بلاخیز کے باوجود اس کی مقبولیت قائم رہی اور اپنی شیرینی ومٹھاس کی بدولت اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا، اردو اپنے گھر سے بے گھر ضرور کردی گئی مگر کیا اپنے اور کیا پرائے، کوئی اسے اپنے دل کے نہاں خانے سے دربدر نہ کرسکے...... قصہ مختصر...... مدارس نے، گیتوں نے، مشاعروں نے اور عوامی بول چال کی اور رابطہ کی عام فہم زبان ہونے نے اسے زندہ رکھا...... آزادی کے پچاس برسوں کے بعد

۱۹۹۷ء میں ایک تاریخ ساز واقعہ پیش آیا یعنی پارلیمنٹ کے ایکٹ (۲/۱۹۹۷ء) کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے درج ذیل مقاصد قرار پائے:

☆ اردو زبان کی ترویج وترقی اور اردو ذریعہ تعلیم سے روایتی اور فاصلاتی طریقوں کو اپناتے ہوئے پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم وتربیت اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کے خواہاں افراد کے لیے وسیع مواقع فراہم کرنا، نیز تعلیم نسواں پر بھی پوری توجہ کا ارتکاز۔

☆ اندرون وبیرون ملک ایسے مراکز کا قیام جو یونیورسٹی کے نزدیک اس کے مقاصد کے حصول میں ضروری ہوں۔

(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۹۶ء نشان ۲ بابتہ ۱۹۹۷ء سے ماخوذ)

یکم نومبر ۱۹۹۹ء کو پروفیسر شمیم جیراجپوری جب لکھنؤ تشریف لائے تو راقم سطور نے موقع کو غنیمت جانا اور ان سے ملاقات کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اردو یونیورسٹی کا پس منظر کیا ہے، اس کی پیش رفت اور آئندہ کے اس کے منصوبے کیا ہیں؟ اس راہ میں کون سی دشواریاں ہیں اور افادہ کے کون سے امکانات ہیں اور یہ کہ اردو یونیورسٹی کے استحکام کے سلسلہ میں خود اردو والوں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

دوران گفتگو پروفیسر شمیم جیراجپوری نے بذات خود فرمایا کہ میرا نام شاعرانہ سا لگتا ہے، اس پر میں نے از راہ مذاق عرض کیا کہ حضور! یہ تو شاید اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے نام سے بننے والی یونیورسٹی کا وی سی کوئی شاعر نہیں جو محض تخیلاتی دنیا میں رہے بلکہ اس کا وی سی سائنس کی دنیا کا انسان ہے اور سائنس کی دنیا کا انسان واقعاتی دنیا کا انسان ہوتا ہے،

حقیقت بیں اور حقیقت پسند انسان !!...... پروفیسر شمیم جے راج پوری ضلع اعظم گڑھ کے قصبے جیراجپور میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے اردو ان کی مادری زبان ہے اور اردو ادب واسلامیات میں برصغیر کے نامور ماہرین اسلم جیراجپوری اور مولانا عبدالسلام ندوی ان کے قریبی بزرگوں میں ہیں۔ ''اقبال کامل'' کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی جن سے مولانا آزاد کے بڑے گہرے مراسم تھے۔

پروفیسر جیراجپوری نے لکھنؤ یونیورسٹی کے ہی جلسہ میں کہا تھا کہ ماں، مادری زبان اور مادر علمی کو کبھی بھولنا نہیں چاہئے...... یہ تو ماں کے مقدس ترین رشتے کی مناسبت سے ایک بات ہوئی لیکن دادا نامدار کی قابل احترام نسبت سے ان کے نامور پوتے کے حصہ میں بھی گیسوئے اردو کو سنوارنا ہی آیا اس فرق کے ساتھ کہ دادا کا کارنامہ اردو ادب کی تخلیق ٹھہرا تو پوتے کے لئے اردو زبان کے پھیلاؤ کا کام مقدر ہوا اور چونکہ یہ کام اکیسویں صدی میں ہونا ہے اس لئے قدرت نے اسے سائنس کی تجربہ گاہوں سے گزارا، غور وفکر کا عادی بنایا اور عمل کی دنیا کا انسان بنایا تا کہ انشاءاللہ اردو یونیورسٹی کا خواب بکھر نہ جائے بلکہ حقیقت کا روپ دھار کر دنیا کے سامنے آئے........... تو ملاحظہ فرمایئے جناب پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری سے ایک گفتگو!!

محترم! اردو یونیورسٹی کی کہانی ہم آپ کی زبانی سننا چاہیں گے۔ تجویز سے لے کر موجودہ یونیورسٹی کے خاکہ اور عملی جامہ پہننے تک کی داستان یقیناً ایک طویل جدوجہد کی داستان ہوگی، اب تک تعلیمی وانتظامی لحاظ سے کون سے کام ہوئے ہیں؟ اس راہ کی عملی دشواریاں کون سی ہیں؟ روزگار کو اردو سے جوڑنے کے علاوہ اردو کی ترقی کے کون سے امکانات اس یونیورسٹی کے قیام سے جڑے ہوئے ہیں؟

جواب: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہندوستان کی دوسری نیشنل یونیورسٹی ہے، پہلی نیشنل یونیورسٹی اندرا گاندھی نیشنل یونیورسٹی ہے۔ اردو یونیورسٹی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فاصلاتی تعلیم اور روایتی تعلیم دونوں طرح کے نظام رائج ہیں۔ اب تک اس میں بی۔ اے اور بی کام کی تعلیم فاصلاتی نظام کے ذریعہ شروع ہوچکی ہے اور آئندہ سال کے منصوبے میں بی ایس سی کا آغاز ہونا ہے اور کچھ دوسرے شعبوں کا بھی اجرا ہوگا۔

اردو زبان میں مختلف کورسز کی کتابوں کی فراہمی کا ایک مسئلہ ہمارے سامنے ہے، آپ جانتے ہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کو معطل ہوئے دہائیاں بیت گئیں اس لیے اردو میں نصابی کتابوں کی تیاری کا مسئلہ بڑا اہم بھی ہے اور مشکل بھی، اس لحاظ سے دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں اس یونیورسٹی کا کام قدرے دشوار ہے۔

پھر ایک دقت یہ بھی ہے کہ جو حضرات اردو سے واقف ہیں وہ سائنس اور دوسرے تکنیکی علوم سے واقف نہیں ہیں اور جو سائنس وتکنیکی علوم کے واقف کار ہیں وہ اردو سے کماحقہ، واقفیت نہیں رکھتے......لیکن یہ کام ہونا ہے اور اس چیلنج کو بہرحال قبول کرنا ہے اس لئے کہ صرف بی اے یا بی کام کے کورسز شروع ہوجانے سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ اردو خواں حلقہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سائنس اور تکنیکی علوم کے بھی تعلیم یافتہ اور سند یافتہ ہوں تا کہ وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔

روزگار کو اردو سے جوڑنے کی بات کہی جاتی رہی ہے ہماری بھرپور کوشش ہے کہ اس یونیورسٹی میں ایسے کورسز کے اجراء کی فکر کی جائے کہ جن کی بدولت اس یونیورسٹی کے طلباء معاشی حوصلہ مندی سے بھی سرفراز ہوں، ایسے کورسز کے اجراء میں کوئی کوتاہی نہیں کی جائے گی لیکن اس سلسلہ میں میں دو باتیں ضرور کہنا چاہوں گا کہ ایک تو ملک کی آبادی اور حکومت کی ملازمتوں میں کوئی تناسب نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ ملازمتیں بھی ان ہی کے حصہ میں آتی ہیں جو اس کی لیاقت وصلاحیت رکھتے ہوں، اس لیے اس یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلباء کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے اندر لیاقت وصلاحیت پیدا کرنے کے لیے جی جان سے محنت کریں۔

یہ بات اب کسی بحث اور دلیل کی محتاج نہیں رہی ہے اور ماہرین تعلیم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ مادری زبان میں ہی تعلیم زیادہ مفید وکارگر اور مؤثر ونتیجہ خیز ہوتی ہے۔اس لحاظ سے اردو یونیورسٹی اردو خواں اور اردو داں طبقہ کے لیے ایک تحفہ اور نعمت ہے اردو یونیورسٹی کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ملک کے سارے اردو داں طبقہ میں باہمی یگانگت کی بھی فضا بنے گی اور اس طرح اردو کا رشتہ اپنے اس ماضی سے قائم ہو سکے گا جو بڑا شاندار تھا۔

اردو یونیورسٹی کی ترقی کا انحصار دو باتوں پر ہے، ایک ملنے والی گورنمنٹ سے گرانٹ پر اور دوسری بات یہ کہ اردو میں ہمیں کس قدر کورسز ترجمہ ہوکر ملتے ہیں، چونکہ یونیورسٹی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت وجود میں آئی ہے اور الحمدللہ بغیر کسی مخالفت کے یہ ایکٹ پارلیمنٹ میں پاس ہوا ہے، اس لیے گرانٹ کے سلسلہ میں کوئی ایسی دشواری پیش نہیں آنی چاہئے لیکن ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کے سامنے کرنے کے اور بھی بہت سارے کام ہیں ان ہی میں سے ایک کام اس یونیورسٹی کا بھی ہے، ترجمہ کے سلسلہ میں جو دقت ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے......اس لحاظ سے یہ کام وقت طلب ہے اور یونیورسٹی کے قیام اور پھیلاؤ کا منصوبہ تو طویل المدتی ہوتا ہی ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک کی ایک تاریخ ہے جو کئی دہائیوں پر مشتمل ہے اس طرح دوسری یونیورسٹیوں کو قیاس کر لیجئے۔اس لئے اردو یونیورسٹی کے کاموں میں بھی پیش رفت ایک مستحکم رفتار سے ہوگی اور کام تدریجا ہوگا۔۔۔

اردو یونیورسٹی کا معاملہ تو اس لحاظ سے انوکھا اور منفرد ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح اس کے پاس نہ تو پہلے سے کالجز تھے، نہ اسٹاف تھا، نہ عمارتیں تھیں نہ کیمپس (Campus) تھا، گویا اس کا صرف ایکٹ تھا جو کاغذ پر تھا......اس مجوزہ یونیورسٹی کے جب چارج لینے کی بات آئی تو حیدرآباد میں قائم ہونے والی اس یونیورسٹی کا چارج میں نے دلی میں لیا، بہرحال میں اس حال میں حیدرآباد پہنچا کہ وہاں میرا کوئی شناسا بھی نہ تھا، لیکن اللہ کا فضل رہا کہ مخلصین مہیا ہوتے گئے، ایسے حضرات جن کا اردو سے کوئی تعلق نہ تھا انہوں نے جس طرح میرے ساتھ تعاون کیا وہ میرے دل پر نقش ہے......ان مخلصین میں

زیادہ تر حضرات حیدرآباد یونیورسٹی کے تھے، آندھراپردیش گورنمنٹ نے اردو یونیورسٹی کے لئے ۱۲۰۰ ایکڑ زمین فراہم کی ہے جو اس کا فراخدلانہ اقدام ہے، اس کی چہار دیواری کی تعمیر کا کام ہو رہا ہے اور کیمپس میں تعمیراتی کام کا سلسلہ بھی جاری ہے، ایک عمارت جس کا تخمینہ تقریباً ۵ کروڑ ہے، اس کی تعمیر بہت جلد شروع ہو جائے گی۔

سوال: ابھی جناب والا نے اردو زبان میں مختلف کورسز کی کتابوں کی تیاری کے سلسلہ میں کچھ باتیں فرمائیں، اس سلسلہ میں وضع اصطلاحات (Terminology) کا مسئلہ بھی کافی مشکل ہے، اس پر قابو پانے کے لیے آپ کے سامنے کون سا لائحہ عمل ہے؟

جواب: اصطلاحات کا جہاں تک سوال ہے تو آپ جانتے ہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اس رخ پر کام ہوا تھا، مگر ان اصطلاحات میں عربی وفارسی کا اثر ہے اور ایسا اس لئے بھی تھا کہ اس زمانہ میں وہ اصطلاحات لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہیں ہوتی تھیں، لوگ عموماً عربی وفارسی سے واقف تھے لیکن کئی دہائیاں بیت جانے کے بعد اور تعلیم میں اردو کا کما حقہ چلن نہ ہونے کی وجہ سے بڑا انحطاط آیا ہے اس لیے وضع اصطلاحات کا کام نہایت توجہ چاہتا ہے یہ ایک اہم اور بنیادی نوعیت کا کام ہے اس کے لیے میں سمپوزیم بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اصطلاحات کے وضع کرنے کی کیا شکلیں ہوں اس کی کیا صورت ہو یونیورسٹی کا اپنا Translation Division بھی ہے جو اس میں پیش رفت کرے گا۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اصطلاحات آسان اور عام فہم ہوں، ایسی اصطلاحات جو عام فہم ہیں مثلاً درجہ حرارت وغیرہ، وہ تو باقی رہیں۔انگریزی کی وہ اصطلاحات جو قبول عام اختیار کر چکی ہیں ان کے لیے علاحدہ سے اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے مثلاً ٹیلی ویژن، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ......ایسی اصطلاحات جن کا اردو میں وضع کرنا ضروری ہے، وہ وضع کی جائیں مگر ان کے استعمال کے وقت ان کے سامنے انگریزی کی اصطلاح بھی قوسین میں ضرور لکھی جائے......اس کے علاوہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ اردو یونیورسٹی کے طلباء وطالبات کے لیے انگریزی سیکھنا نہایت ضروری ہے، ہندی کی اپنی افادیت ہے اور علاقائی

زبان (Regional Language) کی بھی اپنی اہمیت ہے اس کے بغیر اردو یونیورسٹی کے طلباء اپنی نافعیت ثابت نہیں کرسکیں گے اور حصول روزگار (Employment) بھی ان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

سوال: جناب والا نے لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈی پی اے ہال میں فرمایا تھا کہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو کے سارے مسائل اس کے قیام سے حل ہو گئے......اردو والوں کو اس یونیورسٹی کے قیام سے براہ راست کون سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور یہ کہ خود اردو والوں کو یونیورسٹی کے استحکام کے لیے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: جی ہاں! اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو کے سارے مسائل تو حل نہیں ہو جائیں گے مثلاً اردو کی پرائمری تعلیم، ابتدائی تعلیم وغیرہ...... بات یہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ملک کی ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ بارہویں جماعت تک ہے اس کے بعد اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا لیکن اردو یونیورسٹی کے قیام کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم سے یونیورسٹی سطح تک کا تعلیمی سلسلہ قائم رہے گا اور اس کے ذریعہ اعلیٰ ترین ڈگریوں کا حصول ممکن ہو سکے گا۔

تو اس طرح حکومت نے تو اردو یونیورسٹی قائم کردی اب خود اردو والوں پر بھی ذمہ داریاں ہیں، وہ اردو کو اپنائیں، اردو کو سینہ سے لگائے رکھیں، اپنی نسلوں کو اردو سے بیگانہ نہ ہونے دیں...... میں کہتا ہوں کہ اپنے مذہب اور زبان کی حفاظت اور ترویج واشاعت کی ذمہ داری تو خود ان کے حاملین کی ہوتی ہے......حکومت کی طرف سے اگر ان معاملات میں ہمیں اعانت وتعاون ملتا ہے تو فبہا، بہت اچھی بات ہے لیکن اس کی اصل ذمہ داری تو ہماری اپنی ہے......اردو ہمارے تہذیبی ورثہ کی زبان ہے، ہمارا مذہبی لٹریچر اس میں ہے، وہ ہماری تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہے اگر ہم خود اس کے محافظ و پاسبان نہ ہوئے اور خود ہم نے اس کی فکر نہ کی تو پھر دوسروں کو کیا پڑی ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ خود اردو والوں کو بھی اپنی ذمہ داری نبھانے کی فکر کرنا پڑے گی......اس طرح اردو یونیورسٹی سے استفادہ کی

راہیں ان پر کھلیں گی یونیورسٹی میں نت نئے کورسز متعارف کئے جائیں گے اور اس طرح لوگ اس سے جڑتے رہیں گے۔

سوال: یہ بھی ایک پرانی بحث ہے کہ کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟ جناب والا! یونیورسٹی کے ایک اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں اور حقائق اور اعداد وشمار آپ کے سامنے ہیں چنانچہ آپ کے نزدیک اس سوال کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: اردو کسی مخصوص فرقہ کی زبان نہیں، یہ ہندوستان کی زبان ہے اور اس لحاظ سے ہر فرقہ کی زبان ہے، کتنے مسلمان ہیں تامل ناڈو، کیرالا اور بنگال وغیرہ کے، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور کتنے غیر مسلم ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کی زبان اردو ہے...... پچاس سالوں میں اردو کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے باوجود اردو زندہ ہے، اس کی شیرینی کے سب مداح ہیں، قائل ہیں اور وہ ایک مقبول زبان ہے......فیض احمد فیض کی مادری زبان اردو نہیں تھی، پنجابی ان کی مادری زبان تھی اور پنجابی زبان کو حق دلانے کے لیے انہوں نے جدوجہد بھی کی، لیکن مقبولیت وشہرت انہیں اردو ہی کی بدولت ملی تو اردو کی مقبولیت تو اپنی جگہ ایک امر واقعہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی بھی دور کردینے کی ضرورت ہے کہ اردو اور ہندی میں آپس میں ہرگز ہرگز کوئی بیر نہیں ہے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جس قدر قریب رہیں گی، اتنا ہی دونوں زبانوں کو فائدہ پہنچے گا۔

یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ تقسیم ملک کے اردو زبان پر منفی اثرات مرتب ہوئے پھر اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان سمجھ لیا گیا اور ہندی بیلٹ والے صوبوں میں اردو متاثر ہوئی...... لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ اردو کی شیرینی ومٹھاس ایک ایسی حقیقت ہے جس کا سب کو اعتراف ہے، اردو نہ جاننے والوں کو بھی اعتراف ہے۔ جس طرح ایک پھول ہو، وہ خوبصورت ہے اس لیے دیکھنے والا اسے خوبصورت کہے گا ہی اگر خدانخواستہ وہ آنکھیں نہ رکھتا ہو تو اس کی مہک ہی سے وہ مستفید ہوگا اور اس کی تعریف وتوصیف کرے گا، یہی حال

اردو کا ہے...... میں گزشتہ دنوں جو کوریا (Korea) گیا تھا تو وہاں ایک چینی پروفیسر سے ملاقات ہوئی انہوں نے اردو کے گیتوں سے اپنی شیفتگی کی بات کہی اور کچھ گیت بھی سنائے، تو یہ ہے مقبولیت اردو کی...... جو لوگ اردو کو سمجھتے نہیں وہ بھی اردو کے مداح ہیں اور اس پر فدا ہیں اردو کے بول کانوں میں رس گھولتے ہیں اس لیے اردو کو بیرون سے خطرہ نہیں ہے لیکن ہاں! اگر اسے خطرہ ہوسکتا ہے تو خود اپنوں سے یعنی اردو والوں سے، اگر خدانخواستہ وہ اپنی زبان کے ساتھ بے اعتنائی اور بے رخی کا معاملہ کریں۔

سوال: چند مہینوں میں ہم اکیسویں صدی میں داخل ہورہے ہیں، اردو یونیورسٹی کے لیے اس لحاظ سے جناب والا کے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟

جواب: جی ہاں! ہماری خواہش بھی ہے اور کوشش بھی ہے کہ اردو یونیورسٹی اکیسویں صدی کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو، وہ جدید سہولیات سے پوری طرح لیس اکیسویں صدی کی یونیورسٹی ہو اور ۲۲رویں صدی کی طرف دیکھ رہی ہو۔

(بانگ درا، لکھنؤ)

مسلم یونیورسیٹی کی نئی داخلہ پالیسی

پراکٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پروفیسر نفیس احمد سے ایک گفتگو

زیر نظر انٹرویو پروفیسر نفیس احمد صاحب (پراکٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا ہے، جس کا بنیادی موضوع ہے ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی حالیہ نئی داخلہ پالیسی''، جس کے تحت مسلمانوں کو یونیورسٹی میں پچاس فیصد ریزرویشن دیا گیا ہے، مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا حکومت ہند کا مکمل امداد یافتہ ایک اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے اور یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی تھی اور مسلمانوں کے لئے قائم تھی تاکہ دینی تعلیم و تربیت کے ساتھ مسلمانوں میں عصری تعلیم کو فروغ دیا جاسکے، دنیا جانتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایک عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹی رہی اور اس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو وہ رجال اور شخصیتیں دیں جن میں سے بیشتر کے کارہائے نمایاں تاریخ کا ایک حصہ ہیں، لیکن ادھر دو تین دہائیوں سے دو تین صوبہ جات کے طلبہ کی کثرت کی وجہ سے یونیورسٹی کا نہ صرف نیشنل کیریکٹر بلکہ آل انڈیا کریکٹر تک متاثر ہورہا تھا، جس کی وجہ سے جو مشترکہ کلچر (Composite culture) تھا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وہ بھی ناپید ہورہا تھا، یہ سب کچھ نتیجہ تھا سابقہ داخلہ پالیسی کا جس میں انٹرنل طلبہ کے کوٹے اور دوسرے کوٹوں کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی کی مندرجہ بالا امتیازی

شان اور شناخت کھوئی جارہی تھی، لہذا دردمند حضرات جن میں بدرالدین طیب جی سابق وی سی مسلم یونیورسٹی کا نام سرفہرست ہے، اس سلسلہ میں بجاطور پر فکر مند تھے، موجودہ وی سی جناب نسیم احمد صاحب کے سر پہ یہ سہرا بندھا کہ آئینی حدود، سیکولرزم کی پاسداری اور قوانین کے نشیب وفراز کے پورے پاس ولحاظ کے ساتھ انہوں نے مندرجہ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا، اکثر جرأت مندانہ اقدام کی تاریخ رہی ہے کہ اس سے شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والوں اور مفاد پرست نیز تنگ نظر افراد چیں بہ جبیں ہوتے آئے ہیں، چنانچہ مسلم یونیورسٹی کی نئی داخلہ پالیسی بھی ایسے افراد کے لئے موضوع بحث بنی اور میڈیا گل افشانی کرتا رہا، آسرا اسپتال کے افتتاح پر پروفیسر نفیس احمد صاحب پراکٹر مسلم یونیورسٹی کی لکھنؤ آمد پر جناب جنید قریشی صاحب کے سہارے پروفیسر صاحب موصوف سے راقم کو انٹرویو کا موقع ملا، پروفیسر صاحب نہ صرف یونیورسٹی سے تین دہائیوں سے زائد مدت سے وابستہ ہیں بلکہ مختلف دینی و ملی تحریکات سے بھی عملاً دلچسپی رکھتے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے شعبہ چشم کے جہاں دیدہ ایک پروفیسر کے زاویہ نگاہ سے سمجھئے کہ وہ نئی داخلہ پالیسی سے متعلق کیا کہتے ہیں، امید ہے کہ پروفیسر صاحب کا یہ انٹرویو آپ کے لئے چشم کشا ثابت ہوگا، انشاءاللہ العزیز۔

س:- پروفیسر صاحب! ان دنوں مسلم یونیورسٹی کی نئی داخلہ پالیسی سے متعلق میڈیا آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور طرح طرح کے اشکالات کررہا ہے، ان کے لایعنی اشکالات سے قبل ہم آپ سے نفس مسئلہ کو جاننا چاہیں گے کہ اس نئی داخلہ پالیسی کا پس منظر کیا ہے؟

ج:- دیکھئے آپ کے علم میں ہے کہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں میں عصری تعلیم

کے فروغ کی خاطر اور دینی تعلیم وتربیت کے صاف ستھرے ماحول میں محمڈن اورنٹیل اینگلو کالج علی گڑھ میں قائم کیا تھا، سرسید وسیع النظر اور ملک وملت دونوں کی بھلائی کے عمر بھر خواہاں رہے، اس لئے اس ادارہ کے قیام کے وقت بھی ان کے ذہن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تفریق کا کوئی تصور نہیں تھا، البتہ مسلمانوں کی تعلیمی واقتصادی پس ماندگی اور سماجی وثقافتی پچھڑاپن دور کرنے کے لئے انہوں نے محمڈن اورنٹیل اینگلو کالج قائم کیا تھا۔

سرسید احمد خاں کے زمانہ میں وہ طلبہ جو بورڈنگ میں رہتے تھے اور وہ طلبہ جو بورڈنگ میں قیام نہیں کرتے تھے، ان دونوں کی اکثریت مسلمان طلبہ کی تھی اور اس طرح ہندو مسلم طلبہ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، البتہ سرسید احمد خاں پر جو فکر غالب تھی، وہ مسلمانوں میں دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ عصری تعلیم کے فروغ کی تھی۔

س:- ہندو مسلم طلبہ کی اکثریت وغیر اکثریت کی صورت حال کب اور کیوں پیش آئی؟

ج:- اصل میں مسلم یونیورسٹی میں ٹیکنیکل تعلیم کی ترقی اور عروج کے بعد ہمارے برادران وطن خصوصیت کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، مسلم یونیورسٹی ایسی واحد یونیورسٹی ہے جو اپنے زیر انتظام نرسری تک سے تعلیم کا نظم کرتی ہے، اس میں زیر تعلیم طلبہ کو (جنہیں آپ انٹرنل طلبہ کہہ لیجئے) کا پچاس فیصد ریزرویشن تھا، ۲۰ فیصد وی سی کے اختیار کا کوٹہ اور ۳۰ فیصد جنرل کوٹہ، یہ گویا اس سے قبل کی داخلہ پالیسی رہی، اس میں ۵ فیصد کوٹہ کا اختیار مزید وی سی کو دیا گیا کہ ان اضلاع کے طلبہ جو اضلاع پسماندہ کہلاتے ہیں، پچھڑے ہوئے کہلاتے ہیں، انہیں اس کوٹہ کے تحت داخلہ دیا جائے، یہ طلبہ بھی مسلمان ہوا کرتے تھے، اس لحاظ سے داخلوں کا تناسب مسلمانوں کے لئے تقریباً ۷۵ فیصد اور باقی ماندہ کے لئے ۲۵ فیصد ہوگیا۔

س:- مذکورہ بالا نظام کے تحت مسلم یونیورسٹی پر کون سے مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوئے؟

ج:- پرانے نظام کے نتیجہ میں دو خرابیاں پیدا ہوئیں، ایک چیز جس کو آپ انگریزی میں Inbreeding کہہ لیجئے کہ جس کے نتیجہ میں یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کے فارغین کی آمد کم ہوئی بلکہ یوں کہئے کہ صورت حال ان کے لئے تنگ اور پیچیدہ ہوگئی اور مختلف ریاستوں کے طلبہ کی تعداد کے کم تناسب سے تعلیمی معیار اور اکیڈمک معیار بھی متاثر ہوا، نیز مسلم یونیورسٹی کا جو نیشنل کیریکٹر National Character تھا، قومی کردار تھا، یا All India Character تھا وہ بھی متاثر ہوا۔

س:- یونیورسٹی کا نیشنل کریکٹر کب سے متاثر ہوا؟

ج:- مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۶۰ء بلکہ ۱۹۷۰ء تک کہئے کہ موجودہ صورتحال سے یونیورسٹی دوچار نہیں تھی، یونیورسٹی میں نہ صرف ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے طلبہ زیر تعلیم تھے بلکہ ایران، فلسطین، افریقی ممالک، صومالیہ کے سیاہ رنگوں والے طلبہ کی تقریباً ایک ہزار تعداد یونیورسٹی کے علمی دسترخوان کی خوشہ چیں تھی، بڑا خوشنما اور دلکش منظر ہوتا، بیرونی ممالک کے طلبہ اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے طلبہ کی وجہ سے یونیورسٹی میں ایک Composite Culture پنپ رہا تھا، افسوس کہ اس کو دھچکا لگا اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کے طلبہ کی تعداد کم ہے بلکہ غیر ملکی طلبہ کی تعداد ان دنوں تقریباً ایک سو پر سمٹ کر رہ گئی ہے۔

س:- اس وقت یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد کتنی ہوگی اور ان میں ہندوستان کے کن صوبہ جات کی تعداد زیادہ ہے؟

ج:- ان دنوں یونیورسٹی میں تقریباً ۱۹۰۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں، جن میں سے ۱۶۰۰۰ سے کچھ اوپر طلبہ کی تعداد کا تعلق بہار اور یوپی سے ہے، ظاہر ہے کہ اس کے منفی اثرات مرتب ہونا ہی تھے، نیشنل کیریکٹر، اکیڈمک اسٹنڈرڈ، کمپوزٹ کلچر سب پر اس کے اثرات مرتب ہوئے بغیر نہیں رہے۔

س:- بدرالدین طیب جی کے دور میں غالباً داخلہ پالیسی زیر غور آئی اور اس کے

لئے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی، بعد میں بھی اس پر وقتاً فوقتاً غور وخوض ہوتا رہا لیکن اس کے نفاذ میں کیا رکاوٹیں درپیش آتی رہیں؟

ج:- بدرالدین طیب جی صاحب یہ چاہتے تھے کہ اندرونی و داخلی طلبہ کا کوٹہ ۷۵ فیصد ہو اور بیرونی طلبہ ۲۵ فیصد ہوں، جب کہ اس سے پہلے تک تناسب داخلہ ۵۰-۵۰ فیصد کا تھا، طیب جی کے بعد جناب علی یاور جنگ صاحب گورنر ہوئے، ان کا مزاج کچھ اصولی اور قانونی تھا، چنانچہ انہوں نے سابق وی سی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، جس کی قانونی اور تکنیکی پیچیدگیاں تھیں لیکن بدقسمتی سے سازشوں کا ماحول بنا اور علی یاور جنگ صاحب کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا، Ordinance لگ گیا اور پھر اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک چلی اور ۱۹۸۱ء میں نیا ایکٹ بنا۔

س:- ۱۹۸۱ء کے نئے ایکٹ کے مستملات کیا تھے؟

ج:- ۱۹۸۱ء کے ایکٹ میں چند باتیں بڑی اہم اور قابل ذکر ہیں اس کی ایک شق یہ واضح کرتی ہے کہ علی گڑھ میں مسلمانوں کے لئے ایک ادارہ قائم ہو، اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں To incorporate a muslim university at Aligarh اس پر توجہ دیجئے کہ اس میں a muslim university at Aligharh کے الفاظ درج ہیں، اس کی جو تعریف (Definition) کی گئی ہے، اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں، University means an institution of their choice established by the muslims of India as MAO college which was later incorporate as Aligarh Muslim University اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ یونیورسٹی کے لئے لفظ establish کا لفظ ہے۔

س:- لیکن عزیز باد شاہ کیس کے سلسلہ میں یہ کہا گیا تھا یعنی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پارلیمنٹ کے ایکٹ ۱۹۲۰ء کے تحت وجود میں آئی؟

ج:- ۱۹۸۱ء کا ایکٹ اس مغالطہ کو بھی مسترد کر دیتا ہے اور اس کے صریح الفاظ

ہیں Specially promote cultural and educational advancement of Muslims of India یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد اور اختیارات کے سلسلہ میں۔

س:- ۱۹۸۱ء کے ایکٹ سے کون سے فوائد اور مثبت نتائج سامنے آئیں گے؟

ج:- دیکھئے اس سے تو دو باتیں صاف ہوگئیں، اول تو یہ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانوں نے بنائی ہے اور دوم یہ کہ مسلمانوں کے لئے بنائی ہے۔

لیکن عالمی شہرت یافتہ H.M. Seervani Jurist نے Section-8 میں جو نقل کیا ہے کہ "The Hindu University was established by Hindus, thought was open to non-Hindus to join the university Similary Muslim University was established by Muslims for Muslims though non-Muslims could be admitted, The policy requires that members of the other communities should not be totally excluded. (from admissions) (Constitutional law of India. P. 951)

بات صاف ہے کہ اگر Clause 8 کی اس تشریح سے اتفاق نہیں کیا جاتا تو پھر یونیورسٹی کے مسلم یونیورسٹی یا اقلیتی یونیورسٹی کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں؟ مسلم یونیورسٹی بلاشبہ ایک اقلیتی ادارہ ہے، مکمل امداد یافتہ ادارہ ہے لیکن اس میں غیر مسلموں کے لئے بھی دروازے کھلے ہیں، ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چاہے ان کا تناسب کچھ ہو لیکن ان پر دروازے بند تو نہیں ہیں۔

س:- بات طیب جی کی سفارشات پر عمل درآمد نہ ہونے یا ان کے نافذ نہ ہونے کی وجوہات پر ہو رہی تھی؟

ج:- اس وقت تو بات جو دوسرے انداز سے آئی تھی لیکن دراصل بات جب Inbreeding بڑھتی جارہی تھی، نیشنل کیریکٹر متاثر ہو رہا تھا، خصوصاً Technical

Faculties میں کوٹہ سسٹم یا داخلہ پالیسی کی بدولت کم فیصد کے طلبہ بھی داخلہ کا استحقاق حاصل کر لیتے تھے، انٹرنل طلبہ میں غیر مسلم طلبہ کی اکثریت ہے، شہر کے اسکولز میں تو ۸۵ فیصد طلبہ غیر مسلم ہیں، سابقہ وزیر داخلہ پالیسی انٹرنل طلبہ کے لئے مخصوص کوٹے کی بدولت انجینئرنگ اور میڈیکل میں بھی ان کی تعداد بڑھتی رہی، ان پروفیشنل کورسز کے لئے ہونے والے Test میں بھی یہ تعداد غالب رہتی۔

س:- لیکن ان باتوں سے تو کچھ جانبداری کا احساس ہوتا ہے؟

ج:- دیکھئے اس میں قطعی جانبداری کی بات نہیں ہے، مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے اکیڈمک کیریئر، اس کے تعلیمی معیار اور اس کے نیشنل کیریکٹر کی بحالی کا ہے، انٹرنل طلبہ کے لئے سابقہ داخلہ پالیسی کا نتیجہ کھلی آنکھوں یہ سامنے آ رہا تھا کہ کم استعداد و صلاحیت اور کم فیصد یافتہ طلبہ محض کوٹہ کی بنیاد پر داخلہ پا لیتے تھے اور خارجی یا بیرونی طلبہ طالبات زیادہ فیصد مارکس رکھنے اور زیادہ ذہین اور Brilliant ہونے کے باوجود محض داخلہ پالیسی کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ سے محروم رہتے تھے مثلاً گزشتہ سال ایک انٹرنل درخواست گزار کو جس کے صرف ۵۵ فیصد مارکس تے، وہ داخلہ پا گیا اور ایک ایسی غیر انٹرنل یا خارجی طالبہ داخلہ سے محروم رہی جس کے ۸۵ فیصد نمبرات تھے۔

س:- نئی داخلہ پالیسی کے آپ نے فوری طور پر کیا نتائج مرتب ہوتے ہوئے محسوس کئے؟

ج:- میں غالباً ۱۹۷۰ء سے مسلم یونیورسٹی میں برسرکار ہوں، اتنے طویل عرصہ میں پہلی مرتبہ الحمدللہ میری آنکھوں نے امسال ۱۶ ریاستوں کے طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کرتے دیکھا جو یونیورسٹی کے آل انڈیا کیریکٹر کی بحالی کی جانب یقیناً ایک خوشگوار پیش رفت ہے، علاوہ ازیں اس وقت میڈیکل میں زیر تعلیم مسلم طلبہ کی تعداد کل ملا کر ان دنوں ۷۰ یا ۷۱ فیصد ہے، یہ ایک خوش آئند علامت ہے اور مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہے، ایک بات جس کو عرض کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے کہ کوٹہ کے تحت حالیہ

ٹسٹ میں انٹرنل طلبہ میں سے ایک طالب علم بھی اپنا استحقاق ثابت نہیں کر پایا۔

س:- تو گویا نتائج کے اعتبار سے موجودہ وائس چانسلر کا یہ اقدام یونیورسٹی کے نیشنل کیریکٹر اور تعلیمی معیار میں ترقی کا ضامن ثابت ہوگا؟ اس مرحلہ پر ایک سوال یہ ہے کہ موجودہ وائس چانسلر کے لئے وہ کون سے سازگار اور موافق حالات پیش آئے جس میں وہ یہ جرأت مندانہ نیز مفید وکارگر اقدام اٹھا سکے؟

ج:- موجودہ وائس چانسلر جناب نسیم احمد صاحب کئی برسوں سے اس پر غور وخوض کر رہے تھے، پھر ایک بات پیش آئی جس نے انہیں مہمیز کیا کہ سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ یہ آیا کہ سرکاری اداروں میں کچھ فیصد (SC) شیڈیول کاسٹ کے داخلوں کو یقینی بنایا جائے، اسی کے ساتھ سپریم کورٹ کا یہ بھی فیصلہ آیا کہ اقلیتی ادارے اپنی ضروریات کے مطابق ۵۰ فیصد یا اس سے زائد ریزرویشن کرا سکتے ہیں، اس صورت میں ہمارے سامنے دو Option تھے اور جس میں سے دوسرا Option مسلم یونیورسٹی جیسے اقلیتی ادارہ کے روح سے زیادہ ہم آہنگ تھا چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۵۰ فیصد مسلمان طلبہ کے لئے، ۲۵ فیصد انٹر طلبہ کے لئے، ۲۵ فیصد جنرل Seats کی داخلہ پالیسی وضع کی گئی۔

س:- پروفیسر صاحب اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ پچاس فیصد ریزرویشن دیئے جانے کی پیش کش این ڈی اے سرکار نے بھی کی تھی اس وقت مسلم یونیورسٹی نے اسے کیوں مسترد کر دیا تھا؟

ج:- یہ بات صحیح ہے کہ این ڈی اے سرکار نے مسلمانوں کو داخلہ پالیسی میں ۵۰ فیصد ریزرویشن کی پیش کش کی تھی لیکن ڈنک کی مانند ایک شرط کے ساتھ اور وہ ڈنک تھا CAT کا ڈنک، اب سوال یہ ہے کہ ہم نے CAT کی مخالفت کیوں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک خودمختار ادارہ ہے، اس کو اپنی پالیسی وضع کرنے کا خود اختیار ہے، اور CAT ہماری خودمختاری میں مداخلت کے مترادف تھا، ایک طرف UGC ہے، دوسری طرف مسلم یونیورسٹی ہے، دونوں کے دائرہ کار اور میدان کار علیحدہ علیحدہ ہیں،

چنانچہ UGC بھی یہ قدم اٹھائے تو غیر قانونی اور Illegal ٹھہرے گا، الا یہ کہ پالیمنٹ سے اس قانون میں کوئی تبدیلی کا بل پاس کرایا جائے، خودمختار اور اقلیتی ادارہ میں کسی کو مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

س:- لیکن کانگریس کے دور اقتدار میں اس نئی داخلہ پالیسی کے نفاذ سے سنگھ پریوار حسب سابق اسے کانگریس کی جانب سے مسلمانوں کی منھ بھرائی یا تشٹی کرن یا Appeasement کا نام دے رہا ہے؟

ج:- ان کا اس قسم کا ردعمل کوئی نئی بات نہیں ہے، ان کا ہمیشہ سے یہ طرز عمل رہا کہ جو کام بھی مسلمانوں کے لئے کیا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے لئے تشٹی کرن اور Appeasement کے لئے کیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ بائیں بازو کی پارٹیوں نے اس داخلہ پالیسی کی مخالفت کی ہے، جو خود کو پس ماندہ طبقات، مزدوروں اور مظلوموں کا Champion کہتے ہیں، کیا ان کے سامنے یہ حقیقت نہیں ہے کہ مسلمان اس ملک میں تعلیمی واقتصادی لحاظ سے شیڈول کاسٹ سے بھی پیچھے ہیں، تو اگر ملک کی سب سے بڑی اکثریت کی تعلیمی ترقی کے لئے کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو یہ سیکولرزم کے منافی اور دستور ہند کے اصولوں کے خلاف کیوں کر ہوسکتا ہے اور اسے فرقہ وارایت کا نام کس بنیاد پر دیا جاسکتا ہی، مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی ترقی ہماری موت و زیست کا مسئلہ ہے، یہ ہمارے Survival کا مسئلہ ہے، وجود و بقاء کا مسئلہ ہے، اس لئے اسے تشٹی کرن کا نام دینا یا سیکولر شبیہ کے منافی قرار دینا آخری درجہ کی تنگ نظری اور ناانصافی کی بات ہے اور اس کی مذمت کی جانی چاہئے۔

مخالفین نے AMU کے ایکٹ Section-8 کو غلط معنی پہنائے ہیں، ان کو سوچنا چاہئے کہ مذہبی ریزرویشن کا اختیار دستور ہند نے دیا ہے، دفعہ(۱)۳۰ میں مذہبی اور لسانی دونوں اقلیتوں کو تسلیم کیا گیا ہے، دونوں اقلیتوں کو اپنے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے، اس حق کے حاصل ہونے کے بعد کہ اگر کوئی اقلیت اپنے بچوں کو تعلیم دلا

رہی ہے، ان کا نظم کررہی ہے تو وہ دستور کے عین مطابق ہے اور اس اقدام کی مخالفت دستورِ ہند کی مخالفت کہلائے گی۔

س:- پروفیسر صاحب! بائیں بازو کے اس رویہ سے بظاہر ان کی جو سیکولر شبیہ دکھائی پڑتی ہے، وہ دھندلی سی محسوس ہونے لگی ہے؟

ج:- یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی بہبود کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا، بنگال میں ان کی حکومت ہے اور وہاں سروسز میں مسلمانوں کے تناسب کی صورتحال یہ ہے کہ گیارہ فیصد سے گھٹ کر وہ ایک فیصد سے کچھ زائد ہو کر رہ گئی ہے، اگر غرباء نوازی کے معنی ان کے نزدیک یہی ہیں کہ مسلمانوں کو پیچھے کیا جائے تو ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ ذہنیت دستورِ ہند کی روح اور اسپرٹ سے متصادم ہے، ان کو اپنا نظریہ اور رویہ تبدیل کرنا چاہئے اور انہیں کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے قائم کی گئی تھی۔

س:- پروفیسر عرفان حبیب صاحب نے بھی نئی داخلہ پالیسی کو سیکولرزم کے منافی قرار دیا ہے، اس پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

ج:- عرفان حبیب صاحب اپنی جو شبیہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ان کا سیکولر امیج متاثر نہ ہو اور محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے نزدیک سیکولرزم کے معنی Anti-Muslim ہونے کے ہیں، بابری مسجد کے سلسلہ میں انہوں نے جو موقف اپنایا تھا اس سے آر ایس ایس کے نزدیک ان کا سیکولر امیج متاثر ہوا تھا اور وہ مسلم کاز کے حامی سمجھے جانے لگے تھے، غالباً اس کو دھونے کے لئے انہیں یہ اچھا موقع نظر آیا کہ ان کے سیکولر امیج پر پڑی ہوئی گرد ختم ہو جائے۔

س:- پروفیسر صاحب! کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ نئی داخلہ پالیسی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے لئے چلائی جانے والی اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک کے اپنے نامکمل مقاصد کو کچھ تقویت حاصل ہوئی ہے؟

ج:- مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک یہ تھی کہ ایکٹ واپس کیا جائے، مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں کا قائم شدہ ادارہ تسلیم کیا جائے اور اسے خودمختاری دی جائے، اس طرح کافی حد تک مطالبات تسلیم کر لئے گئے تھے سوائے چند ایک کے، چنانچہ اس وقت کی ایکشن کمیٹی نے Protest اور احتجاج کے ساتھ ان مراعات کو تسلیم کرلیا تھا، ایکشن کمیٹی کا Protest یہ تھا کہ اس کو صریح اور صاف لفظوں میں Article-31 کے تحت لکھا جائے لیکن افسوس کہ اس وقت مسئلہ کو گنجلک رکھا گیا اور اگر اس وقت مسئلہ کو اس طرح مبہم اور گنجلک نہ رکھا جاتا تو آج یہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

س:- Article-31 کی کچھ وضاحت فرمادیجئے۔

ج:- Article-31 یہ ہے کہ لسانی اقلیت ہو یا مذہبی اقلیت، انہیں اپنی پسند کے ادارے قائم کرنے کا حق ہے اور ان کے انتظام وانصرام کا حق ہے، ساتھ ہی حکومت اقلیتی اداروں کی مالی امداد میں کوئی تفریق نہیں کرتی۔

بعض کچھ دوسری باتیں بھی تھیں مثلاً یہ کہ کورٹ کے ممبران کی اتنی بڑی تعداد میں کوئی فیصلہ نہیں لیا جاسکتا تھا، ثانیاً کورٹ ایک بے اختیار ادارہ تھا، اس کی حیثیت سفارشی ادارہ کی ہوکر رہ گئی تھی، کورٹ کا کوئی ممبر ہی وی سی ہوسکتا تھا، وی سی کی نامزدگی کورٹ کرتی تھی، اب صدر جمہوریہ ہند (وزیٹر) کو اس کا اختیار حاصل ہے، کورٹ محض سفارش کرسکتی ہے، مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے ایسے بہت سے مطالبات تھے کہ یہ اختیارات بحال کئے جائیں، ایکشن کمیٹی ایسے اختیارات کی طالب تھی لیکن چونکہ یہ سارے کے سارے مطالبات تسلیم نہیں کئے گئے، اس لئے ایکشن کمیٹی نے ان مراعات کو Protest کے ساتھ تسلیم کیا۔

س:- ایک سوال میں اپنی واقفیت کے لئے جاننا چاہوں گا کہ مسلم یونیورسٹی میں کتنی Bodies ہیں جو اس کے انتظام وانصرام سے متعلق ہیں؟

ج:- کئی Bodies ہیں مثلاً اول نمبر پر یونیورسٹی کورٹ جس کے ممبران کی تعداد

۱۸۲ ہے، اس کے بعد Executive Council کا نمبر آتا ہے، اس کے ارکان غالباً ایک سو ہیں، پھر اس کے بعد Academic Council ہے، جس کے ممبران کی تعداد ۱۰۰ کے قریب ہے، ان Bodies میں سب سے بے اختیار باڈی یونیورسٹی کورٹ ہے اور سب سے بااختیار ادارہ اکیڈمک کونسل ہے، جس میں صرف اکیڈمک مسائل زیر بحث آتے ہیں، Executive Council میں اکیڈمک وغیر اکیڈمک دونوں طرح کے مسائل آتے ہیں۔

س:- میرے سامنے چند ایک اخبارات و رسائل ہیں، میں اجازت چاہوں گا کہ حسب معمول میڈیا جو شوشے چھوڑتا رہتا ہے، ان سے متعلق کچھ باتیں پوچھوں، ایک خبر یہ ہے کہ فاشسٹ تنظیموں نے داخلہ پالیسی کے خلاف Writ داخل کی ہے۔

ج:- ابھی تک سنگھ پریوار یا وشو ہندو پریشد نے تو کوئی Writ داخل نہیں کی، طلبہ نے داخل کی ہے، وہ کہتے تو ہیں لیکن داخل نہیں کیا ہے، اس میں ہندو طلبہ زیادہ ہیں، ان میں ۱۲ طلبہ کے داخلے ہو چکے، ۴ نے دوسری جگہوں پر داخلہ لے لیا، ۴ نے Withdraw کر لیا ہے، صرف ۱۰ طلبہ ہیں جو مقدمہ لڑ رہے ہیں۔

س:- میڈیا کا ایک شوشہ یہ بھی ہے کہ اس ایشو Issue کو بہار الیکشن کے موقع پر اچھالا جائے گا کہ بہار کے صوبہ کے طلبہ کی تعداد اس داخلہ پالیسی سے گھٹ جائے گی، کانگریس کے خلاف اسے ایک موضوع بنایا جائے۔

ج:- اس میں صداقت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، بس اتفاق ہے کہ بہار الیکشن قریب ہیں اور اس نئی داخلہ پالیسی کا نفاذ ہوا ہے، ہم نے اپنے وقت پر اور تمام مراحل سے گزرنے کے بعد یہ فیصلہ لیا، اب اگر اسی دوران بہار اسمبلی تحلیل ہو جائے تو اسے اتفاق ہی کہا جائے گا، دونوں واقعات کے مابین تال میل پیدا کرنا بیمار ذہنیت کی علامت ہے۔

س:- مسلم یونیورسٹی میں پچاس فیصد مسلمانوں کے ریزرویشن کے بظاہر داخلوں پر کوئی خاص فرق پڑتا نہیں دکھائی دیتا، اس لئے کہ وہاں تو پہلے ہی سے مسلمان طلبہ کی تعداد تقریباً ۸۰ فیصد ہے، البتہ سنگھ پریوار کو کانگریس کی جانب سے مسلمانوں کی تشٹی کرن کے غلط پروپیگنڈہ

کا ہتھیار ہاتھ آ گیا ہے، اس مجموعی صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ اس نئی داخلہ پالیسی سے کون سے بنیادی اور دوررس فوائد و نتائج کے مرتب ہونے کی توقع کرتے ہیں؟

ج:- اس صورت میں پچاس فیصد مسلم طلبہ کے لئے ریزرویشن کے کوئی خاص معنی تو نہیں ہیں، البتہ اس کے پس پشت دو بنیادی مقاصد ہیں، ایک تو مسلم یونیورسٹی میں All India Character کی فضا کا پیدا ہونا اور دوسرا مقصد ہے مسلم یونیورسٹی کے Education Standard میں ترقی، اس سے مسلمانوں کی محض تعداد بڑھانا مقصود نہیں ہے، انجینئرنگ میں امسال جو داخلے ہوئے ہیں، ان میں سابقہ Seats کے مقابلہ میں مسلمان طبقہ کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے، البتہ میڈیکل ۸۱ سے بڑھ کر ۸۸ کی تعداد ہو گئی ہے، تو ہمارے پیش نظر مسئلہ Quantity کا نہیں ہے Quality کا ہے۔

(پندرہ روزہ ندائے ملت لکھنؤ: مئی ۲۰۰۵ء)

تحریکات

- آل انڈیا ملی کونسل
- دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش
- اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی
- الامین بنگلور
- جمعیت شباب اسلام لکھنؤ
- انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز دہلی

مسئلہ قیادت کے بحران کا نہیں
سمع وطاعت کے بحران کا ہے!

بانی آل انڈیا ملی کونسل وسابق صدر مسلم پرسنل لابورڈ
مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے ایک ملاقات

کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر ملّتِ اسلامیہ ہند کی شیرازہ بندی کی صدا اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے، اس سے قطعِ نظر کہ ملّت کے لیڈران اور قائدین اس رُخ پر کس انداز سے سوچتے ہیں، ایک عام مسلمان کی آرزو یہی ہے کہ ملّت اپنی آبرومندانہ زندگی کے لیے ایک ہوجائے چنانچہ ملیّ کونسل نے جب اتّحادِ ملّت کی صدا لگائی تو ملّت کے ہر اس شخص کی توجہ کا مرکز بن گئی جو اپنے پہلو میں دل دردمند رکھتا ہے، اس کے علاوہ ملت پر ایسے بیشتر مواقع آئے جب کسی مسئلہ میں وہ واضح اور دوٹوک رہنمائی کی طالب رہی لیکن مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا، چنانچہ جب اجتماعی قیادت کی ضرورت کے تحت ملیّ کونسل کا وجود عمل میں آیا تو بجا طور پر ملّت کو اس سے امیدیں وابستہ ہوئی، علاوہ ازیں ملی کونسل نے ملت کی اجتماعی تعمیر اور مجموعی ترقی کا جو خاکہ پیش کیا اس سے محسوس ہوا کہ ملی کونسل کے پیش نظر صرف پتوں کو پانی دینا نہیں بلکہ جڑوں تک پانی پہنچانا بھی ہے، ان وجوہات کی بناء پر ملیّ کونسل قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی اور اس کے سربراہ اور روحِ رواں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب عقیدت ومحبت کا مرکز اور

حرکت وعمل کی علامت قرار پائے۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ملیّ کونسل کے قیام اور اس کے پروگرام سے متعلق ذہن میں اشکالات بھی رہے جن میں سے ایک بات، جو نہایت ذہنی کرب کا باعث بنتی رہی، یہ تھی کہ ملّت کے ’ایک‘ ہوجانے کی صدا بیک وقت ’دو‘ پلیٹ فارم سے بلند ہورہی ہے اور ملیّ کونسل کے علاوہ مجلسِ مشاورت بھی اتحاد ملت کی نقیب ہے دوسری بات، جہاں ملیّ کونسل کی جامع منصوبہ بندی سے آس بندھتی ہے وہیں یہ خدشہ بھی لگا رہتا ہے کہ اس قدر جامع وہمہ گیر منصوبہ کسی ایک تحریک کے بس کی بات کیونکر ہوسکتی ہے اور تیسری بات خود حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی سے متعلق تھی کہ فقہ وفتاویٰ کے اس مرد میدان نے ملّت کی خدمت کا رخ کیا ہے جو پھولوں کی نہیں، کانٹوں کی سیج ہے اور اس کے علاوہ ایک لحاظ سے یہ فقہ وفتاویٰ کی دنیا کا نقصان بھی ہے، یہی وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت قاضی صاحبؒ کے حضور یہ اشکالات پیش کروں! اس اثناء میں حضرت قاضی صاحبؒ دو ایک مرتبہ لکھنؤ بھی تشریف لائے لیکن ان کے ساتھ مصروفیات کا ہجوم دیکھ کر ملاقات کے لیے وقت طلب کرنا مناسب نہ تھا لیکن طلب باقی رہی اور فکر لگی رہی آخر جہاں چاہ وہاں راہ، کے مصداق ایک روز برادرم طارق شفیق نے بتایا کہ حضرت قاضی صاحب ندوہ کے دارالشفاء میں ہیں وہ بیمار ہیں، عیادت کے لئے حاضر ہوا لیکن یہ عیادت ملّت کے ایک دردمند کی عیادت تھی چنانچہ مزاج پرسی کے ساتھ ساتھ راقم نے اپنا درد بھی ان کے سامنے رکھ ہی دیا نقاہت کے باوجود حضرت قاضی صاحب نے بشاشت کے ساتھ درج ذیل تفصیلی انٹرویو کے لیے وقت عنایت فرمایا جو حضرت موصوف کے شکریہ کے ساتھ نذر قارئین ہے!

سوال: مولانائے محترم! میں اپنے سوال نامہ کا آغاز ''ملی کونسل'' سے کروں گا جس نے ملت اسلامیہ ہند کو کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر ایک ہو جانے کا پیغام دیا ہے عام طور پر تاثر ہے کہ اتحاد بین المسلمین فکر وخیال کے لحاظ سے جتنا خوش کن نعرہ ہے عمل کی سطح پر اتنا ہی مایوس کن ہے، آپ نے ملّی کونسل کے عنوان سے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا ہے، اس لئے جناب والا کی زبانی اس تاثر کے متعلق ہم سننا چاہیں گے کہ حقائق کیا ہیں اور اتحاد بین المسلمین کی کس حد تک امید کی جاسکتی ہے؟

جواب: بنیادی طور پر یہ بات سمجھنی چاہئے کہ جو بھی کام ہم شروع کریں وہ ہمیں نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر کرنا چاہئے، سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ کام صحیح ہے یا غلط، اگر کام غلط ہے تو ہرگز نہیں کرنا چاہیے چاہے اس میں سو فی صد کامیابی کے امکانات ہوں، اگر کام صحیح ہے تو چاہے ایک فیصد بھی کامیابی کی امید نہ ہو تو بھی ہمیں اس کام کو ضرور کرنا چاہئے، انبیاء کرام سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے، جب ہم لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا اس وقت یہ بات محسوس کی جارہی تھی کہ امت میں اتحاد نہیں ہوگا لیکن اس مسئلہ پر امت نے اتحاد کا مظاہرہ کیا، ملّی کونسل کی بنیاد یہی ہے کہ ہم کلمہ کی بنیاد پر امت کو متحد کریں گے، اتحاد نہ ہو پانے کے پیچھے عام طور سے وہ عوامل ہوا کرتے ہیں، ایک مخاطب اور ایک خود اتحاد کی دعوت دینے والا، اگر اتحاد کی دعوت دینے والوں نے وقتی سیاست اور وقتی مصلحت کے تحت دعوت نہیں دی ہے بلکہ ایمان وعقیدہ کے ساتھ دعوت دی ہے تو اس دعوت میں تاثیر ہوگی، دوسری طرف ان میں اگر نفسانیت ہے اور وہ اپنی حلقہ بندی اور گروہ بندی سے باہر نہیں آنا چاہتے ہیں تو دشواری پیدا ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام مسلمان اتحاد چاہتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں میرا ذاتی تجربہ ہے ہندوستان کے ہر حصہ کا، میں نے محسوس کیا ہے کہ مسلمان متحد ہو سکتے ہیں، ہو رہے ہیں، خود یوپی کے دورہ میں، جو بہت سخت علاقہ مانا جاتا ہے، میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ عام مسلمانوں کے دلوں کی آواز ہے کہ تمام مسلمانوں کو متحد ہونا چاہئے۔ اتحاد ملت اور اتحاد ملّت کی دعوت محض خواب نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

سوال: ملّی کونسل ملت کیلئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے بنیادی مقصد کو لے کر اٹھی ہے یہی مقاصد مسلم مجلس مشاورت کے بھی پیشِ نظر تھے ملّی کونسل کے قیام کے زمانہ سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ کیا ہی بہتر ہوتا کہ اس کے قیام کے بجائے ان اسباب کے ازالہ کی کوشش کی جاتی جن کی وجہ سے مشاورت سے مایوسی ہوئی تھی اس تعلق سے آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب: میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا، یہ سوال بڑا اہم ہے، ملّی کونسل کے قیام کے پسِ منظر، اس کے اغراض ومقاصد اور اسکے تنظیمی ڈھانچہ کا مطالعہ کیجئے اور اسی طرح مجلس مشاورت کے بھی قیام کے پسِ منظر، اس کے دستور اور اس کے بنیادی ڈھانچہ کے اغراض ومقاصد کا مطالعہ کیجئے، تو اگر کوئی صاف ذہن آدمی ہو تو ان دو تنظیموں کے فرق کو خود بخود سمجھ جائے گا۔

پہلی بات ہمیں یہ کہنی ہے، دوسری بات یہ کہنی ہے کہ میرا جو پورا Back ground ہے وہ دراصل امارت شرعیہ کا ہے، اور امارت شرعیہ کی اساس ہی کلمہ طیّبہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو شرعی تنظیم سے وابستہ کرنا ہے، تو میری زندگی میں اور ذہن وفکر میں یہ ایک رچا بسا اصول ہے، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی سیرت اور ان کاموں سے متاثر ہو کر یہ کام میں نے شروع کیا، اسی زمانہ میں مشاورت کا قیام عمل میں آیا، ظاہر ہے کہ وہ ہمارے دل کی آواز تھی، خود ہم لوگوں نے امارت شرعیہ کی شوریٰ میں مشاورت کی تائید کا فیصلہ کیا، بڑی ہنگامہ خیز شوریٰ تھی جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا، امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کی صدارت میں شوریٰ کا اجلاس ہوا تھا، ذہنی وفکری طور پر میں بھی اس سے وابستہ رہا، اور بعد کو اس کی مختلف مجالس کا رکن بھی رہا اور کلیدی شرکت بھی کرتا رہا لیکن آہستہ آہستہ یہ بات سمجھ میں آتی رہی کہ ایک ایسے فعّال پلیٹ فارم کا فقدان ہوتا جارہا ہے جو وسیع بنیادوں پر مسلمانوں کو جوڑ کر ان کے اجتماعی مسائل کیلئے کام کرے چنانچہ بہت سے لوگ اس پر غور کر رہے تھے، ہم لوگ اکٹھا بھی ہوئے اور بات بھی کی، پھر ہم لوگوں نے سورج کُنڈ کے اجتماع میں ایک تحریر تیار کی، پہلا مقصد ہمارا یہ تھا کہ مشاورت اس راہ پر چل پڑے تو یہ مقصد پورا ہوگا، اور

اس سلسلہ میں ہم نے بزرگوں سے باتیں بھی کیں، ہم نے اس چیز کو پریس میں نہیں دیا، اخبار میں نہیں دیا برس دو برس گزر گئے، پھر اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور سبھی ذمہ دار لوگوں سے ہندوستان بھر میں بات کی کہ ان کے دل کی آواز کیا ہے۔ ان سب باتوں کو ہم نے نوٹ کیا تو ایک عام طلب پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے تلاش کی تھی، مشاورت کے بنیادی ڈھانچہ کے سلسلہ میں ہم نے ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ وہ جماعتوں کا وفاق ہے اور ایک ہی جماعت، ایک طرف تو مشاورت میں بیٹھ کر ایک فیصلہ لیتی ہے اور پھر دوسری طرف اس فیصلہ کی توثیق اپنے تنظیمی ڈھانچہ میں جا کر کرتی ہے، یہ بہت بنیادی مسئلہ ہے جس پر سب ہی اہلِ نظر کو نظر رکھنی چاہیے، کوئی بھی جماعت ہو، ہر جماعت کا معاملہ یہی تھا، مشاورت گویا نام کی مشاورت رہ گئی تھی، فیصلہ تو اس مشاورت میں ہوتا جس میں امت کے اور ملک کے تمام عمائدین اکٹھا ہیں لیکن یہ فیصلہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں قرار پاتا جب تک کہ اس فیصلہ کی توثیق اس جماعت کے تنظیمی ڈھانچہ میں نہ کر دی جاتی، یہ عجیب طرح کا وفاق ہوا کہ جو اعلیٰ ترین باڈی ہے امت کی، اس کا فیصلہ تو ثانوی درجہ کا ہو اور جو اسکے اجزاء ہیں ان کا فیصلہ اولین، شاید مشاورت کے زوال میں ایک بہت بڑا دخل اس کو بھی رہا ہے، آپ بھی غور کریں گے تو اس بات کو محسوس کریں گے کہ اس کا بہت بڑا دخل رہا ہے، تو یہ کہ صرف مشورہ کے لئے بیٹھ جانا اور کوئی اجتماعی ہیئت نہ پیدا ہونا، اس کے علاوہ مشاورت میں جو فیصلہ ہو وہ دوسری جگہ سے توثیق کا محتاج ہو، یہ ایک بڑا مشکل مرحلہ تھا، دوسری دشواری جو ہم لوگوں نے محسوس کی، آپ کہہ سکتے ہیں تبدیلیاں چاہنے والوں نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ جماعتیں ایک نہیں، سو جماعتیں ہوں مسلمانوں کی، لیکن اس بات پر آپ یقین کیجئے کہ امت کے باصلاحیت افراد کی تعداد لاکھوں میں وہ ہے جو کسی جماعت سے وابستہ نہیں ہے، امت کا ایک بہت بڑا وہ حصہ وہ ہے جو کسی ایک خاص جماعت سے وابستہ نہیں ہے، جبکہ مشاورت صرف جماعتوں کا وفاق ہے لہٰذا امت کے باصلاحیت افراد کو جوڑنے کا کوئی راستہ وہاں پر نہیں تھا، اس لئے

ہم لوگوں کو فکر یہ تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہو جس میں جماعتیں بھی ہوں اور اس وابستگی کے ساتھ ہوں کہ یہ پلیٹ فارم جو فیصلہ کرے گا اسے وہ جماعتیں بھی اپنے ہاں مانیں گی، یہ نہیں کہ وہاں جا کر توثیق کراتی پھریں، اور دوسری طرف یہ کہ صرف جماعتیں ہی نہیں، بلکہ امت کے وہ افراد جو Non Committed ہیں، کسی جماعت کے ساتھ ان کی براہ راست وابستگی باضابطہ نہیں ہے، تو ان کو جوڑنے کا یہ دوسرا کام بہت اہم تھا، تیسری بات، اگر آپ غور کریں گے تو خود بھی محسوس کریں گے کہ مشاورت کے قیام کا پس منظر دراصل ہندو مسلم فسادات تھے، اور اسکو ماننا چاہیئے کہ اُس وقت اس نے بڑا تاریخی کارنامہ انجام دیا، خاص کر مسلمانوں کے حوصلہ کو بلند کیا فسادات کے زمانہ میں اچھی فضا بنائی، غرضیکہ بڑا کارنامہ انجام دیا، اس کا ایمانداری سے سب کو اعتراف کرنا چاہیئے۔

اب ماضی قریب میں جو حالات پیدا ہوئے وہ دوسرے تھے، ہزار فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود فرقہ پرستی اس درجہ بڑھی ہوئی نہیں تھی جس حد تک اِن دنوں تھی، جب ملی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ ان حالات میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی، کوئی پلیٹ فارم ایسا نہیں تھا جہاں ہم لوگ اکٹھا ہو جائیں بغیر اس بات کے کہ ہم کسی جماعت سے وابستہ ہیں یا نہیں، بس ہم مسلمان ہیں اور اس ایک بنیاد پر آنا چاہتے ہیں یہ صورتحال بالکل نہیں تھی، اور ایسا پلیٹ فارم موجود نہیں تھا، مشاورت نے اپنے وقت پر اپنا کام کیا، ٹھیک ہے اس کا سب کو اعتراف ہے لیکن اب اس میں بنیادی تبدیلیوں کا ہونا غالباً ممکن نہیں تھا۔

اس دکھ درد کو ہم نے اپنے بڑوں کے سامنے رکھا اس کے بعد یہ دباؤ مجھ پر پڑتا رہا کہ کچھ ہونا چاہیے، ہونا چاہئے، میں اس کو ٹالتا رہا، لیکن بوجھ تو خود میرے بھی ذہن پر تھا، تب ہم لوگ مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، لکھنو کے قریب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا جو لڑکیوں کا مدرسہ ہے، وہیں ندوہ کی ایک قیام گاہ بھی ہے، اُن دنوں اسی قیام گاہ پر حضرت تشریف فرما تھے، وہیں پر ہم لوگوں سے تفصیلی بات ہوئی، حضرت نے بے چینی کا اظہار فرمایا، جو اصول ہم نے بنائے تھے وہ حضرت کے سامنے رکھے گئے،

حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے اس کام کو کرو، اور نام بھی حضرت کا ہی تجویز کیا ہوا ہے، آل انڈیا ملی کونسل، یہ لطیفہ ہے کہ حضرت ہی نے نام تجویز کیا پھر مجھے خط دیا کہ دلّی میں اجلاس نہ بلاؤ، بمبئی میں جلسہ کرواپنے خاص لوگوں کے نام خط بھی دیا کہ بمبئی جاؤ اور وہاں اتحاد ملت کا اجلاس بلاؤ، پھر حضرت نے خطبہ لکھا، تو جب ملی کونسل کا قیام عمل میں آیا تو اس کی پہلی نشست بھی حضرت کے قیام گاہ پر ہی ہوئی اور وہاں سے یہ کام شروع ہوا، تو آج جو صورتحال ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں، مجلس مشاورت کی کوئی مخالفت ہم لوگوں نے کبھی نہیں کی اور نہ کرنا چاہتے ہیں اور آج جو صورت حال ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کسی اہل نظر سے مخفی ہے، تو ملّت کو جوڑنے کے لئے اور امت کے باصلاحیت افراد کو تلاش کرنے اور ان کی صلاحیتوں سے کام لینے کیلئے نیز وسیع الاطراف مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک ایسا پلیٹ فارم تشکیل دینے کیلئے جس کے فیصلے کو ہر جماعت کی سطح پر تسلیم کیا جائے ان بنیادوں پر ملّی کونسل کا قیام عمل میں آیا، یہ ہے حقیقت ملّی کونسل کے قیام اور اس کے پسِ منظر کی۔

سوال: ملی کونسل کے تعلق سے ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسے ملّت کے مختلف الخیال مکاتب فکر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، کیا ملّی کونسل کا احساس بھی یہی ہے؟ اسے زیادہ موثر بنانے کے لئے ملّی کونسل کیا پروگرام رکھتی ہے؟

جواب: ایک بات تو یہ ہے کہ سو فی صد اتحاد کی توقع نہ تو تھی، نہ ہے اور نہ رہے گی، دوسری بات یہ کہ ملّی کونسل کا کام عام طور سے دوسری صف کے لوگوں سے شروع ہوا، یہ بات صاف ہے اور اس میں بہت باصلاحیت لوگ، نئے لوگ آگے آئے ہیں، اور کام کررہے ہیں، آپنے ملّی کونسل کا اجلاس اگر لکھنو میں دیکھا ہوگا تو محسوس کیا ہوگا کہ کس حد تک مختلف مسالک اور مختلف لوگوں کی نمائندگی اس میں تھی، اور الحمد للہ ابھی بھی ہے کچھ طبقے ایسے ہیں جو کسی کام میں ساتھ نہیں آتے پرسنل لاء بورڈ بھی ہمارے ساتھ نہیں آئے ٹھیک ہے ان کو معذور سمجھا جانا چاہیے اور کچھ لوگوں کے اور مصالح ہیں لیکن ملّت کے افراد کے بارے میں ہمارا اطمینان ہے کہ وہ ساتھ آرہے ہیں اور ملّی کونسل جس قدر تیزی اور حسن

کارکردگی کا مظاہرہ کرے گی، امید ہے کہ ملّت اتنی ہی متحد ہوتی چلی جائے گی۔

سوال: ملّی کونسل کی رپورٹ کارکردگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک ہے، جس میں حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر دونوں کے خاکے ہیں اتحاد، تعلیم، معاشی امور، ملّی مسائل، سیاسی شعور کی بیداری میڈیا، دعوت وتبلیغ، اصلاح معاشرہ جیسے امور سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔

رپورٹ کی کارکردگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ الحمد للہ ان سب کاموں میں پیش رفت ہوئی ہے لیکن قریب کی ملّی تنظیموں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ تحریکیں زیادہ موثر اور کامیاب رہیں جنہوں نے محدود مقاصد کو اپنا میدانِ عمل اور ہدف بنایا بہ نسبت ان تحریکوں کے جنہوں نے ایک جامع اور ہمہ گیر منصوبہ اور خاکہ پیش کیا ملّی کونسل کے سربراہ اور روحِ رواں ہونے کی حیثیت سے اس تاثر پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

جواب: ہمارا خیال یہ ہے کہ ملّی کونسل کے سامنے جو بنیادی بات ہے اگر وہ سامنے رہے تو اشکال رفع ہوجائے گا یعنی ایک تو بنیادی بات یہ ہے کہ بحیثیت خیر امت اس ملک میں مسلمانوں کو کلمہ کی بنیاد پر کھڑا کرنا ہے تو خیر امت کی حیثیت تسلیم کرلینے سے ہی اس میں وہ تمام Branches داخل ہوجاتی ہیں جن کا آپ نے ابھی ذکر کیا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر کوئی خواب نہ دیکھے تو کچھ کر بھی نہیں سکتا، یہ خواب کا چوکھٹا ذرا بہت بڑا نظر آتا ہے، لیکن اگر اس کا کچھ حصہ بھی روبہ عمل آجاتا ہے تو انشاء اللہ اس سے بڑا فائدہ ہوگا، تیسری بہت اہم بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو اصل مسئلہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ہر شعبہ کے لئے الگ الگ افراد پر مشتمل الگ الگ سیل بنائیں، اور ہر سیل اپنا اپنا کام کرے، معاشی فلاح کے لئے ایک سیل ہو وہ اپنا کام کرے، تعلیمی مسائل اور اسکی ترقی کے لئے ایک سیل ہو وہ اپنا کام کرے، یہ سیل اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھیں گے، اس کو ہم عام طور سے دولفظوں میں استعمال کرتے ہیں امت کی اجتماعی ترقی اور امت کی مجموعی ترقی یہ دو اصطلاح ہیں امت کی اجتماعی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ امت کا رشتہ مسجد سے استوار کیا جائے، اس کی

تعلیمی ترقی اور معاشی سدھار کی تدبیریں کی جائیں، اس میں پختہ اور مضبوط سیاسی شعور پیدا کیا جائے تاکہ ملک میں اچھے مسلمان اور ایک باعزت شہری کی حیثیت سے انہیں جینے کا حوصلہ عطا ہو، ان امور پر آپ غور کریں گے تو کوئی چیز ایسی نہیں پائیں گے جو چھوڑ دینے کی یا نظر انداز کردینے کی ہو، لیکن ظاہر ہے کہ سارے کام ایک آدمی نہیں کرسکتا، الحمد للہ ہمارے پاس ماہرین معاشیات بھی بہت ہیں، ماہرین تعلیم بھی ہیں اور مسائل بھی ہیں مثلاً مدارس کا وفاق بننا چاہیئے ڈھیلا ڈھالا ہی سہی، جس حد تک بھی ممکن ہو مدارس کی ترقی ہو اور مدارس پر جو خطرات منڈلاتے ہیں، ان کا دفاع کیا جائے، اسی طرح ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم کے اداروں کا ایک فیڈریشن ہونا چاہئے، مسلمانوں میں اپنے طرز کے اسکول قائم کرنے کا رجحان ان دنوں بہت پیدا ہوا ہے، اب ان کو ضرورت ہے نصاب تعلیم کی، مان لیا کہ ہم نے نصاب تعلیم تیار کروایا اور ان کو فراہم کیا تو اس سے یقیناً ایک ضرورت پوری ہوگی، میڈیا کو لیجئے ہم میڈیا واچ بھی کریں اور بات پہونچائیں بھی اس کے لئے ایک مستقل شعبہ چاہئے، اس کے لئے الگ افراد ہوں، بچوں میں صحافی اور جرنلسٹ پیدا کریں، ابھی ہمارے سامنے ایک نیا مسئلہ ہے، دعا فرمائیے کہ اللہ کامیاب کرے، تجربہ یہ بتاتا ہے، ماہرین سے ہماری بات ہوئی ہے کہ جتنے اچھے صحافی مدارس کے فضلاء ہوسکتے ہیں، دوسرے نہیں ہوسکتے، تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ صحافت اور جرنلزم کا ایک شعبہ خود ہمارے مدارس میں قائم ہو، میں نہیں جانتا کہ کتنی کامیابی اس میں ہوگی، لوگوں نے کہا کہ یہ ایک خواب ہے، لیکن میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کام کو بھی کرائے گا، یہ مختلف نہج کے کام ہیں، ہمارے سامنے یہ نقشہ نہیں ہے کہ ایک ہی آدمی یہ سب کرتا رہے، بلکہ ان کے الگ الگ سیل بناکر ان کے حوالہ کام کرکے ان کو آزادانہ کام کرنے کا موقع دیا جائے، اس طرح انشاء اللہ کام بڑھتا رہے گا جو منصوبہ بندی اور پلاننگ کے تحت ہوتا رہے گا۔

سوال: مولانائے محترم! ملّی کونسل کے پلیٹ فارم سے آپ کی کوششوں کو ملّت کے

ایک بڑے طبقہ نے بجا طور پر نہایت مستحسن نگاہوں سے دیکھا اور اسے ایک باضمیر اور بیدار مغز قیادت کی امیدیں وابستہ ہوئیں لیکن جناب والا کی ذات کے تعلق سے کچھ مخلصین کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ کاش فقہ کے اس عالی مرتب مردمیدان نے اس وادی پرخار کا رخ نہ کیا ہوتا جناب والا کا اس سے متعلق اپنا ذاتی تاثر کیا ہے؟

جواب: میں تو یہی چاہتا ہوں کہ مجھے سب لوگ چھوڑ دیں اور میں چپ چاپ بیٹھ کر لکھتا پڑھتا رہوں لیکن یہ مرحلہ میرے سامنے اس وقت بھی آیا تھا جب میں مونگیر میں مدرس تھا اور حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ بہت پریشان تھے کہ امارت شرعیہ کا نظام استوار نہیں ہورہا ہے اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ میں منصب امارت سے استعفیٰ دینے جارہا ہوں، یہ بہت سخت مرحلہ تھا تو میں نے حضرت سے کہا کہ حضرت! میں امارت شرعیہ جانے کو تیار ہوں، انہوں نے سمجھا کہ مذاق کررہا ہے، میں نے کہا کہ نہیں حضرت! میں نے مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کو پڑھا ہے، اس روشنی میں کہتا ہوں کہ امارت شرعیہ کی بقاء اس وقت آپ کی ذات سے متعلق ہے، چنانچہ انھوں نے اس وقت اس بات کو ٹال دیا، بعد رمضان بلاکر مجھے حکم دیا کہ تم چلے جاؤ امارت شرعیہ اور اس طرح میں امارت شرعیہ چلا آیا، الحمد للہ میں ایک بہت اچھا مدرس شمار کیا جاتا تھا، سب ہی فن کی کتابیں پڑھایا کرتا تھا، شروع سے آخر تک نحو میر سے لے کر دورۂ حدیث تک تو اس وقت میرے بعض اساتذہ نے بھی اور بعض دوستوں نے بھی اس عمل کو بہت غلط عمل قرار دیا تھا کہ تم مدرسی چھوڑ کر جاہل ہونے جارہے ہو، میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ ایک بہت اچھے مدرس کی حیثیت سے میری شہرت تو ہے اور میری حیثیت بنتی ہے لیکن امت اسلامیہ کو اتنا فائدہ نہیں پہونچتا جتنا فائدہ شاید میں امارت شرعیہ میں رہ کر پہونچا سکوں اور اب ان دوستوں کا اندازہ ہے کہ اگر تم ایک مدرس کی حیثیت سے ایک مدرسہ میں رہتے تو امارت شرعیہ کے ذریعہ جو بڑا کام انجام پایا ہے وہ نہیں ہوپاتا پھر ابھی یہی صورت حال پیدا ہورہی ہے جیسا کہ آپ نے ابھی سوال کیا اور خود میرے ذہن پر بھی کبھی یہ سوال چھایا رہتا ہے جب مسودات دیکھتا ہوں، کتابیں دیکھتا ہوں، کچھ پڑھنا چاہتا ہوں، وقت نہیں ملتا لوگ گھیر لیتے ہیں، پریشانی تو ہوتی ہے

لیکن یہ مسئلہ ترجیحات کا ہے، اگر آپ اس دن کو یاد کریں گے جس دن بابری مسجد کی شہادت ہوئی اور اس دن کے بعد سے جو کام ملّی کونسل نے ہندوستان میں انجام دیا، ایمانداری سے اگر کوئی اس کا جائزہ لے تو محسوس کرے گا کہ اگر میں دس بار بخاری شریف پڑھا لیتا یا دس کتابیں فقہ کی لکھ ڈالتا تو یہ کام نہیں ہو سکتا تھا، ویسے فیصلہ اللہ کرنے والا ہے کہ کون سا عمل اس کی بارگاہ میں مقبول ہے، کبھی قاعدہ بغدادیہ پڑھانے کا عمل اس کے یہاں زیادہ مقبول ہوتا ہے بخاری شریف کے مقابلہ میں اس لئے اللہ پر فیصلہ چھوڑ دیجئے، اگر اس نے کچھ صلاحیت دی ہے تو اس کی صحیح مصرف میں لگائے اور وہ کام لے جو امت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلم قائدین نے ملت کو جذباتی اور مذہبی مسائل میں الجھائے رکھا اور ان کی تعمیر کے لئے ٹھوس اور بنیادی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا اس رائے سے آپ کو کس حد تک اتفاق ہے؟

جواب: میں کسی بھی لمحہ میں کبھی بھی ماضی کی نفی کر کے نہیں چلتا، ہمارا بنیادی اصول یہ ہے کہ ماضی میں ہمارے سلف کے ذریعہ جو کام جس وقت جہاں بھی ہوا، اس دائرہ میں بلاشبہ اس وقت وہی ہونا ممکن تھا جس وقت چاروں طرف آگ لگ رہی ہو اور آگ سے جلنے والوں کو نکالنے کا مسئلہ ہو، یا خود اپنے کو آگ سے بچا کر باہر نکالنے کا مسئلہ ہو، یا جس وقت کسی سمندر کے بھنور میں کوئی کشتی غرقاب ہو رہی ہو، کسی طرح اس کشتی سے جان بچا کر بھنور سے نکل آنے کا مسئلہ ہو، اس حالت میں اور اس میں کہ جب لوگ ساحل پر بیٹھ کر محفلیں جمائے ہوئے ہوں فرق ہے، ہر اقدام جو سلف نے جس زمانہ میں کیا وہ اس وقت کے حالات کے مطابق ہوا، اس لئے میں کسی کی نفی کر کے آگے بڑھنا نہیں چاہتا، میں یہ جانتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ امت کو اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ امت کی مجموعی تعمیر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے میں نے شروع میں دو لفظ استعمال کئے تھے کہ اجتماعی ترقی اور مجموعی ترقی، تو اجتماعی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانوں کی فلاح کے لئے کام کئے جائیں اور مجموعی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ محض مخصوص طبقات کی ترقی نہیں بلکہ

امت کے ہر طبقہ کی ترقی مقصود ہو، ہمارے دیہاتوں کا حال یہ ہے کہ وہاں لوگ اللہ کو نہیں جانتے، جہاں مسجدیں نہیں ہیں، جہاں الف، با، پڑھنے کے لئے مکاتب نہیں ہیں، جہاں مسلم خواتین غیروں کے گھروں میں جا کر برتن مانجھنے کا کام کرتی ہوں جہاں ہمارے بچے کوڑے کرکٹ پر ردی تلاش کر کے اپنی زندگی گذار رہے ہوں، وہ لوگ جو مختلف اعتبار سے پسماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں، وہ سب جب بنیں گے تب امت بنے گی اس لئے مجموعی ترقی کے لئے اور اجتماعی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

سوال: کیا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنی تعمیر کے امکانات بھی ہیں؟ ان امکانات کو یقینی بنانے کے لئے کیا کیا جانا چاہیئے؟

جواب: امت کے سامنے دو کام ہیں ایک تو تعمیر کا کام ہے اور ایک ہے اس پر مختلف طرف سے ہونے والے حملوں کے دفاع کا کام تو میں سمجھتا ہوں کہ دفاع تو خیر ہوتے ہی رہنا چاہیے، لیکن بنیادی کام تعمیر کا ہے اور امت کی تعمیر کے لئے مختلف میدانِ کار ہیں ان پر بلا لحاظ کسی فرقہ کے اور بلا کسی حلقہ بندی اور گروہ بندی کے ہم کو اجتماعی ترقی کے لئے کام کرتے رہنا چاہیے یہی طریقہ ہے۔

سوال: بابری مسجد کی تعمیر کے تعلق سے ملّی کونسل کس حد تک پُر امید ہے؟

جواب: مسلمانوں کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، ستر برس کے بعد اگر ازبکستان میں اور تاجکستان میں اسلام دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے واقعہ کو ہم فراموش کر جائیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں اسے یاد رکھیں اور ایک وقت آئے گا جب اس کی تعمیر نو ہوگی انشاء اللہ لیکن اس کے لئے ایک طویل جد و جہد ضروری ہے۔

سوال: یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس قیادت نہیں ہے، یہ محض پروپیگنڈہ ہے یا واقعہ ہے؟

جواب: قیادت نہیں بلکہ سمع وطاعت نہیں ہے، مسئلہ قیادت کے بحران کا نہیں بلکہ سمع و

طاعت کے بحران کا ہے۔

سوال: جناب والا امارت شرعیہ بہار کے بھی نہایت کلیدی منصب پر فائز ہیں، امارت کو وہاں حد درجہ اعتماد واحترام حاصل ہے، امارت کی اس نمایاں کامیابی کی وجہ کیا ہوسکتی ہے جبکہ ملک کی دوسری ریاستوں میں دارالقضاء اوراس نوعیت کی سرگرمیوں کو وہ مقبولیت اور تاثیر حاصل نہیں ہو پائی؟ ملک بھر میں دارالقضاء کے نظام کو مؤثر وفعال بنانے کے لئے کیا کچھ کیا جانا چاہیے؟

جواب: کوئی بھی کام اس وقت کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے جب اسے کوئی جنون کی حدتک کام کرنے والامل جاتا ہے، ہرکام کی کامیابی کے لیے کسی ایسی شخصیّت کا ملنا ضروری ہوتا ہے جس پر وہ کام جنون کی حدتک طاری ہو۔

حضرت مولانا سجاد صاحبؒ پر یہی کیفیت طاری تھی اور امارت شرعیہ کے کام کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، اس زمانہ کے اکابرین نے بھی ان کی تائید کی، اور بڑے سے بڑے جھگڑوں سے گذرتے ہوئے انھوں نے اس کام کو مستحکم کردیا ہم لوگ ان کے وارث ہیں تو تعمیر کی بنیاد ان کی دی ہوئی ہے، ہم نے اس پر دو چار اینٹیں ضرور لگائیں، امارت شرعیہ کا کام دوسری ریاستوں میں مستحکم نہ ہونے کے سلسلہ میں میں سمجھتا ہوں کہ ہر علاقہ کے اپنے مخصوص حالات کو بھی دخل ہوسکتا ہے، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ پتہ نہیں کیوں دوسری ریاستوں میں لوگوں کے ذہن میں کچھ ایسی باتیں ہیں کہ بہار میں ہوگیا، ہوگیا لیکن ہمارے یہاں نہیں ہوسکتا یعنی یہ کہ ہمت نہیں کرتے، اور جب مسئلہ پر پہلے یقین ہوتا ہے، تب ہمت پیدا ہوتی ہے، ہم لوگ ایمانداری کی بات یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات کا شرعی طور پر فیصلہ کرنا ہم پر فرض ہے اور ہم پر حق ہے، اب اس راستہ میں جو دشواری پیش آئے گی تو اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر قضاء کا نظام قائم ہوگیا ہے لیکن بہار اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ قضاء کا کام امارت کے ایک حصّہ کی حیثیت سے آیا ہے اور نظریہً

امارت کے متعلق جب ہم لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ امیر کی اطاعت شرعاً تم پر واجب ہے اور بغیر امیر کے رہنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے اور امیر کسی کو قاضی مقرر کرتا ہے جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے:

''فی بلاد تغلب علیها الکفار کقرطبة وبلنسیا الآن یجب علی المسلمین ان یتفقوا علی واحد منهم یولی قاضیا او یکون هذا الذی منهم یقضی بینهم''

تو اس اصول کے مطابق پہلے ہم امیر منتخب کرتے ہیں اور امیر ہمارے لئے قاضی مقرر کرتا ہے اور عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ تم پر امیر کی اطاعت واجب ہے اور قاضی کا فیصلہ دراصل اللہ اور رسول کا فیصلہ ہے اور اسکی اطاعت ضروری ہے تو اندر کی اس تبدیلی سے سمع وطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اس فیصلہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

بہار کی صورتحال یہ ہے کہ یہ چلتا ہوا سِکّہ ہے یعنی اگر سرکاری کچہری سے کوئی نکاح فسخ کرا کے آجائے تو مسلم معاشرہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اب اس لڑکی کا دوسرا نکاح نہیں ہوسکتا کہ نہیں صاحب! نکاح ہی فسخ نہیں ہوا ہے یہ تو کورٹ نے کیا ہے، جب تک امارت شرعیہ میں فیصلہ نہ ہو لوگ مانیں گے ہی نہیں، یہ جو فضاء پیدا ہوئی ہے، اگر علماء مل کر چاہیں تو یہ فضا بن سکتی ہے، حلقہ بندی سے اوپر اٹھ کر کرنے کا یہ کام ہے یہ انجمن سازی تو ہے نہیں، یہ شرعی طور پر منصب امارت کے حکم کی تعمیل ہے جب یہ ہوگا تو انشاء اللہ اس میں قوت آئے گی بہت جگہ ہندوستان میں ایسے دارالقضاء قائم ہیں اور میں جاکر ان کو دیکھتا بھی ہوں، دلّی میں بھی یہ نظام قضا قائم ہوگیا ہے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے فیصلہ کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب کے حکم سے جہاں جہاں موقع مل رہا ہے، قضا کا نظام قائم کرتا جارہا ہوں، قاضی کی تربیت کا بھی مسئلہ ہے، چنانچہ امارت شرعیہ میں ایک نظام قُضاۃ کی تربیت کا بھی ہے جس سے کچھ علماء ہمارے یہاں تیار ہورہے ہیں اوران کو قاضی بنا کر ہم بھیج رہے ہیں۔

سوال: فقہ اکیڈمی کے عنوان سے جناب والا نے مستند علماء وفضلاء اور عصری علوم کے ماہرین کا جو مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا ہے، اس سے اکیڈمی کو بجا طور پر اعتماد ووقار حاصل ہوا ہے لیکن دوسری طرف وہ حلقے بھی ہیں جو سمیناروں کے مختلف فیصلوں کو یا تو قدامت پسندی پر محمول کرتے ہیں یا پھر تجدد پسندی سے تعبیر کرتے ہیں اس پر جناب والا کا کیا ردعمل ہے، نیز فقہ اکیڈمی کے مقاصد میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے؟

جواب: بات یہ ہے کہ جو میدان میں آتا ہے اسی سے اختلاف ہوتا ہے، اگر میں ایک اچھا مدرس رہتا، بہت اچھا وعظ کہتا، بہت اچھی اچھی کتابیں لکھتا تو کوئی مجھ سے ناراض نہیں ہوتا لیکن یہ تو میدان ایسا ہے کہ اس میں جو آئے گا اسے لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا، فقہ اکیڈمی تو بے چاری معصوم ہے، سبھی لوگ اس میں شریک تھے، لیکن کچھ لوگوں نے محض سیاسی اغراض کے تحت مخالفتیں شروع کیں اور جہاں تک مسائل میں اختلاف رائے کا سوال ہے، اکیڈیمی میں تو اس کے لئے کھلا ہوا میدان ہے۔

اس میدان میں شاید ہندوستان کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی کھلی بحث کی کوئی مثال موجود نہیں ہوگی جتنی کھلی بحث فقہی سیمینار میں ہوتی ہے، یہاں تک کہ لوگ مجھ سے ناراض ہیں کہ آپ نوجوان علماء اور نئے نئے مدرسین کو بھی اجازت دے دیتے ہیں بحث کرنے کی، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ نہیں، بحث کے جوہر اسی طرح کھلیں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ فقہ اکیڈیمی ہندوستان میں ایک نادر شئی ہے، پاکستان کے علماء نے مجھ سے کہا کہ یہ کام تو ہمارے یہاں ہونا چاہیے تھا، بجائے اسکے وہ ہندوستان میں ہو رہا ہے، فقہ اکیڈمی کو تو اب لوگ Recognize کر رہے ہیں، المجمع الفقه الاسلامی جدّہ اور مختلف جگہ لوگ اس کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس کی افادیت کو محسوس کر رہے ہیں، اب تک فقہ اکیڈمی نے فقہی مباحث کا ایک کتب خانہ جمع کر دیا ہے، ہمارے یہاں مجلّہ فقہ اسلامی سات جلدوں میں چھپ چکا ہے، پانچ جلدیں اس کی پاکستان میں شائع ہوئی ہیں، فقہ اکیڈیمی کے سیمناروں میں مسائل پر جس طرح بحثیں ہوئی ہیں، مدارس میں اس نے جو تبدیلی پیدا کی ہے، علماء

میں طلباء میں اس نے بحث وتحقیق کا جو مزاج پیدا کیا ہے وہ قطعا فراموش کیا جا چکا تھا فقہ لوگ پڑھتے تھے محض رسمی طور پر، میں تو اس سلسلہ میں زیادہ نہیں کہہ سکتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب کوئی غیر جانبدار مؤرخ یہاں کی علمی فقہی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ فقہ اکیڈمی کی ان خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔

سوال: اس وقت عالم اسلام کے سامنے بنیادی مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

جواب: اسلامی بیداری اور شعور کی بیداری کی لہر پوری دنیا میں ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ شیر خوابیدہ کروٹ لے رہا ہے اور امریکہ اور بڑی طاقتوں کو صرف اسی کا خوف ہے۔ اسلئے کہ اس قوم کے پاس ایک زندہ پیغام ہے اور وہ ہے قرآن اس پیغام پر عمل کے نمونے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ پھر اس کی ایک تابناک ماضی کی تاریخ ہے، پھر جو انسانی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ بھی اس کے پاس کم نہیں ہیں، پھر Strategic Point اس کے پاس ہے، دنیا کا جغرافیائی طور پر پھر اسکی زمین بھی بانجھ نہیں ہے، ان تمام مسائل پر نظر رکھنے والے، خاص کر روس کے زوال کے بعد سے کافی فکرمند نظر آتے ہیں اور انھوں نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا رشتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹنا چاہیے، اور اسلام سے اس کا تعلق منقطع ہونا چاہیے، اس کے لئے انھوں نے تشکیک کا راستہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کا راستہ اختیار کیا ہے، خود مسلمان نسل اسلام کے پیغام کی طرف سے شک میں مبتلا ہو جائے اور اس شخصیت سے جس سے یہ ملت وابستہ ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کا رشتہ کمزور ہو جائے غیر مسلموں کے سامنے (جو اسلام کی فطری کشش سے متاثر ہوتے ہیں) مسلمانوں کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی جائے، ان کو Terrorist دہشت گرد قرار دیا جائے، یہ دراصل سازش ہے! اس میں چاہے امریکہ ہو، چاہے موساد ہو، چاہے آر ایس ایس ہو، یہ سب مشترک کوششیں ہیں، اندرونی طور پر سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کو کمزور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور

ان کو وہ بہت حد تک کمزور کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں، جو کچھ عراق میں ہو رہا ہے، جو عراق اور کویت کے جھگڑے میں ہوا، جو ابھی افغانستان میں ہو رہا ہے، یا دیگر ملکوں میں ہو رہا ہے، ان سب کا اگر آپ مطالعہ کریں تو ان سب کے پیچھے ایک ہی بات نظر آئے گی مسلمانوں کی اندرونی قوت کو برباد کرنا دوسرے ان کو اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اپنے مذہب سے دور کرنا اور تیسرے غیروں کے سامنے ان کی تصویر ایک خطرناک دہشت گرد کی حیثیت سے پیش کرنا، ظاہر ہے کہ اس کے حل کے لئے ایک تو ہم اسلام کی طرف نہایت مضبوطی سے لوٹیں تو دوسری طرف ہم کو پوری حکمت عملی کے ساتھ اس بگاڑی گئی تصویر کو صحیح کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ مغربی میڈیا اس کا بڑا آلہ کار ہے لیکن ہم کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ حقائق کے سامنے میڈیا کا غلط پروپیگنڈہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ سچائی ہمیشہ غالب آئی ہے اور جھوٹے پروپیگنڈہ نے مُنہ کی کھائی ہے، اگر ہم نے اپنی ذاتی، اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اسلام کو صحیح طور سے نافذ کر لیا تو یہ سارے غلط قسم کے پروپیگنڈے نقش برآب ثابت ہوں گے اور ہم دنیا کے سامنے اسلام کو ایک دین رحمت کی حیثیت سے پیش کرنے میں انشاءاللہ کامیاب ہوسکیں گے۔

سوال: ماہنامہ ''بانگ درا'' کے لئے اور اس ماہنامہ کے ذریعہ طلباء اور اس کے علاوہ ملت اسلامیہ ہند کے لئے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: میں اپنے عزیز طلباء اور نوجوانوں سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے لئے جیو اور اسلام کے لئے مرو، کبھی بھی امت میں تفریق کا باعث مت بنو، یہ بہت مظلوم امت ہے، تم اپنی ساری علمی، عملی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ امت کو ایک کرنے اور اسے جمع کرنے کی کوشش کرتے رہو، تیسری بات یہ ہے کہ جزوی اور فروعی مسائل سے بالاتر ہو کر امت کے اجتماعی مسائل کو اپنا میدان کار بناؤ۔

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ، فروری ۱۹۹۷ء)

عقیدہ، زبان اور تہذیب
کی حفاظت خود ہمیں کرنی ہوگی!!

دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری
جناب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی سے ایک گفتگو

دینی تعلیمی کونسل ایک تحریک اور ایک مشن ہے، نسل نو کے عقیدہ کی فکر دینی تعلیمی کونسل نے کی، اس کے علاوہ دینی تعلیمی کونسل اردو کی بھی ایک زبردست عوامی تحریک ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی حفاظت کا کام اللہ تعالی نے دینی تعلیمی کونسل سے لیا، اس طرح دینی تعلیمی کونسل ایک مشن اور ایک تحریک بن گئی، اس نے جگہ جگہ مکاتب قائم کئے، جہاں نئی نسل ناظرہ قرآن اور اردو پڑھ لیتی ہے، قاضی عدیل عباسی اس تحریک کے روح رواں تھے۔

اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دینی تعلیمی کونسل کا بھرپور تعارف قارئین کے سامنے آجاتا، ہم شکر گزار ہیں، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب کے جو دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں، اور اس تحریک سے ان کا قلبی لگاؤ ہے، زیر نظر انٹرویو میں آپ کو دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا پس منظر، اس کے مقاصد اور اس کے طریقہ کار پر سیر حاصل گفتگو ملے گی۔

سوال: دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا پس منظر کیا تھا؟ اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

جواب: یہ ایک لمبی اور تفصیل طلب تاریخ ہے، اس کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی

صاحب تھے، یہ اس کارواں میں سرخیل تھے، اور جنگ آزادی کے مجاہدین میں بھی پہلی صف میں شامل تھے، اور سیاسی اکابرین اور شخصیتوں سے ان کے غیر معمولی مراسم تھے، تحریک خلافت میں وہ شریک رہے، انہوں نے ملک کی آزادی سے پہلے پورا اندازہ کرلیا تھا جو تاریخی شواہد ہیں، اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی جس محنت سے لڑی گئی اسی دور میں ایک تعلیمی منصوبہ بھی بنتا رہا اور گویا ایک حکمت عملی کے طور پر یہ بات ذہنوں میں تھی سیاسی اکابرین کے کہ ملک کی آزادی کے بعد جو سب سے بنیادی مسئلہ ہوگا وہ تعلیم کا ہوگا، کسی بھی ملک کے لئے، بڑی قدر و قیمت کی بات ہے اور ایسے واقعات پیش آئے آزادی سے پہلے کہ جس سے ایک رخ کا اندازہ ہوتا تھا، اسی کو قاضی عدیل عباسی صاحب سمجھ گئے تھے، اس حقیقت کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی سمجھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی سمجھے، ان لوگوں کا نام میں خاص طور سے اس لئے بھی لے رہا ہوں کہ ملک کی جنگ آزادی میں یہ پہلی صف کے تھے، اور ملت کے تعلق سے بھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا مسئلہ یہ ہوا کہ وہ وزیر تعلیم ہوگئے، اور ملک کا مزاج بدلا، رخ بدلا، حالات بدلے، اس میں ان کی فکر بھی بدلی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بہت جلد رخصت ہوگئے، قاضی عدیل عباسی نے ایک فیصلہ کیا جو بڑی دور اندیشی کا فیصلہ تھا، اور بہت اخلاص وللّٰہیت کا فیصلہ تھا، کوئی شخص جو اخلاص کا پیکر نہ ہو وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا، کوئی شور و ہنگامہ نہیں، یہ انہیں بالکل یقین تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد تعلیم کا رخ بالکل بدل جائے گا اور اگر ہم نے اپنی نوجوان نسل کو اسی بدلے ہوئے حالات کے حوالہ کردیا تو پھر اس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی، اس وقت تک قاضی صاحب نے اس موضوع پر کچھ لکھا نہیں تھا، یہ بڑی تاریخی شہادت ہے، بلکہ عملی طور پر ان کا فیصلہ مکاتب کے قیام کا تھا، مکاتب کا جو نظام اس وقت بنا ہوا ہے اس کا اندازہ اس وقت نہیں لگایا جاسکتا تھا، مدارس تھے، لیکن گاؤں گاؤں میں مکاتب کے قیام کا تصور اس خیال سے کہ ہماری نسل ذہنی، دینی لحاظ سے محفوظ رہے گی، چنانچہ قاضی صاحب نے اپنے بستی ضلع میں اس کام کا آغاز نہایت خاموشی سے کیا

اور اسی درمیان ایک واقعہ پیش آیا کہ قاضی صاحب کے گاؤں میں جو پرائمری اسکول تھا جس کے لئے قاضی صاحب کے والد اور دادا نے زمین دی تھی حکومت کے کہنے پر، قاضی صاحب کے دادا قاضی بسم اللہ صاحب عباسی جو مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت اور مجاز تھے، اور اسی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ رحمانی بھی لکھتے تھے، مولانا قاضی محمد بسم اللہ عباسی رحمانی یہ لکھتے تھے وہ خود، لیکن کوئی مکتب نہیں تھا گاؤں میں، گھروں میں جو گفتگو ہوجاتی تھی، بچوں کے سامنے لیکن گھر کے بچے بھی پرائمری اسکول میں جاتے تھے، اپنے گھر کے بچہ سے قاضی صاحب نے پوچھا کہ حضور پاک ﷺ کی والدہ کا کیا نام تھا؟ نہیں بتا سکے وہ، اور پوچھا رام چندر کی والدہ کا کیا نام تھا تو بتادیا، تو قاضی صاحب فرماتے تھے کہ ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینہ پر بہت قریب سے کسی نے گولی ماردی ہو، اور پردہ ہٹ گیا بالکل، یہ کیا ہورہا ہے اور اسی وقت ارادہ کیا اور اپنے گھر کی جو مسجد تھی کچی دیواروں کی، اس میں مکتب کی بنیاد ڈال دی، یہ بظاہر ایک بہت چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن دینی تعلیمی کونسل کے قیام کی بنیاد اسی واقعہ پر ہے، قاضی صاحب نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ تعلیم کی راہ سے ایک بڑا انقلاب آنے والا ہے، اور جیسے بڑی سطح پر سرسید نے اندازہ کیا تھا، جیسے بڑی سطح پر دیوبند کے حضرات نے محسوس کیا، جیسے مدارس کے ذمہ داروں نے محسوس کیا اور فیصلہ کیا بڑی سطح پر، لیکن یہ جو بات تھی زمینی حقیقت کے طور پر کہ یہ جو معصوم بچے ہیں، ان کو کیسے محفوظ رکھا جائے، یہ تھا اصل میں بنیادی تصور دینی تعلیمی کونسل کا، اس لئے مولانا علی میاں صاحب فرماتے تھے کہ اس تحریک میں میں اپنی شمولیت کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہوں، بہت بڑی بات تھی جو مولانا فرمایا کرتے تھے، یہ انہی کی زبان سے ادا ہوسکتی تھی، ہر کس و ناکس یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا، تعلیم کے لحاظ سے جو اندیشے تھے خدشات تھے تعلیم کے نقطہ نظر سے، وہ ملک کی آزادی کے بعد فوری طور پر ظاہر ہونا شروع ہوئے، اور دینی تعلیمی کونسل کا قیام بظاہر ۱۹۵۹ء میں ہوا جب بستی میں ایک بڑی کانفرنس ہوئی اور قاضی صاحب نے پورے ملک سے لوگوں کو مدعو کیا، قاضی صاحب کا یہ مزاج تھا، جب مولانا منظور نعمانی کو اور مولانا علی

میاں کواس تحریک کے بارے میں معلوم ہواتو ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ جب ایک چھوٹی سی نشست ہوئی تھی، بستی میں، دونوں بزرگ تشریف لے گئے تھے اور بستی میں خیر انٹر کالج میں ایک جلسہ ہوا تھا، اور خاص طور سے قاضی صاحب کے ذہن میں یہ بات تھی کہ نوجوان طلبہ کے سامنے ان اکابرین کی گفتگو ہو، ایک نشست میں مولانا علی میاں کی تقریر ہوئی تھی اور ایک نشست میں مولانا منظور نعمانی صاحب کی تقریر ہوئی تھی، اس موقعہ پر ۵۳ء میں قاضی صاحب نے اپنی تحریک کا بھی تعارف کرایا اور وہ واقعات پیش کئے جس کی وجہ سے ان کے دل میں یہ بات آئی، اور محدود پیمانہ پر اس کام کو شروع کیا، مولانا علی میاں نے فرمایا کہ اس تحریک کو بستی سے باہر بھی شروع کیا جائے اور ایک بڑی کانفرنس لکھنؤ میں کی جائے، لیکن قاضی صاحب نے کہا کہ میں لکھنؤ میں کانفرنس نہیں کرسکوں گا، بستی میرا شہر ہے یہاں میرے احباب ہیں، یہ تو ۵۳ء کی بات ہے، اور قاضی صاحب نے کام کا آغاز کیا تھا ۴۶ء میں، یعنی تقریباً دینی تعلیمی کونسل کے قیام سے ۱۲/۱۳ سال پہلے، اس وقت ملک آزاد بھی نہیں ہوا تھا، لیکن انہوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ ملک میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا یعنی اگر تعلیم کا کوئی مسئلہ نہ ہوتو عقیدہ کی حفاظت کا مسئلہ بہرحال ایسے مسائل ہوں گے جن کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیے، اس کا انہوں نے دور بینی سے اندازہ کرلیا تھا، ۴۶ء کے بعد ۵۳ء میں یہ جو دو نشستیں ہوئیں مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی کے ساتھ، اسی ۵۳ء میں قاضی صاحب نے بستی میں ایک اردو کانفرنس بھی کی تھی، وہ ملک کی آزادی کے بعد اردو کے نام پر پہلی کانفرنس تھی جو لوگ اردو کی تاریخ کا علم نہیں رکھتے وہ اسے نہ جانتے ہوں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد پہلی اردو کانفرنس جس میں حکومت سے مطالبات کے سوا محبان اردو کو بھی جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی تھی، انجمن ترقی اردو دہلی میں تھی، اس وقت تک لکھنؤ میں انجمن ترقی اردو نہیں تھی، اسی کانفرنس میں ترقی اردو کی بنیاد پڑی تھی، یہ بھی ایک امتیاز ہے شہر بستی کا اور قاضی صاحب کی شخصیت کا، اردو کے تعلق سے کام کا آغاز وہیں سے ہوا، دینی تعلیمی کونسل کی بنیاد اور فکر میں شامل ہے اس کے افتتاح کے

لئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو زحمت دی گئی تھی، لیکن وہ اپنی علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لاسکے، اور قاری طیب صاحب گورکھپور آکر بیمار ہوگئے تھے، گورکھپور سے بستی نہیں تشریف لاسکے تو اس کا افتتاح مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کیا اور خطبہ صدارت مولانا علی میاں صاحب کا تھا، جو تحریک کی بنیاد بنا، اور جو سب سے خاص بات تھی کہ اکابرین ملت نے اس ضرورت کو اس طور پر محسوس کیا کہ اس کانفرنس میں ملت کی ہر جماعت کے نمائندے موجود تھے، ہر حلقہ کے اور ہر مسلک کے ذمہ داران اور اکابر موجود تھے اور سب نے مل کر متفقہ طور سے اس تنظیم کی اہمیت کو محسوس کیا، بعد میں وہ شیرازہ کمزور ہوا، تقریباً ۵۰/ برس ہوگئے لیکن دینی تعلیمی کونسل کا صراط مستقیم پر سفر جاری ہے۔

افسران نے قاضی عدیل صاحب سے پوچھا کہ آپ کو الگ سے ایک تعلیمی تحریک کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، اور حکومت کا جو نصاب تعلیم ہے اس میں کیا کمی آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے اس تحریک کا آغاز کیا، انہوں نے بلیغ بات کہی اور کہا کہ فرق یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو A فار Apple پڑھاتے ہیں اور ہم ہمارے بچوں کو A فار Allah پڑھانا چاہتے ہیں، اور آپ کے سیکولر نظام میں یہ چیز رکھی گئی ہوتی تو وہ بوجھ آپ کو اٹھانا چاہیے تھا دستور کے لحاظ سے تو اس بوجھ کو ہم نے اٹھالیا، ایک ضرورت یہ محسوس کی گئی، اس تحریک کے پس منظر میں یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جو سب سے پہلی ضرب لگی وہ اردو زبان پر لگی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان نے جنگ آزادی کو شعلہ جوالہ بنایا، اس میں کوئی دورائے نہیں، اس حقیقت سے ایمانداری کے ساتھ کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اردو کا نعرہ مستانہ نہ ہوتا، اور اس کے محبین کی ادائے قلندرانہ نہ ہوتی تو منزل آسان بھی نہ ہوتی، ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور ۱۹۴۸ء میں دو حادثات پیش آئے، ایک تو گاندھی جی کا حادثہ پیش آیا اور دوسرے اردو کی حق تلفی کا حادثہ پیش آیا، تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ دو حادثات مجھے بالکل برابر لگتے ہیں، گاندھی جی کا تعلق بھی اردو سے تھا، اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے وہ، لیکن اتفاق یہ کہ ایک ساتھ یہ دونوں واقعات پیش آئے،

اورخاموشی کے ساتھ یہ پیغام دیا گیا کہ اردو اور گاندھی جی کو ایک خاص ذہنیت کے تحت رخصت کیا گیا ہے، اس پر تفصیلی گفتگو آج تک نہیں ہوئی، یہ ایک قرض ہے جو ہونا چاہیے، یہ ایک خاص پس منظر تھا پورے ملک کو ایک تاثر دینے کی کوشش کی گئی، ۱۹۴۸ء میں قاضی عدیل صاحب کا ایک مضمون قومی آواز میں شائع ہوا جس میں اردو کی حق تلفی کا ذکر تھا اور ان ہی کا ایک جملہ ہے کہ بیک جنبش قلم اردو کے حقوق سلب کر لئے گئے، آزاد ہندوستان میں اردو کو اگر باقی رکھنا ہے تو حکومت باقی نہیں رکھے گی، یہ ایک اشارہ تھا کہ تمہیں اپنی زبان عزیز ہے تو تم اسے باقی رکھنے کی کوشش کرو، بات کو جنہوں نے سب سے پہلے سمجھا وہ قاضی عدیل عباسی صاحب تھے، اور اس کو موضوع بنایا، عنوان بنایا اپنی تحریک کا، میں نے لکھا تھا کہ اردو کی سب سے بڑی عوامی تحریک دینی تعلیمی کونسل ہے، لاکھوں بچے ہر سال اردو پڑھتے ہیں، دینی تعلیمی کونسل کے مکاتب ہیں، اوپر پہونچ کر ان کا رشتہ باقی رہے یا نہ رہے، لیکن دینی تعلیمی کونسل کے نظام تعلیم کے تحت لاکھوں بچے اردو پڑھتے ہیں، ۱۹۶۲ء میں ایک سرکولر آیا کہ جن اسکولوں میں چالیس بچے، جن میں دس بچے اردو پڑھنے کا مطالبہ کریں ان کی اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے، وزرائے اعلی کی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں یہ بات طے ہوئی تھی اور قاضی صاحب کہتے تھے کہ یہ بات حکومت کی سطح پر اس یقین کے ساتھ کہی گئی تھی کہ اب اردو کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں یہ بات پیش نظر تھی کہ نسل نو کو اور نوجوان نسل کو ذہنی اور فکری اعتبار سے کیسے محفوظ رکھا جائے، عقیدہ کی اہمیت، عقیدہ توحید کی اہمیت، رسالت و فکر آخرت کی اہمیت، اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہمیں یہ ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ ان بنیادی باتوں کو بتانے اور سمجھانے کی ذمہ داری ہماری ہے، جس سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں، اپنی زبان اور اپنی تہذیب بھی اگر ہمیں عزیز ہیں تو اس کے لئے خود ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے اس حقیقت کو پوری طرح سمجھا نہیں، اس میں

ایک وجہ تو یہ ہے کہ سیاسی طور پر جو حالات پیش آئے ملک آزادی اور تقسیم اور قیام پاکستان، اس میں مسلمانوں کو کشمکش میں مبتلا کر دیا گیا، چنانچہ چاہتے ہوئے بھی زبان و تہذیب کی حفاظت کو مسلمانوں نے اپنا موضوع نہیں بنایا، اور حکومتوں سے مطالبات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس گھٹتا چلا گیا، قاضی صاحب فرماتے تھے زندہ قومیں ہمیشہ دو محاذ پر ہوتی ہیں، ایک حکومت سے مطالبات کا محاذ، دوسرا محاذ جس کا تعلق ہماری فکر، احساس ذمہ داری، کارکردگی، فکر و رجحان سے ہے، وہ زیادہ قیمتی ہے، اور دونوں محاذ کو گرم رکھنا چاہیے، مولانا علی میاں فرمایا کرتے تھے کہ اپنی زبان کے تعلق سے، اپنی تہذیب کے تعلق سے، اپنے دین وعقیدہ کے تعلق سے ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل نے اپنے کو خالص دینی تعلیم میں محدود رکھا ہے، اور بھی مسائل ہیں، ہر مسئلہ سے ہمارا تعلق ہے اور ہم اس سے واسطہ بھی رکھتے ہیں، لیکن دینی تعلیمی کونسل نے تعلیم کو فکر کا محور بنایا، سرکاری نصاب تعلیم جسے واقعتاً سیکولر ہونا چاہیے تھا وہ سیکولر نہیں رہ گیا، اگر نصاب کو سنوار دیا جائے تو نوجوان نسل دوسرے انداز سے اٹھے گی، بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو مشترک ہیں، اور ایک مشترکہ فکر ہے، کوشش ہونی چاہیے کہ ان بچوں کے سامنے کوئی ایسا موضوع رکھا جائے جو دونوں کے درمیان قدرے مشترک ہو۔

دینی تعلیمی کونسل نے دو تین مرتبہ سرکاری نصاب کا جائزہ لیا کہ کیا کیا چیزیں مسلمانوں کے خلاف ہے، ہمارا کوئی مطالبہ آج تک غیر جمہوری وغیر دستوری نہیں رہا ہے، دینی تعلیمی کونسل نے ہمیشہ یہ کہا کہ اگر تمہیں اپنا عقیدہ، اپنی زبان اور اپنی تہذیب عزیز ہے تو ان تینوں چیزوں کی حفاظت کا فریضہ تمہیں اور صرف تمہیں انجام دینا ہے۔

سوال: دینی تعلیم کونسل کا طریقہ کار کیا ہے؟

جواب: جب دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ایک جلسہ میں آنا تھا، لیکن نہیں آسکے، ایک خط میں انہوں نے قاضی عدیل عباسی صاحب کو لکھا کہ اس کانفرنس کے اعلان نے ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے، مولانا ابو

الليث اصلاحی صاحب نے کہا کہ اس کام کے لئے جماعتوں کو اپنے اندر لچک پیدا کرنی چاہیے، بزرگوں نے بڑی فراست ایمانی کے ساتھ فیصلہ کیا کہ مسلک کے سلسلہ میں کوئی گفتگو نہیں کی جائے گی، مسلک کے اعتبار سے اس کے نصاب میں کوئی کتاب شامل نہیں کی گئی، کونسل کی طرف سے اس کو آزاد چھوڑ دیا گیا کہ آپ کا جو مسلک ہے اس کے اعتبار سے جو کتاب پڑھانا چاہتے ہوں پڑھالیں، دینی تعلیمی کونسل کے نصاب کے متعلق پانچویں تک پہونچتے پہونچتے بچہ قرآن پاک کا ناظرہ ختم کرلے، اردو پڑھنا لکھنا اسے آجائے، دین کی ابتدائی و بنیادی باتوں سے وہ آشنا اور روشناس ہوجائے، اور اسے اس قابل بنادیا جائے کہ اب وہ میدان میں جائے تو اس پر کوئی دوسرا رنگ نہ چڑھے۔

دوسری بات طریقہ کار کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ایک اور سوال کیا تھا کہ اتنی بڑی کانفرنس کا اعلان کردیا گیا اور اتنی بڑی تحریک کا آغاز کیا جارہا ہے، سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ تو قاضی عدیل صاحب نے ان کو لکھا کہ اس تحریک میں سرمایہ کی کوئی ضرورت نہیں، اور بہت بڑا سرمایہ لگنے والا ہے، جس کے لئے ہم اور آپ پریشان ہیں، مکتب کو کسی درپے، یا کسی کھلیان میں اللہ کا نام لے کر شروع کیا جائے گا، اب جو صاحب ان بچوں کو لے کر بیٹھیں گے ان کی تنخواہ کہاں سے دی جائے گی، تو چٹکی کا نظام قائم کیا گیا، خواتین کو خاص طور سے مکلّف بنایا گیا کہ گھروں میں مٹی کے برتن رکھے جائیں، ایک ہفتہ جمعہ سے جمعہ تک جس وقت بھی گھر میں کھانا پکتا ہو تو اس میں سے ایک چٹکی نکال دی جائے، اور اس برتن میں ڈال دیا جائے اللہ کے نام پر تعلیم کے لئے، پھر ایک ہفتہ بعد کارکن اسے اٹھالے جائیں گے، جمع کریں گے، اور اس کو فروخت کیا جائے گا اور آگے کا کام چلایا جائے گا، تحریک کا بہت بڑا بوجھ اسی چٹکی کے نظام نے اٹھایا، اور کسی کی جیب پر کوئی بوجھ نہیں پڑا، یہ باور کرایا گیا کہ زبان و تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری کلیۃً تمہاری جیب پر ہے، تمہارے گھر پر ہے، گھر کے اخراجات میں یہ شامل ہے، حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو، اور اس کے بغیر حفاظت نہیں ہوسکے گی۔

ایک اور طریقہ جو دینی تعلیمی کونسل نے اپنے اوپر نافذ کیا کہ سرکاری تعلیم کے نصاب کا جائزہ لینا، یہ بڑی بنیادی خدمت تھی، تین مرتبہ دینی تعلیمی کونسل نے سرکاری نصاب تعلیم کو شائع کیا، Primary سے لے کر Intermediate تک جائزہ لیا، اس میں اکتیس کتابیں ہیں، جن میں مسلمانوں کے خلاف، مسلمان حکمرانوں کے خلاف، عقیدہ و مذہب کے خلاف چیزیں شامل ہیں، بڑی ایمانداری کے ساتھ، دستور کی روشنی میں اس کو نمایاں کر دیا گیا کہ یہ بات دستور کے خلاف ہے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنے انتقال سے کچھ دن پہلے پارلیامنٹ میں اٹھایا تھا، تیسرے جائزہ میں مولانا کی وہ تقریر بھی شامل ہے وندے ماترم، سورج کی پوجا، جیسے مسائل کا بھی دینی تعلیمی کونسل نے مقابلہ کیا اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود اس طوفان کو روک دیا جو کچھ بچا کچھا اثاثہ ہے اس کی حفاظت کا فریضہ آج بھی کونسل کے پلیٹ فارم سے کیا جارہا ہے۔

سوال: دینی تعلیمی کونسل اور حضرت مولانا علی میاں صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں؟

جواب: مولانا نے میری بسم اللہ کرائی تھی، چار سال کی عمر میں، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ چار سال کے عمر میں مولانا نے جو دستِ شفقت میرے سر پر رکھا تھا وہ اس دن اٹھا جس دن مولانا اس دنیا سے اٹھے، مولانا کی ایک تقریر ۱۹۶۸ء کی ہے، جو شاہجہاں پور میں کی گئی، ان دنوں Recording کا کوئی نظم نہ تھا، میرے والد صاحب نے کہا کہ مولانا کی تقریر کو قلمبند کرو، میں نے مولانا کی وہ تقریر قلم بند کی، وہ تکبیر مسلسل میں شامل ہے، تقریر قلم بند ہونے کے بعد مولانا کے سامنے پیش ہوئی، اور مولانا کے علم میں یہ بات آئی جو بات مجھ سے کہی گئی تھی، مجھ سے جو بن پڑا اس کو میں نے انجام دیا، تو مولانا نے ایک روپیہ مجھے انعام دیا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کے سلسلہ میں مولانا فرماتے تھے کہ اس تحریک میں اپنی شمولیت کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہوں، مولانا عبداللہ عباس صاحب نے میر کارواں میں لکھا ہے کہ کیسی طبیعت خراب ہو، اور کونسل کا کوئی پلیٹ فارم آجاتا تو مولانا ہر ممکن کوشش فرماتے کہ اس پروگرام میں

شامل ہوں، شرکت کے بعد مولانا پر انبساط کی کیفیت طاری ہوتی تھی، ایک بات مولانا بہت درد سے کہا کرتے تھے کہ سنجیدہ کام کرنے کا مزاج مسلمانوں میں نہیں ہے، اور ایک بات اسی تشویش سے فرماتے تھے کہ کسی نصاب سے کسی نظام سے، کسی تحریک سے مجھے تشویش نہیں ہوتی، مجھے تشویش ہوتی ہے مسلمانوں کی جذباتیت اور عجلت پسندی سے۔

دینی تعلیمی کونسل سے جو تعلق مولانا کا تھا وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہ والدین کو اولاد سے ہوتی ہے، مولانا محسوس کرتے تھے کہ ندوہ، دینی تعلیمی کونسل تحریک پیام انسانیت اور مسلم پرسنل لابورڈ مولانا کی یہ چار نرینہ اولادیں تھیں، جنہیں مولانا نے اولاد کی طرح عزیز رکھا۔

بزرگوں کی ان دعاؤں سے دینی تعلیمی کونسل بے سروسامانی کے باوجود طوفانوں کا مقابلہ کر رہی ہے، میں ہر وقت کہتا ہوں کہ کونسل کو مالی اعتبار سے اطمینان نہیں ہے، لیکن الحمدللہ کوئی کام رکا بھی نہیں، اس میں مولانا کی دعائیں شامل ہیں۔

روپ ریکھا ورما کی سربراہی میں کتابوں کا جائزہ لینے کے لئے کمیٹی بنی، ہماری کتابوں کو بھی انہوں نے دیکھا اور غیر مسلم تنظیمیں جو ادارے چلا رہے ہیں ان سب کے نصاب کا موازنہ انہوں نے کیا، تو رپورٹ میں انہوں نے الحمدللہ دینی تعلیمی کانسل کی کتابوں کی تعریف کی اور کہا کہ اس میں مذہب کی تعلیم ہے، اور سیکولر مزاج بنانا چاہتے ہیں۔

دینی تعلیمی کونسل کا نچوڑ یہی ہے کہ مطالبات اپنی جگہ پر اور ملت کی احساس ذمہ داری اپنی جگہ پر، احساس ذمہ داری اگر کمزور پڑ جائے تو اسے تازہ دم کرنا چاہیے، دینی تعلیمی کونسل کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے اردو کو بچایا، دینی تعلیمی کونسل آزاد ہندوستان کی سب سے بڑی مضبوط تحریک ہے، جو بغیر کسی احتجاج کے اپنے صراط مستقیم پر رواں دواں ہے۔

سوال: ایک عرصہ سے آپ اردو کی تدریس سے وابستہ ہیں، آپ کے تجربات کیا ہیں؟ اور آپ نے کن امور پر طلبا کو متوجہ کیا ہے؟

جواب: ایک نظام ونصاب تعلیم بنا ہوا ہے کہ کبھی اردو نہیں پڑھی، پانچویں تک نہیں پڑھی، انٹر (Inter) تک نہیں پڑھی، لیکن بی اے (B.A) میں اردو پڑھ رہے ہیں، اردو کا

کوئی پس منظر نہیں ہے، تو میں نے کچھ دنوں تک اس کا اہتمام کیا کہ میں نئے طلبہ سے کہتا ہوں کہ ایک عنوان ہے گفتگو کا کہ ہم اردو کیوں پڑھ رہے ہیں، اس کا جواب ابھی نہیں چاہتا ہوں، میری گفتگو ہوگی، وہ بھی سنو، جواب ہمیں تحریری طور پر چاہیے جو تحریر مجھے ملی اس میں اصل بات نہیں تھی، اصل بات یہ تھی کہ اردو میں طلبہ فیل نہیں کئے جاتے ہیں، ہمارے مدارس میں ایسا نہیں ہے، ہمارے مدارس میں پس منظر پر توجہ دی جاتی ہے۔

ایک طالب علم نے لکھا رشید احمد صدیقی کے تعلق سے کہ رشید احمد صدیقی کے شعر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے، کیا تعلق ہے رشید احمد صدیقی کا شعر سے۔

شعر وادب کے حوالہ سے ایک بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہتی ہے کہ ایک تو داخلہ میں طلبہ کی سطح کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، دوسرا یہ کہ نصاب تعلیم کی تشکیل میں طلبہ کی سطح کا خیال نہیں رکھا جاتا، اس وجہ سے اردو پڑھنے کے باوجود طلبہ اردو سے نابلد ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اردو طلبہ کی ذہن سازی کے سلسلہ میں طلبہ کو اردو کی محبت کا گرفتار اور اردو کا پرستار بنانے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی، میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ طلبہ سے میں ملک وملت کے مسائل پر بہت کھل کر گفتگو کرتا ہوں یہ کہہ کر ان سے گفتگو کرتا ہوں کہ میر وغالب کو پڑھانے والے تو بہت ہیں، لیکن میرے بزرگوں نے حالات ومسائل کو جس طرح مجھ میں منتقل کیا ہے انہیں منتقل کرنا چاہتا ہوں، ایک بات جو مشہور ہو گئی میں طلبہ سے اکثر عرض کرتا تھا خاص طور پر اردو پڑھنے والے طلبہ سے ضرور یہ بات کہتا تھا کہ اگر ساری زندگی ہنسنا اور قہقہہ لگانا چاہتے ہو تو اس وقت مسکرانا بھی چھوڑ دو، اور اگر اس وقت ہنس لینا چاہتے ہو اور ساری زندگی رونے کا فیصلہ کیا ہے تو ہنس لو جتنا ہنسنا ہے، یہ ہنسنے کا وقت نہیں ہے، طالب علمی کا جو دور ہے یہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کا نہیں ہے، اردو پڑھنے والوں کی جو ذہن سازی ہونی چاہیے ملت کے تعلق سے، زبان وادب کے تعلق سے، اردو پڑھنے والے طلبہ بھی اردو کی اہمیت سے ناواقف ہوتے ہیں، اردو اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ اردو شعر وادب کے ساتھ ملک وملت کے تعلق سے بھی ان کی ذہن سازی کی جائے۔

فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں سے

فضلاء مدارس کے ذوق علم وتحقیق میں جلا پیدا ہوئی ہے!

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء وسکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی

مولانا عتیق احمد بستوی سے ایک ملاقات

عالم دین مولانا مجاہدالاسلام صاحب قاسمی مدظلہ کی سربراہی میں اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کا کارواں ایک مدت سے رواں دواں ہے، جدید شرعی اور فقہی مسائل میں امت کی رہبری کیلئے اجتماعی غور وفکر اس کا بنیادی مقصد ہے ظاہر بات ہے کہ یہ کام جس قدر اہم اور ضروری ہے اتنا ہی نازک اور پیچیدہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ سالار قافلہ مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے بقول انکے اس سفر کا سرمایہ توکل اور رضاء الٰہی ہے، اس کارواں کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں علوم نبوت کے حاملین کے شانہ بشانہ علوم عصریہ کے ماہرین بھی ہیں اور اس طرح اسلامک فقہ اکیڈیمی کی صورت میں قدیم صالح اور جدید نافع کا مزاج سامنے آیا ہے، جس سے نہ صرف دینی و دنیوی علوم کے حاملین و ماہرین کے مابین خلیج کو پاٹنے کا کام ہو رہا ہے بلکہ ایک دوسرے سے استفادہ کی راہیں بھی روشن ہو رہی ہیں اور یہی ایک بات اپنی جگہ پر خدمت ہے قسام ازل نے مولانائے محترم کو دل دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند عطا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا موصوف ایک طرف مسلکی اختلافات سے بلند ہوکر اتحاد کیلئے کوشاں ہیں تو دوسری

طرف نسل نو کی آبیاری، ان میں صلاحیت پیدا کرنے اور اس میں جلاو نکھار پیدا کرنے کیلئے فکرمند بھی ہیں ان عظیم مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے پیش نظر کئی ایک ٹھوس اور عملی پروگرام ہیں اسلامک فقہ اکیڈمی بھی اسی سمت میں ایک کامیاب ومؤثر کوشش ہے۔

......استاد محترم مولانا عتیق احمد صاحب بستوی مدظلہ بھی اس کارواں کے صف اول کے علماء میں سے ہیں، ان کے تصنیفی سلسلہ نے مولانا محترم کو دینی وعلمی حلقہ میں ایک ممتاز مقام پر لا کھڑا کیا ہے، ان کی کتاب ’’فکر کی غلطی‘‘ نے اہل فکر ونظر سے خراج تحسین وصول کیا ہے، ’’ہندوستان اور نظام قضاء‘‘، ’’زکوۃ کے مصارف‘‘ ، ’’زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک‘‘، جیسے موضوعات پر اپنی تصنیفات کی وجہ سے وہ علم فقہ کی دنیا کا ایک معتبر نام ہیں، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اور مشہور مصری ماہر تعلیم ڈاکٹر زغول راغب النجار کی علمی وفکری کتابوں کو اردو قالب میں ڈھال کر مولانا محترم نے اردو خواں حضرات کو گراں بار بنا دیا ہے، اسکے علاوہ وقتاً فوقتاً ملک وبیرون ملک میں شائع ہونیوالے ان کے مقالات اہل علم کی توجہ کا باعث بنتے رہے ہیں، مولانا محترم مصنف کیساتھ ایک معلم بھی ہیں اور ملک کی مایہ ناز درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ ہیں ،اسلامک فقہ اکیڈمی کے پیش نظر جو عظیم تر مقاصد اور اسکے تحت منعقد ہونیوالے فقہی سیمینار جس اہمیت کے حامل ہیں، ان کا تقاضہ تھا کہ بانگ درا، کو اکیڈمی کی خدمات اور عزائم سے روشناس کیا جاتا، سرگرم وفعال اداروں کے ارادوں سے آگہی بھی اپنے اندر تاثیر رکھتی ہے اور مایوسی وافسردگی کے ماحول میں امیدوں کے چراغ جلاتی ہے اور آگے بڑھتے رہنے کی راہ سجھاتی ہے، اس نیت و جذبہ کے تحت اسلامک فقہ اکیڈمی سے متعلق ایک سوالنامہ مولانا عتیق احمد

صاحب بستوی کی خدمت میں پیش کیا گیا، ہم ممنون ہیں کہ مولانا محترم نے نہایت خوشدلی سے جوابات مرحمت فرمائے، امید ہے کہ انشاء اللہ وہ نہایت توجہ سے پڑھے جائیں گے۔

سوال: اسلامی فقہ اکیڈمی کے قیام کے پس پشت کون سے مقاصد کارفرما ہیں اور اکیڈمی اپنے ان مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہی ہے۔

جواب: اسلامی فقہ اکیڈمی کے قیام کا مقصد اور اس کا پس منظر دراصل یہ ہے کہ ایک زمانہ سے اصحاب فکر علماء میں اس بات کا شدت سے احساس پیدا ہوا، خاص طور سے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کے بعد ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے سامنے مختلف میدانوں میں جو مسائل کھڑے ہوئے ہیں اور جن کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے ان مسائل کو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل کرنے میں علماء کی انفرادی کوششیں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہورہی ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ایسی جامع اور ہمہ گیر علمی شخصیتیں دن بدن کم ہوتی جارہی ہیں، جن کے تفقہ، فہم وبصیرت، خداترسی، احتیاط وورع پر امت کو اعتماد ہو، دوسری طرف نئے پیچیدہ مسائل سادہ قسم کے نہیں ہیں امریکہ اور یورپ کے صنعتی اور سائنسی انقلاب کے بعد زندگی کے ہر میدان میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ اتنے متنوع اور پیچیدہ ہیں کہ ان کا صحیح تجزیہ مختلف علوم عصریہ کے ماہرین کے مخلصانہ تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس پیچیدگی میں اس وجہ سے اور اضافہ ہوگیا کہ انگریزوں کے جاری کردہ دوہرے نظام تعلیم نے طبقہ علماء کو زندگی کے اہم ترین شعبوں کے بارے میں بنیادی معلومات سے محروم کردیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ جسے ان سبھی مسئلوں کے بارے میں خاصی واقفیت ہے انھیں دین کی بنیادی معلومات سے محروم کردیا علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مابین ایسی خلیج پیدا ہوگئی کہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اور ایک طبقہ کے لئے دوسرے کی بات سننا مشکل ہوگیا۔

اس پس منظر میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی کہ جدید مسائل کا

شرعی حل تلاش کرنے کیلئے علماء اور اصحاب افتاء کو علوم عصریہ کے ماہرین کا بھرپور تعاون حاصل ہو مسئلہ جس شعبۂ زندگی سے متعلق ہو اسکے ماہرین ومتخصصین مسئلہ کی نوعیت کو پیش کریں اور علماء اور اصحاب افتاء کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کے صحیح جواب اور حل تلاش کریں، اسلامک فقہ اکیڈمی کے قیام میں اس احساس کو بھی دخل ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں علم وتحقیق کے تئیں ایک سناٹا سا پیدا ہورہا تھا، ہمارے قدیم علماء واصحاب افتاء جس محنت، جگر کاوی اور اخلاص ولگن سے جدید پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرتے اس میں کمی آتی جارہی تھی، بحث وجستجو، تحقیق کی آبلہ پائی کی لذت سے ہماری نئی نسل ناآشنا ہوتی جارہی تھی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہمارے نوجوان علماء میں باصلاحیت اور حوصلہ مند افراد کا فقدان تھا بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بحث وتحقیق کے میدانوں میں ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نہیں ہو پارہی تھی، فقہ اکیڈمی کے قیام کا ایک اہم مقصد نوجوان علماء اور اصحاب افتاء کی ایسی نسل تیار کرنا ہے جو سود وزیاں کے مادی حساب سے بلند ہوکر دینی مسائل پر بحث وتحقیق میں اپنے قیمتی اوقات صرف کریں اور اس سفر کی صعوبتیں ان کے حوصلوں کو مہمیز کریں۔

یہ واقعہ ہے کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں خلیج پیدا ہونے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کی کاوشوں اور کوششوں سے پوری طرح واقف نہیں ہے ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہے کہ علماء کو جدید حالات اور زمانہ کی انقلاب انگیز تبدیلیوں کا کوئی علم اور احساس نہیں ہے، جدید مسائل حل کرنے کے لئے ان میں نئی فکر مندی اور تڑپ نہیں ہے، حالانکہ یہ سب باتیں خلاف واقعہ ہیں جو علماء کی علمی وفکری اور تحقیقی جدوجہد ملت کے مسائل کے لئے ان کی فکرودردمندی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اسلامک فقہ اکیڈمی نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو علماء کی حقیقی جدوجہد اور ان کی متنوع صلاحیت سے واقف کرانا چاہا اور انہیں یہ بتانا چاہا کہ ہمارے علماء جدید مسائل پر کتنی گہرائی اور کشادہ قلبی سے کے ساتھ غور فکر کرتے ہیں، نہ وہ اس دور کے مسائل (چیلنجز) سے ناواقف ہیں اور نہ ہی وہ اس سے چشم پوشی کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت صرف شریعت کے محافظ اور نقیب کی ہے، وہ باہر سے آئی

ہوئی ہر چیز کو سند جواز عطا نہیں کر سکتے بلکہ جو چیزیں انسانیت کیلئے نافع ہونے کے ساتھ شریعت کے بنیادی مقاصد و مسائل سے متصادم نہ ہوں گی انہیں کو قابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔

سوال: اکیڈمی نے وقتاً فوقتاً جو سیمینار کیئے ہیں ان میں کون سے قابل ذکر اور اہم فیصلے کیئے گئے؟

جواب: پہلا فقہی سیمینار جامعہ ہمدرد کے کنونشن سینٹر ہمدرد نگر تغلق آباد میں ۱/۲/۳/اپریل ۱۹۷۹ء انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے تعاون سے منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے فرمائی اور افتتاحی خطبہ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے پیش کیا، اس سیمینار میں تین موضوعات زیر بحث آئے۔ مکانوں اور دکانوں کی پگڑی، اعضاء کی پیوند کاری اور ضبط تولید، یہ سیمینار ہندوستان کی تاریخ میں پہلا کامیاب سیمینار تھا، اس میں مختلف مسالک کے علماء کے پہلو بہ پہلو جدید علوم کے ماہرین بڑی تعداد میں موجود تھے، تینوں مسائل کے بارے میں پہلے سے سوال نامے جاری کردے گئے تھے جن کے جوابات مستند علماء اور اصحاب افتاء کی طرف سے آگئے تھے، سیمینار کے موقع پر مسئلہ پر بحث و گفتگو سے پہلے ماہرین کو ان نوعات کی پوری وضاحت کرنے کا موقع دیا گیا، علماء نے بروقت بہت سے سوالات کیئے اور ان کے ماہرین سے ان مسائل کے مختلف گوشوں پر وضاحت طلب کی، میڈیکل سائنس کے جدید ماہرین سماجیات، وکلاء اور قانون داں حضرات نے بھی ان موضوعات کی صحیح تصویر پیش کرنے میں بھرپور مدد دی، اس کے بعد علماء اور فقہاء نے قرآن وسنت، آثار صحابہ، فقہی تصریحات کی روشنی میں ان مسائل پر کھلی بحث کی، ایک دوسرے کے خیالات کا پورا احترام کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پوری صراحت اور جرات کے ساتھ بیان کیا اور سیمینار میں تینوں مسائل کے متعلق اتفاق رائے سے فیصلے کیئے گئے، بعض مسائل کی بعض شقوں کے بارے میں اگر کسی کو اختلاف رہا تو اس کا اختلافی نوٹ شامل کرلیا گیا۔

دوسرا فقہی سیمینار بھی جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال میں ۸/تا ۱۱/دسمبر ۱۹۷۹ء میں ہوا، اس کے بعد چھ سیمینار مختلف مقامات پر منعقد ہوئے، ان سیمیناروں میں زیر بحث آنے والے موضوعات یہ تھے۔

۱۔ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت۔

۲۔ Bank Interest اور سودی لین دین

۳۔ حقوق کی خرید وفروخت

۴۔ اسلامی بینکنگ، مرابحہ

۵۔ دوملکوں کی کرنسی کا زر متبادلہ

۶۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کی شرعی حیثیت

۷۔ ہندوستان کی زمینوں میں عشر وخراج کا مسئلہ

۸۔ زکوۃ کے مختلف جدید مسائل۔ ۹۔ طبی اخلاقیات

۱۰۔ شریعت میں عرف وعادت کا مقام ۱۱۔ نکاح کے وقت لگائی جانیوالی شرطیں۔

سوال: حال ہی میں علی گڑھ میں منعقد ہونے والے سیمینار میں کون سے موضوعات زیر بحث آئے؟

جواب: آٹھویں فقہی سیمینار منعقدہ علی گڑھ میں تین اہم موضوعات زیر بحث آئے، ایک اصولی موضوع عرف و عادت کا ہے، اس ذیل میں اس طرح کے سوالات زیر بحث آئے کہ اسلام کی نگاہ میں کون سا عرف وعادت معتبر ہے اور کون سے معتبر نہیں؟ عرف کے معتبر ہونے کے لئے اس کا کس درجہ عموم اور تعامل مطلوب ہے اگر عرف وعادت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے متعارض ہو تو اس وقت کیا صورت اختیار کی جائے گی اگر عرف اور قیاس میں ٹکراؤ ہو تو کس کو ترجیح دی جائے گی، قدیم فقہاء کی اگر کوئی رائے اپنے زمانہ اور عہد کے عرف کی روشنی میں قائم کی گئی ہو تو موجودہ بدلی ہوئی صورت میں اسی رائے پر قائم رہنا درست ہوگا یا حکم میں تبدیلی واقع ہوگی، علی گڑھ کے سیمینار میں عرف و عادت سے

وابستہ اسی طرح کے بنیادی سوالات کے جوابات متعین کئے گئے سمینار میں شریک علماء اور اصحاب افتاء نے کھلے بحث ومباحثہ کے بعد اتفاق رائے سے اس موضوع کی تجاویز منظور کیں۔ آٹھویں فقہی سمینار کا دوسرا اہم موضوع طبی اخلاقیات تھا، میڈیکل سائنس ایسا علم ہے جو جسم انسانی سے سب سے زیادہ مربوط ہے انسان کے لئے دین وایمان کے بعد صحت وعلاج اور تندرستی سے بڑھ کوئی ضرورت نہیں، علاج ومعالجہ جتنی بڑی انسانی ضرورت ہے اسی نسبت سے معالجین کی ذمہ داری بھی نہایت نازک اور اہم ہے، مریض کے ساتھ حسن سلوک، ہمدردی اور اسکے راز کی حفاظت معالج کے فرائض میں شامل ہے لیکن بعض اوقات مریض کی راز داری، اجتماعی ضرر ونقصان کا باعث بن جاتی ہے، ان حالات میں فقہاء شخصی نقصان وضرر کے مقابلے میں اجتماعی ضرر سے بچنے کو اولیت دیتے ہیں، اس پس منظر میں ایڈز، طاعون اور دوسرے متعدی امراض کے بارے میں معالج، مریض اور سماج کے تئیں پیدا ہونے والے سوالات پر علی گڑھ کے سمینار میں غور وخوض کیا گیا۔

علی گڑھ میں سمینار کے انعقاد سے بڑی سہولت یہ ہوئی کہ میڈیکل سائنس کے بہت سے ماہرین وہاں موجود تھے، اس لئے ان امراض کی نوعیت، ان سے پہونچنے والے نقصانات اور ان امراض کے سماجی اور نفسیاتی اثرات کے سمجھنے میں بہت مدد ملی، طب قدیم اور طب جدید دونوں کے ممتاز ترین افراد سمینار میں موجود تھے، انھوں نے سمینار کی بحثوں میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا، انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ دور حاضر کے علماء اور اصحاب افتاء طبی میدان کے ان سوالات سے نا آشنا نہیں ہیں بلکہ ان مسائل کا پورا شعور رکھنے کے ساتھ ان کے تمام پہلوؤں کا گہرا جائزہ لے کر کتاب وسنت کی رہنمائی میں ان طبی مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں، طبی اخلاقیات کے موضوع پر سمینار میں اٹھائے گئے اکثر سوالات کے بارے میں شرکاء سمینار نے اتفاق رائے سے تجاویز منظور کیں۔

آٹھویں فقہی سمینار میں زیر بحث تیسرا اہم موضوع مشروط نکاح نامہ کا تھا ہندوستان جیسے ممالک جہاں سرکاری طور پر نظام قضا قائم نہیں، نیز مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ

قانون شریعت کو پورے طور پر نافذ کریں ایسے ممالک میں بہت سی معاشرتی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں جس کا سبب اسلامی قانون نہیں بلکہ شریعت کے پورے نظام کے نفاذ وقیام سے محرومی کا نتیجہ ہے، اس پس منظر میں مشروط نکاح اور مشروط مہر وغیرہ کا مسئلہ کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے، کیا شرعا اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ نکاح کے وقت عورت اپنے حقوق کو محفوظ کرنے کے لئے اور شوہر کی امکانی ضرر رسانی سے بچنے کے لئے کچھ شرطیں عائد کرے اگر اس طرح کی شرط نکاح کے وقت لگائی گئی تو شرعا اس کی کیا حیثیت ہوگی اس سلسلہ میں اکیڈمی کی طرف سے جاری کردہ سوالنامہ میں مختلف سوالات اٹھائے گئے تھے جن پر علماء اور اصحاب افتاء نے تحقیقی جوابات اور مقالات لکھ کر اکیڈمی کو ارسال کئے تھے، مشروط نکاح اور مشروط مہر کے موضوع پر سمینار میں گرما گرم بحثیں رہیں۔

شرعا اس طرح کی شرطیں عائد کرنے کے جواز یا عدم جواز سے زیادہ اس پہلو پر گفتگو رہی کہ کیا موجودہ حالات میں اس طرح کے مشروط نکاح کو رواج دینا عورتوں کی کچھ مشکلات کا حل ہے یا اس سے کچھ مزید مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، شرکاء سمینار میں اس بارے میں دو نقطہائے نظر پائے جارہے تھے، سمینار کی کھلی بحثوں میں شرکاء نے پوری آزادی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا، علماء کی ان بحثوں سے سمینار میں موجود ماہرین سماجیات کو اندازہ ہوا کہ دین کا صحیح علم وفہم رکھنے والے فقہاء کی دوررس نگاہ مسئلہ کے کن کن پہلوؤں تک پہونچتی ہے اور کتنی گہرائی سے وہ سماجی مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں، اس موضوع پر بھی علی گڑھ کے سمینار میں تین بنیادی تجاویز اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔

سوال: ان سمیناروں سے کون سے نتائج مرتب ہو رہے ہیں؟

جواب: الحمد للہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمیناروں اور ان میں ہونہار باصلاحیت فضلاء کی ہمت افزائی اور شرکت سے ہمارے نوجوان فضلاء مدارس میں قابل ذکر خوش آئند بیداری پیدا ہوئی ہے ہمارے نوجوان فضلاء مدارس جس عرق ریزی اور محنت سے فقہی موضوعات پر مبسوط اور مدلل مضامین ومقالات لکھ رہے ہیں، ان کوششوں کی ستائش نہ کرنا

ناقدری ہوگی الحمدللہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ان سمیناروں کی برکت سے فضلاء مدارس کے ذوق علم وتحقیق میں جلا پیدا ہوئی ہے، گہرے علمی موضوعات پر دیدہ ریزی اور علمی ریاضت کے ساتھ غور وخوض کرنے اور اپنے نتائج بحث کو قلم بند کرنے کا اچھا رجحان پیدا ہوا ہے، مختلف بڑے دینی مدارس میں فراغت کے بعد نئے فضلاء کو فقہ وافتاء کی تربیت دینے کا نظام قائم ہوا ہے، یہ سب باتیں بہت خوش آئند اور ہمت افزا ہیں لیکن اس سلسلہ میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

سوال: آپ ماشاء اللہ ایک مصنف کے علاوہ ایک معلم بھی ہیں، بانگ درا، کے ذریعہ آپ طالبان علوم نبوت کو کونسا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: مادیت کے جھونکے نے ہمارے مدارس کے ماحول کو بھی مسموم اور پراگندہ کیا ہے، طلباء میں علمی انہماک، یکسوئی، علم کے لئے فنائیت بہت کم ہوگئی ہے مدارس میں وسائل کی فراوانی سے سہولت پسندی اور سطحیت کا رجحان پیدا ہوتا جارہا ہے، ان حالات میں طلباء میں صحیح علمی ذوق، علم دین کے لئے قربانی اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے طلباء کی ذمہ داری ہے کہ حصول علم میں اپنی نیت درست کریں علم دین دنیا کی خاطر حاصل نہ کریں بلکہ اللہ کی رضاء دین پر عمل اور دین کی تبلیغ و دعوت کی نیت سے حاصل کریں، طالب علمی ہی کے دور سے دوسرے مشاغل سے اپنے دل ودماغ کو پراگندہ کرنے کے بجائے پوری یکسوئی کے ساتھ حصول علم میں مشغول ہوں اور پروانہ علم بن کر شمع علم پر نثار ہوں علمی موضوعات پر بحث وتحقیق کے لئے بڑی جانفشانی، شب بیداری، علمی ریاضت ومجاہدہ کی ضروت ہوتی ہے، ہمارے بزرگوں نے علم کیلئے سب کچھ قربان کرکے علم دین کے کارواں کو رواں دواں رکھا ہے اور ہر دور کے نت نئے مسائل کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل تلاش کیا ہے، سلف کی اس روش کو باقی رکھ کر ہی ہم علم کے تیز گام کارواں کی رہبری کرسکتے ہیں اور اسلامی کی ابدیت کو نافعیت کو ثابت کرسکتے ہیں۔

(بانگ درا، دسمبر ۱۹۹۵ء)

تعلیم کو اپنی زندگی کی اساس بنائیں!

رکن تاسیسی ''الامین'' وچیف ایڈیٹر روزنامہ سالار بنگلور

جناب مقصود علی خان سے ایک ملاقات

غار حرا میں قرآن مجید کی جو سب سے پہلی وحی اللہ کے رسول ﷺ پر نازل ہوئی اس کا پہلا لفظ ہی ''اقرأ'' ہے، جس کے معنی ہیں ''پڑھو''، سورہ علق کی پہلی پانچ آیتیں اولین وحی محمدی ہیں جس میں علم اور تعلیم کی اہمیت کو نہ صرف بیان کیا گیا بلکہ اسے اولیت وفوقیت دی گئی...... لیکن یہ صورت حال کس قدر افسوسناک اور کربناک ہے کہ علماء بتاتے ہیں کہ وہ ملت جو اس پیغام کی مخاطب بھی ہے اور اس کی حامل بھی، علم اور تعلیم کے میدان میں اپنی ہمعصر قوموں سے بہت پیچھے ہے ......خود ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں حال یہ ہے کہ گزشتہ برس ایک ٹیم نے صرف ایک صوبہ کے مسلمانوں کا تعلیمی واقتصادی لحاظ سے سروے کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ تعلیمی واقتصادی لحاظ سے جہاں دلت اور عیسائی آج کھڑے ہیں، اس مقام تک پہنچنے کے لئے ہم مسلمانوں کو کم از کم تیس برس درکار ہیں ...... مسلمانوں کی آبادی کا تناسب جس قدر بڑھتا ہے، افسوس کہ تعلیمی گراف (GRAF) گرتا چلا جاتا ہے۔

آزادی کے ان پچاس برسوں میں ملت کو مختلف جذباتی مسائل (ISSUES) میں الجھایا گیا اور اس طرح کوشش کی گئی کہ اس کی توانائیاں

اورصلاحیتیں ''اپنی تعمیر آپ'' کے بجائے اپنے دفاع پرصرف ہوں......لیکن ان سخت دشوار گزار حالات میں بھی اللہ نے ملت کی صفوں میں ایسی دردمند اور بیدارمغز شخصیتیں پیدا کی جنہوں نے یکسو ہو کر ملت کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے مشن کو اپنایا اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ انہوں نے خود بھی محسوس کیا اور ملت کو بھی یہ باور کرانے کی دردمندانہ اور مخلصانہ کوشش کی کہ تعلیم ہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس میں ان کے ہر درد کا توڑ موجود ہے، دین سے غفلت، اقتصادی ابتری اور سیاسی بے وزنی جیسے امراض سے شفا اور نجات اسی راہ سے ممکن ہے......مگر یہ راہ آسان نہیں، یہ چمن بندی کا کام ہے اور چمن بندی کا کام پتہ ماری اور جگر کاوی چاہتا ہے......

خدا کا شکر ہے کہ ملت کا دامن ایسے غیور و دردمند اور حوصلہ مند افراد سے خالی نہیں، اس مختصر مگر زریں فہرست میں ایک ممتاز نام تحریک ''الامین'' بنگلور کے بانی و روح رواں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کا بھی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کے لئے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد معاشی حوصلہ مندی کا بڑا میدان تھا، مگر موصوف نے ملت کی ضرورت کو ذاتی ضرورت پر ترجیح دی! ملت کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی، اس کے اصل روگ کی تشخیص کی، اس کے لئے تعلیم کا نسخہ تجویز کیا اور ''الامین'' کے نام سے اپنے تعلیمی مشن کا آغاز کر دیا درج ذیل انٹریو کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ اخلاص مندی کے ساتھ کئے گئے انسانی فیصلہ میں کس قدر طاقت وقوت اور خیر و برکت پوشیدہ ہے اور کس طرح عزم و ہمت کی بدولت اندھیروں میں امیدوں کے چراغ روشن کئے جاسکتے ہیں۔ بنگلور کی سرزمین پر بے سر و سامانی کے عالم میں PUC کلاسیز کے اجراء سے تحریک الامین کا آغاز ہوا، اور آج وہ ایک ہمہ جہت تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ تعلیم اور

اقتصادیات کے علاوہ خدمت خلق اور صحافت کے مختلف میدانوں میں بھی اس کی خدمات روز روشن کی طرح نمایاں ہیں اور اس طرح تحریک الامین زبان حال سے پکار رہی ہے کہ ملت کو چاہئے کہ وہ اپنی کوششوں اور توانائیوں کا رخ تعلیم کی طرف پھیر دے اور پھر دیکھے کہ کس طرح حالات کا رخ بدلتا اور ان کے حق میں فضا کو سازگار بنا دیتا ہے۔

درج ذیل انٹرویو ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کے رفیق کار جناب مقصود علی خاں صاحب (سابق ایم پی) سے لیا گیا ہے، جناب مقصود علی خاں صاحب تحریک الامین کے تاسیسی رکن ہیں۔ موصوف کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں ضلع بیدر میں ہوئی جو اس وقت کرناٹک میں شامل ہے، نومبر ۱۹۵۶ء جب ریاستی تنظیم جدید ہوئی تو ان کا ضلع ریاست حیدرآباد سے کٹ کر اس وقت کے میسور اسٹیٹ سے جڑ گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی، انٹرمیڈیٹ علی گڑھ سے کیا، B.A مدراس سے کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی سے LLB کی سند حاصل کی......۱۹۵۲ء میں اپنے شہر بیدر میں وکالت شروع کی، ۱۹۵۳ء میں کانگریس سے وابستہ ہوئے، ۱۹۵۵ء میں ڈسٹرکٹ کانگریس بیدر کے سکریٹری بنائے گئے، ۱۹۵۷ء میں کانگریس کی طرف سے اسمبلی سیٹ جیتی اور میسور اسمبلی کے رکن ہوئے، پھر ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں دوبارہ منتخب ہوئے، ۵رسال تک انہیں معدنیات کا قلمدان بحیثیت ڈپٹی منسٹر کے سپرد کیا گیا۔

۱۹۷۲ء میں کرناٹک اسمبلی نے انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا، ۱۹۷۸ء میں پھر راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے......موصوف نے ۱۲ سال پارلیمان میں گزار نے کے بعد سالار اخبار کی ادارت کا فریضہ سنبھالا اور ان دنوں اس کے مدیر اعلیٰ ہیں اور سالار پبلیکیشنز کے صدر بھی......۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء وہ

کرناٹک وقف بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔

تواب پڑھئے تحریک ''الامین'' کے قافلہ سالار ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب اوران کی مساعی جمیلہ کی کہانی مدیر سالار کی زبانی...... جو بتائے گی کہ اپنی ہمسایہ قوموں میں ممتاز مقام حاصل کرنے کی خاطر ملت کو اپنی توانائیوں اور کوششوں کو کون سا رخ دینا چاہیے اور اپنے لئے کون سی سمت سفر متعین کرنا چاہیے۔

سوال۔تحریک ''الامین'' بنگلور کے قیام کا پس منظر کیا ہے؟ کن مقاصد کے تحت اس کی تاسیس عمل میں آئی؟ اپنے مقاصد میں وہ کس حد تک کامیاب ہے اور آئندہ اس کے پیش نظر کون سے منصوبے ہیں۔

جواب۔یاد آتا ہے کہ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب نے ''الامین'' تحریک کی بنا ڈالی جمشید پور میں پھوٹ پڑنے والے ہندومسلم فسادات کا موصوف کی طبیعت پر بڑا گہرا تاثر تھا، نہایت غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کا حل یہ ہے کہ ملت تعلیم کو اپنی زندگی کی اساس بنائے، اپنی فکر اور توانائیوں کو تعلیمی سرگرمیوں پر مرکوز کرے تاکہ ان کی نسلیں زیور علم سے آراستہ ہوں اور اس طرح آنے والے برسوں میں وہ آبرومندانہ زندگی جینے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔تعلیمی مشن کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام کرنا چاہا۔اس کام کے لئے کسی نام کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے اس کے لئے ''الامین'' نام تجویز فرمایا۔گویا نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف اس تحریک کا انتساب کیا گیا تاکہ اس مبارک نام کی برکتیں حاصل ہوں اور اس بابرکت نام کی بدولت تائید الٰہی شامل حال رہے۔

۱۹۶۴ء میں کالج کے ابتدائی درجات (Classes) کے اجراء سے اس کام کا آغاز کیا گیا۔ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہمارے طلباء کسی طرح میٹرک ہو جاتے ہیں لیکن پروفیشنل اور ٹیکنیکل کورسز میں انہیں داخلے نہیں مل پاتے اس لئے انہوں نے PUC

کورسیز کے اجراء کا فیصلہ کیا، بنگلور میں ایک جگہ حاصل کی، کھلی جگہ میں Shed بنوائے اور وہیں کلاسیز شروع کر دیں چند سال میں یہ کام آگے بڑھا، مسلمانوں نے اسے مستحسن نگاہوں سے دیکھا اس کی قدر کی جس سے الامین کی اس تعلیمی تحریک کو حوصلہ ملا۔

الامین تحریک کی تعلیمی سرگرمیوں کا تذکرہ ہو رہا تھا اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے PUC کلاسیز سے اس کا آغاز کیا پھر اس کو ڈگری کالج بنایا، اس کے ساتھ ابتدائی تعلیم کی بھی فکر کی اور پرائمری سے لے کر ہائی اسکول تک کی تعلیم کا نظم کر دیا۔اس طرح تعلیم کا ایک جال بچھا دینے کی کوشش کی، آج 'الامین' کے ایک سو پرائمری اسکولز ڈیڑھ سو سے زائد کے جی و دوسرے درجات ہیں۔اسی طرح اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی ''الامین'' کے ماتحت ادارے قائم ہیں جن میں سے ایک گوشہ انجینئرنگ کالج ہے جو بنگلور سے ۳۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر رام نگرم کے مقام پر واقع ہے اور الحمد للہ اعلیٰ معیار کا حامل ہے، اپنے اسٹاف اور اساتذہ کے لحاظ سے بھی اور اپنی عمارتوں اور آلات و دیگر وسائل کے لحاظ سے بھی، لڑکیوں کے لئے غوثیہ پالی ٹیکنک قائم کیا گیا، اس میں طالبات کی حرفتی تعلیم ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ایک کارنامہ جسے بجا طور پر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کا ممتاز کارنامہ کہا جاسکتا ہے وہ ہے بیجاپور کا الامین میڈیکل کالج، بیجاپور جو ایک زمانہ میں عادل شاہی حکومت کا پایہ تخت تھا......الامین میڈیکل کالج کے ساتھ ایک الامین ڈینٹل کالج بھی چل رہا ہے، جس میں نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں کے طلباء زیر تعلیم ہیں بلکہ غیر ملکی طلباء بھی وہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اگر چہ ان کی تعداد کم ہے، اب تک چار سو سے زائد طلباء یہاں سے ڈاکٹر بن کر فارغ ہو چکے ہیں اور ان میں سے بعض نے تو امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اسی طرح معاشی اسکیموں میں ایک غیر سودی بینک کاری اسکیم ہے۔اس ادارہ کا نام AIFIC یعنی AL-AMIN ISLAMIC FINANCE & INVESTMENT CORPORATION ہے۔اس میں تقریباً دس بارہ کروڑ کے ڈپازٹس جمع ہیں......اس کے تحت اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کو قرضہ جات فراہم کئے جائیں جن

کے پاس کوئی صنعتی اسکیم ہو۔ ادارہ اس اسکیم پر ہر پہلو سے غور کرتا ہے اور جب یہ اطمینان کر لیتا ہے کہ اس اسکیم یا پروجیکٹ سے قابل لحاظ منافع کی امید ہے، تو اس کے لئے قرض کی منظوری دے دی جاتی ہے۔

تعلیمی، معاشی اور صنعتی میدانوں کے علاوہ ''الامین'' کے دائرہ کار میں صحت عامہ بھی شامل ہے، بنگلور میں الامین میڈیکل ہاسپٹل ہے جو سو بستروں پر مشتمل ہے اور اس میں اچھے اور باصلاحیت ڈاکٹر برسرکار ہیں...... میٹرنٹی ہوم، زچگی خانوں کا بھی الامین نے نظم کیا ہے، چنانچہ اس کے تحت بنگلور، بیدر اور گلبرگہ میں میٹرنٹی ہوم چل رہے ہیں...... مسلمان پردہ نشین خواتین کے باسہولت علاج کی غرض سے یہ میٹرنٹی ہوم قائم کئے گئے ہیں، جن کو لیڈیز ڈاکٹرس کی خدمات بھی حاصل ہیں...... بیجاپور میں الامین میڈیکل کالج سے ملحق الامین ہاسپٹل بھی قائم کیا جارہا ہے، اس کا کام چل رہا ہے، انشاء اللہ یہ ایک ہزار بستروں پر مشتمل ایک معیاری ہاسپٹل ہوگا، یہ ۴۰ کروڑ کا پروجیکٹ ہے...... اس ہاسپٹل سے نہ صرف عوام کو فائدہ پہنچے گا بلکہ الامین میڈیکل کالج میں زیر تعلیم طلباء کی بھی ضرورت پوری ہوگی اور اس طرح نظریاتی تعلیم کے ساتھ عملی تعلیم (PRACTICALS) کا بھی نظم ہو سکے گا۔ حکومت کے قوانین بھی کچھ اس قسم کے ہیں کہ میڈیکل کالج سے ایک اسپتال بھی ملحق ہو، الامین ہاسپٹل سے انشاء اللہ یہ ضرورت بھی پوری ہو سکے گی۔

الامین ایجوکیشن سوسائٹی کا کام بڑا منظم ہے۔ اس کے اراکین عاملہ کی تعداد تقریبا ۲۵ ہے، ہر مہینہ اس کا اجلاس ہوتا ہے، حسابات پیش کئے جاتے ہیں، اس کی منظوری دی جاتی ہے اور ضروری امور پر گفتگو ہوتی ہے اس کے علاوہ اس کا سالانہ اجلاس بھی منعقد ہوتا ہے جس میں آئندہ کے منصوبوں پر غور کیا جاتا ہے...... الامین ایجوکیشن سوسائٹی اس کوشش میں ہے کہ وہ ایک ایسا دس سالہ یا بیس سالہ طویل المدتی منصوبہ مرتب کرے کہ جس کا نشانہ یہ ہو کہ انشاء اللہ ۲۰۲۰ء تک ہمارا کوئی مسلم نوجوان ایسا باقی نہ رہ پائے جو زیور علم سے آراستہ نہ ہو اور اس طرح مسلم تعلیم یافتہ نوجوان عملی میدان میں اپنی افادیت و نافعیت

ثابت کر سکیں اور مقابلہ کی اس دنیا میں مستعدی و دانش مندی کا ثبوت دے سکیں۔ مقابلہ کی دنیا کے لئے اس طرز کی نہایت منظم و مرتب منصوبہ بندی کی شدید ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ممتاز صاحب اور ان کے ساتھیوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب تک ایک تحریک اپنا ترجمان (ORGAN) نہیں رکھتی، وہ بے آواز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے ۱۹۷۹ء میں ''سالار'' اخبار خریدا اور اس کو نہ صرف اپنی تحریک کا ترجمان بنایا بلکہ مسلمانوں کے احساسات و جذبات کا بھی ترجمان بنانے کی کوشش کی...... اس غرض کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کا نام ''سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ'' SALAR PUBLICATIONS TRUST ہے۔ یہ ایک خیراتی ٹرسٹ (CHARITABLE TRUST) ہے جو کمپنی لاء اور انکم ٹیکس کے قوانین کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ روزنامہ سالار اس وقت کرناٹک کے مسلمانوں کا مقبول ترقیاتی روزنامہ ہے۔

سوال: شمالی ہندوستان کے مقابلہ جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی عصری لحاظ سے تعلیمی اور ساتھ ہی اقتصادی حالت بھی قدرے بہتر ہے، آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟

جواب: شمالی ہندوستان دراصل ۴۷ء کے بعد جن ہنگامہ آرائیوں، مشکلوں، مصیبتوں اور خون ریزیوں سے گزرا ہے، اس نے یہاں کے مسلمانوں کے لئے بالکل ایک الگ صورت حال پیدا کر دی اس کے مقابلے میں ان کے حالات قدرے بہتر رہے اور وہاں کے حالات و واقعات جو انسانی زندگی کو مفلوج و ماؤف کر دیں، رونما نہیں ہوئے۔ اسکے علاوہ ایک بات یہ ہوئی کہ جنوب میں جو بھی حکومتیں رہیں، کانگریسی، حکومت رہی ہوں یا غیر کانگریسی ان سب نے مسلمانوں کے معاملات کا تھوڑا بہت خیال ضرور رکھا، ان حالات میں جنوب کے مسلمانوں کے لئے کام کرنا آسان تھا اور آج بھی الحمدللہ آسان ہے۔

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جنوب کا مسلمان تجارت اور تعلیم میں شمال کے مسلمانوں سے ہمیشہ ہی آگے رہا، وہاں چونکہ زمین داریاں اور جاگیرداریاں نہیں رہیں جیسا کہ شمال میں

تھیں، اس لئے مسلمان زیادہ تر تجارت کی لائن میں آ گئے، اور الحمدللہ ترقی بھی کی۔

ایک سوال جو عام طور پر ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی لیڈر شپ کہاں ہے؟ یہ سوال ہر میدان عمل کے متعلق ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ لیڈر شپ کے بغیر کوئی کام ہو نہیں پاتا۔

شمال کا جہاں تک سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی مسائل کی حد تک ان کے لئے ضروری ہے کہ کچھ ایسی مقامی تنظیمیں ہوں جو ابھریں اور اسکولوں کا ایک جال پھیلاتے چلے جائیں، جیسے جیسے کام کی رفتار بڑھتی جائے گی، علاقائی توسیع بھی عمل میں آتی جائے گی اور پھر ایک سے دس، دس سے بیس، بیس سے پچاس اور پچاس سے سو تعلیمی ادارے اسکول و کالجز، منظم طور پر کام کرنے کے نتیجے میں دس پندرہ سال میں قائم ہو جائیں گے۔

کسی جماعت کی تنظیم میں اور اس کی کامیابی میں قیادت یا لیڈر شپ کا اہم کردار ضرور ہے لیکن جب تک اس لیڈر شپ کے پیچھے اطاعت کی کارفرمائی نہ ہو، لیڈر شپ بے نتیجہ اور بے کار ہے، شمالی ہند کی سر زمین میں ایسے سپوت ابھرتے ہیں جن کو اللہ نے قیادت کی صلاحیت تو دی ہے لیکن عام لوگوں کو اطاعت کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے......جنوبی ہند میں معاملہ دوسرا ہے وہاں ہر ایک میں اطاعت کی صلاحیت رکھ دی ہے اور قیادت کا طرۂ امتیاز چند ہی کو بخشا ہے۔

سوال: میڈیا کے میدان میں اردو کہاں کھڑی ہے؟ اس میدان میں اردو کو مقام دلانے کے لئے ہم اردو والوں کو کیا کرنا ہوگا؟

جواب: میڈیا کے میدان میں دراصل اردو کا کوئی مقام ہی نہیں ہے، اردو بے یار و مدد گار ہے آگے کی طرف نگاہ کرنے سے قاصر ہے اور حال سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے، اصل میں میڈیا آج کل ایک بڑا تجارتی اکھاڑہ بن گیا ہے، کروڑ پتیوں کی دال نہیں گلتی بلکہ یہاں تو ارب پتی چاہئیں اور وہ بھی ہندوستانی سکہ میں نہیں بلکہ ڈالر میں......اس وقت میڈیا کے تین شعبے ہیں:

(۱) PRINTED MEDIA یعنی تحریری ذریعہ ابلاغ (۲) AUDIO MEDIA یعنی صوتی ذریعہ ابلاغ اور (۳) AUDIO VISUAL یعنی صوتی و نظری ذریعہ ابلاغ مثلاً ٹی وی وغیرہ۔

ان تینوں میدانوں میں اردو میڈیا کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک بڑی دشواری ہمارے لئے یہ ہے کہ اگر ہم PRINTED MEDIA ہی کو لے کر چلیں تو اس کے لئے بھی باصلاحیت کارکن نہیں ملتے......نہ تو پیشہ ورانہ صلاحیت کے رپورٹر ہمیں ملتے ہیں اور نہ SUB EDITORS......مضامین کا جو تنوع انگریزی یا پھر ہندی طباعتی میڈیا میں ہے وہ اردو میں ناپید ہے، مشاہدہ اگر آپ کو کرنا ہو تو کسی دن کے بھی انگریزی، ہندی اور اردو اخبار ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھ لیں ہمارا اردو اخبار چار چھ صفحہ کا ہوتا ہے جب کہ انگریزی ۲۴ اور ۳۶ صفحات کا، ہمارے اردو اخبارات میں UNI یا PTI کی خبریں تو مل جائیں گی لیکن ایسی خبریں جو STAFF REPORTERS سے پہنچتی ہیں یا بڑے بڑے سیاست دانوں، اہل معاملہ، صنعت کاروں، سوسائٹیوں اور ٹریڈ یونینوں سے حاصل ہوتی ہیں، وہ ہمیں نہیں مل سکتیں، وجہ یہ ہے کہ ہمارے رپورٹر ان تک پہنچ نہیں پاتے، موجودہ دنیا کے وسیع شعبہ جاتی علوم و فنون سے انہیں ذرا بھی مس نہیں ہے، جب ان باتوں کی فہم ہی نہ ہو تو پھر ان باتوں پر رپورٹیں کیسی!......نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے اخباروں میں مضامین کی ایک بوچھار ہے اور مضامین کا ایک تنوع ہے، VARIETY ہے جو اردو اخباروں میں نہیں ہے سوائے اس کے کہ سیاسی معاملات کی ہم تھوڑی بہت رپورٹنگ کر لیتے ہیں، آپ کو ہمارے اردو اخبارات میں مسائل پر بحثیں دیکھنے اور پڑھنے کو کم ملیں گی۔

جب PRINTED MEDIA کا یہ حال ہو تو پھر TV وغیرہ پر ہم کیسے نظر آ سکتے ہیں، آج انگریزی میڈیا دنیا کے انٹرنیٹ پر چھایا ہوا ہے، اس میڈیا میں کہیں بھی اردو کا گزر نہیں ہوا ہے، یہ بہرحال ایک ایسا معلوماتی گھاٹا ہے جو اردو کے پڑھنے والے برداشت کرتے رہیں گے، بین الاقوامی سطح پر اردو کے NRI (NON-RESIDENT INDIANS) پر

ستار اور حکومتوں سے تعاون حاصل کرنے والے ادارے ہی اس مسئلہ کا حل اور علاج ڈھونڈ سکتے ہیں۔اس وقت تمام اخبارات بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کے ہاتھ میں ہے جسے ہم Business Houses کہتے ہیں،اردو اخبارات کو ایسے ہمدرد نہیں ملے جو اس کی پشت پناہی کرسکیں مالی وسائل اور اقتصادی سہارا نہ ملنے کی وجہ سے بھی اردو میڈیا کسمپرسی کے عالم میں ہے۔

سوال: بانی تحریک ممتاز احمد خاں صاحب سے متعلق کچھ باتیں؟

جواب: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کے دل میں اللہ نے الامین تحریک کا خیال پیدا کیا اور بے پناہ جذبہ بھی انہیں عطا کیا۔ڈاکٹر ممتاز خاں کی عمر اس وقت ۶۰ سال ہے، تحریک جب ۶۴ء میں شروع ہوئی ان کی عمر ۲۷ سال تھی موصوف نے مدراس یونیورسٹی سے MBBS کر لیا تھا،وہ اپنا کلنک (CLINIC) بنگلور میں قائم کرنا چاہتے تھے لیکن حالات سے مجبور ہوکر انہوں نے پریکٹس کرنے کے لئے تعلیمی مشن کے لئے خود کو وقف کر دیا،یہ واقعہ ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا،پیدائش مدراس کے ایک صوبہ Trichnapalli میں ہوئی تھی،MBBS کے بعد وہ بنگلور پہنچ گئے،چنانچہ اس تحریک نے ان کے پیر بنگلور میں جمادئے اور اس طرح وہ یہیں کے ہو رہے۔ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں مستعدی ہے،ان میں فیصلے کی بے پناہ قوت ہے،وہ ایک بات جب سوچ لیتے ہیں تو اس کو ہر صورت میں پایہ تکمیل کو پہنچانا چاہتے ہیں،وہ یہ کہتے ہیں کہ بس یہ کرنا ہے، مجھے یہ ہدایت ملی ہے،ان کی گفتگو میں لفظ 'ہدایت' کا استعمال آپ زیادہ پائیں گیا،اللہ نے یہ بات دل میں ڈال دی ہے،اب اسے بہر حال پورا کرنا ہے،ابتدا سے انہوں نے بڑی تکلیفیں پائیں،ہم خیال لوگوں کو جمع کیا،خود سب سے زیادہ محنت کرتے رہے،شروع میں مالی حالت غضب کی تھیں،چندوں کی ابتداء ۴ آنے اور روپیہ سے ہوئی،جو بعد میں چل کر ہزاروں لاکھوں تک پہنچ گئی،انہوں نے اپنی قوم میں اپنے مخلصانہ عمل کی بدولت وفاداری کی ساکھ بڑھا دی،لوگ ان پر اور ان کے باتوں پر اعتماد کرنے لگے،شکایات تو ہوتی رہتی تھیں

اور آج بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ لوگ وضاحت سن لیتے ہیں تو ہٹ دھرمی نہیں کرتے ، مان لیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے سامنے جو بنیادی نکتہ اور Motto ہے، وہ یہی ہے کہ ''کوئی مسلمان لڑکا صلاحیت رکھنے کے باوجود محض مالی مشکلات کی وجہ سے ان پڑھ نہ رہ جائے'' اس مقصد کے تحت انہوں نے وظائف (SCHOLARSHIPS) کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے،اس سال الامین اسکالرشپ سوسائٹی کے تحت تقریبا ۲۰ لاکھ روپے کے تعلیمی وظائف دئے گئے۔غرض ڈاکٹر ممتاز خاں صاحب نے مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی،اور معاشرتی ترقیات کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ایک مخلص اور ہمدرد قوم قائد کرسکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے کام کرنے کا ایک عملی اور کارآمد طریقہ یہ ہے کہ الامین تحریک کے جو مختلف ادارے ہیں،وہ تمام الگ الگ سوسائٹیوں اور Trusts کے تابع ہیں اور ہر ادارہ بڑی حد تک خودمختار ہے،اس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو کام کرنے میں آسانی ہوئی۔تعلیمی اور بینک کاری کے محکمہ الحاج رحمٰن صاحب (M.P) کے تحت ہیں،اخبارات میرے تحت ہیں،انجینئرنگ کالج جناب زاہد اللہ مکی ایڈوکیٹ کے تحت ہیں اور میڈیکل کالج اور اسپتال ڈاکٹر ممتاز صاحب کے تحت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ٹیم میں تعلیم یافتہ نوجوان شامل ہیں،اس میں چند بڑے بڑے ویاپاری اور چند حکومتی محکموں کے سابق عہدے دار ہیں گویا ایک ایسا تال میل مختلف اداروں کے مابین قائم رکھا گیا ہے کہ ہر ادارہ دیگر اداروں کے صدور کی ہمدردی اور رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کام کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

(ماہنامہ بانگ حراء: جنوری،فروری ۱۹۹۹ء)

سید احمد شہیدؒ کی طرف نسبت تحریکی نسبت ہے!

بانی وصدر جمعیت شباب اسلام

مولانا سید سلمان الحسینی ندوی سے ایک ملاقات

مولانا سید سلیمان الحسینی ندوی ایک معروف شخصیت کے مالک ہیں،ان کو دیکھ کر جوش کا مصرع یاد آتا ہے ع میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب ......مولانا اپنے نوجوانوں کو شاہین صفت دیکھنا چاہتے ہیں،اسی لئے انہوں نے جمعیت شباب الاسلام کی بنیاد رکھی،اب جمعیت کے تحت ماشاء اللہ بہت سے کام ہو رہے ہیں، جمعیت کیا ہے؟اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں،اوراس کی بنیاد رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟اس کو جاننے کے لئے پڑھیے درج ذیل انٹرویو۔

س جمعیت شباب اسلام کے قیام کا پس منظر کیا تھا؟ کن مقاصد کے تحت جمعیت کا قیام عمل میں آیا؟ ملک میں موجود مختلف تنظیموں اور جماعتوں کے باوجود آپ کو جمعیت کے قیام کی ضرورت کیوں کر محسوس ہوئی؟ وہ کون سے مقاصد ہو سکتے تھے جو جمعیت کو دوسری جماعتوں سے ممتاز وممیّز کرتے ہیں؟ تقریبا دو دہائیوں کے عرصہ میں آپ ان مقاصد میں کس حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئے؟

ج (الف) جمعیت شباب الاسلام کا قیام ۱۹۷۴ء میں ہوا تھا،اس وقت میرے علم میں کلکتہ میں ایک تنظیم M.S.A (مسلم اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن) کے نام سے تھی،اس وقت ہم لوگ دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجہ عالیت کے طالب علم تھے، دار العلوم

کے دینی ماحول،حضرت مولانا دامت برکاتہم کی پر جوش دعوتی تقاریر اور دعوت وتبلیغ کے کام سے متاثر ہو کر اس شدید احساس کے نتیجہ میں انجمن شباب الاسلام قائم کی گئی کہ نوجوانوں کی طرف سے کوئی دعوتی تعلیمی وتربیتی تنظیم کام نہیں کر رہی ہے، ہم لوگوں نے آخر کس لئے دینی علوم کی تحصیل کی ہے، کیا ہم پر یہ فرض نہیں کہ ہم جو کچھ پڑھیں اس کی دعوت دیں۔

(ب) جمعیت کے بنیادی مقاصد

سوال ایک کے جواب سے کسی حد تک واضح ہو ہی گئے ہیں، مسلم نوجوانوں کو دین سے وابستہ کرنے کے لئے ہمہ جہتی کوشش، نوجوانوں کو اپنے بڑوں اور بزرگوں سے جوڑنا، قرآن وسنت کی ان کے درمیان ترویج کرنا، مدرسہ اور کالج کے طلباء کی خلیج کو پاٹنا، ہندوستان میں خاص طور پر دیومالائی تصورات اور اسلامی تشخص کے بارے میں بتدریج پیدا ہونے والی بے حسی اور بے عملی سے تحفظ کی کوشش کرنا، اور مختلف دینی کاموں میں ربط پیدا کرنا وغیرہ۔

(ج) جمعیت کے قیام کے وقت نوجوانوں میں کام کرنے والی کوئی تنظیم معروف نہیں تھی۔ ہندوستان میں اپنے علم کی حد تک مسلم نوجوانوں کی یہ پہلی تنظیم تھی، اس لئے معاملہ امتیاز وانفرادیت کا درپیش ہی نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود آج تک جو بات اس کو دیگر بعد میں وجود میں آنے والی تنظیموں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا زیادہ تر تعلق دینی مدارس سے تھا اور انہیں اپنے بزرگوں اور ان کے کاموں سے مربوط کر کے سکنڈ لائن تیار کرنا مقصود تھا تا کہ اسلام کے صحیح سرچشموں قرآن وسنت کی روشنی میں افراط وتفریط سے پاک رہ کر اور مظاہروں اور نعروں سے بچتے ہوئے ٹھوس بنیادوں پر ملت اسلامیہ کو نوجوان داعی فراہم کئے جائیں، اور

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

پر عمل پیرا ہو کر دعوت وتربیت کے تسلسل کو برقرار رکھا جائے۔ بزرگوں پر تنقید، بے جا جوش، صلاحیت اور وسائل سے زیادہ دعوت اور نعرے اور اساسی طریقہ ہائے کار سے

گریز جمعیت کا شروع سے عمل رہا، اس سب کے ساتھ جمعیت کے پیش نظر ہمیشہ یہ رہا کہ متوازن تربیت کا اہتمام ہو، عام طور پر اسلام کے ظاہری پہلوؤں اس کے غلبہ اور اس کے مشن پر زور بہت دیا جاتا ہے۔ لیکن تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن، عبادت، ذکر و دعا اور مناجات وغیرہ سے غفلت ہوتی ہے۔

(د) جہاں تک مقاصد جمعیت میں کامیابی کا تعلق ہے، تو الحمد للہ اللہ تعالی کا بڑا ہی فضل شامل حال رہا۔ دینی مدارس کے طلباء اور بہت سے مدرسین جمعیت کے تربیتی کیمپوں میں شریک ہو کر بہت سے پہلوؤں سے مستفید ہوئے، مساجد میں جہاں جمعہ کا صرف رسمی خطبہ ہوتا تھا، اصلاحی تقاریر کا بھی انتظام ہوا۔ بہت سی مساجد میں درس قرآن کے حلقے قائم ہوتے۔ عوامی جلسوں اور پروگراموں میں طلباء اور مدرسین کی مسلسل شرکت سے ایسے حلقوں میں کام کرنے والی پوری کھیپ تیار ہوگئی، تحاکم الی اللہ والرسول اسلامی بنیادوں پر فیصلے کی پرزور دعوت نے دارالقضاء کی شکل اختیار کرلی، اور کئی اضلاع میں جمعیت نے دارالقضاء قائم کئے، ہندوستان کے تقریبا تمام مدارس میں ان مقاصد کی دعوت دی گئی ہر جگہ پذیرائی ہوئی، مدارس کے طلباء میں دعوتی اور تحریکی رخ متعین کرنے میں بڑی مدد ملی، جمعیت کے پلیٹ فارم سے بڑی عالمی جماعتوں کی صفوں میں نقطہائے وحدت نہ صرف تلاش کئے گئے، بلکہ الحمد للہ اس رخ پر بڑی پیش رفت ہوئی۔ تعلیم وتربیت کے میدان میں بہت سے اصلاحی پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا گیا، نصاب میں ترمیمات کی گئیں، نوجوانوں کو رفاہی کاموں کی طرف متوجہ کیا گیا اور ۱۹۷۲ء سے اس وقت تک جب کہ ایک بھی نوجوان تنظیم موجود نہیں تھی۔ جمعیت کے نمونے اور کارکردگی کی بنیاد پر اور اس کی روشنی میں مختلف صوبوں، اضلاع اور شہروں میں نوجوانوں کی بیسیوں تنظیمیں اور انجمنیں قائم ہوگئیں، جن کے جمعیت سے برادرانہ روابط ہیں۔

جمعیت نے تعلیم وتربیت، دعوت اور رفاہی کاموں کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ دعوتی میدان میں، دوروں، خطابات، اور نشر واشاعت کے ذرائع سے کام لیا جاتا ہے، الحمد للہ ہندوستان

کا کوئی قابل ذکر حلقہ ایسا نہیں ہوگا جہاں اس کی دعوت نہ پہونچ چکی ہو۔

تربیتی مقاصد کے لئے ماہانہ سالانہ کیمپس منعقد کئے جاتے ہیں، جن سے فکر سازی، جسمانی اور روحانی متوازن تربیت کی کوشش کی جاتی ہے، جس علاقہ میں کیمپ منعقد ہوتا ہے، اس علاقہ کے لئے وہ دعوت دین کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور اس کے سامنے ایک متوازن تربیت کا نظام بھی پیش کرتا ہے۔

تعلیمی میدان میں اس نقطہ نظر کے ساتھ کہ تعلیم میں وحدت ہونی چاہئے اور ہر علم کو ''اسم الرب'' سے مربوط کردینا چاہئے، یعنی ہر علم کو اسلامی شریعت کی روشنی میں سیکھنا چاہئے۔ جمعیت نے کئی مدارس اور اسکولز قائم کئے ہیں اور تعلیم کے اس نقطہ نظر کو زبان، قلم عملی شرکت اور مشوروں کے ذریعہ بہت سے اداروں تک منتقل بھی کیا گیا ہے۔

رفاہی کاموں میں غرباء ومساکین کی امداد، امداد بیوگان کے علاوہ طبی کیمپس، نرسنگ ہوم کا قیام، اور بیت المال کی خدمت ہیں۔

س...... جمعیت کا ایک مرکزی ادارہ جامعہ سید احمد شہید ہے۔ یہ جامعہ ملک کے طول وعرض میں موجود مدارس عربیہ میں محض ایک اضافہ ہے یا اس کے ذریعہ آپ کے پیش نظر ملت کو ایک انقلابی نظام تعلیم وتربیت سے آشنا کرنا ہے؟ جامعہ کو حضرت سید احمد شہید کے نام نامی سے منسوب کرنے میں بھی کیا آپ کے پیش نظر کوئی معنویت ہے اور اس میں اور مقاصد جامعہ میں کیا کوئی ہم آہنگی بھی ہے؟ آپ کے ذہن میں نصاب ونظام تعلیم کا وہ کون سا خاکہ ہے جس کے ذریعہ ''شاہین بچوں کو بال وپر'' نصیب ہوسکتے ہیں اور یہ کہ آپ کے خوابوں کا جامعہ کیا اور کیسا ہے؟

ج...... جامعہ سید احمد شہیدؒ مدارس کی فہرست میں بس ایک اضافہ نہیں ہے، ہندوستان میں عام طور پر جامعہ کا لفظ مدرسہ کے لئے بولا جاتا ہے مدرسہ ابتدائی ہو یا ثانوی یا عالمی، سب کو جامعہ کہہ دیتے ہیں۔

جامعہ سید احمد شہیدؒ کا منصوبہ صرف ایک مدرسہ کا نہیں ہے بلکہ اس کا منصوبہ ایک

اسلامک یونیورسٹی کا ہے، اس میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم اور شعبہ حفظ تو رہیں گے، لیکن جامعہ کے مرحلہ کی تشکیل کلیۃ الشریعہ، معہد اللغات، (شریعت کالج، شعبہ السنہ) فیکلٹی آف سائنس، طبیہ کالج اور ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ وغیرہ سے ہوگی۔

لیکن یونیورسٹیز کے طرز پر صرف چند کلیات کا یہ مجموعہ نہ ہوگا، بلکہ اس کا تصور ''جامعہ'' جامعۃ الرسول ﷺ سے ماخوذ ہے اور اس کا شعار یہ آیت کریمہ ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

ایسے کسی جامعہ کا نقطہ نظر پیش کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اس کا عملاً وجود میں لانا بہت مشکل کام ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو چیز موجود ہوتی ہے اس کی نقل آسان ہوتی ہے، اس کے افراد مل جاتے ہیں، لیکن جو چیز مطلوب ہوتی ہے، اس میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور اس کے افراد تیار نہیں مل پاتے۔

حضرت سید احمد شہید کی طرف جامعہ کی نسبت محض برائے انتساب وتبرک نہیں ہے، بلکہ یہ تحریکی نسبت ہے، ہم سمجھتے ہیں اس برصغیر میں ایسی جامع، متوازن اور اسلام کی نمائندہ تحریک اور کوئی نہیں گزری، ہمارے نزدیک اس کی جامعیت وتوازن کی اس دور کو شدید ضرورت ہے۔

ہمارے ذہن میں نظام تعلیم ونصاب تعلیم کا جو خاکہ ہے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی غیر شائع شدہ کتاب ''ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو'' میں بیان کر دیا ہے جس کا ایک بڑا حصہ قسط وار بانگ درا میں شائع ہو چکا ہے، اس کی اساس وہی ہے جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔

یہ جامعہ میرے خوابوں کا جامعہ نہیں ہے، میری بیداری کا جامعہ ہے، اللہ تعالی سے دعا کریں کہ وہ پایہ تکمیل کو پہونچے۔

س...... بات جامعہ کی اور نصاب تعلیم اور نظام تربیت کی چلی ہے تو یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ برصغیر ہند وپاک کے مدارس، ان کے طریقہ کار اور ان کے قابل قدر کوششوں کے نتائج کے تعلق سے آپ کی رائے کیا ہے۔ اور آپ کے نزدیک ان سب کو کیسا ہونا چاہئے؟

ج...... برصغیر ہند وپاک کے مدارس کی قابل قدر اور تابناک خدمات ہیں اب یہ دیکھنا چاہئے کہ آج بھی کیا وہی خدمات انجام دی جارہی ہیں اور ویسے ہی افراد نکل رہے ہیں جیسے نکلنے چاہئیں اگر نہیں تو اس ماضی کی طرف لوٹنا چاہئے جو زیادہ فعال اور موثر تھا۔

تحریکیں اٹھتی ہیں، بڑے مقاصد لے کر اٹھتی ہیں، کبھی کامیاب ہوتی ہیں، کبھی ناکام، کبھی جزوی کامیاب، میں سمجھتا ہوں کہ مدارس کی تحریکات کا بھی یہی حال رہا، اور زیادہ تر جزوی کامیابی ہوئی، ضرورت ہے کہ جو خلا رہ گئے ہیں انہیں پر کیا جائے۔

س...... حراء نرسری اسکول کے تحت عصری تعلیم کا ایک سلسلہ آپ کی جمعیت نے شروع کیا ہے...... عصری تعلیم کے لئے آپ کے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟ کیا مستقبل قریب میں عصری تعلیم کے لئے اقامتی اسکول وکالجز کا قیام بھی آپ کے منصوبہ میں شامل ہے؟ عصری تعلیم گاہوں کو اسلامی خطوط پر چلانے اور ان اسکول اور کالجز کو نہایت معیاری بنانے کے لئے کون سے ٹھوس منصوبے آپ کے پیش نظر ہیں؟ علاوہ ازیں دینی تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے مابین پائی جانے والی خلیج کو پاٹنے کے لئے جمعیت نے کیا پیش رفت کی ہے؟۔

ج...... میرے نزدیک عصری اور قدیم تعلیم میں دوئی اور ثنویت نہیں ہونی چاہئے، لیکن لمبے فاصلوں کے بعد ایک دم سے قربت بھی مشکل ہے، جب تک وحدت کا دور نہ آئے، اس وقت تک عصری اسکولوں کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بچوں کو غیر اسلامی اسکولوں کے اثرات سے بچایا جائے اور ان کو عصری علوم اسلامی ماحول میں فراہم کئے جائیں۔ انشاء اللہ اقامتی عصری ادارے بھی قائم کئے جائیں گے۔

معیاری اسکول کے لئے مختصراً طریقہ کار یہ ہے کہ جس اسکول کو سب سے زیادہ معیاری سمجھا جارہا ہے اس کا نمونہ اسلام کے لئے اختیار کرلیا جائے ''الحکمة ضالة

المومن انی وجدها فهو احق بها''

ہر دانشمندی کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے، ہاں خلاف شریعت بات حکمت نہیں ہے۔

قدیم وجدید طبقہ کے درمیان کی خلیج کو پاٹنا تو جمعیت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے، الحمدللہ جمعیت اس میدان میں پوری طرح کامیاب ہے، کمیت کے اعتبار سے نہیں کہہ رہا ہوں، کیفیت کے پہلو سے عرض کررہا ہوں، پہلے ایک چھوٹا سا دائرہ بنتا ہے پھر وہ بڑھتا جاتا ہے۔

س...... رفاہی کاموں کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اس کوتاہی کو اجاگر کیا جاتا ہے کہ ان میں کسی مدر ٹریسا کا وجود کیوں نہیں پایا جاتا؟ خدمت خلق جس نبی کی زندگی کا ایک نہایت تابندہ اور روشن باب ہو، ان کے نام لیواؤں کے تعلق سے اس تاثر پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟
...... کیا جمعیت کے منصوبوں میں رفاہی کام بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں اب تک کیا پیش رفت ہوئی اور مستقبل قریب کے منصوبے کیا ہیں؟

ج...... رفاہی کام جمعیت کے ایجنڈے میں شروع سے شامل ہے، اس کے لئے بیت المال قائم کیا گیا، اس مقصد سے نرسنگ ہوم کا قیام عمل میں لایا گیا، طبی کیمپس لگائے گئے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میدان میں ہمیں ویسا تعاون نہیں ملا، جس کی ہمیں توقع تھی لیکن اس میدان میں کام نے بہت کچھ سکھایا، انشاءاللہ اب اس کی روشنی میں کام کو زیادہ مرتب شکل میں بڑھانے کا پروگرام ہے۔ سردست نرسنگ ہوم کی جگہ کی تبدیلی اور شفاء ہاسپٹل کا قیام پیش نظر ہے۔

ہمارے درمیان کوئی مدر ٹریسا نہیں، کاش کہ کوئی ''فادر ٹریسا'' ہی ہوتا، مسلمان اس پہلو میں بہت پیچھے ہیں، عیسائیوں کی فوقیت اور سبقت ہمیں تسلیم کرنا چاہئے اور الحکمة ضالة المومن کے اصول کے تحت ان سے سبق لینا چاہئے۔

س: جمعیت نے اصلاحی ودعوتی میدانوں میں اب تک کیا پیش رفت کی؟ ان میدانوں میں کام کرنے کے لئے اس کے پاس کون ساٹھوس منصوبہ ہے، مستقبل قریب میں

اس سلسلہ میں کون سا خاکہ جمعیت کے پیش نظر ہے؟ اسلامک سینٹر کے قیام کے پس پشت کیا مقاصد رہے؟

ج: اصلاحی اور دعوتی میدان میں ذہن سازی کا کام بڑے پیمانہ پر ہوا اور ہندوستان کے بہت سے قابل ذکر مدارس میں جمعیت کی صدا نے نوجوانوں میں تنظیمی وتحریکی کاموں کی داغ بیل ڈالی، سینکڑوں مقامی تنظیمیں وجود میں آئیں اور الحمدللہ ان سے برادرانہ روابط قائم ہیں اور فکر وعمل میں شرکت ہے۔

اسلامی سنٹر کا مقصد غیر مسلموں تک سنجیدہ طریقہ پر اپنی بات پہونچانا ہے اور حجابات اٹھا کر افہام وتفہیم کا دروازہ کھولنا ہے۔ سردست ایک ہندی اور ایک انگریزی پرچہ اس مقصد کے لئے جاری کیا گیا ہے، ابھی بالکل ابتدا ہے اور کام کو بہتر اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

س: جمعیت کے پیش نظر جو دینی ودعوتی تعلیمی ورفاہی منصوبے ہیں کیا انہیں پوری طرح روبہ عمل لانے میں کچھ دشواریاں بھی ہیں؟ ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے جمعیت کے پیش نظر کون سالائحہ عمل ہے؟

ج: منصوبوں کے راستہ میں دشواریاں دوطرح کی پیش آتی ہیں۔

ایک اہل افراد کی کمی، دوسرے مالیات کے مسائل، دونوں کے لئے سعی وکوشش درکار ہے، سووہ بس بھر کی جارہی ہے۔

(بانگ درا، لکھنؤ، دسمبر، جنوری ۱۹۹۸ء)

غلطی بنیاد ہے سیکھنے کی

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیرمین

ڈاکٹر محمد منظور عالم سے ایک ملاقات

ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب ایک بیدار مغز اسکالر ہیں، ملک وملت کے مسائل پر ان سے لیا گیا انٹرویو بتائے گا کہ مسائل پر ان کی نگاہ کتنی گہری ہے، پیش ہے ان کا انٹرویو۔

سوال: مختلف نوعیت کے مختلف کاموں اور ان سے متعلق مختلف اداروں کو آپ کی رہنمائی اور رہبری حاصل ہے، اپنے تجربات کی روشنی میں کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ کسی تنظیم یا ادارہ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے کن اصولوں کو بنیادی طور پر ملحوظ رکھنا چاہئے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جو مختلف ادارے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (IOS) کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں میں اس کا رہبر نہیں ہوں اس کا خادم ہوں اور جب کوئی خادم کی حیثیت سے کام کرتا ہے تو اس صورت میں باہمی ربط پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف جب کوئی شخص رہبر کی سائیکلوجی سے کام کرتا ہے تو وہاں رابطہ کی کمی کے باعث کام میں روح نہیں پیدا ہو پاتی، میرا احساس ہے کہ ہر وہ شخص جو اس طرح کے کام انجام دینا چاہے تو اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اس کے اندر خدمت کا جذبہ موجود ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کارکنوں اور ماتحتوں میں سے جو شخص جس میدان کا ہو اور جس صلاحیت کا مالک ہو اسی کے مطابق اسے کام تفویض کیا جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہر کام کرنے والے کو یہ حق دیا جائے کہ وہ غلطی کرے، میں پھر کہتا ہوں کہ ہر کام کرنے والے کو یہ حق دیا جائے کہ وہ غلطی کرے۔ غلطی بنیاد ہے سیکھنے کی، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب کام شروع ہوتا ہے اور کام کرنے والوں کی ٹیم بنتی ہے، تو اس پر یہ نگاہ رکھی جاتی ہے کہ کام کرنے والوں سے غلطی نہ ہو، اس صورت میں غلطی کا خوف کام کرنے والوں کو کام کرنے سے روکتا ہے۔ اس لئے کام کرنے والے کو غلطی کرنے کا حق دیا جانا چاہئے۔ حق دیئے جانے کے معنی یہ نہیں کہ ایک شخص جان بوجھ کر غلطی کر رہا ہو، ایک غلطی تو وہ ہے جس کا سرزد ہونا فطری بات ہے، دوسری قسم وہ ہے جسے جان بوجھ کر غلطی کرنا کہہ سکتے ہیں، اور تیسری غلطی یہ ہے کہ کسی غلطی سے غلط فہمی پیدا کرنا۔ پہلی قسم سیکھنے کے لئے ہے، اگر یہ محسوس ہو کہ یہ غلطی فطری ہے اور جان بوجھ کر نہیں کی گئی ہے تو اسے نہ صرف نظر انداز کرنا چاہئے بلکہ اس کو ہمت افزائی ہونی چاہئے، تاکہ اس شخص کو سیکھنے کا موقع ملے اور وہ اپنے کام کو آگے بڑھائے، جان بوجھ کر اگر غلطی ہو رہی ہو تو اسے روکنا چاہئے، اس لئے کہ جان بوجھ کر غلطی کرنا کسی کا حق نہیں ہے لیکن سب سے خطرناک بات ہے کسی کی غلطی کو بنیاد بنا کر اس کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنا۔ افسوس کہ آخر الذکر غلطی اداروں اور تنظیموں میں رواج پا رہی ہے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ کارکنوں کو کھلے انداز سے گفتگو کا موقع ملنا چاہئے، احترام اپنی جگہ پر ہے اسے یقیناً برقرار رکھنا چاہئے۔ مگر محض احترام کی وجہ سے اگر کوئی شخص اپنی بات نہیں کہہ پا رہا ہے تو ایسے ماحول کو ختم ہونا چاہئے، بصورت دیگر اپنی بات نہ کہنے والوں کے دل میں بعد اور دوری پیدا ہوتی ہے، سامنے وہ کہہ نہیں سکتا اور پیچھے وہ کہے گا، اس لئے کہ یہ فطری بات ہے کہ جو بات دلوں میں ہوتی ہے اگر اس کا اظہار موزوں جگہ پر نہیں ہوتا جہاں ہونا چاہئے تو غیر موزوں جگہوں پر اس کا اظہار ہوگا۔

اس کے علاوہ کارکنوں کے جو دستوری حقوق ہیں وہ انہیں ملنے چاہئیں، اس سے ان میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور مفوضہ کاموں میں ان کا جی لگتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک بنیادی بات یہ ہے کہ جو ذمہ دار ہیں مثلاً چیرمین یا سکریٹری جیسے منصب پر فائز ہیں، ان کا رویہ اگر اپنے ماتحتوں کے ساتھ تحکمانہ ہے تو رابطہ کی کمی رہے گی اور بے دلی کے ساتھ کیا جارہا کام بھی بے جان رہے گا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ احتساب اور محاسبہ سے غفلت نہ برتی جائے، ورنہ ظاہر ہے کہ نظام سست پڑ جائے گا، اس لحاظ سے ذمہ دار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر ان دونوں باتوں کا امتزاج پیدا کرے، اپنے ماتحتوں کے ساتھ اگر ایک طرف برادرانہ معاملہ رکھے تو دوسری طرف کام پر سخت نگاہ بھی رکھے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ ذمہ دار میں عنداللہ مسئولیت اور آخرت میں باز پرس کا احساس ضرور پایا جاتا ہو، اگر یہ احساس خدا نخواستہ نہ ہو تو پھر اس کا خطرہ ہے کہ نفس اپنا کام کر جائے اور اس سے دانستہ طور پر بڑی غلطیاں سرزد ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان باتوں کو ملحوظ رکھا گیا تو بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ادارے اور تنظیمیں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں۔

سوال: آپ کا موضوع معاشیات (Economics) ہے، اس عینک سے جب آپ ملت اسلامیہ ہند کو دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ کن خطوط کو اپنا کر ملت کو معاشی خوش حالی سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے؟

جواب: آزادی کے بعد ملک کی معاشی ترقی کے لئے جو منصوبہ بندی (Planning) کی گئی اول تو اس میں خامیاں تھیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پلاننگ کی کمزوری کا سب سے بڑا نقصان اس کو پہونچتا ہے جو سوسائٹی کا سب سے زیادہ کمزور حصہ ہوتا ہے، افسوس کی بات ہے کہ ملت اسلامیہ ہند، ہندوستان کی سوسائٹی کا ایک ''عضوضعیف'' ہے تعلیمی لحاظ سے بھی اور اقتصادی لحاظ سے بھی۔ ستم در ستم کے مصداق یہ بات بھی ہوئی کہ پلاننگ میں اس عضوضعیف یا کمزور حصہ کی ترقی کے لئے جو کچھ بھی گنجائش پائی جاتی تھی اس پر عمل درآمد ہونے میں یہ بات مانع بنی کہ تقسیم ہند کے بعد خوف وہراس کی ایک فضا بنی جس فضاء نے مسلمانوں کو تعلیمی و اقتصادی میدان میں پیچھے چھوڑ دیا، علاوہ

ازیں تعصب (Prejudice) کی بھی کارفرمائی رہی جس کے نتیجہ میں اگر کچھ لوگوں نے اقدام کیا بھی، (Initiative) لیا بھی تو وہ مذکورہ ذہنیت سے دوچار ہونے کی وجہ سے یا تو مایوسی کا شکار ہوئے یا پھر جس مقصد کے تحت انہوں نے کام شروع کیا تھا، اس سے انہیں دستبردار ہونا پڑا یا اپنے مشن سے ہی انہیں مصالحت کرنی پڑی، ان باتوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی نئی نسل میں یہ مزاج پیدا ہوا کہ تعلیم حاصل کرنے سے ہمیں آخر کیا حاصل ہوگا، ہم کوئی اقدام کریں تو اس کی پذیرائی اور ہمت افزائی نہیں ہوتی اور اس طرح دھیرے دھیرے نفسیاتی الجھنیں اور (Psychological Indifference) پیدا ہوتے چلے گئے اور نتیجہ میں مسلمان چھوٹے موٹے کاموں (Petty Works) کا رخ کرنے لگے کہ جن کے ذریعہ بس ان کا پیٹ بھر جائے اور دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو سکے، اس طرح منصوبہ بندی اور دور اندیشی سے انہیں سروکار نہ رہا اور مستقبل کی فکر سے انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ یہ وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے تعلیمی و اقتصادی ہر دو لحاظ سے مسلمان پسماندہ رہے۔

ظاہر ہے کہ عمل کی اس دنیا میں اگر کوئی ایک شخص قدم بڑھاتا ہے، اقدام کرتا ہے، مستقبل کی تعمیر کے لئے سرگرم عمل ہوتا ہے تو اس کے ثمرات اس کی آنے والی نسل کو ملتے ہیں، ان حالات میں جو آزادی کے بعد کی دو تین دہائیوں میں اس ملت کو پیش آئے اور جن کی وجہ سے ان کے حوصلے پست ہوئے تو فطری طور سے اس نسل میں ناامیدی پیدا ہوئی۔ اس مسئلہ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو حالات پیش آئے ان میں اس وقت کی ملی قیادت کے سامنے (Survival) کا، مسلمانوں کے وجود اور بقاء کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ تھا، نتیجتاً ان کی نفسیات میں احتیاط کا پہلو غالب ہو گیا کبھی کبھی احتیاط کے اس پہلو نے اس قدر غیر معمولی احتیاط کی صورت اختیار کر لی کہ ان حالات میں جب کچھ لوگوں نے اقدام کرنا چاہا تو اس ذہنیت نے انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی، ان حالات میں بحیثیت مجموعی اقتصادی میدان میں کچھ پیش رفت نہیں ہو سکی۔

اس تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ زمانہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ نت

نئی مشینوں کی ایجادات نے کام کی رفتار تیز کردی، مسلمانوں کے پاس جو مختلف گھریلو صنعتیں تھیں، وہ انہیں زمانہ کی رفتار سے ہم آہنگ نہیں کرسکے اس کے علاوہ ان کی نگاہ (Marketing) پر نہیں تھی، بین الاقوامی مارکیٹنگ سے بھی انہیں علاقہ نہ تھا، مشینی دور کے آنے کے نتیجہ میں ان کا جو (Expert Hand) تھا وہ بھی (Update) نہیں ہوسکا اور زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکا۔

دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی کے نتیجہ میں بازار میں جس طرح کے افراد کی ضرورت درپیش تھی، تعلیمی پہلو کمزور ہونے کی وجہ سے ایسے افراد کی فراہمی بھی ممکن نہ ہوسکی اور اس میدان میں بھی ملت پیچھے رہ گئی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تقسیم ہند کے بعد پیش آنے والے حالات میں (Survival) کے نقطہ نظر سے تشخص اور (Identity) کا مسئلہ نہایت اہمیت کا حامل تھا، اس مقصد کے پیش نظر اسلامی مدارس کا قیام وقت کی ضرورت اور تقاضہ کے عین مطابق تھا اور ان کا بڑا اہم کردار ہے، البتہ اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ مدارس کے نصاب میں حالات کے تقاضوں کے تحت کچھ اضافہ کیا جاتا اور ان کی رعایت کی جاتی تو ان مدارس اسلامیہ کا رول (Role) زیادہ مؤثر ہوتا اور وہ اور زیادہ افادیت اور اہمیت کے حامل ثابت ہوتے۔

دوسری طرف جن لوگوں نے محض حالات کے تقاضوں کو ہی اپنا منتہائے مقصود بنایا اور ادارے قائم کئے وہ تشخص اور (Identify) کے پہلو کو نظر انداز کرگئے، صرف معاشی ترقی ان کے پیش نظر رہی جب کہ حکومت کے نزدیک توان کی حیثیت مسلمان ہی کی رہی اور نتیجہ میں امتیازی سلوک (Discrimination) سے انہیں دوچار ہونا پڑا نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کے مصداق اس قسم کی کوششیں بھی نتیجہ خیز اور بارآور نہ ہوسکیں۔ بہرحال عمومی پلاننگ میں کسر اور کوتاہی کے علاوہ یہ بھی چند عوامل ہیں جن کے نتیجہ میں مسلمان اقتصادی میدان میں پیچھے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسائل کا ادراک ہوتو

حل نکل آتا ہے لیکن اگر خدانخواستہ مسائل کا ادراک ہی نہ ہوتو اچھے اچھے حل بھی بیکار ثابت ہوتے ہیں، میں محسوس کررہا ہوں کہ اس سلسلہ میں الحمد للہ گزشتہ دس برسوں میں پورے ملک میں احساس جاگا ہے، شعور بیدار ہوا ہے اور مسئلہ کی گہرائی وگیرائی تک پہونچنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ یہ سب باتیں خوش آئند ہیں۔

حل اس کا یہ ہے ان سارے تعلیمی اور اقتصادی پروگرام اور پالیسیوں سے ہمیں بھرپور واقفیت ہو جو حکومت کی طرف سے سامنے آتی رہتی ہیں، اس سلسلہ میں ہماری واقفیت کافی نہیں ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اسکا ادراک ہونا چاہئے کہ اس وقت کس طرح کی معیشت (Economy) کی ضرورت ہے؟ کس میدان میں اقدام کیا جائے کہ جس کے نتیجہ میں ہماری اقتصادی حالت درست ہوسکے، اس سلسلہ میں بھی کما حقہ واقفیت ہم نہیں رکھتے، اس مسئلہ کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ آنے والا وقت بتارہا ہے کہ غیر سرکاری اداروں (Non Government Organisations) کی اہمیت بڑھے گی۔ حکومت یہ کوشش کرے گی کہ مختلف اسکیموں کا نفاذ (Ngos) کے ذریعہ ہو۔

ایک قدم جو نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں زکوۃ کا نظام ایک مرکز کے ماتحت کیا جائے اسے (Centerlize) کیا جائے، زکوۃ کے اجتماعی نظم کی فکر کی جائے، جب تک ہم یہ قدم نہیں اٹھائیں گے غربت کی ان ریکھاؤں سے مسلمانوں کو بالخصوص اور برادران وطن کو بالعموم اوپر اٹھایا نہیں جاسکتا۔ جن ملکوں میں یہ قدم اٹھایا گیا ہے ان ملکوں کے اعداد وشمار (Statistics) بتارہے ہیں کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے کام ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (Ios) نے اس کا ایک پروجیکٹ بنایا ہے کہ ملک میں پائے جانے والے قانون کا جو ٹیکس سے متعلق ہے، جائزہ لیا جائے تا کہ اسے (Double Taxation) سے محفوظ رکھا جاسکے۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ ہمارے وہ مسلمان جن کے پاس کوئی صنعت (Industry) ہے وہ اپنے یہاں بچوں کو تربیت (Training) دیں تا کہ یہ تربیت ان کے

لئے روزگار حاصل کرنے کا ذریعہ بنے اور ان میں اعتماد پیدا ہو۔

ان ساری چیزوں کو اگر ایک ساتھ ہم نے کیا، یہ سارے اقدامات اگر بیک وقت ہم نے اٹھائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ ہماری گرتی ہوئی اقتصادی ساکھ سدھر سکے گی۔ اس سلسلہ میں ہم اس غلطی کو نہ دہرائیں کہ اس پورے خاکہ میں پیش کردہ کاموں میں سے پہلے ایک کام کے مکمل ہو جانے کا انتظار کریں اور اس کی تکمیل کے بعد ہی دوسرے کام کے آغاز کے لئے سوچیں بلکہ یہ سب چیزیں باہم مربوط ہیں، اگر ایک اقدام کو دوسرے اقدام سے یا ایک پروگرام کو دوسرے پروگرام سے الگ کر کے دیکھا جائے تو آپ تعلیم یا میڈیا وغیرہ ہر میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ان تمام باتوں کے لئے متوازن انداز میں منصوبہ بندی (Balanced Planning) ہو تب ہی جا کر ہم اپنا مقام بنا سکیں گے ورنہ زندگی کی اس دوڑ میں ہم ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔

سوال: آزادی کے پچاسویں سالگرہ کے موقع پر وطن عزیز کے ایک ذمہ دار شہری اور ملت اسلامیہ ہند کے ایک بیدار مغز فرد ہونے کے ناطے آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟

جواب: یہ سوال برمحل ہے جب کہ ہم آزادی کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے ہر بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے غلامی کی قید سے ہمارے ملک کو آزادی تو ضرور ملی لیکن افسوس کہ پچاس سال میں انسان کو آزادی نہیں مل سکی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی تو مل گئی لیکن آج پچاس سال بعد بھی معاشرہ غلامی کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے، کہیں اقتصادی غلامی ہے، کہیں سماجی غلامی ہے، کہیں معاشرتی غلامی ہے تو اس لحاظ سے غلامی کا یہ سلسلہ باقی اور جاری ہے، میرا احساس ہے کہ جو آزادی ہمیں ۵۰ سال پہلے ملی اس آزادی کو ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ انسان کی آزادی کا بھی نقیب اور علمبردار ہونا چاہئے تھا، بدنصیبی سے ایسا نہیں ہو سکا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ملک کی آزادی کو صحیح معنوں میں اس وقت آزادی قرار نہیں دیا

جا سکتا جب تک کہ اس میں ہر ایک کیلئے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی نہ ہوں۔ جب تک اس ملک کے ہر باشندے کو، چاہے وہ کسی ذات، کسی برادری کا ہو اور کسی مذہب کا ماننے والا ہو، ہر میدان میں برابری کا حق حاصل نہ ہو وہ ملک حقیقی معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا اور اگر کہیں برابری کا حق حاصل کرنے میں دشواری پیش آئے تو وہاں حکومت اور قانون کا یہ فرض بنتا ہے کہ اسے برابری کا حق دلانے کی کوشش کرے، بدقسمتی سے ہمارے ملک کا یہ پہلو کمزور ہے۔ دستوری طور پر ملک کی تعمیر میں ہر فرد کو کردار نبھانے کا حق دیا گیا لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہو سکا۔ دلت اور ہریجن کے ساتھ امتیازی برتاؤ (Discrimination) ہوا اور مسلمانوں کے ساتھ تو بہت زیادہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا، نتیجہ میں ملک کی ترقی کی جو رفتار ہونی چاہئے تھی وہ دھیمی اور سست پڑ گئی۔ بطور تمثیل کے عرض کرتا ہوں کہ ایک دوشیزہ حسن و جمال کی پیکر ہو لیکن خدانخواستہ اگر اس کی ایک آنکھ خراب ہو تو بھلا بتایئے اسے کون حسین کہے گا، اسی طرح اگر کسی ملک کو ترقی پذیر یا ترقی یافتہ کہا جائے اور اس ترقی سے قوم کا ایک طبقہ محروم رکھا جائے تو ایسی ترقی کو ترقی کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک وطن عزیز کو دراصل کون سے خطرات درپیش ہیں اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے کون سی حکمت عملی اپنائی جا سکتی ہے جس سے نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے؟

جواب: ہمارے ملک کو بیرونی خطرات لاحق نہیں ہیں، البتہ جن خطرات کا سامنا ہے وہ ہیں جہالت اور افلاس، جب تک ان دو خطرات پر قابو نہیں پایا جاتا اس وقت تک ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا، یہی دو ہمارے دشمن ہیں جو اس ملک کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اس ملک کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ ہیں تو اس مسئلہ پر غور ہونا چاہئے کہ ان دو دشمنوں سے کیسے نپٹ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہمہ جہت پلاننگ ہو کہ جن جن میدانوں میں ہمیں جس صلاحیت کے افراد کی ضرورت ہے، ان تقاضوں کے پیش نظر ہم افراد تیار کریں، بجائے اس کے کہ محض عمومی تعلیم (Genral

Education) ہو اور وہ نتائج کے اعتبار سے زیادہ کارگر اور مفید ثابت نہ ہو سکے۔ جب تک ان خطرات اور ان تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم منصوبہ بندی نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

سیاسی طور سے اس ملک کو جو خطرہ لاحق ہے وہ ہے سیاسی فرقہ واریت (Political Commuanlisation) کا خطرہ۔ سوسائٹی کے ایک محدود مختصر طبقہ نے جو خود کو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین منصب ومقام کا حامل اور اہل سمجھتا ہے اس کی بنیاد اس کے نزدیک چاہے مذہب ہو، یا تعلیم، یا اقتصادی حالت ہو یا بیوروکریسی، بہرحال اس چھوٹے سے طبقہ نے فرقہ واریت کو (Strategy) کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ اگر تعلیم عام ہوگئی، سماجی بیداری (Social Awareness) پیدا ہوگئی اور اس طرح ملک میں پائی جانے والی مختلف ذات برادریوں اور قوموں کو اپنی طاقت اور قوت کا اندازہ ہوگیا تو وہ حکومت سازی (Govt Formation) میں بازی لے جائے گا اور نتیجہ میں تناسب کے لحاظ سے اس میں انہیں برابری کا درجہ حاصل ہو جائے گا، اس طرح اس چھوٹے سے طبقہ کو جسے آر ایس ایس اور بی جے پی اپنے قابو میں رکھتی ہے، اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ محکوم ہو جائے گا۔

یہ بیمار ذہنیت اس ملک کی ترقی بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ اس ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ پیدا کر رہی ہے اور یہ سیاسی فرقہ واریت کی ذہنیت ایک خطرناک روپ اختیار کر رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ افلاس اور جہالت کا خاتمہ اور فرقہ واریت کا سد باب ان پالیسیوں پر منحصر ہے کہ تعلیم کا نہج کیسا ہو؟ ملک کی جمہوریت کی حفاظت کس طرح کی جائے؟ ملک کا قانون کس طرح مؤثر ہو؟ ملک کے باشندوں کے تشخص کی حفاظت کیسے کی جائے، ملک کی جو ضروریات ہیں وہ کس طرح پوری ہوں؟ ان تمام چیزوں کو جب ایک ساتھ جمع کیا جائے گا اور بحیثیت مجموعی ان مسائل کے حل کے لئے منصوبہ بندی کی جائے گی تو صحیح ڈھنگ سے

ملک کی ترقی ہوگی، یہی بڑے خطرات ملک کو درپیش ہیں جس چیلنج کو پوری قوم کو قبول کرنا ہوگا اور ملک کے ہر باشندہ کو ان تینوں خطرات سے مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرنی ہوگی۔

سوال: آپ کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں اور ان مسائل کے حل کے لئے مسلمانوں کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟

جواب: جیسا کہ اول الذکر سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ مسلمانوں کو بھی جن مسائل کا سامنا ہے وہ جہالت اور افلاس ہیں، ان دونوں چیزوں سے متعلق بھی سینکڑوں مسئلے اور ہیں لیکن جہالت اور افلاس مسائل کے جنم داتا ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے کیلئے 'جنم داتا' پر ہی پلاننگ کرنی چاہئے، جیسا کہ میں نے کہا کہ فرقہ واریت بھی ایک خطرناک مسئلہ ہے، اگر جہالت، افلاس اور فرقہ واریت ان تینوں مسائل کو سامنے رکھیں تو ترجیحات بھی آسانی سے طے ہو سکتی ہیں۔ تعلیم پر ہم کو سب سے پہلے توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ ہم تعلیم کی منصوبہ بندی اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ جس دین کے ہم ماننے والے ہیں، اس دین کا اگر سب سے زیادہ کسی بات پر زور ہے تو وہ علم ہے اور علم ہی کامیابی کی کنجی ہے، علم ہی ضمانت دیتا ہے مستقبل کی ترقی کی، علم ہر قسم کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی راہ استوار کرتا ہے، تو تعلیمی میدان کے لئے کم از کم چالیس سال کی پلاننگ ہونی چاہیے، اس طرح تعلیم عام ہوگی اور اس سے جو نسل تیار ہوگی اور اس نسل کے بعد جو نسل آئے گی تو آج کی ان کوششوں کے اصل فوائد اور ثمرات آنے والی اس نسل کو حاصل ہو سکیں گے۔

تعلیم کے سلسلہ میں جو کوتاہی ہم سے ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو ہمارے پاس کوئی پلاننگ نہیں ہے، جہاں اور جب ضرورت محسوس کی، کوئی چیز قائم کر دی اس کے پیچھے کوئی ٹھوس پلاننگ نہیں ہوتی اور جو نصاب اور منہج تعلیم ہوتا ہے وہ بھی بہت مرتب نہیں ہوتا مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں وہ بچے جن کی عمر دس بارہ سال ہوتی ہے، اس عمر میں بچے معاشرہ

کی محبت اور ماں باپ کی محبت چاہتے ہیں، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینی اور عصری تعلیم کے نصاب کو مرتب کیا جانا چاہئے بطور مثال کے عرض کرتا ہوں کہ ہم اپنے نونہالوں کو اول مرحلہ میں قرآن پڑھاتے ہیں، ناظرہ قرآن کے ساتھ جو طلباء عربی زبان بھی پڑھتے ہیں ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ پارہ عم کی تمام سورتیں مکی سورتیں ہیں، مکی سورتیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں اور آخرت کا تصور ظاہر ہے کہ ایک انسان کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے ، ان سورتوں کا مطالعہ اپنے پڑھنے والے میں ایک خوف پیدا کرتا ہے جو ایک عاقل و بالغ انسان میں تو احساس جوابدہی پیدا کرتا ہے لیکن وہی مطالعہ بچوں کو خوف زدہ کر سکتا ہے، اس لئے کیا ہی اچھا ہو کہ نصاب میں اس بات کی رعایت کی جائے کہ بچے خوف کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کی بہترین مثال حضرت موسی علیہ السلام کا فرعون کے یہاں آزادی کے ساتھ پرورش پانا ہے، بہرحال میں اس تفصیل میں نہیں جا سکتا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تعلیم کے میدان میں ہمیں چالیس سال کا خاکہ سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرنا چاہئے تاکہ پہلی نسل کو ہم بیس سال میں تیار کریں اور اس کے بیس برسوں بعد جو نسل آئے تو وہ تمام تحفظات (Reservations) کی ذہنیت سے آزاد ہو۔

لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ چالیس سال کی منصوبہ بندی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ ضروریات اور تقاضوں سے ہم صرف نظر کرلیں۔ موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مختصر میعاد کی پلاننگ ہو، ووکیشنل کورسیز Vocational Courses چلائے جائیں، کمپیوٹر کی ٹریننگ دی جائے۔ Crisis Management planning ہو۔ اس طرح سے Short term, Intermediate Term اور Long term ان سب کی ساتھ ساتھ پلاننگ ہونی چاہئے تاکہ ہم اپنی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اور انہیں پورا کرتے ہوئے منصوبہ کو آگے بڑھا سکیں، اسی طرح اقتصادیات کا اور تشخص کا مسئلہ ہے، دستور اور قانون کا معاملہ ہے۔ تو ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ جہالت، افلاس اور فرقہ واریت ان تینوں دشمنوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر منصوبہ بندی کی گئی تو

انشاء اللہ امید ہے کہ یہ ملت اس ملک میں باعزت و بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے گی۔

سوال: ماہنامہ بانگ درا کے ذریعہ آپ کا پیغام ملت کے نام؟

جواب: ملت اسلامیہ کو خیر امت کے لقب سے نوازا گیا ہے وہ خیر امت کے رول کو ادا کرنے کے لئے آگے بڑھے، اس کے لئے آگے بڑھے اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ ہم اپنے تمام تحفظات سے بلند ہوں، اتحاد کی راہیں ہموار کریں، Non-issues پر Fight نہ کریں، ملت کو مضبوط اس لئے کریں کہ بنی نوع انسان کو آزاد کرانے کی ذمہ داری اللہ تعالی نے اس خیر امت کو سونپی ہے، اس احساس کے تحت علم کا زیور اپنی اولاد کو پہنائیں، علم کے زیور سے دوسروں کو بھی آراستہ کریں، علم کو عام کرنے اور اس سے فیض اٹھانے کا ماحول بنائیں، تعلیم، اقتصادیات اور میڈیا ان میدانوں میں ہم نہ صرف پیش رفت کریں بلکہ ان پر قابو حاصل کریں اور ان کو گھر کی باندی بنائیں، جب ان تمام باتوں پر ہم عمل کر دکھائیں گے تو انشاء اللہ ہم اخیر امت کے لقب کے مستحق ہوں گے، اللہ تعالی ہماری کوششوں کو قبول فرمائے گا اور ہماری کمزوریوں سے صرف نظر کرے گا۔

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ، دسمبر، فروری ۱۹۹۸ء)

شخصیات

- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
- مولانا عبدالشکور فاروقیؒ
- مولانا عبداللہ عباس ندویؒ
- جناب عبدالکریم پاریکھؒ
- جناب بہاءالدین حیدرآبادیؒ
- جناب عشرت علی صدیقی

سب سے بڑے عالم کہیے اور انسان کہیے تو

مولانا علی میاںؒ!!

معروف بزرگ صحافی

جناب عشرت علی صدیقی سے ایک ملاقات

مخدوم ومکرم جناب عشرت علی صدیقی (سابق ایڈیٹر قومی آوز) ایک شخص اور صحافی کا نہیں بلکہ ایک عہد اور اس کی روشن وتابناک قدروں کا نام ہے ......وہ عہد جو عبارت ہے سادگی وجفاکشی، ایمانداری وفرض شناسی اور اصول پسندی سے......وہ زمانہ جس میں مادیت،......مقصدیت پر غلبہ نہ پاسکی، ''پرانے وقتوں کے ان لوگوں'' نے جس کام کو کیا، مشن سمجھ کر کیا اور جس اصول وروایت کو اپنے لیے منتخب کیا، پھر اسے ایسا گلے سے لگایا کہ اس کے خلاف انہیں گلہ سننا گوار نہ ہوا...... جناب عشرت علی صدیقی صاحب نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، مہاتما گاندھی اور مولانا مدنی جیسی قدآور شخصیتوں کو زندگی کی عملی تجربہ گاہ میں دیکھا ہے اور ان کے فکر وعمل سے گہرا تاثر قبول کیا ہے......کھدر کے کرتا پاجامہ اور گاندھی ٹوپی میں ملبوس عشرت علی صدیقی صاحب پر یہ تاثر اس قدر گہرا ہے کہ زمانہ کے نشیب وفراز اسے مدھم نہ کرسکے بلکہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہ رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس رنگ سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ''......ایک اچھے انسان، سچے مسلمان اور مخلص محبّ وطن''......کی تصویر ہے اور شاید ان ہی تین عناصر

سے عشرت صاحب کی شخصیت مرکب ہے، ان کی تحریروں سے بھی انسانی قدروں کی عظمت وبلندی، ایمان وعقیدہ کی صلابت وپختگی اور وطن کے لیے سچی محبت وہمدردی کی دھنک پھوٹتی دکھائی دیتی ہے......صحافت کو انہوں نے پیشہ نہیں، مشن سمجھ کر اپنایا اور آج بھی وہ اس سے وابستہ ہیں......موجودہ دور کی صحافت میں اخلاقیت کے زوال سے وہ رنجیدہ ہیں......ضرورت تھی کہ اس راہ کے ان طویل تجربات اور تاثرات محفوظ کرلیے جاتے تاکہ ایسے جیالوں کے لیے جو صحافت کو مشن سمجھ کر اپنانا چاہیں، یہ تاثرات ہمت وحوصلہ کا باعث بنیں......کیا عجب کہ دل سے نکلی ہوئی بات کسی دل میں اتر ہی جائے!!

برسوں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں جناب عشرت علی صدیقی صاحب کو حاضر ہوتے رہنے کا شرف حاصل رہا۔ درج ذیل انٹرویو کی اس پہلی قسط میں حضرت مولانا سے ان ملاقاتوں کی جھلکیاں قارئین ملاحظہ فرماسکیں گے چونکہ یہ اشاعت خصوصی اشاعت ہے اس لئے درج ذیل انٹرویو میں صرف انہی سوالات وجوابات کو سردست شامل کیا جارہا ہے جو صرف مولانا سے متعلق ہیں۔

اس انٹرویو کی دوسری قسط میں قارئین کرام ''جناب عشرت علی صاحب کی صحافت سے وابستگی کی کہانی، خود ان کی زبانی''......نیز صحافت کی اخلاقیات اور ملک وملت کے مسائل پر بھی اس بزرگ صحافی کے خیالات وتاثرات ملاحظہ فرماسکیں گے۔

[یہ انٹرویو ان دنوں لیا گیا تھا جب حضرت مولانا باحیات تھے، کاش یہ انٹرویو حضرت مولانا علیہ الرحمۃ ہی کی حیات میں شائع ہوجاتا]

سوال: طبقہ علماء میں سے کن شخصیتوں نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب: مولانا مدنی! مولانا آزاد! ان کی تعلیمات اور ان کے کیرکٹر نے متاثر کیا اور آج کل تو مولانا علی میاں...... دنیا کے سب سے بڑے عالم کہئے تو اور انسان کہئے تو مولانا علی میاںؒ میں ہیں!!

سوال: حضرت مولانا علی میاں سے آپ کے مراسم اور ان کی کچھ یادیں، کچھ باتیں......

جواب: قومی آواز میں میرے پیش رو تھے حیات اللہ انصاری صاحب مرحوم۔ وہ جب ریٹائر ہوئے تو میں نے ہمارے اخبار سے وابستہ محمود الحسن صاحب (ندوہ کے پڑھے ہوئے تھے اور پھر سفارت خانہ سے متعلق ہو گئے تھے) سے کہا کہ ہم مولانا علی میاں سے ملنا چاہتے ہیں لیکن مولانا ہم سے شاید ملنا پسند نہ کریں اس لیے کہ ان کے خلاف ہمارے اخبار میں جہاد کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اس لیے ہماری تو ان سے ملنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے ......محمود الحسن صاحب نے مولانا سے اس کا ذکر کر دیا، مولانا نے فرمایا کہ نہیں نہیں! میں جانتا ہوں کہ میرے خلاف اخبار میں جو مہم چلی اس میں عشرت صاحب کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور پھر یہ کہ میں تو بہت برا آدمی ہوں اسی لیے میرے خلاف مہم چلی، اس لیے اس مہم سے بھی مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، اخبار کے دفتر کے جو حالات ہیں، وہ ہیں۔ پالیسی تو وہ بناتے نہیں ہیں، اس لیے تم عشرت صاحب کو بلا لاؤ...... ان سے کہو کہ مجھ سے ملیں، محمود الحسن صاحب نے مجھ سے یہ بات کہی، اس زمانہ میں مولانا کچہری روڈ تبلیغی مرکز میں ٹھہرے ہوئے تھے، چنانچہ میں دوپہر کے وقت وہاں گیا، میں نے مولانا سے کہا کہ مولانا آپ سے ملنے کو تو جی چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی کہ شاید آپ مجھ سے ناراض ہوں تو فرمایا کہ نہیں میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔ بہر حال مولانا سے باتیں ہوئیں'' کھانے کا وقت ہو گیا تھا یاد نہیں آتا کہ میں نے کھانا کھایا یا نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ مولانا نے فرمایا کہ یہاں آنا معتبر نہیں، رائے بریلی آؤ۔ بہر حال میں رائے بریلی گیا، دن بھر رہا اور شام میں جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ دن بھر رہنا معتبر نہیں ہے، رات میں رہنا

ضروری ہوتا ہے تو رات بھی وہیں رہ گیا اور دوسرے دن واپسی ہوئی، یہ واقعہ ۷۲-۷۳ء کا ہے۔ اس کے بعد تو پھر برابر حاضر ہوتا رہا، رمضان المبارک میں بھی جانا ہوا، عام دنوں میں بھی، ان کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ مولانا علی میاں کی مجلسوں کی ایک بڑی خوبی اور صفت میں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ میں نے ان کی زبان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی، میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں (جن میں علماء نما بھی ہیں) جو مولانا کی برائی کرتے رہتے ہیں لیکن مولانا سے کبھی میں نے کسی کے لیے برا لفظ نہیں سنا۔ ان کی اپنی شان اور ادا تھی، کسی شخص کے بارے میں پوچھئے کہ فلاں شخص کیسے ہیں تو یا تو ٹال جاتے تھے یا پھر فرماتے کہ ہاں! آدمی ٹھیک ہیں بھئی...... بعض لوگوں نے تکلیف سے آگے بڑھ کر ایذا بھی پہنچائی مگر مولانا خاموش رہے، ان کی مجلس میں ایسے لوگوں کے تعلق سے کسی نے غصہ کا اظہار کرنا چاہا تو مولانا نے ایسا کرنے سے بھی منع فرما دیا......

سوال: تو گویا ۷۲-۷۳ء سے آپ کے حضرت مولانا سے مراسم رہے۔

جواب: جی ہاں! جب میں نے اخبار کی ذمہ داری سنبھالی تو مولانا سے عرض کیا کہ میں آپ سے کہیں اختلاف تو کر سکتا ہوں لیکن گستاخی نہیں کروں گا۔۔ اس کا وعدہ کرتا ہوں...... مولانا خالص لکھنے پڑھنے والے انسان تھے، وہ بالکل سیاسی آدمی نہیں تھے، ملک کی یہ سیاست تو ان کے لیے آفت تھی جو سیاسی حضرات مولانا سے ملنے جاتے تھے وہ اپنے مفاد کے لیے جاتے تھے، اپنی غرض کے لیے جاتے تھے، ووٹ ان کے پیش نظر ہوتے تھے، میرے پیش نظر تو ایسا کوئی مفاد تھا نہیں، دو تین مواقع ایسے آئے کہ لوگوں نے مولانا کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی، چونکہ میری نیت صاف تھی اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی اس لئے میں نے مولانا سے کہا کہ مولانا! میں اب ندوہ نہیں آؤں گا، لوگ نہ معلوم کیا سمجھتے ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ نہیں بھئی! میں کوئی بچہ ہوں جو لوگ مجھے بہکا دیں گے...... ایک بار تو میں نے مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد میں مولانا نے عرض کیا کہ مولانا! اب میں ندوہ نہیں آؤں گا آپ کو دیکھنا ہوگا تو راستہ میں کہیں دیکھ لیا کروں گا یا رائے بریلی آجاؤں گا...... مولانا نے

فرمایا کہ بھئی! میں مسجد میں کہہ رہا ہوں مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ آیا کریں پھر مولانا رابع صاحب نے اور مولانا عبداللہ عباس صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں ریاکاری نہیں ہوتی ہے، اگر کوئی شخص ہمیں پسند نہیں ہے تو ہم اس کے منھ پر کہہ دیتے ہیں کہ تمہاری فلاں بات ہمیں پسند نہیں ہے اور جب مولانا علی میاں آپ سے محبت کرتے ہیں تو ہم سب بھی آپ سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں اور تعلق رکھتے ہیں...... ویسے ہی مولانا اویس نگرامی صاحب بھی مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، آج بھی ان کا تصور آتا ہے تو میری آنکھیں نم ہوجاتی ہیں...... وہ ہمارے اخبار کی بڑی تعریف فرمایا کرتے تھے ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ سے ہم اپنے اخبار کی تعریف نہیں سننا چاہتے بلکہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اخبار میں نقص کیا ہے اور ہماری کمزوری کیا ہے تاکہ ہم اپنی اصلاح کریں تو انہوں نے فرمایا کہ ......''اور اگر نقص نہ ہو تو!''

سوال: نہرو خاندان سے آپ کے دیرینہ مراسم رہے ہیں، ان کی کچھ یادیں؟

جواب: بہت زیادہ تو مجھے یاد نہیں لیکن کچھ باتیں جو اس وقت یاد آرہی ہیں وہ عرض کئے دیتا ہوں، مثلاً جب راجیو گاندھی کے زمانہ میں بابری مسجد کی آراضی پر شیلا نیاس ہوا تو میں نے راجیو گاندھی سے کہا کہ آپ نے تو مسجد کی جگہ پر شیلا نیاس کرادیا، انہوں نے کہا کہ نہیں، مجھے تو یہی بتایا گیا ہے کہ شیلا نیاس جہاں پر ہوا ہے، وہ غیر متنازعہ ہے......تو میں نے کہا اور سختی سے کہا (اس لیے کہ میں ان دنوں اگر قومی آواز کا ایڈیٹر تھا اور جب تک بھی رہا تو کسی کے رحم وکرم کی وجہ سے نہیں بلکہ الحمدللہ اپنی محنت ولیاقت کی بدولت رہا) ہم آپ کو عدالت کا فیصلہ بتادیں گے چنانچہ یہاں لکھنؤ سے ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کی نقل لے کر ہم نے انہیں بھجوادی۔

اسی طرح مسلم پرسنل لاء سے متعلق جب شاہ بانو مقدمہ کا فیصلہ کورٹ سے آیا تو اس وقت دلی میں تھا۔ میں نے قومی آواز کے اپنے اسٹاف سے کہا کہ اس فیصلے کے خلاف لکھا جانا چاہئے، ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو Contempt of court ہوجائے گا، میں نے کہا

کہ نہیں، قرآن مجید کی تفسیر وترجمانی (Interpretation) کا حق تو صرف ان علماء کو ہے جنہوں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں، اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں اور اس کی خدمت میں اپنی عمریں کھپائی ہیں، چنانچہ ہم نے اس مقدمہ کے خلاف لکھا۔

اسی طرح مولانا علی میاں نے رائے بریلی میں مسلم پرسنل لاء سے متعلق ایک بڑی کانفرنس بلائی تھی، مولانا کلب عابد صاحب بھی اس میں شریک ہوئے تھے......اس کے بعد مسلمانوں ہی میں سے ایک دوسرے گروپ کے لوگوں نے رائے بریلی میں ہی اسی عنوان سے کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا، انہوں نے قومی آواز میں وہ خبر اشاعت کے لیے دی، ہم نے شائع کردی لیکن اس کے بعد وہ چاہتے تھے کہ ان کی کانفرنس کے انعقاد کی خبریں برابر شائع ہوتی رہیں ہم نے کہا کہ آپ کانفرنس کرنا چاہتے ہیں، کریں، اس میں جو Development ہوگا، اسے بھی ہم شائع کردیں گے لیکن یہ کہ ہم آپ کے لیے مہم چلائیں، Compaining کریں، یہ ہم سے نہیں ہوسکتا...... چنانچہ انہوں نے اس بات کی شکایت پرائم منسٹر راجیو گاندھی سے کی، انہوں نے بھی وہی بات کہی جو میں نے کہی تھی تو بہرحال، شاہ بانو مقدمہ کے سلسلہ میں انہوں نے قانون پاس کروایا، اس کا جو مسودہ بنا تو اس پر غور وخوض کے لیے جو میٹنگ ہوئی اس میں اس وقت کے وزیر قانون اشوک سین بھی موجود تھے، انہوں نے کہا کہ مسودہ میں فلاں لفظ یا فقرہ بدل دیا جائے یا اسے یوں کردیا جائے، تو راجیو گاندھی نے ان سے کہا کہ دیکھئے آپ خاموش رہئے، ہوگا وہی جو علی میاں جی کہیں گے......!

اسی بل کے سلسلے میں ایک موقع پر میں نے راجیو گاندھی سے کہا کہ آپ تو معقول آدمی ہیں، علی میاں نے آپ سے کہا اور آپ قائل ہوگئے اور آپ نے فوراً کاروائی کردی......تو انہوں نے کہا کہ نہیں، میں فوراً نہیں قائل ہوا تھا، میں تو نے مسئلہ کو سمجھا ہے، اس پر بحث کی ہے تب میں قائل ہوا ہوں......راجیو کے قائل ہونے کی وجہ تو علی میاں کی شخصیت تھی، مولانا علی میاں نے راجیو سے کہا کہ جس طرح تحریر کی شارٹ ہینڈ ہوتی ہے،

اسی طرح سیاست کی شارٹ ہینڈ ہے، جس کا معاملہ ہے اس سے پوچھ لیجئے، یہی سیاست کی شارٹ ہینڈ ہے، تو معاملہ مسلم پرسنل لاء کا ہے، ہم مسلمانوں کی طرف سے آپ کے پاس نہ تو کوئی سیاسی غرض لے کر آئے ہیں، نہ کوئی سیاسی مطالبہ لے کر آئے ہیں، بلکہ یہ مذہبی مطالبہ ہے کہ ہم قرآن کے پابند ہیں اور قرآن میں پرسنل لا کا جو معاملہ ہے وہ رہنا چاہئے اور یہ بات آپ کے اکابر نے بھی مانی تھی......تو راجیو قائل ہوئے، یہ بات ان کے دل میں اتر گئی اور انہوں نے پارلیمنٹ میں بھی یہ بات کہی اور مجھ سے بھی کہا کہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور ہم نے ان کی مذہبی ذمہ داروں سے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے اور جب ہمیں یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی سیاست نہیں ہے بلکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے تو ہم نے قانون بدلوادیا......تو یہ راجیو کی دیانت داری تھی۔

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ، اپریل ۲۰۰۰ء)

مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے سنیوں کو سنی بنایا!

مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب سے ایک ملاقات

لکھنؤ کے لئے شیعہ سنی مسئلہ ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے، اس سلسلہ میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب کے جانشین مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب سے لیا گیا ایک تفصیلی انٹرویو۔

سوال: مولانا محترم! آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ نہ صرف خاندان کے اعتبار سے آپ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے جانشین ہیں بلکہ آپ ان کے افکار اور ان کی تحریک کے وارث وامین بھی ہیں۔ امام اھل سنت کے ابتدائی حالات کے علاوہ ہم خصوصیت کے ساتھ آپ کی زبانی یہ بھی سننا چاہیں گے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی نے شیعیت کو اپنا ہدف بنایا؟

جواب: امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ نے کاکوری سے لکھنؤ آ کر حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب کے پاس تعلیم حاصل کی، گیارہ سال تک پڑھا، اس کے بعد مرزا حیرت دہلوی کے مطبع میں ملازمت اختیار کی، اس بات کا ذکر حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم نے نزہۃ الخواطر کے ضمیمہ میں کیا ہے۔

لکھنؤ میں نوابوں کے اثرات اور ان کے اقتدار وتسلط کے نتیجہ میں لوگ تبرا کرتے تھے اور ان لوگوں کو تبرا میں شامل کرتے تھے جنہیں تبرا کے مفہوم تک سے واقفیت نہیں ہوا کرتی تھی اس زمانہ میں ایک کتاب فتنۂ محشر کے نام سے لکھی گئی، وہ لوگ جن کے پاس اس کتاب کے نسخے موجود تھے انھوں نے مجھے بتایا اور دکھایا کہ بعض حضرات حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتے اور تبرا کی مجلسوں میں بھی

شریک ہوا کرتے، حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب کو کسی نے اس طرف متوجہ کیا تو حضرت نے ایسے لوگوں سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ تبرا کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اس پر ان حضرات نے جواباً کہا کہ نہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ تبرا کیا چیز ہے، ہم تو ایسی مجلسوں میں شریک ہوئے ہیں، جہاں کوئی ابوبکر وعمر تھے ان پر نعوذ باللہ لعنت کی جاتی ہے، اسی زمانہ میں مقبول احمد دہلوی (جن کا ترجمہ قرآن ترجمہ مقبول احمد کے نام سے ہے) سنی بن کر اودھ میں گھوم پھر رہے تھے اور سادہ لوح سنی عوام میں شیعیت کا پرچار کررہے تھے۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ کی صورتحال یہ تھی کہ عام طور سے جمعہ کے خطبوں میں خلفائے راشدین کا نام چپکے چپکے لیا جاتا تھا کہ کہیں شیعوں تک اس کی اطلاع نہ پہونچ جائے، اس قسم کی افسوسناک صورت حال تھی جس میں حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب نے مولانا عبدالشکور صاحب سے فرمایا کہ یہ کام کرنے کا ہے۔ چنانچہ مولانا نے اس کام کو شروع کیا۔ ان دنوں جب حضرت مولانا الیاس صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور یہاں تبلیغ کے سلسلہ میں کوشش فرمائی تو ان کے مشاہدہ میں یہ بات آئی کہ وہ لکھنؤ میں جہاں تشریف لے جاتے، وہاں وہاں انہیں تعزیہ، علم تابوت، شیعہ اور شیعیت سے واسطہ پڑتا، مولانا عبدالشکور صاحب سے انہوں نے یہ صورت حال بیان کی کہ یہ حالات ہیں، مولانا نے فرمایا کہ نہیں آپ کو مایوس ہونے کو ضرورت نہیں، آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں، چنانچہ پہلی مرتبہ چکمنڈی کی مسجد میں مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا الیاس صاحب علیہ الرحمۃ کو لے گئے، وہاں پہونچ کر وعظ کروایا، لکھنؤ میں تبلیغ کا یہ پہلا وعظ تھا، پھر اس کے بعد مولانا عبدالشکور صاحب نے تسلسل کے ساتھ نماز پر مواعظ کا سلسلہ شروع فرمایا، اس طرح نماز کی تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا اور لوگ نماز کی طرف مائل ہوئے، چونکہ نماز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فواحش ومنکرات سے روکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے مولانا کے سوز دروں کو قبول فرمایا اور لوگوں کی اصلاح ہوتی چلی گئی۔

مولانا عبدالشکور صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے شیعیت کا رد کیا بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے سنیوں کو سنی بنایا۔ حال کے ایک عالم ومحقق مولانا نسیم احمد

فریدی نے ایک ملاقات میں مجھ سے فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نے باڑھ رکھ دی تو ان حالات میں مولانا عبدالشکور صاحب اپنا کام کرتے رہے۔ انہوں نے دار المبلغین قائم کیا، دارالمبلغین کے قیام کا ایک مقصد یہ ہے کہ علماء کی تربیت کی جائے، خصوصیت کے ساتھ انہیں شیعوں کے مکائد اور ریشہ دوانیوں سے آگاہ اور باخبر کیا جائے۔ دارالمبلغین کے علاوہ مولانا نے پندرہ روزہ شہدائے اسلام کے نام سے درس کا ایک نظام بنایا، اس درس کو شہدائے اسلام کا نام اس لئے دیا چونکہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس طرح کے تذکرے جو حضرات صحابہ کرام اور شہدائے اسلام کے ذکر مبارک سے خالی ہوں جائز نہیں ہیں، چنانچہ مولانا عبدالشکور صاحب نے شہدائے اسلام کا عنوان دیا، جس میں تمام صحابہ کرام کی مدح وتوصیف اور ان کے فضائل ومناقب کے بیان کا اہتمام کیا تاکہ عوام ان سب سے واقف ہوا اور ان تک یہ بات پہونچے۔ اور اسی طرح دین کی روزمرہ اور ضروری باتوں کو عوام وخواص میں رائج کرنے کی جدوجہد ان ہی جلسوں اور درسوں کے ذریعہ فرمائی جو آج بھی الحمد للہ جاری ہیں چنانچہ ان محنتوں کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ لکھنؤ کے سنیوں نے تعزیہ داری سے توبہ کی شیعوں کے جو اثرات ان پر قائم ہو گئے تھے، اس سے ان کو نجات ملی اور الحمد للہ اب یہ صورت حال ہے کہ سنیوں کو تعزیہ داری سے سخت نفرت ہے۔

سوال: شیعہ سنی قضیہ کی بنیاد کیا ہے جلوس مدح صحابہ اور جلوس عزا کا پس منظر کیا ہے؟ اور آپ کے نزدیک اس مسئلہ کا کیا حل ہوسکتا ہے؟

جواب: شیعہ سنی قضیہ تو بہت قدیم ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ فتنہ رونما ہوا، کچھ لوگ جو یہودیت سے متاثر تھے، کچھ یہودی ہی تھے جیسا کہ رجال کشی میں عبداللہ بن سبا کے بارے میں ہے کہ ''کان یھود یا فاسلم ووالیٰ علیا'' کہ عبد اللہ بن سبا یہودی تھا، پھر اسلام لایا، پھر حضرت علی کی ولایت کا اعلان کیا اور رجال کی کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے'' وکان اول من اشھر بالقول بغرض امامة

علی '' کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی کی امامت کا اظہار کیا۔ لہٰذا مسئلہ امامت کی بنیاد عبداللہ بن سبا کی ڈالی ہوئی ہے۔ شیعہ اپنے آپ کو امامیہ کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں سبائی کہا جاتا ہے۔

لکھنؤ میں ان دنوں جو قضیہ ہے اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ چونکہ لکھنؤ میں یک طرفہ طور پر شیعہ حضرات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں اور وہ صرف اس پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ جلوس عزا، علم، تعزیہ، تلواروں سے ماتم زنجیروں سے ماتم، آگ پر ماتم کو اپنا شعار بتاتے ہیں، ادھر تقریباً بیس برسوں سے یہ مسئلہ اس طرح پیدا ہوا کہ ۱۹۷۴ء میں شیعوں کا علم، تابوت اور تعزیوں کا ایک جلوس، (جس کو ہماری اصطلاح میں مقبرہ والا جلوس کہا جاتا ہے) نکلا اور اس نے یکطرفہ طور پر پاٹا نالہ کی سڑک پر نوسنیوں کو قتل کیا، اس موقع پر حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم نے (اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے) اس حادثہ پر اخبارات میں صاف لفظوں میں بیان دیا کہ کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی کے بزرگوں کی برائی یا مذمت کرے، یہ جو المناک واقعہ پیش آیا ہے، وہ اسی عمل کا نتیجہ ہے۔ پھر اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں بلوچ پورا میں آٹھ آدمی مارے گئے، شیعہ علم اور تعزیہ لے کر جا رہے تھے، ان کے تبرا پر مزاحمت ہوئی تو ان المناک واقعات کی وجہ سے جلوس کے سلسلہ پر پابندی عائد کر دی گئی ان دونوں جھگڑوں میں کسی ایک شیعہ کو کوئی معمولی زخم بھی نہیں آیا۔

جلوس مدح صحابہ کا جہاں تک سوال ہے تو ایک زمانہ سے جلوس مدح صحابہ کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اسی زمانہ میں لکھنؤ تشریف لائے، ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور تحریک مدح صحابہ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ بات پیش نظر رہی ہے کہ چونکہ شیعوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے اماموں اور بزرگوں کی تعریف و توصیف باہر نکل کر کرتے ہیں، لہٰذا جس انداز سے وہ تعریف کرتے ہیں اسی انداز کی تعریف کا حق سنیوں کو بھی ملنا چاہئے۔ چنانچہ

حضرت مدنی، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب اور ظفر الملک ان سارے حضرات نے اس سلسلہ میں تحریک چلائی۔ تو جہاں تک مدح صحابہ کی بات ہے تو مدح صحابہ تو قرآن کریم سے ثابت ہے، اس سلسلہ میں کسی کو کلام نہیں۔ رہ گیا معاملہ جلوس کا، تو فقہاء کی صراحت ہے کہ صحابہ کرام کی مدح و ثناء شارع عام پر اسی انداز سے کرنا چاہئے جس انداز سے نعوذ باللہ ان کی برائی اور مذمت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ہم مدح صحابہ کے جلوس کو اصل نہیں کہتے بلکہ اس کو صحابہ کرام کی تعریف و توصیف کی اشاعت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں چونکہ اس تعریف و توصیف کا بیان کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور ضروری ہے۔ قرآن شریف پر جو ایمان رکھتا ہے وہ صحابہ کرام کی تعریف کا ضرور قائل ہوگا۔ اس صورت حال میں صحابہ کرام کی تعریف پر ہم کو اصرار ہے۔ جبکہ ہمیں اس سے روکا جاتا ہے۔ تمام علماء جانتے ہیں کہ اگر کسی مباح چیز سے کوئی آدمی روک دے تو پھر وہی چیز ضروری ہو جاتی ہے مثلاً ایک دوسرے کو سلام کرنا مستحسن ہے، اب اگر کوئی شخص اس بات سے روکے تو سلام کرنا واجب ہو جائیگا۔ اس طرح صحابہ کرام کی تعریف کے لئے حکم ہے، اس میں کوئی قید نہیں ہے نہ مسجد کی قید، نہ مدرسہ کی قید، نہ چہار دیواری کی قید، لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ اس پر پابندیاں عائد ہوں تو پھر ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا شہری حق استعمال کریں اور مدح صحابہ تو ہوتی ہے، مسجدوں میں ہوتی ہے، خطبوں میں ہوتی ہے جلسوں میں ہوتی ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ سڑک پر مدح صحابہ نہیں ہو سکتی تو جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فقہاء کی صراحت ہے کہ جب کسی جگہ کسی چیز پر روکا جائے تو اسی جگہ واجب بھی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں ہم کو جلوس پر اصرار ہے، ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں ہر مذہب کی اشاعت اور اس کے رواج کے مطابق اس پر عمل درآمد کی اجازت ہے۔

دوسری طرف شیعوں کے مطالبہ کا جہاں تک تعلق ہے تو اول تو یہ ہے کہ تعزیہ، علم، تابوت، کا خود ان کی مذہبی کتابوں میں کہیں کوئی ثبوت نہیں، جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں وہ ایجاد بندہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی غور طلب ہے وہ یہ کہ شیعوں کی جانب سے

اعلان ہے کہ ہم کو جلوس عزا کی اجازت دی جائے شارع عام پر ہم تبرا سے گریز کریں گے تو اس صورت میں سوال یہ ہے کہ یہ شارع عام کی قید کیوں لگاتے ہیں۔ گالی بکنے سے ماں باپ اپنے بچوں کو منع کرتے ہیں کہ بیٹے گالی نہ بکنا، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر میں گالی بکنا اور باہر نہ بکنا۔ اگر گالی بری بات ہے، اس سے زبان آلودہ ہوتی اور ذہن پراگندہ ہوتا ہے تو گالی نہ گھر میں بکیئے اور نہ باہر۔ تو شیعوں کا یہ کہنا کہ شارع عام پر تبرا نہیں کریں گے۔ یہ اعلان خود ایک گالی ہے۔ شیعوں کے معروف عالم کلب صادق صاحب نے کہا ہے کہ ہم شارع عام پر تبرا نہیں کریں گے اور موجودہ مجتہدین کے فتوی پر عمل کریں گے یہ کہنا مغالطہ آمیز ہے کہ ہم اپنے مجتہدین کے فتوی پر عمل کرتے ہوئے تبرا سے گریز کرتے ہیں، واضح ہو کہ شیعہ مجتہدین کے فتوی سے تبرا کی ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ تبرا ان کے اماموں کی ہدایت کی بنا پر ہے ان کے بقول جو معصوم تھے اس وقت کے تمام مجتہدین بھی عصمت امام تک نہیں پہونچ سکتے تو ایسی صورت میں مجتہدین کے اقوال اور فتاویٰ کیا معنی رکھتے ہیں جبکہ اماموں کی ہدایت اس کے خلاف ہو۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ تبرا کا وجود جہاں جہاں سے پایا جائے اس کا رد کیا جائے۔ خود مولانا کلب صادق صاحب کے والد ماجد مولانا کلب حسین صاحب تحریک تبرا میں تبرا کہہ کر جیل گئے۔ سروزیرحسن کے لڑکے علی ظہیر بیرسٹر تبرا کہہ کر جیل گئے۔ کتاب تحفظ عزاداری اور ان کی تصویریں ہمارے پاس محفوظ ہیں کہ جس میں تسبیح پر استخارہ کرتے ہوئے تبرا کر رہے ہیں اور جس پر لکھا ہوا ہے کہ تلاوت تبرا شریف کرتے ہوئے جیل جا رہے ہیں۔

شیعہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو جلوس عزا نکالنے کی اجازت دی جائے، سنی یہ چاہتے ہیں کہ ان کو جلوس مدح صحابہ نکالنے کی اجازت دی جائے، مسئلہ صرف اس بات پر رکا ہوا ہے کہ مدح صحابہ پر شیعہ حضرات تیار نہیں، وہ جلوس عزا نکالنا چاہتے ہیں، نکالیں، ہمارے نزدیک جلوس عزا جائز ہو یا ناجائز، اس سے قطع نظر ہم ان پر قدغن نہیں لگاتے لیکن اسی طرح ان کو جلوس مدح صحابہ بھی تسلیم کرنا چاہئے اور اس میں کسی قسم کی مزاحمت یا رکاوٹ

نہیں پیدا کرنا چاہئے، مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا۔

شیعوں کا مطالبہ سال میں ۹۵۳ جلوس نکالنے کا ہے، کون حکومت ۹۵۳ جلوس نکلوائے، پھر یہ کہ پاٹانالہ اور پل غلام حسین کی پتلی پتلی گلیوں سے پندرہ پندرہ ہزار آدمیوں کو لے کر وہ نکلتے ہیں، یہ ہے ان کے جلوس کی حقیقت۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوتے۔ گزشتہ دنوں آپ نے دیکھا کہ مسئلہ کو کس طرح سیاسی رنگ دے دیا گیا، دہلی کے امام بخاری صاحب یہاں آئے اور چیلنج کر کے چلے گئے کہ چاہے خون خرابہ ہو جائے، جلوس عزا نکل کر رہے گا، لہذا ہے کوئی معشوق اس پردہ زنگاری میں۔ مایاوتی کی حکومت میں شور مچا رہے ہیں جبکہ مایاوتی کی حکومت خود ہی دوسروں کی بیساکھیوں پر چل رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت گر جائے، لہذا وہ سختی بھی نہیں کر سکتی اور نہ ہی جلوس نکالنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

یہ قضیہ سپریم کورٹ میں بھی زیر سماعت ہے، یہ سارا پس منظر ہے جس کی وجہ سے ہاں ہاں نہیں نہیں والا معاملہ چل رہا ہے، اس لئے شیعہ اور شیر ہو رہے ہیں۔ پہلے وہ ایک علاقہ تک محدود رہا کرتے تھے، اب وہ حضرت گنج تک پہونچ گئے ہیں اور اس تعفن کو سارے شہر میں لے جانا چاہتے ہیں، اس سلسلہ میں مجھے ایک بات یہ کہنی ہے کہ یہ مسئلہ اب شیعہ سنی مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ تو سارے شہریوں کا مسئلہ بن گیا ہے، کرفیو میں مسئلہ یہ ہے کہ شہری زندہ کس طرح رہیں۔ مریضوں کا مسئلہ ہے کہ ان کو دوا کیسے ملے، حد یہ کہ جنازے رکھے ہوئے ہیں اب اس کی فکر ہے کہ تدفین کیسے ہو۔ کرفیو کے زمانہ میں اس صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہے جسے اس سے سابقہ پیش آیا، ان ہی دنوں میں دو جنازوں کی تدفین کے لئے بڑی مشکل سے اجازت ملی، میرے بھائی عبدالعظیم کے کہنے سننے سے محدود تعداد کو جنازہ کو قبرستان تک لے جانے کی اجازت مل سکی۔ بچے دودھ کے لئے بلک رہے ہیں۔ غریب مزدور پریشان ہیں، دکانیں بند ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ برادران وطن نے اس قدر پریشانیاں اٹھائیں لیکن اف تک نہیں کیا، اللہ انہیں خوش رکھے اور دنیا میں ان کو راحت دے

،ورنہ کرفیو کے دنوں میں یہ صورت حال تھی کہ کھالا بازار بند، رستوگی ٹولہ بند، صرافہ بند اور چوک میں جہاں لاکھوں کا کاروبار روزانہ ہوتا ہے بند، بینک بند یہ سب کیا مصیبت ہے، ایسا کوئی طریقہ اور ایسا کوئی مذہب ہوتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ یہ بات کہ شیعہ خواتین بازاروں میں پہونچ کر پولس کے سامنے مظاہرہ کریں اور ان کی تصویریں اخبارات میں صفحہ اول پر شائع ہوں، بتایئے یہ مظاہرہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے، شیعوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے اور یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔

رہ گیا ہمارا مسئلہ تو ہم تحریک مدح صحابہ کو صرف قانونی سطح پر لڑنا چاہتے ہیں، کسی قسم کے احتجاج کا فی الحال ہمارا ارادہ نہیں ہے۔ ہم نے ۲۶ جون کو ۲۱ آدمیوں کے ساتھ خود اپنی گرفتاری دی جس کے سلسلہ میں ہم نے اخبارات کو وضاحتی بیان بھی دیا کہ اگر پولس اور انتظامیہ نے کرفیو کے باوجود نرمی برتی اور شیعہ حضرات کو ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں پر آنے دیا تو ایسی صورت میں ہم اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہم نے اس مصلحت کو پیش نظر رکھا کہ اگر ہم گرفتاری کا اعلان کرتے تو شہر کے ہر علاقہ سے لوگ نکلتے اور پولس کے مظالم کا شکار ہوتے ہمارے اندر نہ اتنی چالاکی اور دسیسہ کاری ہے جتنی کہ ہمارے مخالفین میں ہے، اس لئے ہم نے خاموشی کے ساتھ رات کے وقت اسی لئے گرفتاری دی کہ احتجاج بھی درج ہو جائے اور حالات پر امن بھی رہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس وقت سنیوں کا کوئی معاملہ نہیں ہے، اس وقت مسئلہ شیعہ حضرات اور حکومت کے مابین کا ہے۔ ہم نے اعلان بھی کیا کہ ہم قانونی لڑائی لڑنا چاہتے ہیں۔ ہم کوئی ایسی تحریک نہیں چلانا چاہتے کہ جس سے عوام کو پرندوں چرندوں کو کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق ہو، شیعوں کو چاہئے کہ حکومت نے جو کمیٹی بنائی ہے، وہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم ملک گیر پیمانہ پر کھڑے ہو جائیں گے مناسب نہیں تشدد کا راستہ کسی بھی اقلیت کے لئے مناسب نہیں ہے۔

بابری مسجد کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں اس مسئلہ کو سڑکوں پر لایا گیا، ۴۹ء سے یہ مسئلہ

چل رہا تھا، بعض تنظیمیں اس کے لئے قانونی لڑائی لڑ رہی تھیں لیکن جب اس مسئلہ کو سڑک پر لایا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ بابری مسجد کے لئے جس پیمانہ پر احتجاج ہوا اس سے بڑھ کر اور کیا احتجاج ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں صرف ہندوستان ہی نہیں، ساری دنیا یک زبان تھی لیکن وہ سانحہ پیش آ گیا جو سب کے منشاء کے خلاف تھا۔ لہذا ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر بڑھانا ہوگا۔ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم اس مسئلہ میں کیوں خاموش ہیں، اس کے جواب میں ہم صاف لفظوں میں کہنا چاہیں گے کہ حضرت مولانا علی میاں کی سطح کی کوئی شخصیت بھی تو سامنے ہو، خمینی صاحب ہوتے تو حضرت مولانا ان سے گفتگو فرماتے۔ اس لئے اس مسئلہ میں تو حضرت مولانا کے شاگرد اور ان کے متوسلین ہی کافی ہیں، ان میں ندوہ اور دیوبند کے لوگ ہیں، ان میں میدان سیاست کے لوگ بھی ہیں، یہی کافی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اتنا اہم بھی نہیں ہے کہ اس میں حضرت مولانا کو مداخلت کرنی پڑے یہ تو ہٹ دھرمی اور ضد کا مسئلہ ہے۔

پاکستان میں شیعہ سنی قضیہ کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ پاکستان میں سنی حضرات امام اہل سنت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کے طریقہ اور نقشہ کو سامنے رکھ کر کام نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت نے کبھی بھی تشدد کی راہ اختیار نہیں کی اور نہ کبھی اسکا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ کراچی بلکہ پاکستان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے اندر نصب اور خروج پایا جاتا ہے اور خارجی اور ناصبی بھی ہمارے نزدیک اسی طرح راہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں جس طرح رافضی۔ اعتدال کی راہ صرف وہ ہے جو اہل سنت و جماعت کی راہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے قطع نظر کہ ہندو ہوں یا مسلمان یا شیعہ، کوئی ہو تشدد کی راہ اختیار کرنا نہایت غیر انسانی اقدام ہے، ایک دوسرے کی مسجدوں پر بم مارنا، مدرسوں کو نشانہ بنانا ان سب کی بھرپور مذمت کی جانی چاہئے۔ اس سے خواص کے قتل کا رواج پڑتا ہے اور جب یہ ہونے لگتا ہے تو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں، قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بھی اور اشارۃً بھی یہ بات موجود ہے کہ خواص کو قتل نہ کرو

اور رھبان کو قتل نہ کرو، وہ لوگ جو اپنی اپنی خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے ہیں ان پر حملہ نہ کرو، یہ کیوں کر کہا گیا؟ کیا اس موقع پر مسئلہ جہاد موقوف ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ اس قسم کے اقدام سے امن عامہ میں خلل پڑتا ہے اور اسلام نے امن عامہ میں خلل اندازی کو کبھی بھی گوارا نہیں کیا۔ اس لئے اگر خدانخواستہ قتل وغارت گری کا یہ سلسلہ نہ رکا تو پھر مسجدیں بھی باقی نہیں رہیں گی، یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا (الحج) اس میں مساجد کے ساتھ دیگر عبادتگاہوں کا ذکر اسی لئے ہے کہ دیگر عبادتگاہیں بھی برقرار رہیں چنانچہ خلفائے راشدین نے بھی اس کا التزام رکھا کہ کسی کا مذہبی تقدس پامال نہ ہونے پائے چاہے وہ موافق ہوں یا مخالف۔

پاکستان میں یہ جو سلسلہ ہے اس کی تفصیلات ہمارے علم میں نہیں ہے، لیکن بہر حال قتل وغارت گری کا یہ سلسلہ مذموم ہے۔ اور اسے بند ہونا چاہئے۔

سوال: لکھنؤ کے سنی مسلمانوں کے نام آپ کا پیغام۔

جواب: سنیوں کے لئے ہمیشہ سے یہ بات کہی گئی ہے اور آج پھر کہی جا رہی ہے کہ وہ پرامن رہیں، سڑکوں پر احتجاج اور تشدد کی راہ سے گریز کریں اس راستہ سے نہ کام بنا ہے اور نہ بنے گا۔ وہ اپنا احتساب کریں اور مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جائیں۔ صحابہ کرام کے محض تذکروں پر اکتفاء نہ کریں بلکہ ان کی زندگیوں کو اپنی زندگیوں میں اتار لیں، ان کے نقش قدم پر چلیں، جن کے چہرے پر داڑھی نہیں ہے وہ داڑھی رکھیں، شادی بیاہ کے موقع پر رسم ورواج اور خرافات سے اجتناب کریں۔ نسل نو کی فکر کریں انہیں دین کی بنیادی باتوں سے آشنا بنائیں اور ان کے ایمان ویقین کو بنانے کی اپنے اندر تڑپ پیدا کریں۔ تعلیم پر خصوصی توجہ ہو اسی طرح رفاہی کاموں میں سنیوں کو پیش پیش رہنا چاہئے، کس قدر دکھ کی بات ہے کہ اس شہر میں ہمارا اپنا ایسا کوئی اسپتال نہیں ہے جسے مرکزی حیثیت حاصل ہو جبکہ عیسائی مشنریاں یہ کام کر رہی ہیں۔ تو ضرورت ہے ہمارے اپنے اسپتال کی جس میں بلا تفریق مذہب وملت مریض آئیں اور وہاں انہیں علاج کی سہولتیں میسر ہوں۔ شہر میں

جامع مسجد نہیں ہے، اسے بننا چاہیے۔ جو مسجدیں ہیں لیکن ویران پڑی ہیں۔ انہیں آباد کیا جانا چاہئے۔ وہ اسلامی تحریکیں جن پر ہمارے بزرگوں کی چھاپ ہے اور جن کو ان کی تائید و سرپرستی حاصل ہے، ان میں ہم لگیں، وقتاً فوقتاً اکابر کی خدمت میں حاضر ہوتے رہا کریں، علماء سے ربط رکھیں اور دینی ودنیاوی دونوں امور میں ان کا مشورہ شامل حال رہے۔

سوال: حالیہ شیعہ سنی مذاکرات کے سلسلہ سے آپ کس حد تک پرامید ہیں؟

جواب: پچھلے دنوں لکھنؤ کے حالات کی خرابی کے بعد میں نے دلی کے ایک سفر میں مولانا مجاہدالاسلام صاحب قاسمی سے ملاقات کی اس موقع پر کلب صادق صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے سامنے یہ بات آئی کہ بھئی لکھنؤ میں فساد کیوں ہو رہا ہے، اس کے اسباب کیا ہیں، میں نے ان سے بات کی کہ شیعہ صاحبان اس وقت جلوس ہائے عزا کے درپے ہیں کہ کسی طرح انہیں بیس سال سے رکے ہوئے جلوس نکالنے کا موقع ملے لیکن حکومت کی کڑی پابندیوں کی وجہ سے وہ نہیں نکال پا رہے ہیں اور ان کو موقع نہیں مل پا رہا ہے۔ اسلئے وہ چاہتے ہیں کہ احتجاج کر کے اس بندش کو ختم کریں۔ وہ جو کچھ اس کے بعد ہوا وہ کہا میں نے مولانا مجاہدالاسلام قاسمی صاحب سے اور کلب صادق صاحب سے کہ آپ حضرات کو اس کا علم ہے کہ عزاداری آپ کے مذہب کا کوئی جزء نہیں ہے، آپ کے کسی امام سے ثابت نہیں ہے آپ کے اماموں کے زمانہ میں نہ تعزیے نکلے نہ تابوت نکلے نہ علم نکلے، لہذا آپ اس پر اصرار نہ کیجئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے دل میں جو جذبہ عزا داری کے جلوس کو نکالنے کا پیدا ہوتا ہے وہی جذبہ سنیوں کے دلوں میں مدح صحابہ کے جلوسوں کے سلسلہ میں بھی پیدا ہوتا ہے، لہذا آپ اپنے لئے اگر عزاداری کو پسند کرتے ہیں تو سنیوں کے لئے جلوس مدح صحابہ بھی آپ پسند کیجئے، یہ سیدھی سیدھی بات ہے، رہ گئی بات تبرا کی۔ اب آپ یہ کہتے ہیں کہ تبرا شاہراہ عام پر نہیں ہوگا تو یہاں سے شاہراہ عام کی قید ہٹا دیجئے، تبرا کسی عنوان سے نہیں ہوگا۔

آج کل جو مذاکرات ہو رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیعہ اور سنی دونوں نرم لہجے

میں گفتگو کر رہے ہیں، شیعوں نے پہلے ہم سے یہ مطالبہ کیا کہ صاحب آپ کو جلوس عزاداری پر کیا اعتراض ہے؟ ہم نے کہا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ جس طرح چاہیں اپنے رواجی طور پر رسمی طور پر جس طرح چاہیں جلوس نکالیں لیکن آپ کے لئے نہ تو سڑکوں پر اور نہ ہی اندرون خانہ، کسی کے مذہب کی دلآزاری یا ان کے بزرگوں پر تبرا جیسی نامناسب بات کو زبان سے نکالنا مناسب نہیں ہے، اس پر سب لوگ ہمارے خیال سے تیار ہیں۔

دوسری بات یہ ہم نے کہی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے تو جب وہ محبت بڑھ جاتی ہے تو آپ سڑکوں پر آ جاتے ہیں، ہمارے یہاں حضرات خلفائے راشدین حضرات صحابہ کرام، حضرات اہلِ بیت ان سب کی محبت دلوں میں ہے، لہٰذا ہم اگر سڑکوں پر آ کر ان ہی نقوش پر جن نقوش پر آپ ہیں، آ جاتے ہیں اور آ کر کے جلوس نکالتے ہیں، تو آپ کو کیوں اعتراض ہوتا ہے، ان کی طرف سے چھ علماء تھے اور میں اپنی طرف سے سے تنہا تھا، میں نے اپنی طرف سے کہا کہ آپ اس کی کوشش کریں کہ ضد کا کوئی پہلو نہ ہونے پائے، جب مدح صحابہ ہو رہی ہے میلادوں میں ہو رہی ہے، آپ کو تسلیم، خطبوں میں ہو رہی ہے، آپ کو تسلیم، سارے مقامات پر ہو رہی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کا نام رکھا ابوبکر و عمر اور عثمان۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲۵ سال تک خلفاء ثلاثہ کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ تو پتہ نہیں آپ کو کیوں اعتراض ہے۔

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ، جولائی اگست ۱۹۹۷ء)

عربی کے ساتھ اپنی مقامی زبان کو بھی اہمیت دیں!

معروف عالم و معلم اور ادیب و مصنف

معتمدِ تعلیم ندوۃ العلماء، مشیر (اعزازی) رابطہ عالم اسلامی

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سے ایک ملاقات

نہیں معلوم کہ پٹنہ سے آٹھ کیلومیٹر پچھّم کی طرف واقع ایک قصبہ پھلواری شریف کی وجہ تسمیہ کیا ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ بستی اہل علم و اہل دل کی بستی رہی۔ ایک ایسے چمن کے مانند جس میں علم و فضل، شعر و ادب، رشد و ہدایت اور قیادت و سیادت کے گلہائے رنگا رنگ کھلتے اور مسکراتے رہے اور جن کی بہار نے بہار کو صوبۂ بہار بنا دیا...... خوشبو پھر خوشبو ہے، یہ جغرافیائی حدود کی پابند نہیں ...... یہ خوشبو علم و ادب کی خوشبو تھی جو دل و دماغ میں رچ بس جاتی اور روح میں سما جاتی ہے، اس سے سرشار ہونے والا شخص جہاں ہوتا ہے، ایک جہان آباد کر لیتا ہے...... اسی مردم خیز قصبہ پھلواری کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی مخدومی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مدظلہ بھی ہیں...... پھلواری سے موصوف کو وطن کی نسبت تو حاصل ہے ہی، مشاہیر پھلواری کے اوصاف و کمالات سے بھی مناسبت ہے، اس لحاظ سے وہ پھلواری شریف کے چمنستان علم و ادب کی خوشبوؤں کے امین بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے تعارف میں کچھ لکھنا خود کو متعارف کرانے اور سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے چنانچہ یہ چند سطریں تعارف پر نہیں، تاثر

پر مبنی ہیں......موصوف نے علمی وروحانی خانوادہ میں آنکھیں کھولیں، ان کے والد ماجد ممتاز عالم دین تھے، ابتدائی تعلیم پھلواری شریف میں ہوئی، علم کی لذّت انھیں فرنگی محل لے آئی پھر ان کے ذوق نے ندوہ کی طرف رہنمائی کی جہاں جوہر شناس اساتذہ اور مفکر اسلامؒ جیسی رجال ساز شخصیت کی وہ توجہات نصیب ہوئیں کہ وقت آنے پر موصوف معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ندوہ کی علمی وتعلیمی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں...... ندوہ کی ایک بنیادی خصوصیت جدید صالح وقدیم نافع کا امتزاج ہے، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سازی میں بھی امتزاج کی ایسی کیفیات کا بڑا دخل دکھائی پڑتا ہے...... خانوادہ علمی وروحانی! یہاں دیکھنے والا علم وعشق کا امتزاج دیکھے!! علمی مراحل پھلواری شریف، فرنگی محل کے مدرسہ قدیمہ اور ندوہ میں طے ہوئے اور پھر تعلیم اور تدریس کے سلسلہ میں جہاں دیارِ مقدس میں رہنا مقدر ہوا وہیں دیارِ غیر ''یورپ'' میں بھی کچھ عرصہ گزرا۔ ایسے امتزاج وعناصر سے جس شخصیت کی تشکیل ہو، وہ شخصیت قوس قزح کی مانند ہوتی ہے، ہمہ جہت، منفرد وممتاز!!

راقم عاجز کو ڈاکٹر صاحب سے بالواسطہ پڑھنے اور استفادہ کا موقع تو ہاتھ نہ آیا البتہ ان کی نگارشات کو پڑھتے رہنے کا اتفاق ہوتا رہا اور اب تو نگاہوں کو ان نگارشات کی تلاش وجستجو رہتی ہے، کیا ہی دل کو چھوتا ہوا اچھوتا اسلوب ہے! ان کا قلم شبنم کے موتی بھی لٹاتا جاتا ہے اور ضرورت پیش آنے پر شعلہ کی آنچ کا احساس بھی دلاتا ہے!!

ڈاکٹر صاحب مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہیں، اُس مقدس دیار میں جہاں کی خاک ہم خاک نشینوں کے لئے سرمہ اکسیر کا درجہ رکھتی ہے......لیکن ماں، مادری زبان اور مادرِ علمی سے وابستگی فطری بات ہے...... چنانچہ ڈاکٹر

صاحب کا ندوہ سے رشتہ استوار رہا، موصوف معتمد تعلیمات تو ہیں ہی، وہ حضرت مفکر اسلامؒ کے معتمد علیہ بھی رہے ہیں اور موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے رفیق وشریک کار بھی ہیں، موصوف حضرت مفکر اسلام کے سوانح نگار ہیں، اور ان کے افکار کے شارح وترجمان بھی۔ حضرت مولاناؒ پر لکھنے والے لکھتے رہیں گے لیکن اس کے لئے وہ ''کاروان زندگی'' کے ساتھ ساتھ ''میر کارواں'' سے بھی استفادہ ضرور کریں گے، وہ اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتے، ''کاروانِ زندگی'' کو کما حقہ، سمجھنے کے لئے ''پس کارواں'' کا جاننا ضروری ہے اور یہ ضرورت ''میر کارواں'' کے مطالعہ کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی...... اِن دنوں جب کہ ڈاکٹر صاحب ندوہ میں تشریف رکھتے ہیں، ہم نے غنیمت جانا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے، چنانچہ ایک سوالنامہ تیار ہوگیا۔ اس سوالنامے کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے عاجز کے نام جو گرامی نامہ تحریر فرمایا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کا سوال نامہ پیش نظر ہے، اس کے جوابات اگر اسی تفصیل سے عرض کروں تو گویا اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھنا پڑے گی، جس کے لئے میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، اور سچی بات یہ ہے کہ اپنی زندگی میں کوئی انوکھا پن نہیں پاتا جو دوسروں کے لئے قابل عبرت یا قابل استفادہ ہو، اگرچہ اس حقیقت سے واقف ہوں کہ انسان کو اپنے ذکر میں مزہ ملتا ہے، اور آدمی اپنے آباء واجداد کا ذکر اس شدت سے اور جوش کے ساتھ کرتا ہے کہ خالق کائنات جو انسان کی فطرت کی تمام کمزوریوں سے واقف ہے، اس نے حکم دیا کہ اللہ کا ذکر اس طرح کرو جیسے تم آباء واجداد کا ذکر کرتے ہو''**فاذکروا الله کذکرکم آبائکم**" ایک عامیانہ زندگی جو

شکم پروری اور آرام طلبی میں گذری وہ کروڑہا انسانوں کے ساتھ مشترک ہے، اس کو پڑھنے والے یا اس سے دلچسپی لینے والے صاحب تحریر کے آل واولاد اور افراد کنبہ ہوسکتے ہیں، مجھے متعدد ایسی سوانح حیات سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا جس میں عام انسانوں کے لئے کوئی نصیحت اور عبرت کا سامان نہیں ہے اسی طرح اگر میں بھی آپ کے سوالات کو بنیاد بنا کر اپنی سوانح لکھوں تو کوئی کام کی چیز نہیں ہوگی، لیکن آپ کے مطالبہ کا احترام بھی پیش نظر ہے، اس لئے اختصار کے ساتھ جواب لکھتا ہوں اگر اس کا کوئی جز آپ مفید پائیں تو شائع کرسکتے ہیں، اور جو باتیں کسی دوسرے مسلمان کے لئے نفع بخش نہ ہو اس پر کاغذ، روشنائی، کتابت وطباعت کے اخراجات ایک طرح کا اسراف ہوگا، امید کہ آپ میری اس صراحت بیانی کو ''مصنوعی خاکساری'' اور متکبرانہ تواضع نہیں سمجھیں گے''

یہ سطریں بتاتی ہیں کہ پھلدار ٹہنی یقیناً جھکی ہوتی ہے نیز ان سطروں سے انداز لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف نے اپنے فکر وعمل کے چراغ کی لو کو تیز تر کرنے میں حضرت مفکر اسلامؒ کی شخصیت کا کیسا اثر قبول کیا ہے کہ ان کے مربی جلیل کا ایک بنیادی وصف، انکارِ ذات تھا۔

صفحات کی تنگ دامانی اگر مانع نہ بنتی تو حق تو یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو پیش کئے گئے سوال نامہ میں رابطہ عالم اسلامی، جدید عربی، مغربی تہذیب اور لسانیات جیسے موضوع بھی شامل ہوتے۔ اس کا راقم سطور کو احساس ہے، بہرحال جو کچھ بن پڑا وہ ربِ کریم کے شکر اور موصوف کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ایک جہاں دیدہ عالم ومعلم اور صاحبِ طرز ادیب ومصنف کا درج ذیل انٹرویو جو تاریخی یادداشت بھی ہے اور نشانِ منزل بھی۔

سوال: چند باتیں آپ کے اپنے متعلق۔ سن پیدائش، خاندانی ماحول وپس منظر تعلیم وتربیت، بچپن وزمانہء طالب علمی کی وہ شخصیتیں جن کا آپ نے اثر قبول کیا۔

جواب: میرا نام عبداللہ ہے، میرے والد کا نام محمد عباس تھا، اور ندوہ میں میں نے تعلیم حاصل کی ہے اس لئے ندوی اپنے نام کے ساتھ لکھتا ہوں۔ اس طرح میرا نام ثلاثی مرکب عبد اللہ عباس ندوی ہوا۔ عربی روایت کے مطابق ''ابن'' کو درمیان سے حذف کردیا گیا۔ سن پیدائش ۱۹۲۵ء کا آخری مہینہ ہے، خاندانی ماحول وپس منظر یہ ہے کہ میرے والد اور آباء واجداد سات آٹھ پشتوں سے علم دین سے متعلق رہے، تعلیم وتعلم، درس وتدریس، تزکیہ وتربیت میں زندگی گذاری، معیشت درویشانہ رہی ''قدر علیہ رزقہ'' کہا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بچپن میں نہ کوئی امتیاز تھا اور نہ خدانخواستہ کوئی گراوٹ، وہ شخصیتیں جن کا میں نے اثر قبول کیا، ان میں سب سے پہلے میرے والد مولانا مفتی محمد عباس صاحبؒ اور میرے بڑے بھائی مولانا شاہ نعمت امام پھلواری مرحوم تھے۔

میرے بڑے بھائی جن کا ابھی میں نے نام لیا اور عرض کیا کہ ان کے علم واخلاق کا مجھ پر گہرا اثر پڑا ہے، فرنگی محل کے ایک مدرسہ میں جس کا نام مدرسہ قدیمہ تھا، پڑھایا کرتے تھے، منطق ویونانی فلسفہ کی اعلیٰ کتابیں زیر تدریس تھیں، فارسی کے فی البدیہہ شاعر تھے، میں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ان کے پاس لکھنؤ آگیا، اور تین سال تک مدرسہ کے مدرسین سے نحو میں شرح جامی، اور فقہ میں شرح وقایہ اول پڑھ کر ندوہ میں داخلہ لے لیا۔ درجہ پنجم سے نہم تک پڑھنے کے بعد کسب معاش میں لگ گیا اور ندہ کے ایک مخلص حکیم شرافت حسین صاحب مرحوم نے اپنے گاؤں (رحیم آباد) میں اس کام پر متعین کیا کہ وہاں معمر لوگوں کو قرآن کریم کا ترجمہ پڑھاؤں، اور خارج اوقات میں بچوں اور بچیوں کو تعلیم دوں۔

اپنی عمر کے اکیسویں سال میں تھا ابھی مزید پڑھنے اور آگے بڑھنے کا زمانہ تھا مگر میں مولوی صاحب بن چکا تھا، اس قصبے کے رحیم آباد کے زمیندار اور عوام اچھے لوگ تھے اور ہیں

مگر اب بھی اس راہ سے کبھی گذر ہوتا ہے تو یہ شعر یاد آتا ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال
یاد آگیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر

والد مرحوم کا انتقال ہو چکا تھا، ۱۹۳۴ء کے زلزلہ نے گھر کی معیشت تباہ کردی تھی، رزق حلال کی تلاش میں جو کام ملا، کیا۔ میرے استاذ ومحسن حضرت مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ نے مجھ پر ترس کھایا اور فرمایا "تذببت قبل ان يحصرما" تم اپنی عمر کے اس حصہ میں ہو جب ایک انگور کی حیثیت تھی، لیکن وقت سے پہلے "کشمش" بن گئے پھر انہی کی کوشش اور حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کی منظوری سے ندوہ میں مدرس بن کر آیا۔ اور زندگی میں پہلی بار شب وروز کی محنت سے تعلیمی دور کے نقائص دور کئے۔ پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سرپرستی میں لیا اور تبلیغی جماعت کے ساتھ حجاز گئے، وہاں کے فرائض کی مدت پوری کرکے ایک مصری استاذ سے نحو وبلاغت کی کتابیں پڑھیں اور شیخ عبد الحق دہلوی کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ اور سال سے زیادہ وقت گذار کر ندوہ واپس آیا۔ ادیب اول کا عہدہ دیا گیا۔ گیارہ سال بعد پھر عرب گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ریڈیو میں ملازمت کی اور رابطۃ العالم الاسلامی قائم ہوا تو کئی شعبوں کا انچارج بنایا گیا۔ چھٹی کا استحقاق پاکر انگلستان جاکر پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما لسانیات میں حاصل کیا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کرکے حجاز واپس آیا۔ چند سال رابطہ میں گذار کر یونیورسٹی سے ملحق ہوا۔ وہاں مساعد استاذ (اسسٹنٹ پروفیسر) کا درجہ ملا۔ ترقی کرکے فل پروفیسر ہوا ہی تھا کہ عمر کے لحاظ سے ۱۴۰۵ء میں ریٹائرڈ ہو گیا۔ ایک سال یونیورسٹی کی طرف سے پھر بعد میں اپنی ذاتی حیثیت سے ہر سال ایک یا دو بار لکھنؤ آنے جانے لگا۔ ذریعہ معاش پنشن ہے، یونیورسٹی سے غیر رسمی تعلق اب بھی ہے، کچھ امتحانات، تھیس کے جانچ کا کام مل جاتا ہے اور کچھ نگرانی کا۔ اللہ کی رزاقی وستاری میں بہت قانع اور خوش ہوں۔ ہوس کا پیٹ تو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ **لا يملأ بطن ابن آدم الا التراب**،

لہذا کوئی ہوس بڑھائی نہیں۔ ندوہ کی جو خدمت تعلیمی میدان میں کرسکتا ہوں وہ زندگی کے بقیہ ایام گذارنے کا بہانہ ہے۔ عمر کی اس منزل میں ہوں کہ ہر آنے والا دن دنیا سے دور اور قبر سے قریب کررہا ہے۔

سوال: آپ کے زمانہ طالب علمی کا ندوہ کیسا تھا؟ اس دور کی کچھ یادیں......

جواب: میرے زمانہ طالب علمی کا ندوہ آج سے بہت مختلف تھا، اس وقت طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، اور بڑی عمر کے لڑکوں کے لئے ایک ہوسٹل تھا، جس کو شبلی ہوسٹل کہا جاتا تھا، جواب الحمد للہ انگریزی لفظ ہوسٹل کے بجائے دار الاقامہ کہلاتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا دار الاقامہ نہیں تھا، دور طالب علمی کی کچھ یادیں یہ ہیں کہ میرے اساتذہ اپنے اپنے فن کے ماہر اور اخلاص وصداقت کے نمونہ تھے، ان میں حضرت شاہ حلیم عطاءؒ تمام درسیات کے ماہر تھے، یاداشت بہت قوی تھی، قرآن کریم کے حفظ کے ساتھ سنن ابن ماجہ بھی حفظ کیا تھا، صحاح کی طول طویل حدیثیں بھی ان کو مع اسناد کے زبانی یاد تھیں، دینیات کے ساتھ ادبیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ہاں فن تدریس اور اس کی نزاکتوں کا انہیں تجربہ نہیں تھا، نہ اپنی عظمت علمی کو جتایا اور نہ اس کو باور کرانے کا ان کے اندر کوئی داعیہ تھا، ان کی سادگی قابل رحم اور ان سے انتساب قابل فخر تھا، استاذوں میں دوسری شخصیت جس کی سیرت وصداقت کو اس دور میں اسلام کا معجزہ سمجھتا ہوں، وہ مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت تھی، جن سے مسلسل تین سال تک پابندی کے ساتھ درجوں میں سبق لیے، ان کے ساتھ سفر کئے، ان کے تبلیغی دوروں میں شریک رہا، اور ان سے جدا ہو کر جب باہر ملکوں میں گیا، علمی ودینی شخصیتوں سے سابقہ پڑا حضرت مولاناؒ کی عظمت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی، بلکہ تجربات جتنے بڑھتے گئے، مطالعہ جتنا وسیع ہوتا رہا حضرت مولاناؒ کی شخصیت دل ونگاہ میں بڑھتی رہی، دوسرے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کو مفردات لغت اور نحو میں کامل دسترس حاصل تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ لغت میں کسی غیر مانوس لفظ کے بارے میں ان سے پوچھا کہ کس باب سے ہے تو انھوں

نے وہی بیان کیا جو ''قاموس'' اور ''المنجد'' میں پاتا تھا، نحو کا کوئی مسئلہ پوچھا تو الفیہ ابن مالک کا شعر سنا کر قاعدہ بتا دیا کرتے تھے، قرآن کریم کی بلاغت پر ان کا اور حضرت مولانا علی میاںؒ اور شاہ حلیم عطاء قدس سرہ کا ذوق یکساں تھا ان سب کو سینکڑوں اشعار یاد تھے اور ہزاروں جملے ادب عربی کے ان کی زبان پر تھے، لیکن جب قرآن کریم کی کوئی آیت اس کے مقابل میں پڑھتے تو ایسا لگتا کہ ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی ہے، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سراپا شفقت وکرم استاذ اور نگراں تھے، اور مجھے جو بھی ٹوٹی پھوٹی اردو آئی ہے وہ انہیں کی تربیت کا ثمرہ ہے، خود انتہائی متشرع اور پابند سنت، سنن ونوافل کا اہتمام رکھنے والے تھے، مگر طلبہ کے تساہل کو نظر انداز کرنے کے قائل تھے۔ اسی طرح اور اساتذہ جن میں مفتی محمد سعید صاحب علیہ الرحمہ تھے، عبارت خوانی کے بعد صورت مسئلہ کو اس درجہ وضاحت سے بیان کردیتے کہ پھر دوبارہ کتاب کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، انگریزی کے ماسٹر مسرور صاحب مرحوم تھے، جو شہر کے کسی علاقہ میں رہتے تھے اور پیدل ندوہ آتے اور راستہ بھر درود شریف پڑھتے رہتے تھے، ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم یعنی ماسٹر عبدالسمیع صاحب سراپا شفقت اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ خدا کرے کہ ہمارے اس دور کے اساتذہ بھی اسی طرح کے ہوں جن کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اور جن کی عظمت کا دل معترف ہے، اور جن کے لئے پابندی سے دعائے مغفرت کرتا رہتا ہوں۔

سوال: ندوہ نے جدید صالح وقدیم نافع کی صدا لگائی تھی، ایک حلقہ مدارس کی افادیت ومعنویت میں اضافہ کی خاطر نصاب میں عصری ودینی تعلیم شامل کرنے کی ضرورت پر زور دے رہا ہے، ایسے مشوروں پر آپ کا تاثر؟

جواب: ندوہ نے قدیم صالح اور جدید نافع کی جو صدا لگائی تھی اور جن تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نصاب رکھا گیا تھا، وہ ہر زمانہ میں تغیر کا طالب اور ترقی کا محتاج ہے اور رہے گا، جس طرح ہمارے بزرگوں نے اصلاح نصاب کی کوشش کی تھی کہ آنے والی نسلوں کو اسی طرح کی کوشش جاری رکھنا ہوگی، ایک اصولی فرق ہمارے اور جدید دانش گاہوں کے

درمیان ہے کہ ہم اپنی اصل محنت اور کوشش کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور احکام شریعت پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس کا حصول بغیر عربی زبان سے گہری واقفیت کے نہیں ہوسکتا، اس لئے اس زبان کو ایک زندہ اور علمی زندگی سے پیوست رکھ کر پڑھنا پڑھانا چاہتے ہیں، عصری اور حکومت کے زیر سایہ چلنے والی دانش گاہیں اور دوسرے مضامین کو مرکزی حیثیت دینے والے ادارے بے شمار ہیں، جہاں اسلامیت کو ضمنی حیثیت حاصل ہے، اور یہاں اسلامیات کو مرکزی حیثیت اور دوسرے علوم وفنون کو ضمنی مقام حاصل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اس ادارے پر محنتیں صرف کرنا اور قوم کی مالی امداد بیکار ہوتی۔

سوال: ماشاء اللہ آپ ایک صاحب طرز ادیب ہیں، نو آموز قلمکاروں کو آپ مطالعہ کے سلسلہ میں اور لکھنے لکھانے کے سلسلہ میں کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

جواب: آپ کے سوال کا ابتدائی جملہ میری حیثیت سے زیادہ ہے، ہاں! نوجوانوں کو مطالعہ کے سلسلہ میں اور لکھنے لکھانے کے سلسلہ میں یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ کسی صاحب فن کی نگرانی میں اپنے مطالعہ کو وسعت دیں ''حسن خط'' کے لئے تختی یا کاغذ پر حرف بنانے کی مشق درکار ہوتی ہے، اور ''حسن تحریر'' کے لئے مطالعہ کی شرط ہے، اور نحو وبلاغت کے قواعد کے بغیر عملی مشق کے اور بغیر تطبیق کے مفید نہیں ہے، میں نوجوانوں سے اگر کچھ کہہ سکوں یا ان تک میری آواز پہونچ سکے تو کہوں گا کہ عربی کے ساتھ اپنی مقامی زبان کو بھی اہمیت دیں، استاذ کی نگرانی میں مطالعہ کی فہرست بنائیں اور پڑھیں، وسعت مطالعہ کا ابال ان کی تحریروں کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

سوال: آپ ادب اسلامی کے نقیب بھی ہیں، اطلاعاتی انقلاب نے وسائل ومواقع غیر صالح لٹریچر کو مہیا کردئے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان حالات میں آپ ادب اسلامی کی فکر رکھنے والوں سے کیا کہنا چاہیں گے کہ وہ خود کو اور اپنی قلمی کاوشوں کو کیسے مؤثر ثابت کرسکیں؟

جواب: آپ کے اس سوال کا ابتدائی جملہ میرے لئے خود فریبی کا ایک انجکشن ہے، بہر

حال جواب عرض ہے کہ مخرب اخلاق لٹریچر کا مقابلہ پورے طریقے سے نہ ہم کر سکے ہیں نہ دنیا کی کوئی تحریک کرسکی ہے، شیطان کو ڈھیل دینے والے رب کریم نے مسٹر ابلیس کو ابتدائے آفرینش میں جو ڈھیل دی تھی وہ اپنا کرشمہ دکھائے گی۔ جنس اور جسم کے راستے سے انسانی دماغ میں داخل ہونے والے وسائل کا مقابلہ پورے عالم اسلام کی خانقاہیں، درسگاہیں اور ادارے نہ کر سکے ہیں نہ کرسکیں گے، البتہ کچھ افراد کو ہم اس شر وفساد کے دلدل سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کو دین کا معجزہ سمجھئے، وسائل اطلاعات نے قدم آگے بڑھائے ہیں، اس کی اثر پذیری کا مجھے بھی اندازہ ہے، اور اپنے عجز اور کوتاہی کو بھی ہم جانتے ہیں، اور بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے طرز کو اپنا نہیں سکتے۔ برہنگی کا مقابلہ ہم برہنگی سے نہیں کر سکتے، ہاں عریانیت آپس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کررہی ہے، ایک نائٹ کلب دوسرے نائٹ کلب سے بازی لے جانے پر اپنی کاوشیں صرف کررہا ہے جہاں انسانی جسم کی خرید وفروخت جاری ہے ہم اخلاقیات کی دعوت دینے والے، ستر پوشی کو دین بتانے والے، اخلاقی قدروں کو دنیا کے لئے دماغی راحت رسانی کا ذریعہ سمجھنے والے، عصری وسائل اطلاعات کے ساتھ نہیں دے سکتے، مزید صراحت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی جاسکتی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مفید عناصر کو ہم حاصل کر کے اپنی مسلم نسل کو مسلح کر سکتے ہیں، لیکن وہ ٹیکنالوجی جس کی بنیاد غیر اخلاقی بنیاد پر قائم ہے اور جو انسان کو اس راہ پر چلانا چاہتی ہے، جو قسطوں میں خودکشی پر مائل کررہی ہے، اس کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، ہاں اس کے شر سے بچنے کی ترغیب دے سکتے ہیں، اور یہی وہ ’’نھی عن المنکر‘‘ ہے جو امر بالمعروف کے ساتھ چلتا ہے اور جو ہمارا مقصدِ حیات ہے۔

سوال: آپ نے مشرق ومغرب کے مے خانے دیکھے ہیں مدارسِ اسلامیہ اور عصری دانش گاہوں سے اکتساب فیض کیا اور فیض پہنچایا بھی ہے...... مدارس کے مروجہ طریقۂ تعلیم سے متعلق آپ کا کیا احساس ہے؟ طلباء کی فکری وذہنی اساس کو مستحکم وبلند کرنے کے لئے کیا مدارس کے مروجہ طریقۂ تعلیم میں کچھ اصلاحات کی جاسکتی ہیں، مدارس کے طریقۂ تعلیم

وتربیت کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو یونیورسٹیز کو اپنانی چاہئیں؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ میں نے ایک مدرسہ کی چٹائیوں پر اپنی ناقص استعداد کے مطابق دینی تعلیم حاصل کی، اور یورپ میں بھی ایک بڑی یونیورسٹی میں رہ کر بحث وتحقیق کا نیا اسلوب سیکھا، اور تمام علمی وسائل سے بھرپور دانشگاہ میں بحیثیت ایک معلم کے کچھ وقت گذارا ہے مدارس کے مروجہ طریقہ تعلیم سے متعلق میرا احساس یہ ہے کہ ان کو عصری تعلیم گاہوں اور طریقہ مطالعہ اور اسلوب تحقیق وبحث سے فائدہ اٹھانا چاہئے "**الحکمة ضالة المؤمن**" پر ہمارا ایمان ہے۔ اور جس طرح ہم مائیکروفون، ٹیلی فون، فیکس اور انٹرنیٹ، ہوائی جہاز سے مستغنی نہیں ہوسکتے، اور باوجود اس کے کہ یہ ہمارے دشمنوں کی ذہانت اور کسب کاوش کا نتیجہ ہیں، مگر ہم اس سے مستفید ہونے پر مجبور ہیں، اسی طرح تحقیق وتالیف کے میدان میں جو ترقیاں یورپ نے حاصل کی ہیں ان کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے، اور اس سلسلہ میں ہمیں حقائق کا سامنا کرنا ہے، بزرگان سلف کی عظمت سر آنکھوں پر، مگر ہم ان کی طرح اونٹ گھوڑوں کو سواری کے لئے نہیں استعمال کرتے، بادبانی کی کشتیوں پر حج کرنے نہیں جاتے، آدمی بھیج کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پیغام رسائی نہیں کرتے، مگر اس کو اسلاف کے عمل سے روگردانی نہیں سمجھتے اور نہ اصرار کرتے ہیں، کہ ہم اسی طرز کو اپنائیں گے جو ہمارے بزرگان سلف کی طرح قلمی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے اور نہ خود قلمی کتابیں تیار کرتے ہیں، اسی طرح لغت، بائیوگرافی، انڈکس کے ذریعہ سے یہ علوم حاصل ہوسکتے ہیں، ان کو نظرانداز کرنا نہ دانشمندی ہے اور نہ دین داری۔

یونیورسٹیز کو اسلامی مدارس سے ایمان واخلاص، صداقت وحمیت، انسان دوستی کا سبق مل سکتا ہے یونیورسٹیز کے ارباب حل وعقد یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے مدارس میں بسا اوقات ایک شخص پوری ٹیم کا کام کرتا ہے، اس میں خیر کا پہلو اور انسان دوستی کا پہلو اپنانے کے لائق ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ایمان اور اخلاص کی دولت ان مدارس سے عصری دانش گاہیں حاصل کرسکتی ہیں۔

سوال: آپ کی سب سے پہلی ادبی کاوش؟ اردو زبان کے آپ کے پسندیدہ ادباء وشعراء؟ اردو ادیبوں میں سے کن کے طرزِ نگارش نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب: (الف) ''عربی کی نعتیہ شاعری'' ایک مختصر سی کتاب ہے، جسے میں نے بغیر کسی کی فرمائش کے خود اپنے جذبات فدائیت کی بناء پر مرتب کر کے شائع کیا، جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس پر مقدمہ لکھا، یہ مقدمہ میرے لئے سیکڑوں اسناد وتمغہائے تحسین سے بلند وبالا ہے اور ذخیرۂ آخرت بھی۔

(ب) اردو زبان کے میرے پسندیدہ ادیب وشعراء میں علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں، ان بزرگوں نے خالص اسلامی اور دینی مضامین کو ادبی زبان میں پیش کیا، ان سے پہلے جن بزرگانِ علمِ دین اپنے مواعظ تحریر فرمائے اس میں صرف روایات اور حقائق کو اپنی کتابی زبان میں لکھا تھا، دوسرے درجہ میں وہ ادباء جن کے ''فنِ ادب'' اور ''ذوقِ تحریر'' اور ''اندازِ بیان'' کا میں نے اثر قبول کیا، ان میں ڈپٹی نذیر احمد، حالؔی، اور سرسید ہیں، شعراء میں مومنؔ، خواجہ درد، اور میر تقی میرؔ کے اشعار کا متوالا رہا ہوں، اپنے دور کے شعراء میں اصغر، جگر، حسرت موہانی کا بہت قائل ہوں، جنھوں نے اردو کے روایتی ادب وشاعری کو اس زمانہ میں پناہ دی جب کہ کمیونزم کا پروپیگنڈائی ادب ترقی پسندی کے نام پر اچھالا جارہا تھا۔ ''نیا ادب'' کے نام پر بے حیائیاں نئے روپ میں پیش کی جارہی تھیں، غالبؔ اور اقبالؔ کا نام اس لئے نہیں لیا کہ ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں''۔

(ج) اردو ادیبوں میں جن بزرگوں کے طرز نگارش نے مجھے متاثر کیا، ان میں سر فہرست مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے ادباء کی ادبی کاوشوں کا خدانخواستہ منکر ہوں، یا ان کی عظمت تسلیم نہیں کرتا۔

سوال: تصنیفات کے سلسلے میں آپ کے پیش نظر کون سے اصول کارفرما رہے؟

جواب: تصنیف کے سلسلہ میں اس اصول کا پابند ہوں کہ شروع میں ان باتوں کا جواب دوں، موضوع کیا ہے؟ کس کے لئے لکھا، اور کس طرح لکھا؟

میں نے ندوہ کے ابتدائی مدرسی کے زمانہ میں چند چھوٹے چھوٹے رسالے مرحوم حکیم شرافت حسین صاحب کے ہمت دلانے پر لکھے تھے، جیسے ''آسان فقہ'' اور ''دروس الاطفال'' یہ دونوں میرے بھولے بسرے کتابچے ہیں، جن میں آخر الذکر کو پاکستان کے ایک پبلشر صاحب نے ابھی چند سال ہوئے شائع کیا، اور ''مکتبہ دین ودانش'' لکھنؤ سے بھی ان کے ایڈیشن نکلتے رہے ہیں، انگریزی میں ان قواعد، صرف ونحو کی تشریح کی ہے جس میں مثالیں قرآنی آیات سے دی ہیں اس کے بعد انگریزی میں قرآنی الفاظ کی ایک ''ڈکشنری'' تیار کی ''**قاموس الفاظ القرآن الكريم**'' جو الحمدللہ میرے توقعات سے کہیں زیادہ مقبول ثابت ہوئی اور اسکے بار بار ایڈیشن نکل رہے ہیں ''رابطہ عالم اسلامی'' کی فرمائش پر ایک کتاب ''**ترجمات معانی القرآن وتطور فهمه عند الغرب**'' لکھی جس میں قرآن کریم کے انگریزی ترجموں پر تبصرہ ہے ''جامعہ ام القری'' کی فرمائش پر اردو زبان کے قواعد اور اصول نیز یہ کہ عربی الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں، ان کے اقسام درج کئے، ''**نظام اللغة الاردوية**'' ''مذاہب المنحرفین في التفسیر'' مرتب کیا، ایک دو کتابیں اور ہیں، مثلاً ''نگارشات''، ''ردائے رحمت''، ''تفہیم المنطق'' جو ابھی حال میں نکلی ہیں، کچھ کتابچے ہیں جن کو آپ چاہیں تو تصنیفات میں شمار کر سکتے ہیں۔ جیسے ''چند دن دیارِ غیر میں'' ''شرح قصیدہ علامہ نحوی'' وغیرہ۔

سوال: جب آپ کی نظروں سے آپ کی اپنی برسوں پرانی تحریریں گزرتی ہیں تو اُس وقت آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ کسی تحریر کے لکھتے وقت آپ کن باتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں؟

جواب: لکھنے کی کوشش اس وقت کرتا ہوں، جب دیکھتا ہوں کہ یہ موضوع کچھ لوگوں کے لئے مفید ہوگا، یا ان کی معلومات کے لئے نفع بخش ثابت ہوگا، بعض وقت میں نے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی یا ترجمہ کر ڈالا پھر معلوم ہوا کہ اس موضوع کا حق فلاں صاحب ادا

کر چکے ہیں، تو میں نے اس تحریر کو پرانے کاغذات کے فائل میں دفن کر دیا۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ ''جب میں اپنی کوئی پرانی تحریر دیکھتا ہوں تو کیا کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے''؟

عرض یہ ہے کہ اپنی جوانی کی تصویر کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی کیفیت ''پرانی تحریر'' دیکھ کر ہوتی ہے، لکھنؤ سے ایک رسالہ ''صبح صادق'' نکلا کرتا تھا، وہ میری عین جوانی کا زمانہ تھا، اس وقت کے بعض مضامین دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے زندگی میں کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ ان میں سے بعض مضامین کو ''تعمیر حیات'' میں مولانا شمس الحق صاحب نے شائع کیا، بعض مخلص احباب نے حیدرآباد سے تحسین کے خطوط لکھے، لیکن ۴۵ سال پہلے جب یہ مضامین شائع ہوئے تھے اس وقت شاید کسی نے نظر بھی نہ ڈالی ہو۔ بہر حال اب غلط فہمی یا خود پسندی ہے کہ سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ کسی قدیم مفکر نے کہا تھا کہ ''انسان یہ سمجھے کہ اس کے اندر تکبر نہیں ہے، یہی سب سے بڑا تکبر ہے''۔

سوال: آپ کے نزدیک حضرت مفکر اسلام کی محبوبیت ومقبولیت کی وجوہات کیا ہوسکتی ہیں؟

جواب: میرے نزدیک مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت ومحبوبیت کی صرف ایک وجہ ہے، جس کا ذکر سورہ مریم کے آخر میں ہے "**إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا** ''اور حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالی کسی کو پسند فرماتا ہے تو فرشتوں میں اعلان کرایا جاتا ہے اور ''**يوضع له القبول في الدنيا**" یعنی اسکی محبت اہل دنیا کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب میر کارواں میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے عرب وعجم دونوں جگہوں میں ان کی مقبولیت کا راز عنداللہ مقبولیت ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک مفکر اسلامؒ کی فکر کی اشاعت وترویج کے لئے عملی تدابیر کیا کیا ہوسکتی ہیں؟ آپ کے نزدیک دینی واسلامی فکر کے لحاظ سے مفکر اسلامؒ کا تذکرہ مستقبل کا

مؤرخ کن اکابر علماء کے ساتھ کرے گا؟

جواب: میرے نزدیک مفکر اسلامؒ کی فکر کی اشاعت وترویج کے لئے عملی تدابیر یہ ہیں کہ:

۱۔ ہم اپنے رجحان کو اس بات پر پختہ کریں کہ اللہ تعالی کی طرف سے انعام واکرام کی بارش جس طرح پہلے ہوتی تھی اب بھی ہوسکتی ہے۔

آج بھی جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

۲۔ اخلاص وصداقت پر ایمان رکھیں، نفاق اور خود پسندی سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں، مستقبل کا مؤرخ حضرت مرحوم کا ذکر کن بزرگوں کے ساتھ کرے گا؟ میں یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا، میرے تصور میں بزرگوں کے اندر ''گروپ بندی'' کوئی معقول بات نہیں ہے۔ جو اللہ تعالی کی طرف اخلاص سے بڑھا، اللہ تعالی نے اس کو ایک مقام عطا فرمادیا۔ عطار ہوں، رومی ہوں، غزالی ہوں، مجدد الف ثانی ہوں، شاہ ولی اللہ دہلوی ہوں، شیخ الہند اور شیخ الاسلام ہوں یا حضرت تھانوی ہوں ہر ایک کا مقام الگ اور ہر ایک کا معاملہ براہ راست اللہ تعالی سے تھا اور اپنی جگہ پر وہ ایک ''اکائی'' تھے۔

اسی طرح ہمارے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی ایک ''اکائی'' تھے، نہ وہ مجدد الف ثانی تھے اور نہ شاہ ولی اللہ تھے، وہ ابوالحسن علی تھے۔ ان کا معاملہ دنیا میں بھی اللہ سے رہا اور آج مرنے کے بعد بھی ہے۔ اللہ تعالی سے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کے درجات قرب کو بڑھاتا رہے۔

سوال: آپ کو سعودی مملکت کے ایک شہری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے، شہنشاہیت کو اسلام پسند حلقہ معیوب سمجھتا ہے، آپ نے قریب سے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اپنے مشاہدات وتاثرات کی روشنی میں آپ کا شہنشاہیت سے متعلق تاثر؟

جواب: شہنشاہیت کو صرف اسلام پسند طبقہ ہی نہیں بلکہ ہر متمدن انسان پسندیدگی سے نہیں دیکھتا، مگر تجربہ بتا رہا ہے کہ موجودہ دور میں شہشاہیت پر ایک نقاب ڈال دیا گیا

ہے، جس کا نام ''جمہوریت'' یا ''ڈیموکریسی'' ہے۔ آپ جس ملک میں سانس لے رہے ہیں، وہاں تین چار پشتوں سے ایک خاندان حکومت کرتا رہا ہے اور اب بھی اسی خاندان سے مصاہرے کا تعلق رکھنے والی یا رکھنے والے حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

عرب ممالک میں شام (سوریہ) نے سب سے پہلے شہنشاہیت کے گروہ سے نکل کر اپنے آپ کو جمہوریت قرار دیا، وہاں بھی دیکھئے کہ ایک درزی شیعہ نے فوج کے ذریعہ ملک پر قبضہ کیا اور اب اس کا فرزند باوجود جمہوریت کے نظام کے مخالف ہونے کے جانشین بنایا گیا۔ تیونس میں بورقیبہ کے فرزند الابن ابورقبہ حکومت کررہے ہیں، یورپ میں البتہ نسلی حکمرانی نہیں ہے، مگر جمہور وہاں بھی بے دست وپا ہیں، پانچ یا چار سال میں ان کی ''آواز'' (ووٹ) کو خریدا جاتا ہے، مشرق کے لئے یہ مغربی نظام اب تک راس نہیں آیا۔

سوال: ماہنامہ ''بانگ درا'' کے ذریعہ آپ کا پیغام قارئین کے نام۔

جواب: خاصان خدا میں سے جس سے مناسبت ہو اس کو مثالی رہنما بنا کر اللہ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کریں ﴿ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما﴾ پر ایمان کو اپنے عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کریں تو اعانت الٰہی اللہ کا دروازہ ہر ایک کیلئے اور ہمیشہ کے لئے کھلا ہے۔

آخر میں ایک شعر سناتا ہوں جو میرے مولاناؒ لطف لے کر پڑھا کرتے تھے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

''سودائے عشق'' کا ترجمہ کیجئے تعلق باللہ وطاعت نبی ﷺ سے۔

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ)

قرآن مجید

اپنے قاری کو داعی کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے!

مولانا عبدالکریم پاریکھ سے ایک ملاقات

ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام فرما مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کی خدمت میں ایک مرتبہ راقم آثم ماہنامہ ''بانگ درا'' لے کر حاضر ہوا...... اس وقت ان کے کمرہ میں موجود ایک ملازم سے مولانائے محترم نے سوال کیا کہ یہ بتاؤ کہ بانگ درا کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ملازم جواب نہ دے سکا، تو مولانا نے راقم سے فرمایا کہ جب عوامی سطح کے لوگ آپ کے پرچہ کے نام کو ہی نہ سمجھ سکیں گے تو اس کے کام اور پیغام سے انہیں کیوں کر واقفیت ہو سکے گی۔

یہ گفتگو سن کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ محض گفتگو نہیں بلکہ موصوف کے اپنے درد وکرب کا اظہار ہے...... وہ درد وکرب جو ایک داعی کو نصیب ہوتا ہے اور جس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کو سننے اور سمجھنے سے کوئی محروم نہ رہنے پائے...... اور جب بات دعوت کی آئی ہے تو ظاہر ہے کہ دعوت اسلام کا سب سے اول اور اعلیٰ سرچشمہ ومنبع قرآن پاک ہے اور اس لحاظ سے اللہ کی اس کتاب کا سب سے زیادہ حق ہے کہ اس کے پیغام کو نہایت آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے......

مترجمین قرآن کی مبارک وزریں فہرست میں مولانا عبدالکریم پاریکھ

صاحب کا نام اس لحاظ سے منفرد نام ہے کہ ترجمہ کرتے وقت جن کے پیش نظر خواتین کم پڑھے لکھے اور اوسط درجہ کے عام لوگ پیش نظر رہے......

وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مولانا محترم نے ''آسان ترجمہ قرآن'' کی ضرورت محسوس کی؟ اس سوال کا جواب آپ کو درج ذیل انٹرویو میں مل سکے گا۔تو پڑھیے ''آسان ترجمہ قرآن'' کی کہانی مولانا پاریکھ کی زبانی۔

سوال: مولانا محترم! یہ پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ آپ بنیادی طور سے ایک معروف تاجر ہیں اور ''روایتی عالم'' بھی نہیں ہیں، پھر آپ کو نہ صرف عربی زبان سیکھنے اور درس قرآن کا حلقہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا بلکہ اب تک آپ کے ترجمہ قرآن کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں......اردو زبان میں قرآن پاک کے بہت سارے تراجم موجود ہونے کے باوجود آپ نے قرآن پاک کا ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں کر محسوس کی؟

جواب: اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ نے بڑا اچھا سوال کیا...... اصل میں اللہ تعالی کی مشیت اور اس کی نصرت وحمایت کے بغیر انسان کا کوئی ارادہ عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا...... یہ محض اللہ رب العزت کا اس عاجز پر کرم ہے کہ جوانی کے ایام میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان القرآن اس نے مجھ تک پہونچایا، یہ ترجمہ قرآن میرے لئے ایسی نعمت ثابت ہوا کہ اس کے ذریعہ مجھ پر اللہ کی کتاب کے ساتھ وابستگی کی راہیں کھلتی گئیں......قرآن مجید کا یہ خاصہ ہے کہ جو شخص اسے سمجھ کر پڑھے اور اس میں غور وفکر اور تدبر کرے تو اللہ کی یہ کتاب اپنے قاری کو داعی کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے...... چنانچہ اللہ رب العزت نے درس قرآن کا حلقہ قائم کرنے کی توفیق بخشی...... وہ زمانہ تقسیم ملک کا زمانہ تھا، مسلمانان ہند کے پاؤں اکھڑ چکے تھے......نہ صرف ہمارے علاقہ سے بلکہ ملک کے ہر صوبہ سے خوشحال اور تعلیم یافتہ حضرات پاکستان ہجرت کر چکے تھے...... اس پر آشوب دور میں جو بچے کھچے مسلمان رہ گئے تھے ان کی فکر تھی کہ ان کے اکھڑے

قدموں کو کس طرح جمایا جائے، مایوسی اور حوصلہ شکنی کی اس فضا میں انہیں کس طرح ڈھارس بندھائی جائے اور ان میں ہمت کی جوت کیسے جگائی جائے،......بس اللہ رب العزت کی توفیق تھی کہ یہ خیال آیا کہ ان سخت گزار حالات کا رخ موڑنے کی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو ہجرت سے روکا جائے اور انہیں اللہ کی کتاب سے جوڑا جائے۔ والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوۃ انا لانضیع اجر المحسنین...... ''جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں تو اصلاح پسند لوگ ہیں اور ہم ان کے حق الخدمت اور ان کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیں گے......''

تجارت ورثہ میں ملی، آباء کا پیشہ ہی تجارت تھا، والد صاحب کا جو کاروبار تھا، وہی مجھے ورثہ میں ملا، الحمد للہ اسی سے وابستہ ہوں اور اللہ تعالی اس کے ذریعہ فراخی سے مجھے روزی عنایت فرماتا ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ عربی زبان اور قرآن پاک سے میرا تعلق قائم ہوا...... درس قرآن کے سلسلہ کے بدولت مجھ میں عربی زبان سیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، میں نے محسوس کیا کہ عربی زبان سے ناواقفیت کے باوجود عربی زبان کے بہت سارے الفاظ تو میں جانتا ہوں ......مثلا سورت، بدن، جسم، عقل کتاب، قلم، امتحان، عورت، زوجہ، مکان، وغیرہ...... یہ سارے الفاظ قرآن پاک میں موجود ہیں تو مجھے ایسا لگا کہ الحمد للہ آدھی عربی تو میں جانتا ہی ہوں۔اس احساس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا اور تقویت بخشی......اس مرحلہ پر مولانا عبد السلام ندوی قدوائی مرحوم کی کتاب ''عربی زبان کے دس سبق'' میرے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی، اس زمانہ میں مولانا عبد السلام قدوائی صاحب سے مجھے ملاقات کے مواقع ملتے رہے، حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کی عربی زبان کے نصاب کے لئے تحریر کردہ کتابیں مثلا القراءۃ الراشدۃ وغیرہ نے میرے لیے خوب آسانیاں فراہم کیں، عربی زبان نے مجھے موہ لیا اور پھر وہ مرحلہ بھی آیا جب اللہ رب العزت کی تائید ونصرت کے نتیجہ میں متن اور ترجمہ دیکھے بغیر از خود ترجمہ کرنے لگا اور اس سے کام بھی چلتا رہا۔

تجارت کا کام اپنی جگہ پر ہو رہا تھا، عربی زبان کے متعلق میں جب بھی غور کرتا تو مجھے احساس ہوتا کہ قرآن کی یہ زبان کتنی آسان ہے اور اس کے بہت سے الفاظ مختلف زبان کی عام بول چال میں استعمال ہو رہے ہیں، وہ زبانیں جن کی حیثیت علاقائی زبانوں کی ہیں، اور جن کی عمر پانچ سات سو برس کی ہیں، بلکہ بعض تو تین چار سو برس کی ہیں، ان زبانوں میں بھی قرآن مجید کے الفاظ موجود ہیں اور زبان زد ہیں......تو کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ قرآن مجید کے صرف ایسے الفاظ پر مشتمل لغت تیار کی جائے جنہیں لوگ نہیں جانتے...... تا کہ اس لغت کی مدد سے پڑھنے والے کا اس میں وقت بھی کم لگے اور قرآن پاک سے اس کا تعلق بھی قائم ہو جائے...... چنانچہ غالبا ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ اللہ جل شانہ نے مجھے لغات القرآن کو مرتب کرنے کی توفیق بخشی......لغات القرآن میں اس کا التزام کیا گیا کہ اس میں الفاظ کی ترتیب تلاوت کے اعتبار سے رکھی گئی، جس ترتیب سے جو لفظ آیا، اس کو معنی کے ساتھ درج کر دیا گیا، اگر وہ لفظ اسی معنی میں آیا تو اسے نہیں دیا گیا لیکن اگر وہ لفظ کسی اور معنی میں آیا تو اس لفظ کو پھر لکھ دیا گیا......مثلا ایک لفظ صلوۃ ہے......اس کے معنی رحمت کے بھی ہیں، بندگی کے بھی ہیں، نماز کے بھی ہیں، سلامتی کے بھی ہیں، دعا کے بھی ہیں...... چنانچہ قرآن مجید میں جو لفظ جس جگہ جس معنی میں استعمال ہوا، وہاں اسی لحاظ سے وہ معنی لکھے گئے......مثلا اقم الصلوۃ لدلوک الشّمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر......تو یہاں صلوۃ نماز کے معنی میں ہے لیکن وصل علیھم ان صلوتک سکن لھم تو یہاں صلوۃ سے مراد نماز نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دعا ہے کہ ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ان کے لئے دعا کیجئے، آپ کی دعا ان کے حق میں باعث تسکین ہے''......بس یہ اللہ رب العزت کا کرم اور احسان ہے کہ اس نے اس لغت کو مقبولیت عطا فرمائی، علماء کے ملاحظہ کے بعد میں نے اس میں اضافے بھی کئے۔ حضرت تھانویؒ کا وصال ۱۹۴۳ء میں ہو چکا تھا، ان کے بیان القرآن سے مجھے خصوصی شغف رہا، اس کے علاوہ دوسرے علماء ربانیین کے تراجم کو بھی دیکھتا رہا، میں نے محسوس کیا کہ الحمدللہ قرآن پاک کے تراجم بہتر سے بہتر ہیں لیکن ان کی

سطح اس قدر بلند ہے کہ اس تک معاشرہ کے ایک عام فرد کی پہنچ آسان نہیں معلوم ہوتی...... ایک دھوبی، ایک درزی اسے نہیں سمجھتا، اسکول کے لڑکے لڑکیاں اسے نہیں سمجھتیں، کالج کے طلباء وطالبات اسے نہیں سمجھتے......پھر یہ ایک المیہ ہے کہ اور تلخ حقیقت ہے کہ تقسیم ملک کے نتیجہ میں اردو پر بھی افتاد پڑی، اردو کا رواج کم ہونے لگا، بھاری بھرکم الفاظ کا چلن ختم ہوا، نکتخدائی، کج ادائی، تن وتوش، ناؤنوش جیسے الفاظ معاشرہ میں غیر مانوس ہو گئے۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ قرآن مجید کے ایسے عام فہم ترجمہ کی ضرورت ہے جسکی مدد سے معمولی صلاحیت رکھنے والا ایک عام شخص بھی استفادہ کر سکے اور اللہ کی کتاب کو سمجھ سکے......قرآن مجید میں ایک اشارہ موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا کہ ان سے بات اس طرح کرو کہ ان کے جی میں اتر جائے......ان کے من کو چھولے......الفاظ ایسے ہوں جو عام فہم ہوں، دل نشین ہوں......قرآن کے ان الفاظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے......ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر......خود مسلمان اس نکتہ پر غور کریں اور ابنائے وطن کو بھی اس پر غور وفکر کی دعوت دیں......!

بہر حال یہ تھے وہ احساسات وتاثرات ومشاہدات جن سے مغلوب ہو کر میں نے بنام خدا قرآن مجید کا عام فہم ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا......الحمدللہ اس مبارک ومسعود کام کی ابتدا ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ ۱۹۵۳ء ہی میں مجھے حج کی سعادت نصیب ہوئی، اس زمانہ میں حرم شریف میں دن میں دو مرتبہ دیوبند کے ایک عالم کا درس قرآن ہوتا تھا، وہیں مجھے جلالین پڑھنے کی سعادت ملی، آپ جانتے ہیں کہ جلالین گویا قرآن پاک کا ایک لحاظ سے عربی ترجمہ ہے اس کی افادیت بھی مسلم ہے......اللہ تعالی اس کے مترجمین کے درجات بلند فرمائے، شاید اس زمانہ میں اس کا ہدیہ ایک ریال تھا......یہی وہ زمانہ تھا جب تبت کا حادثہ پیش آیا اور وہاں کے مسلمانوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان اور پاکستان کے جانے کے بجائے حرمین شریفین کا رخ کیا، حرم شریف کے اس حلقہ درس قرآن میں تبّتی علماء بھی شریک ہوتے تھے......

وہیں ایک واقعہ پیش آیا، میں حرم شریف سے باہر جا رہا تھا کہ ایک تبّتی عالم نے پکڑ کر

مجھ سے کہا کہ ہم مومن ہیں عالم ہیں، دیوبند سے فارغ ہیں اور شیخ الھندؒ کے شاگرد ہیں، میں نے کہا اللہ رب العزت کا شکر ہے پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں قرآن میں کبھی شک نہیں ہوا تو میں عرض کیا کہ الحمدللہ مجھے بھی کبھی شک نہیں ہوا......اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آیتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آئیں، انہوں نے ایک آیت پیش کی:

واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق
عليها القول فدمرنها تدميرا (سورۃ بنی اسرائیل:٦)

اس آیت کو سن کر میں سمجھ گیا کہ یہاں ان کو ترجمہ کی وجہ سے دھوکہ ہو رہا ہے۔ عام طور سے اس آیت کے ترجمے ہیں صحیح، مگر ایسے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی وجہ سے الجھ جاتا ہے۔ عام طور سے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ جب ہم کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ فسق کریں تو جب وہ فسق کرتے ہیں تو ہم ان کو سر دبوچ کر چکنا چکور کر دیتے ہیں...... یہاں جو یہ ترجمہ ہے کہ ہم حکم دیتے ہیں کہ فسق کریں...... یہ ترجمہ قرآن مجید کے ذوق سے میل نہیں کھاتا......اس لئے کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالی ناشائستہ باتوں کا حکم ہی نہیں دیتا'' قل ان الله لا يامر بالفحشاء'' چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں، آپ سنئے پھر بتائیے کہ اس میں آپ کو کیا اشکال ہے...... چنانچہ میں نے ان کے سامنے ترجمہ کیا کہ ''جب ہم کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے خوش حال لوگوں کے پاس احکامات بھیج دیتے ہیں جو وہ ہمارے احکامات کی نافرمانی کرتے ہیں تو ہم ان کو سر دبوچ کر چکنا چور کر دیتے ہیں......''۔

اس ترجمہ کا سننا تھا کہ ان تبّتی عالم نے میرا گلا پکڑ لیا، میں گھبرایا کہ یا اللہ ماجرا کیا ہے، کہیں ان کا موڈ تو نہیں خراب ہوا......وہ میری جوانی کا عالم تھا، اس وقت میرے دو ہی بچے تھے......بہر حال انہوں نے کہا کہ اچھا ایک آیت اور بتاؤ، سورہ کہف کی آیت تھی وہ:'' ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطا'' عام طور سے

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے......اب ترجمہ پر غور کیجئے کہ جب کسی کو غافل کر دیا گیا تو اس شخص پر تو ذمہ داری عائد نہیں ہوتی...... چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے مجھ سے اس کا ترجمہ سنئے کہ ''اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل پایا''......، غافل پایا، اور ''غافل کر دیا'' کے لئے عربی ترکیب ایک ہی ہے، عربی زبان کی تفاسیر میں یہ نکتہ موجود ہے، یہ تفسیر بالرائے بھی نہیں ہوئی...... یہ ترجمہ سن کر وہ تبّتی عالم بہت خوش ہوئے، دو تین آیتیں انہوں نے مزید پوچھیں، پھر کہنے لگے کہ آپ کو قرآن پاک کا ترجمہ کرنا چاہیے...... وہیں حرم شریف کی دہلیز پر انہوں نے یہ بات مجھ سے کہی...... میں نے کہا کہ میں کیا قرآن کا ترجمہ کروں گا جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ اس وقت تک میں سورہ بقرہ کی آیات کا ترجمہ کر چکا تھا لیکن میرے پیش نظر میری بیوی، بہنیں اور گھر کے لوگ تھے، عام سطح کے لوگ تھے چنانچہ ترجمہ میں ایسے الفاظ کا استعمال مقصود تھا جو سب کے سمجھ میں آجائیں...... بہر حال، چالیس برس اس کام میں لگے اور الحمدللہ اس ترجمہ قرآن کے کئی ایک ایڈیشن شائع ہوئے......کچھ لوگوں نے اشکالات بھی پیش کیے میں نے کہا کہ علماء سے اس سلسلہ میں رجوع کر لیا جائے، الحمدللہ علماء کرام نے اس کو ملاحظہ فرمایا اور اس ترجمہ کو یہ خصوصیت نصیب ہوئی کہ اس پر بہت سے علماء کرام کے Notes ہیں ......انہوں نے جہاں جہاں اصلاح کا مشورہ دیا، وہاں اصلاح کر لی گئی......میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ علماء کرام کے مشورہ کے بغیر جو کام ہوگا اس میں برکت نہیں ہو سکتی......!

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ مئی، جون ١٩٩٨ء)

'سچی باتیں' تو بس سچی باتیں ہی ہوا کرتی تھیں!

مولانا دریابادیؒ اور حضرت مفکر اسلامؒ کے ایک نیاز مند

جناب بہاء الدین صاحب حیدرآبادی سے ایک گفتگو

گذشتہ دو تین برسوں پہلے بہاء الدین صاحب حیدرآبادی سے نیاز حاصل ہوا، نام مدتوں پہلے سن رکھا تھا، ان کے صاحب زادے جناب شعیب اسلم میرے معاصر تھے، انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے میں خصوصی درجات میں زیر تعلیم تھا اور وہ عام درجات کے آخری سندی سالوں میں، اصلاح کے ناظم تھے اور اس لئے راقم کا مختلف جلسوں میں جانا ہوا کرتا تھا پہلی گفتگو ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ شعیب اسلم کا کسی شریف اور وضع دار خاندان سے تعلق ہے۔

مدتوں بعد ندوہ میں ان کے والد جناب بہاء الدین صاحب حیدرآبادی سے نیاز حاصل ہوا، ابھی ابھی رائے بریلی سے لوٹے تھے، ہیں تو سن رسیدہ لیکن طبیعت باغ و بہار پائی ہے، نہ صرف لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے بلکہ دو مصنفین کے بڑے نیاز مند بھی ہیں ان ہی دو صاحب قلم شخصیتوں میں موصوف کو ایک تو مولانا دریابادیؒ سے نیاز رہا اور پھر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے عقیدت و محبت کا تعلق استوار ہوا۔ دوران ملاقات ان کی کچھ ڈائریاں دیکھیں تو رشک آیا کہ بھری پڑی، موتیوں کی لڑی اور نگینوں سے جڑی، شب و روز کی کارکردگیاں، سب کی سب محفوظ۔ یاد رکھنے کا

شوق بھی اور یاد رکھے جانے کا ذوق بھی!!!

آج سے دو تین برس پہلے ندوہ کے مہمان خانے میں ان سے شرف نیاز
حاصل ہوا، ہنستا مسکراتا ہشاش بشاش چہرہ! گفتگو بے تکان ہی نہیں بلکہ
کانوں میں رس گھولتی ہوئی بھی! حیدرآبادی تہذیب کا مرقع حلیہ بشرہ سے
کسی سرکاری ملازم کا! سن رسیدہ مگر بول میں مٹھاس اور شیرینی۔

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں سے مجھے بھی عقیدت ہے اس لئے ان کے جب کسی سچے عقیدت مند سے ملاقات ہو تو اس کی طرف طبیعت کا مائل ہونا فطری بات ہے۔ موصوف کی ٹرین کا وقت قریب تھا، میں نے اسی وقت کو غنیمت سمجھا اور ذکر چھیڑ دیا اس موضوع سے لگاؤ ان کا بھی تھا چنانچہ پہلے تو مولانا دریابادی کا ذکر کیا کہ دریاباد کا میرا پہلا سفر تو جولائی ۵۷ء میں پیش آیا اس سے پہلے خط و کتابت رہی اس لئے کہ یوں بھی مولانا کا معمول بلا اطلاع ملنے والوں سے ملاقات کا تھا نہیں ۔صدق میرے مطالعہ میں ۴۵ سال سے تھا، جب ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو دیکھا کہ اتنے جید عالم دین اور نامور ادیب کی سادگی کا کیا عالم ہے! فرنیچر نہایت سادہ، چارپائی کھری!! ۱۹۶۰ء میں جب مجھے سفر حج پیش آیا تو میرے اصرار پر ایک ہدایتی خط لکھا کہ لوگ عبادت کے شوق میں بعض گناہ کر لیتے ہیں مثلاً اژدہام میں دوسروں کی حق تلفی اور حجر اسود کا بوسہ دینے میں اس اصول سے احتراز اور موقع پڑنے پر کعبۃ اللہ میں داخلہ کی کوشش۔

مولانا دریابادیؒ کی بے حد اور لگاتار مصروفیت نے انہیں نامی گرامی علماء و ادباء میں لا کھڑا کیا۔ دوران مطالعہ کبھی غنودگی کا اثر دیکھتا بھی لیکن منٹ، دو منٹ سے زیادہ یہ کیفیت نہ رہتی۔ صبح چار بجے بیدار ہوتے ورزش کا معمول تھا، تیز روی کے ساتھ Walking کا معمول تھا قد اونچا پایا تھا۔

ایک دوسرے موقع پر موصوف سے بیعت ہو جانے کا اظہار کیا تو خاموش رہے پھر پوچھا تو مسکرا کر کہنے لگے کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بیعت کے بغیر بخشش نہیں ہوگی بس سیدھا

راستہ ''صراط مستقیم'' اختیار کرو کوئی اچھا آدمی مل جائے تو بیعت ہو جاؤ۔

مولانا کا صدق کا حلقہ کیا تھا با ذوق وصاحب علم حضرات کا نہ کہ عام سطح کا طبقہ پڑھا کرتا تھا، اردو زبان بھی معیاری ہوتی اوران نکات میں بھی لطیف اشارے و کنایے۔ سچی باتیں تو بس سچی باتیں ہی ہوا کرتی تھیں ان معاملات میں وہ مروت سے کام نہ لیتے تھے، مولانا دریابادی کی آپ بیتی پڑھ لیجئے، سفر حجاز دیکھ لیجئے انداز کیسا دلنشین و دلکش! اور اس میں کیسی کشش وجاذبیت صدق کی سرخیوں پر ذرا ایک نگاہ ڈالتے چلئے بھائی کے انتقال پر عنوان قائم کیا۔ ''ناز بردار بھائی''! ماں کے لئے ''ماں کے قدموں میں''! بیوی کے لئے ''بوڑھی محبوبہ''! اور بہن کے انتقال کے موقع پر ''بہن کی رخصتی''!

وقت کم تھا ٹرین کا وقت ہو چلا تھا، چنانچہ میں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا تذکرہ کیا تو کہا کہ حضرت محض علمی شخصیت ہی نہیں تھے، خوش مزاج بھی واقع ہوئے تھے ایک مرتبہ پونا میں بڑی اچھی مجلس ہو رہی تھی کسی سفر کے لئے گاڑی تیار تھی غالباً پیام انسانیت کا جلسہ تھا۔ حضرت نے برمحل یہ شعر پڑھا

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشہ می روی

غالبا ۸۲-۸۱ء کی بات تھی، رائے بریلی میں گجراتی مہمانوں کی آمد تھی کھانا آنے میں کچھ اتنی تاخیر ہوئی کہ گجراتی مہمان رخصت ہو گئے ادھر کھانا آ گیا۔ تھے تو آٹھ آدمی لیکن اس وقت ہم تین ہی رہ گئے تھے، کھانا بہت بچ گیا تھا، میں نے اجازت حاصل کر لینے کی بات گوش گزار کی ہی کہ موٹر کی آواز آئی اس میں ماشاء اللہ تین لحیم شحیم آدمی سوار تھے اور سرکاری حضرات تھے، L A C MM مسافر تھے ان کی گاڑی بے وقت خراب ہو گئی تھی اس لئے تکیہ کا رخ کر لیا بہر حال کھانا کھایا گیا اور سب کام آ گیا حضرت نے تبسم آمیز لہجہ میں فرمایا سب ایک ہی ''حجم'' کے رہے ہوں گے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کی کتابیں اپنی نوعیت کی انوکھی اور دلکش ہوتی تھیں، عام مجلس میں بھی گفتگو فرماتے تو عمل پر توجہ دلاتے۔

خطبات بھی تاثیر سے پر ہوتے تھے۔ غالباً ۸۱ء کی بات ہے سیلاب کا زمانہ تھا ہم لوگ کمرہ میں سو رہے تھے حضرت نے فرمایا کہ اٹھئے تنور سے پانی پھوٹ رہا ہے اس طرح طوفان نوح کی یاد دلائی۔

حضرت ابوالخیر برق کا تذکرہ آیا تو چاندی کے گلاس کے لئے ان کے کہے ہوئے ایک شعر کو سنایا (جو پرانے چراغ جلد دوم) میں درج ہے ۔

ظرف عالی آپ کا ایسا کہ اس کو دیکھ کر
ایسی سمٹی چاندنی چاندی کا ساغر بن گئی

مجلس میں ایک صاحب اپنے کسی عزیز کے انتقال پر ملول تھے حضرت مولانا علی میاںؒ نے اسی مناسبت سے ایک شعر سنایا ۔

وہی راستے کہ جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

حضرت مولاناؒ بھی اسی سفر آخرت کے مسافر ہو گئے جس کے بارے میں اللہ کے رسول صادق وامین نے فرمایا ''لاعیش الاعیش الاخرۃ۔

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ)

صحافت کے اس دورانحطاط کو دیکھنے کے لئے

مجھے زندہ ہی نہیں رہنا چاہیے تھا!

معروف بزرگ صحافی عشرت علی صدیقی سے ایک ملاقات

جناب عشرت علی صدیقی صحافت کی دنیا کا ایک روشن اور معتبر نام ہے، قومی آواز ایک عرصہ تک اردو دنیا کا ایک معتبر روز نامہ تھا جس کو زندگی جناب عشرت علی صدیقی ہی نے بخشی تھی، کئی دہائیوں تک قوم وملت کے مسائل پر ان کا قلم بولتا رہا اور عوام وخواص دونوں حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوتی رہی، اس طرح جناب عشرت علی صدیقی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کو نہ صرف یادرکھا جانا چاہیے بلکہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ آنے والی نسلیں بھی اپنے اس محسن کو فراموش نہ کردیں، اس خیال سے درج ذیل انٹرویو لیا گیا، امید کہ قارئین اسے نگاہ شوق سے پڑھیں گے!

س:- آپ کی زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت اور ملازمت سے متعلق کچھ باتیں۔

ج:- میں سندیلہ کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوا، آٹھویں جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کی، ہائی اسکول اس زمانہ میں وہاں تھا نہیں، ہردوئی میں ایک گورنمنٹ ہائی اسکول تھا، جس کی اچھی خاصی شہرت تھی، نویں دسویں کے بعد کی تعلیم وہیں حاصل کی، اس زمانہ میں دسویں کا امتحان ہردوئی میں نہیں ہوتا تھا بلکہ لکھنؤ میں ہوتا تھا، دسویں کے بعد انٹر میڈیٹ کرسچین کالج لکھنؤ سے کیا، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں بی اے ہوا، سوچتا رہا

کہ اب آگے کیا کرنا چاہئے، سرکاری ملازمت کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی، والد صاحب چاہتے بھی تھے کہ اپنی زمینداری کے اثر ورسوخ سے مجھے کسی سرکاری ملازمت سے وابستہ کردیں، ان کے اثرات بھی تھے، مگر میں رضامند نہیں ہوا، میں لکھنؤ چلا آیا، کچھ دس پندرہ روپے میرے پاس تھے، یہاں میرے کچھ عزیز تھے، ان کے ساتھ رہتا، دو تین دوست بھی یہاں رہتے تھے، ان کے ساتھ گھومتا پھرتا، ہم لوگ کافی ہاؤس جایا کرتے، جب پیسے ختم ہونے لگے تو فکر ہوئی، اسی زمانہ میں ''آشرم'' کا ایک اشتہار شائع ہوا، آج جہاں لال باغ (لکھنؤ) میں نور منزل ہے، وہیں اس زمانے میں ''آشرم'' تھا، جہاں یورپ کے مشینری رہا کرتے تھے، ان کو اردو پڑھانے کے سلسلے کا اشتہار تھا، بہر حال میرا انٹرویو ہوا اور تقرر ہو گیا، اس زمانہ میں یعنی ۳۸-۱۹۳۷ء میں وہ ماہانہ ۶۰ روپے مشاہرہ دیتے تھے، ہفتہ میں دو روز پڑھانا ہوتا تھا، تو اس سے گزر بسر ہو جاتی تھی، اس لئے ''ہندوستان'' سے میں پیسے نہیں لیتا تھا۔ اصل میں اس زمانہ کا مزاج ہی یہی تھا کہ کھانے پینے کی حد تک پیسے مل جائیں تو بس ہے، پیسہ کی حرص تو دور کی بات ہے، اس کی ضرورت سے زیادہ طلب کا بھی کوئی تصور نہیں تھا، مجھے اپنی زندگی کے تنگی کے وہ دن بھی یاد ہیں، جب میں صرف امرود اور ٹماٹر سے دن گزار لیتا تھا، سائیکل پر گھر سے چلے اور ایک جیب میں دو آنے کے ٹماٹر اور دوسری جیب میں امرود رکھ لیے اور کھاتے ہوئے چلے جارہے ہیں، پھر دفتر پہنچے اور کام میں جٹ گئے، بعد میں ''ہندوستان'' میں پیسے بھی ملنے لگے تھے، بہت کم پیسے ملتے تھے، مجھے بھی اور حیات اللہ صاحب کو بھی، مجھے شاید ۱۵-۲۰ روپے ملتے ہوں گے، ایک دن کی بات ہے کہ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا، جواہر لال جی آگئے، میں زمین پر بیٹھا اخبار لپیٹ رہا تھا، دفتر کا جو ٹائپسٹ (Typist) تھا، وہ میز کرسی پر بیٹھا تھا، تو جواہر لال جی نے اس کی میز پر پڑے ہوئے چیک کو اٹھا لیا، ٹائپسٹ کو شاید پتہ بھی نہ چلا اور وہ کمرہ میں اندر آگئے، ظاہر ہے، ۱۹۳۹ء میں میری جوانی کا زمانہ تھا، جواہر لال جی کو دیکھا کہ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، تو کہا کہ تمہارے یہاں گندگی بہت ہے، میں نے کہا

کہ جی ہاں! ہے، دیکھئے میرے ہاتھوں میں بھی لئی لگی ہوئی ہے، اس پر کہا کہ جی ہاں یہ میرا کام تو نہیں ہے لیکن بس ایک ہی چپراسی ہے وہی دفتری ہے، اسے پریس کے کام سے بھیجا ہے اور آج ہی اخبار کی ترسیل (Dispatch) ہونا ہے، تو ہم خالی بیٹھے ہیں، اس لئے ہم نے چاہا کہ ہم ہی کردیں، کہا میرے ساتھ چلو، پھر وہ ایک دوسرے کمرہ میں لے گئے اور پوچھا ''کام کیسا چل رہا ہے؟'' ہم نے کہا ''اچھا چل رہا ہے'' کہا ''نہیں نہیں، تمہارا اپنا کام'' ہم نے کہا ''وہ بھی اچھا چل رہا ہے'' انہوں نے کہا ''پیسے کتنے ملتے ہیں؟'' ہم نے کہا ''کبھی پندرہ روپے، کبھی بیس روپے اور کبھی وہ بھی نہیں ملتے لیکن کام چل جاتا ہے'' کہا ''یہ کیسے! کھاتے کہاں ہو؟'' ہم نے کہا ''کھلاتے تو ہمارے والدین ہیں'' انہوں نے کہا ''والد نے تمہیں پڑھا لکھا دیا، اب بھی تم ان پر بوجھ بنے ہوئے ہو'' ہم نے کہا ''ہم بوجھ نہیں بنے ہیں، ہمارا بھائی بوجھ بنا ہے'' چھوٹا بھائی اس زمانہ میں پڑھتا تھا اور ہمارے ساتھ یہاں رہتا تھا، تو ہم نے کہا ''اس کو تو وہ خرچ دیتے ہیں، اس میں ہم بھی دو روٹی کھا لیتے ہیں اور ہمارا کوئی خرچ نہیں ہے، جب صبح نہاتے ہیں تو اپنے کپڑے خود دھو لیتے ہیں، دفتر میں دن بھر کام کرتے ہیں، تو تفریح کے لئے کوئی وقت ہی نہیں ہے، کوئی اور شوق بھی نہیں ہے، بیڑی سگریٹ ہم پیتے نہیں، سنیما دیکھتے نہیں، تو پیسوں کی ضرورت ہی کیا ہے'' انہوں نے کہا ''نہیں نہیں! تم اپنے بھائی کے خرچ میں بھی شریک ہو جاؤ، پچاس روپے ماہانہ ہم بھیجیں گے'' ہم نے کہا ''ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے ہیں'' کہا ''کیوں نہیں لیں گے، بیوقوفی کر رہے ہو'' ہم نے کہا ''کرنے دیجئے ہمیں بیوقوفی! ہماری اپنی اطلاع یہ ہے کہ آپ کی اپنی کوئی آمدنی نہیں ہے، لڑائی چھڑ چکی ہے، آپ کا جتنا پیسہ کتابوں کی رائلٹی کا یورپ میں تھا، وہ وہاں سے آنا بند ہو گیا ہے، یہاں ہندوستان کی تین چار سو روپے کی رائلٹی آپ کی آمدنی ہے، اس میں آپ ہندوستان بھر کا دورہ کرتے ہیں (جواہر لال جی سفر خرچ لیتے نہیں تھے) اس کے علاوہ آپ کا اور کوئی ذریعہ آمدنی (Source of Income) ہے نہیں، اس صورتِ حال میں ہم بھی آپ کی اس قلیل آمدنی کے شریک ہو جائیں، یہ ہمیں اچھا نہیں

لگتا، ہم نہیں لیں گے پیسہ'' لیکن الحمد للہ ہمیں کوئی ایسی تکلیف بھی نہیں ہوئی کہ ہم اپنے آپ کو کوستے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم کو احساس ہوتا کہ ہم نے ناحق اخبار نویسی کی۔

س:- صحافت سے آپ کی وابستگی، اس کا آغاز اور اس کی کچھ یادیں، خصوصاً اس زمانہ کی صحافت اور موجودہ دور کی صحافت میں آپ کیا فرق محسوس کر رہے ہیں؟

ج:- اردو صحافت کا ماضی تو نہایت شاندار رہے، آزادی کی لڑائی میں بھی اس کا بڑا اہم اور نمایاں کردار رہا، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاشے کشن، لالہ لاجپت رائے اور نریندر وغیرہ، یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے صحافت کو ایک مشن سمجھا، فاقے کئے، مصیبتیں جھیلیں مگر اپنے اخبار کو جاری رکھا۔

یہ تھا وہ ماحول اور پس منظر جب صحافت کی وادی میں مَیں نے قدم رکھا، ۱۹۳۶ء میں مَیں نے بی اے کیا، میں نے لکھنا لکھانا تو اس سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا، لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار پیغام نکلتا تھا، اس میں ترجمہ کیا کرتا تھا، صحافت سے میری باقاعدہ وابستگی ستمبر ۱۹۳۷ء سے ہوئی، غالباً اگست ۱۹۳۷ء کی بات ہے جب ''ہندوستان'' نکلنا شروع ہوا، وہ اخبار بھی آزادی کی لڑائی کا ایک آرگن تھا، اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب تھے، بعد میں وہ علی گڑھ چلے گئے اور پھر وائس چانسلر ہو گئے، حیات اللہ انصاری صاحب اس کے ایڈیٹر تھے، تو ہم لوگ تو صحافت کو مشن سمجھ کر اس سے وابستہ ہوئے، میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جتنے قابلِ ذکر اخبارات تھے وہ سب صحافت کو مشن ہی سمجھتے تھے، تو میری تربیت بھی اسی زمانہ کی ہے اور میری عادتیں بھی اسی زمانے میں DEVELOPE ہوئیں، انگریزوں سے لڑائی کو بھی میں نے مشن ہی سمجھا، میں اس کی ایک مثال پیش کروں، ہم نے ''ہندوستان'' میں جوش ملیح آبادی کی ایک نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' شائع کی، یہ اس زمانہ کی بات ہے جب لڑائی کا زمانہ تھا، صوبائی خودمختار حکومت (Provincial Autonomy) آ گئی تھی، ان دنوں ڈی پی مکھرجی انفارمیشن ڈائرکٹر تھے، تو طلبی ہوئی، ایڈیٹر تو حیات اللہ صاحب تھے لیکن شاید وہ باہر گئے ہوئے تھے، اس لئے مجھے جانا پڑا، میں اس لئے بھی گیا کہ ڈی پی مکھرجی صاحب ہمارے استاد رہ چکے

تھے، ہمیں انہوں نے اکنامکس پڑھایا تھا، مجھے جانتے بھی تھے، میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ تم نے کیا کر دیا، جوش کی نظم کی اشاعت پر بڑا اعتراض ہو رہا ہے، تو میں نے کہا ''یہ اعتراض تو غلط ہے، نظم ہم نے اس لئے چھاپ دی تھی کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں'' انہوں نے کہا کہ کیا مطلب؟ میں نے کہا ''ہم تو وہی کر رہے ہیں جو آپ نے سکھایا تھا کہ انگریزوں کے خلاف لڑنے کی پوری کوشش کرو، تو ہم انگریزوں سے لڑ رہے ہیں اور پوری کوشش سے لڑ رہے ہیں'' انہوں نے کہا کہ یہ کوئی بات نہیں ہوئی، یہ تو لڑائی کا زمانہ ہے، میں نے کہا ''استاد کی تعلیم تو استاد کی تعلیم ہے، چاہے وہ زمانہ لڑائی کا ہو یا امن کا، ہر حال میں وہ قابل احترام ہے'' اس پر انہوں نے ہنس کر کہا کہ اچھا جاؤ، آئندہ احتیاط برتنا، ڈی پی مکھر جی بڑے لائق فائق انسان تھے، وہ محض اکنامکس (ECONOMICS) ہی کے استاد نہیں تھے بلکہ لٹریچر، فلسفہ، سوشیالوجی وغیرہ جیسے علوم میں بھی انہیں درک حاصل تھا، اس زمانہ کا مزاج ہی یہ تھا کہ جو بھی کام کیا جائے، مشن سمجھ کر کیا جائے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد کی صحافت میں بڑا انحطاط آ گیا ہے، ''اب تو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی'' والا معاملہ ہ۔

، میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اردو نہیں جانتے ہیں مگر اردو اخبار کے ایڈیٹر ہیں، اخبار کے مالک ہیں، پہلے تو مالک ہی ایڈیٹر ہوتا تھا اور اس صورت میں ایڈیٹر ہی اصل ہوتا، اُس زمانہ میں ایڈیٹر کا مقام منیجر کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، ایڈیٹر کا مقام منیجر سے بلند ہوتا تھا، آزادی کے بعد کم از کم میرے زمانہ اور اخبار تک تو یہ ہوا کہ ایڈیٹر سپریم (Supreme) ہوتا تھا اور منیجر اس کو Dictate نہیں کرتا تھا، مگر افسوس کہ میری آنکھوں دیکھتے دیکھتے یہ بات ہو گئی ہے کہ اب منیجر کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اخبار نکالنا ایک انڈسٹری کی طرح ہو گیا ہے اور انڈسٹری چلانے کے جو حربے ہوتے ہیں، منیجر ان سے واقف ہوتا ہے، اس لئے اس کا پلہ بھاری رہتا ہے، میں تو اس لحاظ سے خود کو بدقسمت سمجھتا ہوں، صحافت کے اس دورِ انحطاط کو دیکھنے کے لئے مجھے زندہ ہی نہیں رہنا چاہئے تھا، ہمارے دور تک تو یہ روایت برقرار رہی کہ ایڈیٹر کا مقام منیجر سے بلند رہا، ایک واقعہ ہے کہ ایک روز میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک ملازم آیا اور کہا

کہ صاحب نے سلام بھیجا ہے، میں نے کہا کہ کون صاحب؟ اس نے کہا کہ منیجر صاحب نے، میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ہم تھوڑی دیر میں ملتے ہیں، پھر میں ان کے کمرہ گیا، اس وقت ان کے یہاں چار پانچ لوگ اور موجود تھے، انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو زحمت دی، اس پر میں نے کہا کہ دیکھئے ہمارے ادارہ میں سلام کرنے کے لئے آنا چاہئے تھا، منیجر صاحب پریشان ہوئے کہ یہ پہلا شخص ہے، جس اس لب ولہجہ میں بات کر رہا ہے، منیجر خود کو اخبار کا کرتا دھرتا سمجھتے تھے، مالک سمجھتے تھے، بہر حال انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ سے لمبی بات کرنی تھی، اس لئے آپ کو تکلیف دی، میں نے کہا کہ لمبی بات وہیں ہوگی، ہمارے کمرے میں یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

اسی زمانہ میں نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر تھے، چلپت رائے، وہ بڑے بھاری بھر کم آدمی تھے، پرائم منسٹر بھی بغیر اطلاع کے ان کے کمرہ میں جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا، جواہر لال انہیں عزیز رکھتے تھے، ساتھ ہی ان کا بڑا لحاظ بھی رکھتے تھے، تو یہ ایک روایت بن گئی تھی، افسوس کہ یہ روایت اب دم توڑ چکی ہے۔

ایک بات اور بتاتا چلوں کہ ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد کے ہفتہ وار اخبار الہلال کی تعداد اشاعت اٹھارہ بیس ہزار تھی اور اخبار فروخت بھی ہوتا تھا، اب تو تعداد اشاعت کے سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے، فرضی تعداد بتائی جاتی ہے، محض کاغذ کا کوٹا اور اشتہارات وغیرہ حاصل کرنے کے لئے، میں جانتا ہوں کہ ۷۰۰ کی تعداد میں اخبار نہیں چھپتا اور ۷۰۰۰ کی تعدادِ اشاعت بتا دیتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ان دنوں کا جب میں پریس کمیشن کا ممبر رہا، اس موقع پر ہم نے ایک سروے کیا کہ مختلف اخبارات میں کتنی فی صد خبریں مقامی ہوتی ہیں اور کتنی فیصد ضلعی وصوبائی وملکی اور بین الاقوامی وغیرہ، تو اس موقع پر عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آئیں، غالبًا رائے بریلی یا کسی دوسرے قصبہ کے ایک اخبار کی شاہ سرخی خروش چیف سے متعلق تھی، Information Reorganisation Committee کا جب میں ممبر تھا تو یوپی کی سطح پر کئی مقامات پر جانا ہوا، اس موقع پر مراد آباد کا بھی ایک سفر ہوا، ہم نے وہاں کے

ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر سے پوچھا کہ یہاں کتنے مقامی اخبارات شائع ہوتے ہیں، انہوں نے ۴۰-۴۲ روزناموں کی تعداد بتائی، ہم نے پوچھا کہ اخبارات کو پڑھتا کون ہے؟ بہرحال ان میں سے ایک اخبار منگایا تو دیکھا کہ ایک ورقی اخبار ہے، اس کے ایک جانب ہندی ہے اور دوسری جانب اردو اور دونوں کی پرنٹ لائن علیحدہ علیحدہ ہے، رجسٹریشن نمبر علیحدہ علیحدہ ہے اور دونوں میں سرکاری اشتہارات، ہم نے اس کے ایڈیٹر کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، تو انہوں نے کہا ان دونوں کی پرنٹ لائن الگ الگ اور اخبارات کے رجسٹریشن نمبر علیحدہ علیحدہ ہیں، ان میں شائع شدہ سرکاری اشتہارات کے علیحدہ علیحدہ Payment ہوا ہے، جواب میں انہوں نے کہا کہ صاحب! سب چلتا ہے، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ میں نے یہ واقعہ اپنی رپورٹ میں درج بھی کردیا تھا، جو رپورٹ سرکاری سطح پر شائع بھی ہوگئی ہے، تو اس صورت میں آپ ہی بتائیں کہ اخبارات کے مستقبل کے تعلق سے کیا آس لگائی جائے، ہاں! الحمد للہ حیدرآباد، بھوپال، بمبئی اور دوسرے شہروں سے معیاری اخبارات بھی شائع ہورہے ہیں، اخبار کی جو اخلاقیات ہوتی ہیں، ان کا وہ پاس ولحاظ بھی رکھتے ہیں، مگر تصویر کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو ابھی میں نے آپ سے بیان کیا، کچھ اخبارات ایسے بھی ہیں جو ذاتیات اور فرقہ پرستی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، کیا اردو اور کیا ہندی، مجھے یاد آرہا ہے کہ جن دنوں علی گڑھ میں ہندو مسلم فسادات ہورہے تھے، تو ایک ہندی اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ علی گڑھ میں ایک ڈاکٹر نے ہندو مریضوں کو مار ڈالا، حکومت نے انکوائری بھیجی مگر اس خبر میں کوئی صداقت نہ تھی، پھر پریس کونسل نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے باز پرس کی اور مذکورہ خبر کی اسے اپنے اخبار میں تردید کرنا پڑی، تو یہ معیار ہوگیا ہے آج صحافت کا۔

س:- آپ ابھی صحافت کی اخلاقیات کی بات کررہے تھے، آپ کی نزدیک صحافت کی اخلاقیات اور اس کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

ج:- ایک بنیادی بات تو یہ ہے کہ جب ایک صحافی قلم اٹھائے تو ذاتیات کو بھول کر

لکھے، بلکہ اپنے آپ کو بھی بھول جائے اور وہی لکھے جو دیانت داری پر مبنی ہو تو گویا خبروں کے معاملے میں ایماندارانہ رویہ اپنائے، البتہ تبصرہ Comments کے بارے میں اخبار آزاد ہے، وہ اپنی پالیسی کے لحاظ سے اس پر تبصرہ کرسکتا ہے، اس کے علاوہ اگر غلطی سے کوئی خبر شائع ہوجائے تو پھر اس کی تردید بھی شائع ہو، حال کی ایک مثال دوں کہ یہاں لکھنؤ کے ایک روزنامے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مولانا علی میاں نے سونیا جی سے ملنے سے انکار کردیا اور کہا کہ میں اپنی قوم کو کیا جواب دوں گا، یہ سوفی صد جھوٹ بات تھی، میں نے مولانا علی میاں سے بات کی تو مولانا نے کہا کہ سونیا جی کے آنے کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی بلکہ گزشتہ دنوں رائے بریلی میں انہوں نے تو جب میرے مکان پر چھاپہ پڑا تھا، نرائن دت تیواری کو خط دے کر بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ بڑا افسوس ہوا کہ آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہوا، خبر میں جن صاحب کے بارے میں تھا کہ انہوں نے سونیا جی سے متعلق یہ بات کہی تھی، وہ خود تردید لے کر اخبار کے دفتر گئے، لیکن اس اخبار نے تردید نہیں شائع کی، پھر ندوہ سے بھی تردید سرکاری طور پر کی گئی، وہ بھی نہیں چھاپی، یہ تو دیانت داری نہیں ہے یہ بات بنیادی اصول کے خلاف ہے۔

تیسری بات یہ کہ فرقہ پرستی کو ہوا نہ دی جائے، خدانخواستہ کہیں ہندو مسلم فساد ہوجائے تو اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کی خاطر واقعات کو رنگ آمیزی کے ساتھ شائع کریں اور متاثرین کی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھیں، یہ بھی ایک خطرناک رجحان ہے، میں جن دنوں پریس کمیشن میں تھا تو گجرات کے فسادات کی تحقیقات کا مسئلہ آیا، تفتیش کے لئے آدمی بھیجے گئے، پہلے دن جو فساد ہوا وہ ہندو مسلم فساد تو تھا، مگر چھوٹے پیمانے پر ہوا تھا، اخبارات نے اس کی اس طرح رپورٹنگ کی کہ بعد میں جس کے نتیجہ میں چار چھ گنا زیادہ خون خرابہ ہوا، تو اخبارات کا کردار (Role) بڑا اہم ہوتا ہے، وہ چاہیں تو محبت کی فضا پیدا کردیں یا چاہیں تو فضا میں نفرت کا زہر گھول دیں، مولانا علی میاں کی زبان سے میں نے بارہا یہ مصرعہ سنا ہے جب وہ صحافیوں اور قلم کاروں سے ہم کلام ہوتے تھے کہ ع

زیر قلمت ہزار جاں است

س:-آپ کن شخصیات سے متاثر ہوئے؟

ج:- ہندوستان چھوڑ و تحریک چلی تھی ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان'' بند ہوا اور ۱۹۴۵ء میں قومی آواز شروع ہوا، ''ہندوستان'' سے وابستگی سے پہلے میرا حیدرآباد جانا ہوا تھا، میں ان دنوں قاضی عبدالغفار صاحب کے اخبار ''پیغام'' سے وابستہ رہا تو قاضی عبدالغفار صاحب کی شرافت نے مجھے بہت متاثر کیا، میں جو واقعہ بیان کرنے جارہا ہوں وہ بظاہر ایک معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس نے مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا۔ ہوا یہ کہ ایک بار ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کا (جن کا انگریزی میں ترجمۂ قرآن بھی ہے اور پاکستان پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے) فون آیا، فون قاضی صاحب کی میز پر تھا، تو عبداللطیف صاحب نے پوچھا کہ فلاں محاورہ کا ترجمہ کیا ہوگا، میں نے بتایا کہ میرے خیال میں تو یہ ہونا چاہئے، انہوں نے کہا کہ اگر اس کے بجائے یہ ترجمہ کیا جائے تو! تو میں نے کہا کہ یہ تو مہمل معلوم ہوتا ہے، یہ کہہ کر ٹیلی فون بند کردیا، قاضی صاحب جو اس گفتگو کو سن رہے تھے، نے کہا کہ ارے بھائی! تم نے جسے مہمل ترجمہ کہا وہ میرا ترجمہ تھا اور وہ واقعی مہمل ہے اور تم نے جو ترجمہ بتایا وہی صحیح ہے، یہ عظمت تھی قاضی صاحب کی، ورنہ میں نے تو دیکھا ہے کہ کوئی خوبی سامنے آئے تو اپنے ماتحتوں کو اس کی Credit نہیں دی جاتی بلکہ اس کا سہرا اپنے سر باندھا جاتا ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے، سر یعقوب قاضی صاحب کے بہنوئی تھے، سر یعقوب کے انتقال کے بعد قاضی صاحب حیدرآباد سے مرادآباد آگئے تھے، کئی مہینوں کے بعدب وہ حیدرآباد واپس گئے تو لوگ ان سے ملنے آئے، ناظر یار جنگ صاحب، غلام پنجتن صاحب جو جج تھے، یہ سب علی گڑھ کے ان کے ساتھی تھے تو ان لوگوں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ نے تو کمال ہی کردیا، مرادآباد میں سر یعقوب کے معاملات طے کرتے رہے، کچہری عدالت کرتے رہے لیکن یہاں کے اپنے اخبار کے اداریے بھی آپ روز لکھتے رہے، قاضی صاحب نے کہا کہ نہیں بھئی! میں نے ایک دن بھی اداریہ نہیں لکھا جس نے لکھا ہے کیا آپ

انہیں نہیں جانتے ہیں؟ پھر ہم کو آواز دے کر بلایا اور ان لوگوں سے کہا کہ یہ ہیں عشرت صاحب جو اداریے لکھتے رہے، تو یہ تھی قاضی صاحب کی عظمت، قاضی صاحب کے بعد مجھے ویسی کوئی شخصیت ملی نہیں۔

زبان میں نے سیکھی مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی سے، خواجہ حسن نظامی ایک رسالہ منادی نکالا کرتے تھے، ان کا اپنا اسلوب ہے، چھوٹے چھوٹے اور دلنشیں جملے، آسان زبان، اسی طرح مولانا محمد علی کی کتاب ''مضامین محمد علی'' بھی میں نے اسی زمانے میں دیکھی، آخر میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا اسلوب، اگرچہ ان کے بعض نظریات وافکار سے ان کی زندگی میں بھی مجھے اختلاف رہا اور اب بھی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے صاحبِ قلم تھے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، وہ زبان کے بادشاہ تھے، ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح لکھی ''یادوں کی بارات'' جھوٹ اور خرافات سے بھری پڑی ہے وہ کتاب اس پر مولانا دریابادی نے جو تبصرہ کیا اس کا عنوان قائم کیا ''ایک زیٹلے کی سرگزشت'' اس سے بہتر اس کا عنوان نہیں ہوسکتا تھا۔

تو ہم نے خواجہ حسن نظامی اور مولانا دریابادی کی زبان سیکھی اس میں جو Direct Expression ہوتا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور آج تو اس کی اور زیادہ ضرورت ہے، اس زمانہ میں اگر آسان زبان میں لکھا جائے تو وہ قارئین کو جلد اور بآسانی متاثر کرسکتی ہے، اب مولانا آزاد والی زبان نہیں چل سکتی۔

س:-آپ کی والدہ کی تربیت کا کوئی واقعہ جس نے آپ کی زندگی کو متاثر کیا ہو؟

ج:-افسوس کہ میری والدہ کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔

(ہفت روزہ شرجیوی، مئی ۲۰۰۰ء)

سیاسی مسائل

ملت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ شناخت کا ہے!

صدر انڈین نیشنل لیگ

جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ سے ایک ملاقات

جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ کی ذات سے ملک وملت کی خدمات کی ایک طویل تاریخ وابستہ ہے۔ موصوف کے حصہ میں ایک اعزاز وشرف یہ بھی آیا ہے کہ تسلسل کے ساتھ ۳۶ برس تک وہ پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور اس طرح ان کی آنکھوں نے ایک ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر جناب آئی کے گجرال تک کی وزارت عظمی کے ادوار کو دیکھا ہے، وہ ایوان پارلیمنٹ میں ملت اسلامیہ ہند کے نمائندہ اور ترجمان رہے، آزادی کے بعد سے ہی ملت ابتلا وآزمائش سے گزرتی رہی، چنانچہ ملت کے درد کا درماں ڈھونڈھ نکالنے کی جب بھی کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ ایسی ہر کوشش میں شامل رہے، ۱۹۶۴ء کے راوڑکیلا اور جبل پور کے فسادات کے بعد مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل ہو یا ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس یا پھر ۱۹۹۲ء میں فسطائی قوتوں کی ناپاک کوششوں کے نتیجہ میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعہ کو لے کر ملک کی فضا کے مکدر ومسموم ہوجانے کے بعد ملی کونسل کا قیام......ان سب میں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ نے بنیادی اور کلیدی کردار نبھایا......انڈین یونین مسلم لیگ سے وہ نہ صرف پانچ دہائیوں

تک وابستہ رہے بلکہ ۲۲ برس تک اس کی صدارت کے منصب پر بھی فائز رہے، لیکن مسلم لیگ سے ان کی علاحدگی کا واقعہ بھی اپنے اندر بڑا سبق رکھتا ہے، بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ مسلم لیگ سے ان کی علاحدگی کا سبب بنا۔ آئندہ صفحات میں درج تفصیلات سے آپ بھی یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہیں گے کہ انہوں نے اقتدار کے مقابلہ میں اقدار کو عزیز رکھا اور دین وملت کی زبانی حمایت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وقت آنے پر عملاً اپنی دینی حمیت اور ملی غیرت کا بھی ثبوت دے ہی دیا......کڑی آزمائش کے اس موقع پر توفیق خداوندی ان کے شامل حال رہی، آج جب کہ موجودہ سیاست میں اخلاقی قدروں کو زوال آچکا ہے اور اصولوں کو پامال کیا جارہا ہے، مستقبل کا مورخ جب بھی بابری مسجد قضیہ پر قلم اٹھائے گا تو وہ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ کی غیرت وحمیت اور عند اللہ مسئولیت کے احساس کا ذکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھے گا......

گزشتہ دنوں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ لکھنؤ تشریف لائے جی چاہا کہ ملک وملت کی سیاست کے میدان خار زار کے اس شہ سوار سے پوچھا جائے کہ ملت کے درد کا درماں کیا ہے......اس لئے بھی کہ موصوف نے ساحل پر بیٹھ کر تماشہ نہیں دیکھا بلکہ وہ موجوں سے نبرد آزما رہے......یہی وجہ ہے کہ درج ذیل انٹرویو میں آزادی کے پچاس برس اور اس مدت میں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی حالت وکیفیت کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، وہ موصوف کے اپنے براہ راست مشاہدات کا حاصل اور تلخ وطویل تجربات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے......اس میں صرف درد کا اظہار ہی نہیں بلکہ درد کا مداوا بھی پیش کیا گیا ہے، اب یہ ملت اور ملت کا کام کرنے والوں کا کام ہے کہ وہ اس دانا وبینا اور صاحب بصیرت شخصیت کے تجربات و

مشاہدات کی روشنی میں اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کریں......اس لئے کہ ملت پر یہ آزمائش کی گھڑی ہے اور اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا وقت ہے۔

ملی پولیٹیکل فورم کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ نے ساری ملت کو اور ملت کے تمام تر سیاسی جماعتوں کو بھی کلمۂ طیبہ کو اساس بنا کر ایک ہو جانے کی دعوت دی ہے تاکہ فسطائیت کے عفریت کو شکست دی جا سکے......۱۴؍نومبر ۱۹۹۸ء کو اسی شہر لکھنو میں مخدوم ومکرم جناب غلام محمود بنات والا صاحب (ایم پی) نے بھی ملی جمہوری محاذ کے چیئرمین کی حیثیت سے یہی دعوت دی ہے......ان دونوں بزرگوں نے ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے اور ایک بہت بڑے خطرہ سے مقابلہ کے لئے تمام سیکولر پارٹیوں سے بھی متحد ہو جانے کی اپیل کی ہے......چھوٹا منھ بڑی بات ہے لیکن ملت کے ایک عام فرد کے بھی دل کی یہی آواز ہے کہ یہ ملت اپنے قائدین کی صفوں میں بھی اتحاد دیکھنے کی آرزومند ہے...... بابری مسجد کی شہادت کا زخم جب بھی ہرا ہوتا ہے تو اس موقع پر جہاں فسطائی قوتوں کی جارحیت پر غصہ آتا ہے وہیں اپنے قائدین کی صفوں کا انتشار رلاتا بھی ہے ......یقین واثق ہے کہ انشاء اللہ اس سلسلہ میں ہمارے قائدین کے فیصلے تمام مصلحتوں سے بلند وبالا ہوں گے اور اس طرح ان کی مخلصانہ ودرد مندانہ کوششوں کے نتیجہ میں ملت اور سیکولر طاقتیں، متحد ہو کر ملک کو درپیش فسطائیت کے خطرہ کا مقابلہ کرنے کی اہل ہو سکیں گی......

ہم جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ کے نہایت مشکور ہیں کہ موصوف نے ہمیں وقت عنایت فرمایا، امید ہے کہ یہ انٹرویو نگاہ شوق سے پڑھا جائیگا جو قارئین میں احساس زیاں اور احساس عمل دونوں کو جگائے گا......انشاء اللہ العزیز

سوال: گزشتہ مہینہ ملی پولیٹیکل فورم کا قیام عمل میں آیا۔ جناب والا کا اس فورم کی تشکیل میں اہم کردار ہے۔ اس فورم کے قیام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا، نیز آپ کے نزدیک مستقبل قریب میں فورم کی بدولت ملک کے سیاسی افق پر کون سے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟

جواب: آپ جانتے ہیں اللہ کے فضل وکرم سے آج سے ۵۰ سال پیشتر ہمارا ملک آزاد ہوا، ملک کی آزادی میں جو کردار علماء کا رہا اس سے آپ خوب واقف ہیں، اس بات پر میرا یقین واثق ہے کہ ملک کو جو آزادی نصیب ہوئی، وہ علماء کرام کی مخلصانہ اور پر عزیمت جدوجہد اور ان کی قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے خون کا صدقہ ہے، ان کی جدوجہد کی یہ داستان ایک صدی نہیں بلکہ مسلسل دو صدیوں پر محیط ہے، انہوں نے اس راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے، ان کا خون رنگ لایا اور بالآخر یہ ملک آزاد ہو گیا۔

آزادی سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں......علماء نے یہ سمجھ کر قربانیاں دی تھیں کہ اسلام کی آزادی کے لئے ہندوستان کا بھی آزاد ہونا لازمی ہے، آزادی کے ماحول میں فضا سازگار ہوگی، حالات نارمل ہوں گے، مذہبی آزادی ہوگی، برادران وطن سے خوشگوار تعلقات ہوں گے اور اس طرح انشاء اللہ دعوت کے امکانات بھی روشن ہوں گے لیکن افسوس کہ یہ سارے خواب چکنا چور ہو گئے، فضا مکدر ہو گئی، تقسیم وطن کے سبب ہندوستان و پاکستان میں آباد لوگوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کی، اس کے بھی برے اثرات مرتب ہوئے......متمول حضرات کاروبار کے لئے گئے، سیاسی قیادت کا رخ بھی پاکستان کی طرف ہوا، اس کے علاوہ ملازمت پیشہ طبقہ نے بھی ہجرت کر لیا اور پاکستان میں بس کر وہیں ملازمت اختیار کرنے کو ترجیح دی، نتیجہ کے طور پر یہاں رہ جانے والوں میں عموماً غریب اور پس ماندہ مسلمان رہ گئے، ہاں! اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے قائدین اور علماء کرام میں ایک تعداد ایسی بھی رہی جس نے اس ملک میں رہنے اور بسنے اور یہیں مرنے جینے کا فیصلہ کیا۔

آزادی کے بعد سے ہی مسلمانوں کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا...... ایک بہت بڑا مسئلہ مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کا تھا، فسادات کا ایک سلسلہ جاری رہا جس کا ایک افسوسناک اور شرمناک پہلو یہ ہے کہ ان فسادات میں حکومت کی مشنری خصوصاً پولیس بھی ملوث رہی، شر پسند عناصر کے ساتھ وہ بھی لوٹ مار اور غارت گری میں شامل رہتی...... دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں حکومت تھی...... خود کو سیکولر کہنے والی حکومت! مستحکم حکومت!!...... مگر ان فسادات پر قابو پانے، شر پسند عناصر کو لگام دینے اور ملوث محکمہ پولیس کے خلاف اقدام کرنے کی کبھی کوئی سنجیدہ اور ٹھوس کوشش نہیں کی گئی، یوپی کی بدنام زمانہ پی اے سی سے اور مہاراشٹر کی پولیس کی جانبدارانہ کارکردگی سے سب واقف ہیں، لیکن حکومت نے ان کے خلاف اقدام سے ہمیشہ گریز کیا، اس کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ اسی زمانے میں فسطائی قوتوں نے سر ابھارنا شروع کیا تھا اور ان کو قوت مل رہی تھی، افسوس کہ کانگریس نے (جو خود کو سیکولر کہتی رہی ہے) ان فسطائی قوتوں کو ابھرنے نہ دینے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس ملک میں مسلمان سب بڑی اقلیت ہے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان کے ساتھ کبھی سماجی انصاف نہیں کیا گیا، ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا، ملازمتوں کے معاملے کو لے لیجئے، اعداد وشمار کی روشنی میں کسی سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ادنی درجہ کی ملازمتوں میں ان کا تناسب دو تین فی صد ہوگا اور اعلی درجہ کی ملازمتوں میں ڈیڑھ فی صد۔ اس کے ساتھ یہ پہلو بھی یاد رکھنے کا ہے کہ مسلمانوں کی صحیح اور حقیقی قیادت کو ابھرنے اور مؤثر اور طاقتور ہونے نہیں دیا گیا، ان میں جو سچی اور مخلص قیادت ہوسکتی تھی اسے نظر انداز کرنے اور دبانے کی کوششیں بھی کی جاتی رہیں...... ہاں! کچھ مسلمانوں کو وزارتیں اور اعلی منصب بھی بخشے گئے مگر ایسے لوگوں کو جو ان کے مفادات کے نگہبان ہوں اور ان کے ہمنوا ہوں۔

۵۰ سال بعد جو حالات درپیش ہیں، وہ نہایت سنگین اور نازک ہیں، ان پچاس سالوں میں حکومتیں آتی جاتی رہیں، اس مدت میں زیادہ تر کانگریس ہی برسر اقتدار رہی، پھر ملک میں سیکولر مخلوط حکومتوں کے تجربے بھی ہوئے۔ ایمرجنسی کے بعد جنتا پارٹی کی مرارجی حکومت سے

لے کر ماضی قریب میں آئی کے گجرال کی وزارت عظمی تک کی حکومتیں آتی جاتی رہیں، لیکن ان دنوں ملک کا جو نقشہ ہے وہ سب کے سامنے ہے، اس میں فسطائی قوتیں نہایت زور پکڑ چکی ہیں اور بی جے پی اقتدار میں ہے...... اس تصویر کا ایک تاریک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان فسطائی قوتوں کا مقابلہ میں کرنے سیکولر طاقتیں ناکام دکھائی دے رہی ہیں...... حکومت تو بی جے پی کی ہے لیکن ان کی طاقت وقوت کا اصل سرچشمہ آر ایس ایس ہے، سنگھ پریوار ہے، شیوسینا، بجرنگ دل، وشو ہند پریشد جیسی فسطائی قوتوں کے مقاصد ایک ہیں...... سب جانتے ہیں کہ حکومت آر ایس ایس کے اشاروں پر چلتی ہے، جناب اٹل بہاری باجپئی بھی سمجھتے ہیں کہ ان احکامات سے سرموانحراف کرنے کا نتیجہ کیا ہاتھ آئے گا۔

بی جے پی اقتدار تک کیسے پہنچی، اس سوال کا تجزیہ کریں تو بآسانی اس نتیجے پر آپ پہنچیں گے کہ ملک کی سیکولر پارٹیاں کبھی متحد نہیں ہوسکیں، سیکولر پارٹیوں کو مواقع بھی ملے انہوں نے مسلمانوں سے ہمدردی کے خوب دعوے بھی کئے لیکن سیکولر پارٹیوں کا باہمی ٹکراؤ اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں سیکولر ووٹوں کا بٹوارہ ہوا...... نتیجہ میں بی جے پی کو تقویت ملی، حاصل یہ کہ سیکولر پارٹیوں کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجہ میں یہ دن دیکھنے کو ملے۔ سیکولر ووٹوں کا بٹوارہ ہوتا رہا...... اور ان سیکولر ووٹوں میں مسلمان بھی شامل رہے، نتیجہ میں ان کے ووٹ بھی تقسیم ہوتے رہے...... بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کی جو سیاسی صورت حال بنی اس میں مسلمانوں نے ملائم سنگھ، لالو پرساد یادو اور کانشی رام جیسے سیکولر کہلائے جانے والے لیڈران کا ساتھ دیا، اس قسم کے لیڈران میں باہمی پھوٹ کے نتیجہ میں مسلم ووٹ بھی تقسیم ہوتے رہے، الیکشن اور اس کے نتائج کا تجزیہ کیا جائے تو اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ جتنے ووٹ ایس پی، بی ایس پی اور کانگریس کے امیدواروں کو ملے ہیں وہ بی جے پی کی جیتنے والے امیدوار کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اگر یہ سیکولر پارٹیاں باہم دست وگریباں نہ ہوتیں اور اس طرح سیکولر ووٹوں کا بٹوارہ نہ ہوتا تو اتر پردیش کی ۶۵ سیٹوں سے سیکولر پاٹیوں کے امیدوار کامیاب ہوتے...... اپنی نادانی کی وجہ سے ہم نے یہ موقع کھودیا اور آج یہ دن دیکھنا

پڑا ہے، مختلف سنین میں پارلیمنٹ میں بی جے پی کے ممبران کی تعداد پر نظر ڈالئے۔ پانچویں لوک سبھا میں دو، نویں لوک سبھا میں پچاسی، دسویں لوک سبھا میں ۱۱۹ اور اس کے بعد اور آگے گئے تو یہ تعداد بڑھتی رہی۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کو درپیش مسائل کے سلسلے میں چند باتیں رہ گئیں...... مسلمانوں کی مساجد اور ان کے مدارس کو غیر محفوظ بنا دیا گیا، بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آ ہی گیا، ندوۃ العلماء جیسے ممتاز تعلیمی ادارہ پر سی بی آئی کے چھاپے کا افسوسناک واقعہ پیش آیا، مدارس اسلامیہ پر آئی ایس آئی کا اڈہ ہونے کے بے بنیاد الزامات لگائے جاتے رہے۔ اسلامی درس گاہوں کے لئے ناپاک اور منصوبہ بند پروپیگنڈہ کا ایک سلسلہ چل پڑا،...... ان تمام کوششوں کا مقصد یہ رہا کہ مسلمانوں کی حب الوطنی کو مشکوک بنا دیا جائے اور اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے حوصلوں کو کچل دیا جائے، ان کی غیرت وحمیت سے کھلواڑ کیا جائے اور وہ اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ان فسطائی قوتوں کا ایک منصوبہ بابری مسجد کی شہادت کا تھا، بابری مسجد کی شہادت کے سلسلے میں یہ بات صاف کہہ دینے کی ہے کہ اس ناپاک اور گھناؤنی سازش میں نرسمہا راؤ کی برابر کی شرکت رہی، درحقیقت بابری مسجد کے شہادت کی تمام تر ذمہ داری نرسمہا راؤ پر ہے وزارت عظمی کی کرسی پر بیٹھ کر اس شخص نے کیا کیا وعدے نہیں کئے۔ ''بابری مسجد پر آنچ نہیں آنے دوں گا، اس کی حفاظت کے لئے میں پوری طرح سے پابند اور ذمہ دار ہوں'' ملت کے اکابر وقائدین سے اس شخص نے یہ وعدے کئے، حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ اور محترم مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب جیسی باوقار شخصیتوں کی موجودگی میں اس نے یہ یقین دہانیاں کرائیں۔ ہم لوگ برابر ملاقاتیں کرتے رہے، حالات کی سنگینی کی طرف نرسمہا راؤ کو متوجہ کرتے رہے، ہمارا مطالبہ تھا کہ کلیان سنگھ کو معزول کیا جائے، یوپی میں صدر راج نافذ کیا جائے، فوج بھیجی جائے اور بابری مسجد کو بچایا جائے...... لیکن دنیا جانتی ہے کہ کیا ہوا، اس وقت کے ہوم سکریٹری نے بھی برملا اعتراف کیا ہے اور اس وقت

وزیر داخلہ ایس بی چوان نے بھی کہا ہے کہ نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے ہی نہیں دیا ایمرجنسی پلان تیار ہو گیا تھا کہ کس طرح فوج بھیجی جائے اور بابری مسجد کو بچایا جائے لیکن نرسمہا راؤ نے اس پلان کو روبہ عمل ہونے نہیں دیا، اجودھیا میں کارسیوک بھاری تعداد میں جمع ہوتے رہے لیکن اس پر کوئی کاروائی نہیں کی گئی!...... مسجد کی شہادت کے بعد صدر راج کا نفاذ ہوا، سانحہ پیش آنے کے بعد کلیان سنگھ کو معزول کیا گیا اور سب سے زیادہ افسوسناک شرمناک اور خطرناک بات یہ ہوئی کہ ۴۸ گھنٹوں کے اندر مسجد کی جگہ پر مندر کا چبوترہ بنا دیا گیا اور وہاں بت لا کر رکھ دئے گئے...... نرسمہا راؤ کی زیر سرپرستی مسجد کو مندر بنا دینے کا یہ کام ہوا اور فوج کی موجودگی اور حکومت کی نگرانی میں ہوا...... اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے ساتھ کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ یہ زخم بالکل ہرا ہی تھا کہ مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے، اس پر بھی بس نہیں کیا گیا، ٹاڈا جیسا کالا قانون نافذ کیا گیا اور مسلمان بڑی بے دردی کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دئے گئے، وہ ایذارسانی کی نہایت کربناک داستان ہے جس کا سب کو علم ہے۔

آج جو صورت حال ہے وہ نہایت نازک اور سنگین ہے، آج ہمارے عقائد خطرے میں ہیں، ہمارا دینی تشخص خطرے میں ہے، دین خطرہ میں ہے، ان حالات میں مسلمانوں کا جینا، جینا ہی کیا!!...... اگر خدانخواستہ فسطائی قوتیں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتیں تو پھر ہمارا جینا ہی کیا!!...... یہ عمل ہماری موت کے مترادف ہے، شریعت مطہرہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور قرآن مجید اللہ رب العزت کی کتاب ہے، ایک عام مسلمان بھی اس سے بخوبی واقف ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ شریعت مطہرہ کا پابند ہے...... وہ احکام الٰہی کا پابند ہے۔

بی جے پی کا مینی فیسٹو شائع ہوا تھا، اس میں پہلی چیز کیا ہے...... یکساں سول کوڈ کا نفاذ ...... اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا سیدھا مطلب ہے، مسلم پرسنل لاء کا خاتمہ...... ان ناپاک عزائم ڈھکے چھپے نہیں ہیں، ارادے صاف ظاہر ہیں...... اس مینی فیسٹو میں دوسری بات ہے

کہ جہاں بابری مسجد واقع تھی، اسی جگہ رام مندر تعمیر ہوگا...... حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ مقدمہ لکھنو بنچ میں، عدالت میں زیر سماعت ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا مقدمہ بہت مضبوط ہے، فیصلہ ہونا ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہی ہوگا، یہ ساری باتیں اپنی جگہ ہیں...... لیکن دوسری طرف سنگھ پریوار کے بیانات بھی برابر آرہے ہیں کہ ہم رام مندر کے معاملے کو قانون اور عدالت سے بالاتر سمجھتے ہیں...... ہم اس میں عدالت کے فیصلے کے پابند نہیں ہیں، چنانچہ مندر وہیں تعمیر ہو کر رہے گا،...... تعمیر مندر کی تیاریوں کے بھی چرچے ہو رہے ہیں، ستون تیار ہو رہے ہیں، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان تیاریوں کی تشہیر بھی کی جارہی ہے۔

تیسری بات اس مینی فیسٹو کی یہ ہے کہ پچاس سالہ تجربات کی روشنی میں دستور پر نظر ثانی کی جائے گی، اس کے لئے کمیشن مقرر کیا گیا، دستور پر نظر ثانی کے پس پشت کیا مقاصد ہو سکتے ہیں انہیں سمجھنا دشوار نہیں ہے...... ''ہندتوا'' ان کا فلسفہ ہے، ہندو راشٹر کا قیام ان کا نصب العین ہے اور ہندو راشٹر میں مسلمانوں کا کیا بنے گا، اس سلسلے میں بھی ان کے نظریات سے سب واقف ہیں۔ گرو گولوالکر کی ایک تحریر کے مطابق مسلمانوں کو شہری تسلیم ہی نہیں کیا جائے گا اور جب وہ شہری ہی نہیں مانے جائیں گے تو ان کے حقوق کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلیمی اور مذہبی حقوق کے خاتمہ کا کام تو سر فہرست ہے...... حاصل کلام یہ کہ منصوبے ایسے ہیں سارا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا جائے، صدارتی طرز حکومت کے لئے وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی کی پرزور وکالت اور اس کے پس پشت مقاصد سے بھی ہمیں آگاہ رہنا چاہیے، اپنے ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے انہوں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ ہر محکمہ میں آر ایس ایس اور اس ذہنیت کے لوگ داخل کئے جارہے ہیں، ہر محکمہ کے بیوروکریٹس کو آر ایس ایس کے افسر سے ہدایات حاصل کرنا ہوتی ہیں...... جیسا کہ میں نے کہا کہ تعلیم کے سلسلے میں اور تعلیمی اداروں کے سلسلے میں بھی دوررس نتائج کی حامل پالیسیاں بنائی جارہی ہیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں

زیر تعلیم طلباء مسلم ہوں یا غیر مسلم، سب کے لئے سرسوتی کی پوجا اور وندے ماترم کا پڑھنا لازمی قرار دیا جارہا ہے، وندے ماترم بھومی پوجا کا معاملہ ہے اور بھومی پوجا شرک ہے...... ملی کونسل کے کاروان آزادی کے سفر کانپور میں میں نے کہا تھا کہ ملک ہمارا محبوب ہے، معبود نہیں...... لیکن یہاں پر مجبور کیا جارہا ہے کہ ملک کو معبود سمجھو......!

ان ساری کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ وطن سے آپ کی وفاداری کے معنی ہیں کہ وطن سے باہر آپ کی کوئی مذہبی و روحانی وابستگی باقی نہ رہے، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ سے عشق و وارفتگی اور نبی پاک سرور کائنات محمد رسول اللہ سے لگاؤ اور وابستگی بھی خاکم بدہن گوارا نہ ہوگی...... اس صورت حال کے پیدا کئے جانے کی ناپاک کوششیں کی جارہی ہیں، آخر ان سب باتوں کو کیسے اور کہاں تک برداشت کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک طرف تو ہندوتوا کا یہ فلسفہ اور اس کے مطابق ان کے یہ ناپاک عزائم ہیں لیکن دوسری طرف پارلیمنٹ میں بی جے پی کو حکومت سازی کے لئے درکار اکثریت نہ ملنے کی وجہ سے حکومت بیساکھیوں پر چل رہی ہے، حکومت میں شریک بی جے پی کی حلیف جماعتیں بھی دستور پر نظر ثانی، بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر اور یونیفارم سول کوڈ جیسے ایشوز پر بی جے پی کی ہم نوا نہیں ہیں، اس لئے سردست ایک نیشنل ایجنڈا بنالیا گیا ہے اور بظاہر بی جے پی کے منشور کو التوا میں ڈال دیا گیا ہے، بیساکھیوں پر قائم یہ حکومت ممکن ہے کچھ اور چل جائے، سال دو سال چل جائے لیکن جب بیساکھیوں سے بے بناؤ رنگ لائے گا تو سب سمجھتے ہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا...... یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ یہ لوگ از خود کسی نہ کسی بہانے حکومت گرادیں اور پھر یہ مطالبہ لے کر عوام کے سامنے آئیں کہ ہمیں مکمل اکثریت کے ساتھ کامیاب بناؤ، مخلوط حکومت کا حشر آپ نے دیکھ لیا، ہم بے دست و پا رہے، ہمارے سارے کام تشنۂ تکمیل ہیں، یکساں سول کوڈ کا نفاذ، رام مندر کی تعمیر اور ہندتوا کے فلسفے کے تحت مختلف منصوبوں پر عمل درآمد، اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ پارلیمنٹ میں ہمیں مکمل اکثریت نہ مل جائے...... اس طرح یہ عوام کی ہمدردی اور تائید

حاصل کرنے کی کوشش کریں گے...... اسی لئے کہتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کے لئے آخری موقع ہے...... اس بات کا ہمیں پوری شدت کے ساتھ احساس ہونا چاہیے کہ اگر یہ موقع خدانخواستہ گنوادیا گیا تو پھر موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ پہاڑ جیسی غلطی ہوگی۔

اس کے لئے تیاریاں ابھی سے ہونا چاہیے، اس کی فکر پیدا ہونا چاہیے، اس کا احساس جاگنا چاہیے، فکر کے ساتھ اتحاد عمل کا جذبہ بیدار ہونا چاہیے، بنیادی بات اتحاد ہے۔ اس کے لئے ہماری صفوں میں اتحاد ہونا چاہیے...... یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے......

اللہ تبارک تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے ''یایھا الذین امنو اتقو اللہ حق تقتہ و لا تموتن الا وانتم مسلمون'' مسلمان کی موت مرنے کے لئے کہا گیا ہے...... ایک مسلمان، مسلمان کی موت اسی وقت مرے گا جب وہ مسلمان کی حیثیت سے جئے گا...... مسلمان کی حیثیت سے جینے کے لئے شریعت کی پابندی لازمی ہے...... اور جب شریعت پر عمل درآمد کا معاملہ ہی خطرہ میں پڑ جائے گا تو ہماری زندگی ایک مسلمان کی زندگی ہی کب رہ جائے گی......!!

ہمارے مابین اتحاد کی اساس اور بنیاد موجود ہے اور وہ ہے کہ کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... اتحاد کی لئے یہی ایک مضبوط اور ٹھوس اساس ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ اتحاد بین المسلمین کا اور کوئی راستہ نہیں، تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ہم متحد ہوسکتے ہیں...... اس احساس کا ہمارے اندر جاگنا ناگزیر ہوگیا ہے، اس یقین کا ہمارے اندر پیدا ہونا ضروری ہے، اقبال نے کہا تھا ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

یہ ''احساس زیاں'' ہمارے اندر جاگنا چاہیے۔ اور احساس زیاں کے ساتھ احساس عمل...... اس بات کا احساس کہ ہم خیر امت ہیں، اور خیر امت کی حیثیت سے اپنے فرائض کا احساس کہ بحیثیت ''خیر امت'' ہندوستان میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ برادران وطن

کے ساتھ خیر سگالی اور پھر خیر امت کے اس فریضہ کی ادائیگی جسے دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔

یہ سارے کام منصوبہ بندی چاہتے ہیں، افسوس کہ بہت وقت گزر چکا، بہت وقت ضائع ہو چکا، پانی سر سے اونچا ہوا جارہا ہے، ہمارے گھر ہی کو نہیں پورے ملک میں آگ لگ رہی ہے۔ اس لئے اگر خدانخواستہ یہ احساس اب بھی نہ جاگا تو حالات کی سنگینی کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔

اگر گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلات لا الہٰ

حق کے راستہ میں تو مشکلات آئی گی ہی، انہیں برداشت کرنا پڑے گا، انبیاء کرام نے مشکلات اٹھائیں، سرور کائنات ﷺ نے ہمارے لئے کیا کچھ نہیں برداشت کیا۔ تو خطرات ومشکلات سے خوف کیسا! ہمیں بھی مشکلات کا سامنا کرنا ہی پرے گا اور مختلف قربانیاں دینی پڑیں گی، قربانی کے بغیر کوئی مقصد حاصل نہیں ہوا کرتا، قربانی کا جذبہ کب پیدا ہوتا ہے جب اللہ رب العزت سے، سرور کائنات ﷺ سے، دین متین اور شریعت مطہرہ سے محبت ہو جب یہ محبت پیدا ہوتی ہے تو قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی عشق!
معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق!

تو قربانی کے بغیر منزل نہیں ملا کرتی!!

اس تصویر کا ایک پہلو اور ہے، ایسا نہیں ہے کہ پچاس سال کے اس عرصہ میں مسلمان بالکل ہی غافل رہے۔ الحمد للہ مسلمانوں میں بیدار مغز علماء ودانشور موجود تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً ملت کو جگایا، جھنجھوڑا ان کے شعور کو بیدار کیا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے ۱۹۶۲ء میں ایک کنونشن بلایا تھا، ڈاکٹر سید محمود بھی اس میں شریک تھے مگر افسوس کہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ پھر ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، حضرت مولانا علی میاں صاحب اور ان کے علاوہ جماعت اسلامی ہند، جمعیۃ العلماء ہند، انڈین

یونین مسلم لیگ وغیرہ کے سربراہ سر جوڑ کر بیٹھے اور مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی لیکن آپ جانتے ہیں کہ مسلم مجلس مشاورت کا دائرہ کار محدود تھا، فساد زدہ علاقوں میں دورے کرنا، ان علاقوں میں امن قائم کرنا، ہندو مسلم تعلقات کو بحال کرنا وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود الحمدللہ مسلم مجلس مشاورت نے اپنے دور میں بڑا کام کیا اور اس کی حسن کارکردگی نے خلافت کے دور کی یادیں تازہ کردیں، یہ سب باتیں ہیں جو اپنی جگہ ایک حقیقت اور ایک تاریخ ہے، لیکن افسوس کہ اس سے وابستہ قد آور شخصیتیں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتی چلی گئیں، اس کے علاوہ کچھ غلط قسم کے لوگ بھی اس کارواں سے جڑ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم مجلس مشاورت میں اضمحلال آگیا۔

اس کے بعد ملک کے حالات نے ایک نیا موڑ لیا، متبنیٰ بل، شریعت میں مداخلت اور شاہ بانو کیس کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک بار پھر بیداری کی لہر پیدا ہوئی، تحفظ شریعت کے لئے علماء کرام میدان عمل میں آئے اور مسلم پرسنل لاء کانفرنس دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں منعقد ہوئی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس کے صدر ہوئے اور ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب (اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو ہم سب کے سروں پر دراز فرمائے) صدر ہیں، الحمدللہ مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلمانان ہند کا نمائندہ بورڈ ہے۔ ہر مسلک و مکتب فکر اور تمام مسلم سیاسی جماعتوں کی اس میں نمائندگی ہے لیکن اس کا بھی اپنا دائرۂ کار ہے۔

وقت گزرتا گیا، حالات موڑ لیتے رہے اور پھر بابری مسجد کا مسئلہ زور وشور سے اٹھایا گیا۔ سومناتھ سے ایودھیا تک رتھ یاترا کا سلسلہ چلا، ملک میں فرقہ وارانہ فضا پیدا کی گئی، مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا ماحول بنایا گیا، ان نازک حالات میں مسلمانوں کو رہنمائی کی ضرورت تھی، اس نازک گھڑی میں مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی نے بمبئی میں اتحاد ملت کانفرنس بلائی، اس کانفرنس کا افتتاح بھی حضرت مولانا علی میاں صاحب نے فرمایا، یہ مئی ۱۹۹۲ء کی بات ہے، یہ بابری مسجد کی شہادت سے قبل کی بات ہے پھر ملی کونسل کی

تشکیل میسور میں ہوتی ہے، سلطان ٹیپو شہیدؒ کے مزار سرنگا پٹنم کے قریب ہے، دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد شہید کردی گئی، اور سورت اور بمبئی میں مسلم کش فسادات کا سلسلہ چل پڑا، یہ بڑے نازک حالات تھے، فساد زدہ علاقوں کے دورے کرنا، فساد زدگان کی ریلیف کی فکر کرنا، فساد زدگان کے آنسو پونچھنا اور ان کے مسائل کا فوری ممکنہ حل ڈھونڈنا جیسے بہت سارے کام تھے، الحمدللہ توفیق خداوندی شامل حال رہی اور ملی کونسل کے کارکنوں نے آزمائش کی اس گھڑی میں صبر وضبط اور نظم وضبط کے ساتھ ان کاموں کو انجام دیا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ملی کونسل کا دائرہ کار بڑا وسیع ہے، یہ ملت کی تعمیر وترقی کے لئے ایک ہمہ گیر اور جامع منصوبہ رکھتی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس میں تمام تر گوشوں کا احاطہ ہوجائے، مسلمان تعلیم، اقتصاد، ذرائع ابلاغ اور ان جیسے دوسرے میدانوں میں کیوں کر اپنا مقام بنائیں، یہ ساری فکریں ملی کونسل کے دائرہ کار میں ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے، ان کا سیاسی شعور بیدار کیا جائے۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ملی کونسل کے دستور میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کونسل موجودہ انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے گی، اس صورت میں مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری کا کام کس طرح کیا جائے، اس کے لئے طریقۂ کار کیا ہو۔ مسلمانوں کے ووٹ تقسیم نہ ہوں، سیکولر ووٹ تقسیم نہ ہوں، مسلمانوں کی سیاسی تنظیموں میں باہمی ٹکراؤ نہ ہو۔

مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں الحمدللہ کام کررہی ہیں، مجلس اتحاد المسلمین، مسلم لیگ، مسلم مجلس اور دوسری جماعتیں ہیں لیکن ان سب کے دائرہ اثر محدود ہے، مثلاً اتحاد المسلمین آندھرا پردیش میں اور مسلم لیگ کیرالا میں سرگرم عمل ہے، تو ان کے دائرہ اثر کے محدود ہونے اور دیگر وجوہات کی بناء پر بھی ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی نمائندگی ان کے ذریعہ نہیں ہوپاتی۔ کوشش کی گئی تھی کہ ان تمام مسلم سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لایا جائے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا۔

اس صورت حال پر غور وخوض کے لئے ملی کونسل کا اپریل ۹۸ء میں ایک جلسہ طلب کیا

گیا جس میں ملی پولیٹکل فورم ابھی اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہے، چنانچہ اس مرحلہ میں فورم بنیادی کاموں پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمان سیاسی سطح پر اپنی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں، اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور اپنا وزن ثابت کریں، ایسی حکمت عملی وضع کریں کہ جس سے ان کے ووٹ تقسیم نہ ہونے پائیں، تو یہ گراؤنڈ ورک، (Root Work) اس وقت ملی پولیٹکل فورم کے پیش نظر ہے، بنیادی نوعیت کے اس 'وقت طلب' اور صبر آزما کام کے بعد جب انشاء اللہ حالات سازگار ہو جائیں گے تو ملی پولیٹکل فورم انتخابات میں حصہ لینے پر بھی غور کر سکتی ہے۔

ملک میں موجود سیکولر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر بھی کام کیا جا سکتا ہے، دنیا طاقت کی زبان جانتی ہے، اگر آپ کے پاس طاقت ہے تو دنیا آپ سے بات کریگی، آپ سے رجوع کرے گی، مسلمانوں نے ادھر ایک دو دہائیوں میں وقتاً فوقتاً مختلف سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیا ۔

چلتا ہو تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کی کیفیت مسلمانوں کی رہی، تو مسلمانوں کو اس وقت سیاسی رہنمائی کی ضرورت ہے، سیاسی قیادت کی ضرورت ہے، جو ایسی حکمت عملی وضع کرے جو سیاسی میدان میں مسلمانوں کی بے وزنی کو ختم کرے اور انہیں مؤثر بنائے۔ ایک بات بہت واضح طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں کو ایسی پالیسی وضع کرنا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے دو فریضے انجام دے سکیں۔ ملک کی ڈوبتی کشتی کو بھی بچانا ہے اور اپنے آپ کو بھی بچانا ہے، ایک طرف اپنے دین و شریعت کا تحفظ، داخلی اعتبار سے اس کے احکامات کی اس طرح مکمل پابندی کہ اس کی تعلیمات کے جیتے جاگتے نمونے بن جائیں اور خارجی سطح سے اس پر کئے جانے والے حملوں کا دفاع۔ اس طرح مسلمان اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، اور ملک کا بچانا یہ ہے کہ اس کی تعمیر و ترقی میں ہمارا کردار ہو، ملک کی سالمیت کے تحفظ اور اس کی آزادی کے تحفظ کی

ہمیں پوری فکر ہو، ملک میں فرقہ وارانہ فضا کو نہ بننے دیا جائے، ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی کا ماحول بنے، اس کے لئے ہم برابر کوشاں رہیں خیر امت کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کرنے کے یہ دو اہم کام ملی پولٹیکل فورم کے پیش نظر ہیں، آپ جانتے ہیں کہ فورم چند مہینوں پہلے ہی قائم ہوا ہے، ابھی جگہ جگہ اس کی تشکیل ہونی ہے، اس کی جڑیں پھیلنی ہیں، اس کے لئے مخلص و دردمند اور صالح، بیدار مغز اور خدا ترس افراد کی ضرورت ہے، ایسے افراد جنہیں ملک وملت عزیز ہوں، جو ان مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں اور ان خطوط پر کام کرنے کے لئے اپنا وقت بھی دے سکتے ہوں۔

سیاست اور مذہب جدا جدا نہیں، سیاست شجر ممنوعہ نہیں ہے، اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اسلام خیر و شر کی تمیز سکھاتا ہے، سیاسی میدان ہو یا اقتصادی، تعلیمی ہو یا معاشرتی، ہر شعبہ زندگی میں اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

آج ملک کدھر جا رہا ہے، آپ دیکھ رہے کہ کس قدر انحطاط ہے، دیانتداری عنقا ہے، ان حالات میں خیر امت کی حیثیت سے بھی ہمارا فریضہ ہے کہ ہم سیاسی میدان میں بھی اخلاقی قدروں کی بحالی کی فکر کریں، ہم کسی جماعت اور تنظیم کی مخالفت نہیں کرتے، نہ کسی مسلم جماعت کی نہ دیگر سیکولر جماعتوں کی۔ ہم اپنی بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی دعوت پیش کرنا چاہتے ہیں، اپنی پالیسی کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ سب کو ساتھ لے کر چلیں اور مثبت و تعمیری لائحہ عمل مرتب کریں۔ اس طرح مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار ہو، ان کی صفوں میں اتحاد ہو، سیاسی میدان میں ان کا وزن ہو، یہ ہیں وہ مقاصد جو ملی پولیٹیکل فورم کے پیش نظر ہیں۔

سوال: آپ کی آنکھوں نے ایک ممبر پارلیمنٹ (M.P) کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر جناب ائی۔ کے۔ گجرال تک کی وزارت عظمی کے دور کو دیکھا ہے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ادھر کچھ دہائیوں سے میدان سیاست میں جرائم پیشہ افراد کی بن آئی ہے اور اخلاقی قدریں پامال ہوگئی ہیں اس پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

جواب: دیکھئے! آزادی کے معابعد کا جو دور تھا وہ آج کے دور سے یقیناً مختلف تھا، نئی نئی آزادی ملی تھی، کانگریس کی صف سے مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی اور انڈین یونین مسلم لیگ سے قائد ملت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب جیسی شخصیتیں پارلیمنٹ میں اور میدان سیاست میں موجود تھیں، یہ وہ دور تھا جب کچھ نہ کچھ اخلاص تھا، ملک کی خدمت کا جذبہ تھا لیکن افسوس کہ پھر میدان سیاست میں اخلاقی انحطاط در آیا، اس زوال وپستی کی وجہ یہ ہوا کہ نیتیں بدل گئیں، سیاست کو وطن کی خدمت کا نہیں، ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا گیا، اقتدار کا حصول ہی مقصد ومنتہا قرار پایا۔ پارلیمنٹ تک پہنچنا اور پھر وزارت کی کرسی حاصل کرنا ہی مقصود ٹھہرا، اس راہ سے دولت بٹورنے کا جنون بھی دماغوں میں سما گیا، حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی، صحیح غلط کا امتیاز جاتا رہا، میدان سیاست میں جرائم پیشہ افراد کے داخل ہوجانے سے اخلاقی قدروں کو تو پامال ہونا ہی تھا چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ملک بھر میں اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے کتنے ممبران ہیں جن پر عدالت میں مقدمات قائم ہیں، کس قدر خوفناک جرائم کے مقدمات ان پر چل رہے ہیں...... ملک کی باگ ڈور جن کے ہاتھوں میں ہو، جب ان کا یہ عالم ہو تو سوسائٹی کا کیا حال ہوگا، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے، مذہب سے بے تعلقی نے ملک کو یہ دن دکھائے ہیں کاش کہ اسلام کی اس ایک بات کو یہ ملک اور اس کا سماج سمجھ لیتا کہ ایک دن ہم سب کو اپنے ایک ایک عمل کے لئے اللہ رب العزت کے سامنے جواب دہ ہونا ہے...... اب اسے کیا کیا جائے کہ یہ احساس جاتا رہا ہے اور بقول شاعر ؂

آج تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے

ذہنیت نے اخلاقی قدروں کو پامال کردیا ہے، فرد ہو یا معاشرہ اخلاقی قدروں کے انحطاط کا اسی وقت شکار ہوتا ہے جب دنیا کی محبت غالب آجائے اور دلوں میں آخرت کا خوف باقی نہ رہے...... افسوس کہ میدان سیاست میں یہ گراوٹ نمایاں طور سے دیکھنے کو ملتی

ہے، ملک کی فکر کس کو ہے، مسائل حل نہیں ہوتے، ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ......خدا سے بے خوفی سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہزار مسئلوں کا جنم داتا ہے......

سوال: آپ کے نزدیک اس وقت ملت کو سب سے بڑا کون سا خطرہ درپیش ہے؟

جواب: ملت کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس کی شناخت کا مسئلہ ہے، دین وشریعت ہی اگر محفوظ نہ ہوں تو مسلمانوں کے لئے زندگی کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں! اس خطرہ کے سامنے جان ومال کی عدم تحفظ کا مسئلہ بھی ہی ہے...... اس خطرہ کا مقابلہ کرنا ہے، موجودہ حکمراں پارٹی کے منصوبے کسی سے مخفی نہیں، اسے انصاف سے کوئی سروکار نہیں، اقلیتوں کے حقوق انہیں تسلیم نہیں، ہندتوا کا فلسفہ ان کے پیش نظر ہے اور ان خطوط پر وہ اپنے خوابوں کا راشٹر بنانا چاہتے ہیں...... ضرورت ہے ان فسطائی طاقتوں کی ناکامی کے لئے حکمت عملی وضع کرنے کی۔

سوال: ملت کے مسائل کے حل کے سلسلے میں ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟

جواب: اتحاد، اتحاد، اتحاد...... یہ ہماری ترجیح اول ہونا چاہیے، ہمارے مابین سیاسی بنیادوں پر اختلاف ہوسکتے ہیں، مسلکی اختلاف بھی ہیں لیکن ہم یہ نہ بھولیں کہ ہمارے پاس اتحاد کے لئے ایک مضبوط اساس اور بنیاد کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ہے...... افسوس کہ مسلمان نادانی کا ثبوت دیتا ہے، مسلکی اختلافات کی نوعیت فروعی اختلافات کی ہے، انہیں بنیادی حیثیت نہیں دی جاسکتی، پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ اغیار ہمارے ان اختلافات کو ہوا دیتے ہیں...... ایک اور حربہ اغیار کا یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسائل میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مسلمان بڑی سادہ لوحی سے اس میں الجھ پڑتے ہیں...... جذباتیت نے بھی ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے، مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسلمان جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے اور نقصان اٹھاتا ہے...... اس سلسلے میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے...... میں نہیں کہتا کہ ضرورت پڑنے پر بھی مسلمان غم وغصہ کے اظہار سے باز رہیں، جہاں ناگزیر ہو، وہاں ضرور اظہار ہونا چاہیے...... جمہوری ملک میں اس کی

گنجائش موجود ہے......مگر وہ بھی سلیقہ مندی اور ہوش مندی کے ساتھ، حکمت کے ساتھ...... تاکہ وہ موثر ہو، مثبت نتائج پیدا کرنے والا ہو اس کی ایک مثال شاہ بانو کیس کی ہے، جس کے سلسلے میں مسلمانوں نے بیداری کا ثبوت دیا اور ہوش مندی کے ساتھ احتجاج بھی کیا، صفوں میں اتحاد نے بھی ہمیں اپنے مقصد سے ہم کنار کیا۔

اس کے علاوہ اپنے حق رائے دہی کی اہمیت کو پہچاننا اور اس کے دوررس نتائج کا ادراک ہونا بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر بیداری لانے کی ضرورت ہے در در جاکر اس اہمیت کو سمجھانے کی ضرورت ہے......کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف تو فسطائی قوتوں کے یہ ناپاک عزائم اور دوسری طرف ہمارے مسلمان ووٹروں کی غفلت شعاری کا یہ عالم کہ ان میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے والوں کا فیصد بیس اور پچیس!! یہ کس قدر بے خبری اور بے شعوری کی بات ہے۔ غفلت کی اس صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دینے کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ ذہن بنایا جائے کہ ملت قیادت پر اعتماد کرے......اخلاص مندی اور دردمندی کے بغیر اللہ کی مدد ہمارے شامل حال نہیں ہوسکتی، ہمارے اندر ملک وملت کی خدمت کے سلسلے میں بھی اللہ سے اجر وثواب کی امید کا جذبہ ہی کارفرما ہو، یہ جذبہ ہم میں خدااعتمادی اور خوداعتمادی پیدا کرے گا...... پھر ہماری صفوں میں اتحاد پیدا ہوگا، شعور کی بیداری بھی آئے گی، قوت عمل بھی جاگے گی، صالح وخداترس قیادت بھی ابھرے گی اور انشاء اللہ یہ ملت ان عظیم تر مقاصد کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرے گی...... یہ عمل بڑا صبر آزما اور دیرطلب ہے، یہ سب باتیں باہم مربوط ہیں ان سب کے بغیر ٹھوس اور مثبت نتائج کی امید نہیں کی جاسکتی۔

سوال: بابری مسجد کی بازیابی اور تعمیر نو کے سلسلے میں مسلمان کس حد تک پرامید رہیں؟

جواب: بابری مسجد کی تعمیر اور بازیابی کے سلسلے میں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے،

مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھے۔ تاریخ میں اس کی نظیریں موجود ہیں کہ بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے لئے حالات نہایت سخت تھے لیکن پھر حالات کس طرح سازگار ہوگئے۔ تاتاریوں کی مثال موجود ہے کہ کس طرح کعبہ کو صنم خانہ سے پاسباں مل گئے، ماضی قریب میں سپر پاور کہلائے جانے والے روس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ کس طرح بکھر کر رہ گیا۔ تو حالات یکساں نہیں رہتے۔ ہمیں اللہ سے امید رکھنی چاہیے کہ بابری مسجد کی تعمیر نو کے لئے بھی انشاء اللہ حالات ضرور سازگار ہوں گے۔

بابری مسجد قضیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کا مقدمہ عدالت میں زیرسماعت ہے اور جیسا کہ میں نے کہا الحمدللہ ہمارا مقدمہ نہایت مضبوط ہے، ہمارے دلائل اور شواہد میں وزن ہے جب کہ مخالف اس کے جواب میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جو حقیقت کے بجائے تصوراتی دنیا سے متعلق ہیں۔ ۱۹۴۹ء تک اس مسجد میں باقاعدہ پنج وقتہ نماز ہوتی رہی، ۲۲ اور ۲۳ کی شب کو عشاء کی نماز ہوئی، نماز پڑھنے والا موجود، امامت کرنے والا موجود...... پھر آدھی رات کے بعد شرپسندوں نے اندھیرے میں مسجد میں مورتیاں لاکر رکھ دیں۔ ان دنوں اکشے برہمچاری صاحب نے برت رکھا تھا، لال بہادر شاستری جی نے یقین دلایا تھا کہ بابری مسجد مسلمانوں کے حوالے کردی جائے گی......مقدمہ عدالت میں تھا ۶۸ء میں خواہ مخواہ مسجد کا تالا توڑا گیا۔ پھر راجیو گاندھی نے شیلانیاس کرایا۔ اور پھر سب جانتے ہیں کہ ۶؍دسمبر ۹۲ء کو مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا لیکن یہ بھی مقام عبرت ہے کہ گھناؤنے کھیل اور سازش میں جو بھی ملوث رہا اس کا انجام کیا ہوا......قرآن مجید نے چودہ سو برس پہلے کہا تھا:

ومن اظلم ممن منع مسجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى
فى خرابها اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الا خائفين لهم
فى الدنيا خزى ولهم فى الاخرة عذاب عظيم۔(البقرہ:۱۱۳)

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں، صبر وضبط سے کام لیں اور اتحاد کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں۔ ہمارے بعض قائدین مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ

بابری مسجد کو بھول جائیں......ایسے موقعوں پر ہمیں اپنے موقف کو دہرانا چاہیے اور ان پر اپنا موقف واضح کرتے رہنا چاہیے کہ مسلمان بابری مسجد سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔

سوال: مسلم لیگ سے علاحدگی کے بعد آپ نے انڈین نیشنل لیگ کی بنا ڈالی۔ آپ کا یہ تجربہ کیسا رہا؟

جواب: مسلم لیگ سے میری علاحدگی کی بنیاد ہی یہی تھی کہ کیرالا مسلم لیگ بابری مسجد کی شہادت پر عملا احتجاج کرے اور کیرالا میں کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت سے علاحدہ ہوجائے لیکن افسوس کہ برسر اقتدار کیرالا مسلم لیگ اس قربانی کے لئے آمادہ نہیں ہوئی، اس کے برخلاف مجھ سے کہا گیا کہ آپ چونکہ کیرالا سے ایم پی منتخب ہوئے ہیں اس لئے کیرالا مسلم لیگ کے صدر کی آپ کو ہدایت ہے کہ پارلیمنٹ میں تحریک عدم اعتماد کے موقع پر آپ نرسمہا راؤ کے حمایت میں ووٹ ڈالیں......میں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے، میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا، میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں......٦ ردسمبر ۹۲ء کو ساڑھے سات بجے (جب بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آچکا تھا) میں نے نرسمہا راؤ سے ملاقات کی تھی اور کہا تھا کہ تم نے دھوکہ دیا ہے، سراسر جھوٹ سے کام لیا ہے، تمہارے مکر وفریب کے نتیجے میں بابری مسجد شہید ہوئی ہے، تمہیں فی الفور استعفی دے دینا چاہیے...... ایک طرف تو میں نے نرسمہا راؤ سے یہ کہا تو پھر مجھ سے کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ دوسری طرف میں پارلیمنٹ میں نرسمہا راؤ کی حمایت میں ووٹ دیتا) چنانچہ میں نے کہا کہ اس کی حمایت کرنے سے اچھا ہے کہ مجھے موت آجائے اور میں خدا کو پیارا ہوجاؤں!!...... مجھے خدا کی خوشنودی چاہیے، آپ کی خوشنودی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں!...... چنانچہ مجھے مسلم لیگ سے علاحدہ کردیا گیا۔

اسی موقع پر انڈین نیشنل لیگ کی میں نے بنا ڈالی۔ ہمارا مقصد تھا کہ جس پارٹی کی قیادت کے دامن پر بابری مسجد کی شہادت کا داغ ہے، اسے انتخابات میں شکست سے دوچار ہونا چاہیے، چنانچہ میں نے کیرالا اور ملک کے مختلف صوبوں کے دورے کئے،

نرسمہا راؤ کی کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا...... ہمارا ایک مقصد تو پورا ہوا۔

سردست انڈین نیشنل لیگ کا کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ اتحاد کا معاملہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس سرمایہ اور افراد کی بھی کمی ہے، ادھر ملی پولیٹیکل فورم بھی قائم ہوا ہے، مجموعی حیثیت سے حالات پر نگاہ رکھتے ہوئے انشاءاللہ فیصلے کئے جائیں گے۔

سوال: اگرچہ ملک میں فسطائی قوتیں زور پکڑتی دکھائی دے رہی ہیں لیکن عام طور سے برادران وطن کی سوچ وفکر کے سلسلے میں آپ کے تجربات کیا ہیں؟

جواب: خدا کا شکر ہے کہ برادران وطن ایک بہت بڑا طبقہ فرقہ واریت پر یقین نہیں رکھتا بلکہ اس کے برخلاف بی جے پی اور فسطائی قوتوں کی مخالفت کرتا ہے، یہ ایک خوش آئند بات ہے......اس طبقہ کی کانگریس سے بیزاری کی وجہ تو بابری مسجد کی شہادت ہے لیکن اب کانگریس نے اس سلسلے میں معافی مانگی ہے...... میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ ملک میں تمام سیکولر پارٹیوں میں باہم اتحاد ہونا چاہیے...... ان کے مابین اختلاف کا فائدہ بی جے پی کو پہنچتا ہے، اس لئے ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہئے کہ کانگریس اور دوسری جماعتیں مل کر فسطائیت کا مقابلہ کریں اور اسے شکست دیں۔

سوال: ماہنامہ بانگ درا کے ذریعہ ملت کے نام آپ کا پیغام؟

جواب: اقبال نے جو کہا ۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!

نوجوان ہمارا مستقبل ہے، ہمیں نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں، ان سے وابستہ توقعات اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب ان مقاصد کے لئے نوجوان تیار کئے جائیں، اسلامی خطوط پر ان کی تعلیم وتربیت ہو......منصوبہ بند طریقہ سے ان کی ذہن سازی ہو......خود آگہی اور خدا آگہی کے ساتھ ان میں سیاسی بصیرت پیدا ہو اور پھر وہ متحد ہوکر حالات کو بہتر بنانے کے لئے میدان عمل میں آئیں......اقبال نے کہا تھا ۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کردے

میں کسی نور بصیرت کا دعویٰ نہیں کرتا، یہ تو اقبال کا مقام تھا، لیکن میرا پیغام یہی ہے کہ ملت کے ادبار کو اقبال سے بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کی ذہن سازی اور تربیت ہو یہ وقت کی ایک بہت بڑی اور ناگزیر ضرورت ہے!!

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۸ء)

آثار قدیمہ کی حفاظت ملکی ضرورت ہے!

بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر

جناب ظفریاب جیلانی سے ایک ملاقات

جناب ظفریاب جیلانی اس لحاظ سے بھی محتاج تعارف نہیں کہ ان کا نام اس شہید بابری مسجد سے وابستہ ہے، جس سے ملت اسلامیہ کا جذباتی تعلق ہے، موصوف کی ملی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت ہوا جن دنوں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ ان ہی دنوں وہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار سے متعلق تحریک سے وابستہ ہوئے اور اس کی ایکشن کمیٹی کے معاون کنوینر مقرر ہوئے، ان ہی دنوں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم سے انہیں نیاز حاصل ہوا، اس کے بعد سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر شپ ہو یا اس کی مجلس عاملہ کی رکنیت، کسی نہ کسی عنوان سے اپنی مادر علمی سے ان کا رابطہ استوار رہا اور اس شجر سایہ دار سے پیوستہ رہے۔

گزشتہ برسوں شاہ بانو مقدمہ زیر بحث آیا، اس موقع پر مسلم پرسنل لاء بورڈ کی آواز پر ملت اسلامیہ ہند نے بلا تفریق مسلک ومشرب یک آواز ہوکر کہا کہ ہمیں مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی ہرگز ہرگز گوارا نہیں، بیداری اور اتحاد کی وہ ایک ایسی لہر تھی جس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ شاہ بانو تحریک کے اس موقع پر جیلانی صاحب تحفظ شریعت کمیٹی یوپی کے کنوینر مقرر ہوئے، ان دنوں وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

موصوف جمعیت العلماء کے خصوصی مدعو بھی ہیں اور ملی کونسل کی عاملہ میں بھی شامل ہیں، شیعہ کالج لکھنؤ میں وہ شعبہ قانون کے صدر بھی رہے، مگر ۸۱ء میں پیشہ وکالت اور ملی سرگرمیوں کی مصروفیات کے باعث تدریس کی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے، البتہ تعلیمی اداروں سے ان کی وابستگی گہری ہوتی چلی گئی وہ سردست اسلامیہ کالج لکھنؤ کے اسسٹنٹ منیجر ہیں اور انجمن اصلاح المسلمین کے سکریٹری ہیں، ممتاز ڈگری کالج، ممتاز دارالیتامی اور دیگر ادارے اس انجمن کے ماتحت ہیں۔ اس طرح جیلانی صاحب داخلی وخارجی دونوں محاذ پر سرگرم عمل ہیں، ان دنوں جب ایک بار پھر بابری مسجد اور رام مندر کا موضوع زیر بحث آیا تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر جناب ظفریاب جیلانی صاحب سے درج ذیل انٹرویو لیا گیا، جو یہ تاثر دیتا ہے کہ نہ تو ہندوستان کا ضمیر مردہ ہوگیا ہے اور نہ ہی ہمارا مقدمہ کمزور ہے، بابری مسجد کی یاد کو دلوں میں بسانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان حقائق سے واقف ہوں۔

سوال: حال میں اجلاس پارلیمنٹ میں رام مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں جو باتیں سامنے آئی ہیں، اس سلسلہ میں کمیٹی نے کیا نوٹس (Notice) لیا، موجودہ صورت حال میں آپ کا موقف اور کمیٹی کی حکمت عملی کیا ہے؟

جواب: سپریم کورٹ کا ۱۹۹۴ء میں جو فیصلہ ہوا کہ عدالت کے فیصلہ کے مطابق صورت حال کا تصفیہ ہو، اس لحاظ سے فریقین پر ایک قسم کی اخلاقی پابندی لگ گئی جس کا پاس ولحاظ رکھنا دونوں کی اخلاقی ذمہ داری ہوگئی کہ کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے اشتعال پیدا ہو اور اس میں اضافہ ہو، سپریم کورٹ نے فریقین سے اس توقع کا اظہار کیا لیکن ۱۹۹۴ء سے مندر کی تعمیر کے سلسلے میں تیاریوں کا کام چلتا رہا، اس میں اس وقت سے تعطل نہیں البتہ شروع میں وہ شدت اس میں پیدا نہیں ہوئی لیکن حال میں وشو ہندو پریشد کی طرف سے رام

مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں بیانات آئے، سب جانتے ہیں کہ بی جے پی سرکار نے مندر کی تعمیر کو قومی ایجنڈہ میں یا Governance programme میں شامل نہیں کیا، اس وجہ سے ان کے طبقہ کو اس طرز عمل سے مایوسی ہوئی، ان کا کہنا تھا کہ اگر بی جے پی سرکار بن جائیگی تو اس صورت میں ہم قانون سازی کرلیں گے، اس مایوسی کو دور کرنے کے لئے وشو ہندو پریشد اور اسکی حلیف تنظیموں نے اس بات کا زیادہ پرچار (Propagada) کیا کہ ہم تیاری پوری کررہے ہیں اور ہم ہر حالت میں مندر بنائیں گے۔ اپوزیشن نے جو مسئلہ اٹھایا تو اس سلسلہ میں یہ بات صحیح ہے کہ انہیں رام مندر تیاریوں کا پورا پورا علم نہیں تھا اور یہ اندیشہ بھی بہرحال تھا کہ چونکہ مرکز میں بھی اور ریاست میں بھی بی جے پی کی سرکار ہے، تو نہ معلوم یہ مندر کی تعمیر کا کام کب شروع کردیں، اگر خدانخواستہ مندر بن جائیگا یا بنا بنایا مندر وہ آناً فاناً راتوں میں کھڑا کردیں گے تو یقیناً بڑی مشکل آن پڑے گی، اسلئے انہوں نے اس مسئلہ کو اٹھایا، ۳۰ رمئی کو فیض آباد کورٹ کو ہم نے فیکس کیا تھا، اس سلسلہ میں ہم کو یہ اطلاع ملی تھی کہ متنازعہ جگہ پر جو بلیاں وترپال وغیرہ ہیں، اس کو یہ بدلنا چاہتے ہیں، ان کو بدل کر کچھ زیادہ مضبوط چیزیں لانا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں ہم نے فیکس کیا تھا کہ وہ اس میں کوئی تبدیلی نہ کریں کہ جس کی وجہ سے مسئلہ میں مزید الجھاؤ پیدا ہو،...... کچھ اخبارات کی بنیاد پر پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ اٹھ گیا...... حاصل یہ کہ اس قسم کی سرگرمیوں پر قانون پابندی لگانے کی کوئی صورت نہیں اور دوسری بات یہ کہ اس مسئلہ پر شور شرابہ کرنے سے ہمیں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ بلکہ اس میں ہمیں اس لحاظ سے نقصان نظر آیا کہ ہمارے شور شرابہ کرنے پر ہندوؤں کو یہ تاثر ملتا کہ ان تنظیموں کے ذریعہ گویا بڑا اچھا کام ہورہا ہے۔ اس طرح فائدہ مخالف کیمپ کو ہی ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں جو شور ہوا وہ تو ہمارے اختیار سے باہر ہے، پھر اس مسئلہ کا ایک خوش گوار پہلو یہ بھی ہے کہ اس مسئلہ کو غیر مسلم ممبران پارلیمنٹ نے اٹھایا، تمام تر پارٹیوں نے اٹھایا اور ان سب نے مندر کی تعمیر کی سرگرمیوں کی مذمت کی جس کے نتیجہ میں وزیر اعظم کو اتنا تو کہنا ہی پڑا کہ ہم عدالت کے فیصلہ کو مانیں گے اور اس پر عمل در

آمد کریں گے اور جب تک عدالت کا حکم نہیں ہوتا ہے جب تک ہم وہاں مندر تعمیر نہیں کریں گے...... یہ سب وضاحتیں اور باتیں ان کی زبان سے ایوان پارلیمنٹ میں کی گئیں، اس طرح رام مندر تحریک کے جو دو اہم رکن ہیں، شری لال کرشن اڈوانی اور جناب اٹل بہاری باجپائی، ان دونوں نے اس قسم کے بیانات پارلیمنٹ میں دئے، اس طرح اس شو شرابہ سے ہمیں تو کوئی نقصان نہیں ہوا...... ایسی صورت میں ہم کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتے جس سے غیر مسلموں اور برادران وطن میں یہ تاثر پیدا ہو کہ ہاں واقعتاً رام مندر کی تیاریوں سے کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہے یا یہ کہ یہ لوگ مندر بنانے میں واقعتاً بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ لوگ رام مندر نہیں بنانا چاہتے بلکہ انہیں تو حکومت بنانا ہے حکومت حاصل کرنا ہے، جزوی طور پر انہیں حکومت سازی میں کامیابی مل تو گئی لیکن اب یہ پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے یہ اس مسئلہ کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہماری کمیٹی کا موقف یہ ہے کہ اس مسئلہ کو سیکولر پارٹیاں اور سیکولر طاقتیں اٹھائیں۔ ہم اس میں شور شرابہ اور ہنگامہ اس لئے نہیں کرتے کہ اس صورت میں سیکولر پارٹیوں کو دشواری پیش آئیگی...... اس لئے ہم نے بی جے پی کے رہنماؤں کے بیان پر جس ردعمل کا اظہار کیا، اس کی کاپی مسز سونیا گاندھی کو Fax کردیں، اسی طرح ملائم سنگھ جی کو بھی بتایا کہ یہاں وزیر اعظم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مثلاً اٹل بہاری جی اور لال کرشن اڈوانی جی نے جو بیانات پارلیمنٹ میں دئے اس میں انہوں نے دو غلط بیانیاں کیں۔ باجپائی جی نے کہا کہ اگر عدالت کا فیصلہ رام مندر کے حق میں ہوگا تو رام مندر بنا دیں گے لیکن اگر مسلمانوں کے حق میں فیصلہ آئے تب وہ کیا کریں گے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا، جبکہ سپریم کورٹ نے واضح طور سے کہا کہ اگر فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تو وہ مسجد اس پر بنائیں گے اور اس سے متعلق جو ملحقہ آراضی ہے، وہ سبھی انہیں دینا پڑے گی تا کہ وہ اسکا استعمال کرسکیں ......تو ہم نے ان سیکولر لوگوں سے ان کی غلط بیانیوں کی نشاندہی کی...... دوسری بات یہ کہ لال کرشن اڈوانی صاحب نے اندر جیت گپتا صاحب کا جو بیان پارلیمنٹ میں پڑھ کر سنایا

کہ انہوں نے مولانا اسعد مدنی صاحب کو ہاؤس میں جواب دیا تھا، تو ۱۹۹۷ء میں تو مولانا اسعد صاحب راجیہ سبھا کے ممبر ہی نہیں تھے۔ کبھی ذاتی طور پر ان سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی اور یہ بات انہوں نے ان سے کہی ہوگی...... اس کو اڈوانی صاحب نے ہاؤس کا بیان بتایا، تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس سلسلہ میں جو غلط بیانیاں سامنے آئیں ان سے غیر مسلم سیکولر لیڈروں اور جماعتوں کو مختلف ذرائع سے آگاہ اور متوجہ کیا جائے، مثلاً کبھی اعظم خان صاحب کے ذریعہ، کبھی سید شہاب الدین صاحب کے ذریعہ، کبھی اویسی صاحب کے ذریعہ...... ہم کوئی ایسا کام یا اقدام نہیں کرنا چاہتے جس سے ہمارے فریق اور مخالف کو فائدہ پہونچے۔

آگے کا سلسلہ یہ ہے کہ آئندہ بھی یہی طریقہ کار اور حکمت علمی مناسب اور سود مند ہوگی، پرسنل لاء بورڈ وغیرہ میں بھی یہی طے ہوا ہے کہ ہم اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں توجہ دیں، جہاں ضرورت ہو اور ناگزیر ہو، وہاں ان کے اس قسم کی غلط بیانیوں کا جواب دیں ورنہ نظر انداز کریں۔

یہ تو صحیح ہے کہ ہم اس بات کو درست نہیں سمجھتے کہ مندر کی تیاریاں ہو، ورنہ ہم بھی مسجد کی تیاریاں شروع کردیتے، لیکن ہم ان کو اس قسم کی سرگرمیوں سے جبراً تو روک نہیں سکتے، وشو ہندو پریشد اور انکی حلیف تنظیموں کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ اشتعال پیدا کیا جائے، ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہے، وہ یہ تیاریاں یا یہ کام اس جگہ پر نہیں کررہے ہیں بلکہ اس جگہ سے دو کلومیٹر کی دوری پر کررہے ہیں۔

سوال: ملت کے قائدین کی جانب سے بابری مسجد کے سلسلہ میں واضح موقف کے بعد بھی شری اٹل بہاری باجپائی اور اس کے حلقہ کے بعض لوگوں کی طرف سے رام مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ ہموار کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں، اس طرح کی باہمی مفاہمت یا بات چیت کے سلسلہ میں کمیٹی کا موقف کیا ہے؟

جواب: جہاں تک ان سے مفاہمت یا بات چیت کرنے کا سوال ہے تو پرسنل لاء

بورڈ کا فیصلہ غالباً ۱۹۹۵ء ہی کا ہے کہ اب بات چیت کی گنجائش نہیں رہی، واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ لوگ نا قابل اعتبار ہیں، ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اب ایک ہی راستہ اور طریقہ مسئلہ کے حل کا ہے اور وہ عدالت ہے، جس طرح ہائی کورٹ کے اسپیشل بنچ میں اس مسئلہ کی شنوائی ہو رہی ہے، ہمارا مطالبہ ہے کہ ہائی کورٹ کی اسپیشل بنچ میں اس مقدمہ کی شنوائی روزانہ کی جائے اور مقدمہ جلد از جلد فیصل ہو، یہی مطالبہ بورڈ کا بھی اور یہی مطالبہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا بھی ہے۔ ایک مطالبہ یہ سامنے آیا تھا کہ اس مقدمہ کو سپریم کورٹ منتقل کر دیا جائے اس کی مخالفت بورڈ نے بھی کی تھی اور سب ہی نے کی تھی کہ سپریم کورٹ میں اس مقدمہ کو منتقل کرنے کی صورت میں دیر اور زیادہ ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک وفد وزیر اعظم جناب دیوگوڑا سے بھی ملا تھا، اس کے بعد انہوں نے اس پر اصرار نہیں کیا...... ابھی ۹؍ جون کو ہم نے وزیر اعظم کے بیان پر اپنا تاثر ظاہر کیا تھا کہ آپ اپنے اٹارنی جنرل کے ذریعہ ہائی کورٹ سے یہ کہلوائیے کہ وہ مقدمہ کی روز بروز شنوائی کرے، تا کہ مسئلہ کے حل میں اور مقدمہ کے فیصل ہونے میں اتنی دیر نہ لگے...... تو حاصل یہ ہے کہ مخالف کیمپ سے اس مسئلہ پر بات چیت کا کوئی حاصل نہیں ہے، ابھی آج ہی ایل کے شرما صاحب ایک انٹرویو میں کہہ رہے تھے کہ ابھی تک اس سلسلہ میں عدالت کے جتنے فیصلے ہوئے ہیں، وہ سب ہمارے حق میں ہوئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جتنے آرڈر ہوئے ہیں، سب ان کے خلاف ہوئے ہیں، ان سے سوال کیا گیا کہ اگر فیصلہ آپ کے خلاف ہو گیا تو آپ کیا کریں گے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ابھی ہم نے سوچا ہی نہیں ہے جب ایسا ہوگا تب ہم غور کریں گے، یہ باتیں بتاتی ہیں کہ ان کی نیت صاف نہیں ہے یا تو قانون سازی کے ذریعہ سے یا پھر جبراً ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ سے بچ کر یہ چاہتے ہیں کہ رام مندر تعمیر کر لیں لیکن اس کی امید اس وقت ان کو نظر نہیں آ رہی ہے، اس لئے کہ ان کی حلیف پارٹیاں بھی اس مسئلہ میں ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہیں۔

سوال: مقدمہ میں عدالت کے فیصلہ سے متعلق مسلم قائدین کے حد درجہ اطمینان

سے بعض دفعہ تشویش ہوتی ہے کہ آخر کس بنیاد پر اس درجہ کے اعتماد کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس اظہار اعتماد و اطمینان کی بنیادیں کیا ہیں اور آپ اس سلسلہ میں کس حد تک پر امید ہیں؟

جواب: عدالت کے فیصلہ کے سلسلہ میں کوئی بات حتمی طور سے تو نہیں کہی جا سکتی، البتہ ہمارے پاس کاغذات، شہادتیں اور ثبوت ہیں ان کی بنیاد پر غالب گمان یہی ہے کہ انشاء اللہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔ اگر عدالت انصاف کے پیمانہ کو ملحوظ خاطر رکھے گی تو وہ ان ثبوت اور کاغذات کی موجودگی میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ یہ عمارت مسجد کی نہیں مندر کی تھی۔ اب تک جتنی کاغذی شہادتیں جمع ہوئی ہیں (اور ظاہری بات ہے کہ اب اس کے بعد دوسری کاغذی شہادت کہاں سے آئیں گی) وہ سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ عمارت اب تک بطور مسجد کے استعمال ہوئی ہے، مخالف کیمپ کا یہ کہنا ہے کہ اس سے پہلے یہ عمارت مندر تھی، اس کی کوئی شہادت ان کے پاس نہیں ہے...... یہ جو issue انہوں نے بنایا تھا کہ یہ رام جنم بھومی ہے، اس issue کو اب انہوں نے خود چھوڑ رکھا ہے، اب وہ یہ کہتے ہیں کہ عقیدہ ہمارا ایسا ہے۔ یعنی اسے واقعاتی طور پر نہ مان کر عقیدہ کے طور پر یہ مانا گیا کہ ہمارا یقین ہے کہ رام یہاں پیدا ہوئے تھے، تو عدالت میں تو اس کے کوئی معنی نہیں ہے کہ صرف عقیدہ کی بنیاد پر کوئی دعوی صحیح تسلیم کر لیا جائے، ہم نے اشارے دئے ہیں اور ہم نے غیر مسلم گواہوں کو بھی پیش کیا ہے۔ وید اور رام چرت مانس وغیرہ کے حوالہ سے انہوں نے بتایا ہے کہ رام چندر جی ۹؍ لاکھ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے گیارہ ہزار برس حکومت کی اب یہ ۹ لاکھ سال اور گیارہ ہزار سال کے متعلق جرح میں ان کی طرف سے کہا گیا کہ تحقیق سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں ایک نکتہ بڑھ گیا ہے، اس لحاظ سے ۹ لاکھ سال کے بجائے ۹۰۰۰ (نو ہزار) سال ہی ہونگے اور گیارہ سو سال کے بجائے یہ ایک سو دس برس ہوں گے، تو اس طرح یہ تو خود اپنی تاریخ کو بدل رہے ہیں، ان کے پاس کوئی شہادت نہیں ہے کہ رام چندر جی کی جائے پیدائش یہی ہے، کیونکہ ایودھیا کی آبادی کل ۲۷۰۰ (ستائیس سو) سال کی ہے، وہاں اس سے قبل آبادی ہی نہیں تھی اس صورت میں ایودھیا

رام چندر جی کی جائے پیدائش کیسے ہوسکتی ہے، ان حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ یہ ثابت کردیں کہ یہ رام چندر جی کی جائے پیدائش تھی، اسی طرح مندر توڑ کر مسجد بنانے کی بات بھی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی......ان کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ ایک پتھر ان کو ملا ہے، جو کیسے مل گیا، اس کا ان کو پتہ نہیں......جس کے ذریعہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گیارہویں صدی میں ایک بادشاہ نے کوئی پتھر لکھوایا تھا کہ یہ رام جنم بھومی مندر تھا۔ وہ پتھر گیارہویں صدی سے پندھوریں صدی تک کہاں رہا، اس کی کوئی شہادت نہیں ہے، ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد ایک دم سے کیسے مل گیا، اس کی بھی شہادت نہیں ہے، ان کی طرف سے یہ کوششیں ضرور کی جارہی ہیں کہ کچھ باتوں کو گڑھ لیا جائے جن کی بنیاد پر اپنی بات ثابت کی جاسکے لیکن اس کی توقع نہیں ہے کہ مقدمہ میں وہ کوئی ایسی شہادت پیش کرلیں کہ جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ یہ مندر تھا یا یہ بطور مندر مستقل رہا ہے یا یہ کہ ۱۹۴۹ء میں یہ مندر تھا، یہ لوگ کیس بدلتے رہتے ہیں اب یہ کہہ رہے ہیں کہ ۴۹ء میں چبوترہ سے مورتیاں منتقل ہوئی ہیں جبکہ وہ پہلے یہ کہتے تھے کہ ہمیشہ سے یہ مندر تھا، جب ان کا کیس شروع ہوگا تب پتہ چلے گا کہ وہ کیا شہادتیں دے پارہے ہیں۔

سوال: بابری مسجد کے مسئلہ کو ''سیکولرزم اور فرقہ واریت کے مابین کا مسئلہ'' بنانے اور اس سلسلہ میں سیکولر مؤرخین، دانشور اور عوام کا تعاون حاصل کرنے میں آپ کو کس حد تک کامیابی ملی؟

جواب: جہاں تک سیکولر برادران وطن، دانشور اور مؤرخین اور عوام کا سوال ہے تو وہ اسے مسجد ہی کہتے ہیں، ۱۹۹۰ء میں جب فریقین کی گفتگو ہورہی تھی تو ایک جانب تین تاریخ داں غیر مسلم ہی تھے، وہ تینوں حیات ہیں، انہوں نے فریق مخالف کے پیش کردہ سارے کاغذات کو ثابت کردیا کہ یہ سب جھوٹے کاغذات ہیں، غلط ہیں اور اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رام جنم بھومی رہی ہے......حاصل یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ہندو بھائی، تاریخ داں اور دانشور ہمارے ہم نوا ہیں بلکہ اکثریت ہماری ہم نوا ہے......رام شنکر اپادھیائے صاحب

نے ہماری طرف سے عدالت میں گواہی دی ہے کہ ہم نے اس عمارت کو اپنی آنکھوں سے مسجد کی حیثیت سے دیکھا ہے آثار سے بھی اور تاریخ سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ مسجد کبھی مندر تھی۔ اس کے بعد جو گواہ ہم پیش کرنے جارہے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اس عمارت کے مندر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے......اس سلسلہ میں وسائل کی ضرورت ہے بعض لوگ یہاں نہیں آپاتے، وہ چاہتے ہیں کہ کمیشن دلی جائے۔ اس کی درخواست بھی دی گئی ہے، اس صورت میں اس کا خرچ بھی برداشت کرنا ہوگا، پرسنل لاء بورڈ کی یہی کوشش ہے کہ اس کے اخراجات میں کوئی کمی نہ پڑنے پائے۔

سوال: رام مندر کے مسئلہ کو زور وشور سے اٹھانے کے پس پشت بی جے پی کے متعلق اس تاثر پر آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ حربہ ''مکمل اکثریت'' حاصل کرنے کے لئے اپنایا جارہا ہے؟ اس صورت میں ملت کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟

جواب: یہ بات صحیح ہے کہ چونکہ مرکزی حکومت میں بی جے پی کو مکمل اکثریت حاصل نہیں ہے اور قومی ایجنڈہ میں یہ رام مندر کی تعمیر کو شامل نہیں کرسکے۔ اس لئے ان کے ووٹرس کو مایوسی تو ہوئی۔ اس صورت میں انہوں نے یہ تاثر دینا ضروری سمجھا کہ انہوں نے مسئلہ کو چھوڑا نہیں ہے البتہ یہ حکمت عملی اپنائی ہے کہ اس مسئلہ پر کچھ لوگ بولیں اور کچھ لوگ نہ بولیں، چنانچہ اشوک سنگھل اور گری راج کشور نے زور وشور سے اس مسئلہ کو اٹھایا، ان لوگوں سے انہوں نے بیانات دلوائے اور خود یہ کہا کہ نہیں ہم تو کچھ نہیں کررہے ہیں، ساتھ ہی ان کے بیانات کی مذمت بھی نہیں کی بلکہ الٹا اپوزیشن والوں سے کہا کہ آپ نے اس مسئلہ کو کیوں اٹھایا......اپوزیشن والوں نے تو مجبوراً اس مسئلہ کو اٹھایا، اگر ان ہی کے بیانات نہ آتے کہ ہم رام مندر بنائیں گے اور عدالت کی پرواہ نہیں کریں گے وغیرہ تو اپوزیشن اس مسئلہ کو نہ اٹھاتی......سنگھ پریوار کی حکمت عملی ہے کہ ہندو عوام کو یہ تاثر دیا جاتا رہے کہ وہ رام مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں سنجیدہ ہیں اور مناسب وقت آنے پر وہ رام مندر وہاں تعمیر کردیں گے، اسی حکمت عملی کے تحت انہوں نے اخبارات میں یہ شوشے چھوڑے۔

مسلمانوں کو اس مسئلہ میں کافی حلم و بردباری اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دینا ہے، جذبات اور اشتعال میں نہیں آنا ہے، اس لئے کہ سنگھ پریوار کی پالیسی تو یہ ہے کہ مسلمان مشتعل ہوجائیں اور کوئی قدم ایسا اٹھائیں کہ جو ان لوگوں کے حق میں مفید ثابت ہوسکے، مسجد کو شہید کرنے میں جتنی عجلت اور تیزی انہوں نے دکھائی، رام مندر کی تعمیر میں وہ اتنی جلدی نہیں کرسکیں گے لیکن بہر حال ہمیں چوکنا تو رہنا پڑے گا، جو لوگ اس مسئلہ سے متعلق ہیں وہ مستعد رہتے ہیں، آگاہ رہتے ہیں اور مشورے کرتے رہتے ہیں، ملی قائدین کو چوکنا اور چاق و چوبند رہنا ہے ہی، جو ہمارے سیکولر رہنما اور برادران وطن ہیں ان کو ان حقائق و واقعات سے واقف کراتے رہنا بھی ضروری ہے۔

سوال: بابری مسجد کی طرح وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے نشانہ پر ہندوستان کی دوسری مساجد ہیں مثلاً گیان واپی مسجد بنارس اور متھرا کی مسجد...... کیا آپ کی کمیٹی ان مساجد کے سلسلہ میں بھی فکرمند اور متحرک ہے؟

جواب: گیان واپی اور متھرا کی مسجدوں کے سلسلہ میں ہم لوگ رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں، گیان واپی کا تو مسئلہ یہ ہے کہ وہاں انہوں نے ایک مقدمہ دائر کررکھا ہے، یہ سیاسی طور پر بھی کوشش کرتے ہیں اور کورٹ کے ذریعہ بھی کوشاں رہتے ہیں، تو گیان واپی مسجد کے سلسلہ میں انہوں نے مقدمہ دائر کررکھا ہے اس عمارت پر قبضہ کے لئے ...... یہ مقدمہ وہاں بنارس میں چل رہا تھا اس میں ہم نے ایک درخواست سنی وقف بورڈ کی طرف سے گزار دی تاکہ وقف بورڈ بھی فریق ہوجائے، وہاں پہلے ایک کمیٹی تھی لیکن وقف بورڈ فریق نہیں تھا ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ مقدمہ یک طرفہ نہ ہوجائے،...... اس میں ہم نے یہ کہا کہ یہ مقدمہ ختم ہوجانا چاہئے، اس لئے کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء میں جس مذہبی عبادت گاہ کی جو نوعیت تھی وہ قائم رہے گی یہ قانون پاس ہوچکا ہے۔ بنارس اور متھرا کی یہ دونوں مساجد ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بطور مسجد کے استعمال ہورہی تھیں۔ یہ ثابت ہے۔ لہذا اس قانون کی رو سے اس قسم کا مقدمہ قابل اخراج ہے، اس درخواست پر سماعت ہوکر آدھا حکم

ہمارے حق میں ہوا اور یہ طے ہوا کہ یہاں ان کا مقدمہ نہیں چل سکتا لیکن آدھے کے بارے میں کہا کہ یہ چل سکتا ہے...... جہانگیر عالم صاحب اس مقدمہ کو دیکھ رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم کو اس کی اطلاع ملتی رہتی ہے، جولائی میں اس کی تاریخ لگی ہے اگر وہاں سے ہمارے حق میں فیصلہ نہیں ہوتا ہے تو پھر ہم اسے ہائی کورٹ میں لے جائیں گے اس سلسلہ میں ہم چاہتے ہیں کہ یہ طے ہو کہ یہ مقدمہ چلنے کے لائق ہی نہیں ہے......

متھرا کے بارے میں بھی ہائی کورٹ میں رٹ فائل ہوئی تھی، وہاں کے ایوب صاحب سے بھی ہم لوگ رابطہ رکھے ہوئے ہیں، وہاں بھی وقف بورڈ کو فریق بنادیا گیا ہے ...... وہاں مقابل نے یہ رٹ داخل کی تھی کہ اس کا نام عیدگاہ ہے اس لئے وہاں مسلمانوں کو پنج وقتہ نماز پڑھنے سے روک دیا جائے، یہ ایک خطرناک سازش تھی کہ اگر ایک مرتبہ مسلمانوں کو پنج وقتہ نماز پڑھنے سے روک دیا گیا تو پھر اس صورت میں مسجد کی حیثیت ختم ہوجائیگی جبکہ وہ مسجد پنج وقتہ نماز کے لئے ہے، اس کا نام عیدگاہ مسجد ہے، اس زمانہ میں جب یہ بنی ہوگی تو شہر سے دور رہی ہوگی اس لئے اس کا نام عیدگاہ پڑ گیا ہوگا، پھر اسے مسجد میں تبدیل کردیا گیا۔ کئی سو سال کے عرصہ سے یہاں پنج وقتہ نماز ہورہی ہے تو یہ سب کاغذات ہم نے وقف بورڈ کی طرف سے داخل کروادئے...... خود ہندوؤں نے بھی مانا کہ یہ مسجد ہے...... اس وقت سے وہاں کے مقدمہ میں ان کی تیزی ختم ہوگئی، ابھی تک تو اس پر انہوں نے دوبارہ بحث نہیں کی۔ ایوب صاحب وغیرہ اس مسئلہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور ہمیں صورت حال سے مطلع رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ مقدمہ کی حد تک ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جس سے غفلت ظاہر ہوتی ہو۔

سیاسی طور پر وہ لوگ جو کوششیں کرتے ہیں تو متھرا اور بنارس دونوں جگہ کے مسلمان الحمد للہ چاق و چوبند ہیں اور حالات پر نگاہ رکھتے ہیں، البتہ اسے ہم عوامی تحریک نہیں بنانا چاہتے...... ہاں! جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو ہم حرکت میں آجاتے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ مایاوتی صاحبہ کے زمانہ میں متھرا کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ ہم وہاں گئے بھی تھے تو اس

طرح ہم اپنے اثرات کا استعمال کرتے ہیں کہ متعلقہ ذمہ داران تک Approach ہو سکے مستقل تحریک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: بابری مسجد کو فسطائی ذہن رکھنے والے ''غلامی کی علامت'' کہتے ہیں جبکہ یہ مسجد کی شہادت ان کی مسلم دشمنی اور مخاصمت کی علامت ہے۔ مسلم دشمن ذہنیت اور اس کے لئے اغیار کی منصوبہ بندی کے تدارک کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ہمارا ہی نہیں، ہمارے ہندو بھائیوں، مؤرخوں اور دانشوروں کا بھی خیال ہے کہ آثار قدیمہ کی حفاظت ہمارا اخلاقی فریضہ ہے اور ملکی ضرورت ہے، ان کی حفاظت ملک کے مفاد میں ہے...... سپریم کورٹ نے بابری مسجد کی شہادت کے موقع پر یہی کہا کہ ایک ایسی عمارت جو سینکڑوں برس سے ایک تاریخی عمارت کے طور پر قائم تھی اور جو اپنا دفاع خود نہیں کر سکتی تھی اس کو چند شر پسندوں نے مسمار کر کرے ایک ایسا فعل کیا ہے جس کی وجہ سے پوری قوم کا سر شرم سے جھک گیا ہے، یہ فعل صرف مجرمانہ ہی نہیں بلکہ قومی حمیت کے بھی خلاف ہے اور Defenceless Structure کو برباد کرنا شرم کی بات ہے...... صدر جمہوریہ، پارلیمنٹ سب نے اس کی مذمت کی ہم تو مسجد کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے ہیں لیکن ان سبھوں نے اسے ایک تاریخی ورثہ سمجھا، اسے غلامی کی علامت کبھی نہیں کہا...... یہ تو صرف وشو ہندو پریشد جیسی تنظیمیں کہتی ہیں کہ بابری مسجد غلامی کی علامت تھی...... کسی اور نے نہیں کہا کہ بابر کے دور کو ہم غلامی کا دور سمجھتے ہیں اسلئے مغلوں کی ساری عمارتیں ڈھاوی جائیں تو پھر تاج محل، لال قلعہ جیسی عمارتیں ان میں آئیں گی جبکہ انہیں National Mouments کہا جارہا ہے، انہیں World Heritage میں گنا جا رہا ہے۔ اور بجا طور پر اس پر فخر کیا جاتا ہے...... سپریم کورٹ نے بابری مسجد کے شہادت پر تو یہاں تک کہا کہ چونکہ ہندوؤں نے اسے گرایا ہے، اگرچہ اس کے گرانے والے تمام تر ہندوؤں کے نمائندے نہیں تھے لیکن بہرحال ہندو تھے اس لئے یہ ہندوؤں کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ جس کو مٹانا آسان نہیں ہوگا...... اس طرح سپریم کورٹ نے ان کی جن الفاظ میں مذمت کی ہے وہ بہت سخت ہیں۔

ہمیں اس کی کوشش کرنا ہوگی کہ ملت غافل نہ ہو۔ مختار نقوی جوان کے وزیر ہیں، وہ ہندو ہو چکے ہیں۔ ان کا نام مانویندر سنگھ ہے۔ ۸۳ء یا ۸۴ء میں اپنے آپ کو Convert کر کے انہوں نے ہندو لڑکی سے شادی کی جو رتّو بھیا کی رشتہ کی نواسی ہیں...... اور وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ بتا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! مسلمان تو بابری مسجد کا مسئلہ اٹھانا نہیں چاہتے...... اس کے علاوہ ہمارے کچھ ایسے دانشور بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اب اس مسئلہ کو بھول جانا چاہئے...... ہمارا یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی شہادت بھولنے والی چیز نہیں ہے، اس مسئلہ پر سب سے بڑی کامیابی تو یہ ہے کہ اس مدافعت کے ذریعہ اور قانون لڑائی کے ذریعہ دوسری مسجدوں پر حملہ کئے جانے پر روک لگی ہوئی ہے۔...... اسے کم کامیابی نہیں سمجھنا چاہئے...... اگر ہم نے اس کی مدافعت نہیں کی تو پھر مساجد پر حملوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائیگا...... بابری مسجد کے مسئلہ کو چھوڑ دینا Surrender ہو جانا ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، اس صورت میں ہم اپنے کسی ورثہ کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے...... اور ہمارا تشخص ختم ہو جائیگا۔ لہذا ملت کو واقف کراتے رہنا چاہئے، ملت کو مایوسی کا شکار نہیں ہونے دینا چاہئے۔ ہمارا ایمان تو یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے...... اللہ تعالی کا کام ہم کو کامیابی یا ناکامی دینا ہے...... بڑی بڑی جنگیں مسلمانوں نے ہم سے کہیں بہتر طریقہ سے لڑیں اور اس میں کبھی ان کو ناکامی بھی ہوئی...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی اس ناکامی سے وہ مایوس ہو جاتے...... اسی طرح شب خون مار کر جس طرح بابری مسجد کو انہوں نے ڈھادیا اس کی وجہ سے یہ مایوسی مسلمانوں میں ہرگز نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ اب وہاں مسجد نہیں بن سکتی۔ اگر بیت المقدس کی عرصہ دراز بعد بازیابی ہو سکتی ہے اور اگرچہ اب پھر وہ غیروں کے تصرف میں ہے لیکن اس کے دعوی سے بھی مسلمان دستبردار نہیں ہوئے ہیں تو بابری مسجد کے متعلق بھی مسلمانوں کو نہ تو مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اس دعوی سے دستبردار ہونے کی ضرورت ہے...... ایسے حالات انشاءاللہ اس ملک میں پیدا ہونگے کہ جب ہندو از خود کہیں گے کہ تمہاری مسجد ہے تو

خود بنالو......اس کی وجہ سے ملک کی معیشت کو نقصان ہورہا ہے اور اس لحاظ سے اکثریت کو زیادہ نقصان ہورہا ہے، ہندوستان کی Economy میں نوے فیصد حصہ تو اکثریت کا ہے ...... ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے کہ کرفیو لگا، دکانیں بند ہوئیں تو اس صورت میں زیادہ نقصان کس کا ہوا؟ اب یہ بات اکثریتی فرقہ بھی سمجھ رہا ہے چنانچہ ایسے جذباتی مسئلوں میں الجھنا نہیں چاہتا، چار پانچ سال پہلے وشو ہندو پریشد نے ریلی نکالی، اسے ہندو عوام نے تعاون نہیں دیا......اب رہا Voting Pattern کا مسئلہ، اس میں تبدیلی آسکتی ہے اور وہ دن آسکتا ہے جب بی جے پی کا زور ٹوٹے اور انشاء اللہ ہندو عوام بھی یہ کہے کہ مسلمان وہاں مسجد بنالیں، البتہ ہمیں لوگوں کو حقائق سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں مسلمانوں کی بھی واقفیت بہت کم ہے۔ بابری مسجد سے متعلق حقائق کے بارے میں اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان بھی واقف نہیں کہ ۱۹۴۹ء میں یہاں کیا ہوا؟ ۱۸۸۵ء میں کیا نوعیت تھی؟ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سالہا سال سے یہاں پر کوئی نماز ہوئی ہی نہیں جبکہ ۱۹۴۹ء تک یہاں نماز ہوئی ہے۔ بابری مسجد نہ کبھی سنسان رہی، نہ ویران ہی نہ غیر آباد رہی......ایودھیا کے مسلمانوں کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ۱۹۹۲ء میں مسلمانوں کے گھر غیر آباد ہوجانے کے بعد وہاں کی ساری مسلم آبادی وہاں پھر آباد ہوگئی، ایودھیا ایک بڑا اسلامی مرکز ہے، وہاں درجنوں مساجد ہیں، وہاں چھ چھ سات سات سو سال پہلے کی قبریں ہیں کہا جاتا ہے کہ سید سالار مسعود غازیؒ کا قافلہ اسی راستہ سے گزرا، وہاں ان کا پڑاؤ رہا، ایسا نہیں ہے کہ بابر کے زمانہ میں وہاں مسجدیں بنیں، اس سے پہلے وہاں مسجدیں تھی وہاں کے پختہ قبریں ظاہر کرتی ہیں۔ وہ بابر کے دور سے بھی پہلے کی قبریں ہیں، ایودھیا جینیوں اور بودھوں کا بھی مرکز رہا ہے، ہندوؤں کا مرکز تو یہ تیرہویں چودھویں صدی سے بنا ہے، اس سے پہلے وہ ہندوؤں کا مرکز نہیں تھا، خود تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ رام کا Cult جو پیدا ہوا ہے، وہ بہت بعد میں پیدا ہوا ہے گیارہویں صدی کے بہت بعد۔

تو ہمیں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی اس سلسلہ میں واقف کرنا ہے، انہیں یہ

معلوم ہونا چاہئے کہ رام مندر کے بارے میں رام چرت مانس میں کیا لکھا ہے۔ ان حقائق کے جاننے کے بعد یہ بات واضح ہوجائیگی کہ رام جنم بھومی کا مقدمہ کس قدر کمزور ہے۔ جب غیر مسلموں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ۱۸۸۵ء میں جب دعوی کیا گیا تھا تو اس میں مسجد ہی کا ذکر تھا اس حقیقت کو جان کر غیر مسلم کافی متاثر ہوتے ہیں اور ان کا رویہ بدل جاتا ہے......اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بابری مسجد کے مسئلہ کے حقائق سے واقف ہوں اور غیر مسلموں کو بھی ان حقائق سے واقف کرائیں اس صورت میں انشاء اللہ غیر مسلموں کا ذہن بھی بدلے گا، بدقسمتی سے جس غلط پروپیگنڈہ کا وہ شکار ہوئے ہیں، اس سے وہ باہر نکل سکیں گے اور وہاں مسجد کی تعمیر کی سلسلے میں ان کا ذہن بھی بن سکے گا۔

بابری مسجد کے متعلق یہ بات عوام کے علم میں آنا چاہئے کہ مقدمہ دھیرے دھیرے ضرور چل رہا ہے لیکن پیش رفت ہوئی ہے، ۲۴؍جولائی ۱۹۹۶ء سے زبانی شہادتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۴ء کے بعد جب مقدمات بحال ہوئے تو کاروائی آگے بڑھی سب سے پہلے درخواستوں پر آرڈرس ہوئے پھر ۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء سے شہادتیں شروع ہوئیں سب سے پہلا بیان ہاشم صاحب کا ہوا جو مدعی ہیں۔ اس کے بعد اور چھ سات ایودھیا سے متعلق لوگوں کے بیانات ہوئے، کچھ فیض آباد کے لوگوں کے بیان ہوئے، علماء کے بیانات ہوئے، مولانا محمد ادریس بستوی کا، پھر مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کا اور ابھی آخر میں رام شنکر اپادھیائے جی کا، پھر ۱۳ جولائی ۹۸ء کو انشاء اللہ اگلا بیان عدالت میں ہوگا، اس طرح سے یہ واقفیت رہنا چاہیے کہ الحمد للہ مقدمہ میں پیش رفت ہوئی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے......ہمیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے بابری مسجد میں نماز پڑھی ہے وہ اب عمر کے آخری مرحلہ میں ہیں، معمر ہوچکے ہیں تو کسی طرح عدالت کے سامنے ان کے بیانات ہوجائیں......اللہ کا شکر ہے کہ ساتھ آٹھ گواہ ایسے پیش ہوچکے ہیں جنہوں نے وہاں پنج وقتہ نماز پڑھی ہے، تراویح پڑھائی ہے، تو اب یہ تشویش نہیں ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مدت گزر جانے کے بعد کوئی ایسا گواہ ہمارے درمیان موجود نہ ہوجس

نے نماز پڑھی ہو۔ الحمد للہ مایوسی کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا ضرور ہونا چاہیئے کہ ہمارا مطالبہ ہو کہ اس مقدمہ کو جلد از جلد نمٹایا جائے اور مقدمہ کی شنوائی روزانہ ہو، جو بھی حکومت رہے اس سے ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اس عدالت کے پاس سوائے اس مقدمہ کی شنوائی کے اور کوئی کام نہ ہو۔

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ، جولائی ۱۹۹۸ء)

اگر اس ملک میں لوگ
رشوت لینا چھوڑ دیں تو ہندوستان سونے کی چڑیا ہے!

وزیر شہری ترقیاتی حکومت اتر پردیش

جناب محمد اعظم خاں صاحب سے ایک ملاقات

جناب محمد اعظم خاں صاحب (وزیر شہری ترقیات حکومت اتر پردیش) کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ملک کے سیاسی افق پر کئی دہائیوں سے ان کی شبیہ ایک نڈر و بے باک اور صاف گو رہنما کی حیثیت سے ابھرتی رہی ہے اور ان دِنوں جہاں سیاست کا دوسرا نام ہی عملاً مصلحت ہو کر رہ گیا ہے ایسے سیاسی ماحول میں جناب محمد اعظم خاں صاحب کی شخصیت کا وجود بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے، بالخصوص مسلم مسائل کے سلسلہ میں انہوں نے ہمیشہ دینی وملی غیرت وحمیت کا ہی مظاہرہ کیا، اور کبھی کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کی، ان کی شخصیت سازی میں اوران کی شخصیت کے اس بے باکانہ وجرأت مندانہ عنصر کے پس پشت ان کی وہ خوش نصیبی ہے جو ربِ کائنات نے انہیں مشفق وتجربہ کار اور ملت کا سچا درد رکھنے والے پہلی صف کے ملی و قومی رہنماؤں کی رہنمائی وتربیت کی شکل میں عطا فرمائی، اس طرح انہوں نے نہ صرف بڑوں کی آنکھیں دیکھیں بلکہ ان قدآور رہنماؤں کے ساتھ ساتھ وہ موجوں کے تلاطم میں گھری ملت کی کشتی کو ساحل تک لانے کی کوششوں میں ہمہ وقت ان کے ساتھ بھی رہے، سرد وگرم بھی جھیلے، نشیب

وفراز بھی دیکھے اور تلخ تجربات کی کڑی دھوپ میں انہوں نے تسلسل کے ساتھ قوم وملت کے لئے پسینہ بہایا اور آج کے حالات میں ملت کی خاطر مسلسل پسینہ بہانے والوں کی ضرورت ہے جو منزل تک پہنچے بغیر دم نہ لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

اِن دنوں جناب محمد اعظم خاں صاحب، مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی بل اور تاج محل میں موجود قبروں کے وقف بورڈ میں اندراج کے بیانات کی وجہ سے مستقل خبروں میں ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ایک شیر ہے جو پنجہ آزمائی کا جگر رکھتا ہے، ان کی جرأت رندانہ اور شان قلندرانہ میں مزید پختگی آئی ہے اور طویل سیاسی مسافت طے کر لینے کے نتیجہ میں میسر آنے والی حکمت وبصیرت نے انہیں دور بینی ودور اندیشی اور تدبر وفراست کے جوہر سے بھی متصف کر دیا ہے، مولانا محمد علی جوہر کے شہر رامپور سے تعلق رکھنے والے اس جوہر قابل میں بھی وہ جوہر واوصاف محسوس کئے جاسکتے ہیں جن کی بدولت مولانا محمد علی، مولانا محمد علی جوہر کہلائے تھے اور جو جئے بھی اور مرے بھی تو اس شان سے کہ:

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقتدار کی باگ ڈور کی مالک سماج وادی پارٹی کے صف اول کے اس رہنما سے زیر نظر انٹرویو کے سوالات میں آپ شعلہ وشبنم اور گل وخار دونوں کا امتزاج پائیں گے، اعتراضات بھی اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی، امید ہے کہ انٹرویو کی اس پہلی قسط کو قارئین انشاءاللہ نگاہ شوق سے پڑھیں گے، اگلی قسط کے لئے انہیں جس انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے گی اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

س:- جناب والا! شہر لکھنؤ تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے، سابق وزیر اعظم اٹل جی

بھی لکھنؤ کو چار چاند لگانے کی بات کرتے رہے لیکن لکھنؤ کی عام سڑکیں ان کے اس خواب کا خاموش جواب ہیں، اب جب کہ آپ وزیر شہری ترقیات ہیں، کیا ہم اس کی توقع کریں کہ شہر لکھنؤ ہندوستان کے نقشہ پر ایک ترقی یافتہ شہر بن کر ابھرے گا؟

ج:- آپ اہل لکھنؤ سے ہی پوچھ لیں، میں نے جب اس وزارت کی ذمہ داری سنبھالی تو میں نے کہا کہ پرانا لکھنؤ ہی اصل لکھنؤ ہے، نئے لکھنؤ میں بہت کام ہو چکا، پرانے لکھنؤ والے انشاءاللہ آپ کو یہ حقیقت بتائیں گے کہ وہاں ترقیات کا اور بنیادی ضروریات کی فراہمی کا کام ہو رہا ہے یا نہیں؟ گلیاں پختہ ہو رہی ہیں یا نہیں؟ جو گلیاں اب تک محض اس لئے قابل اعتناء نہیں تھیں کہ وہ کسی بھلے آدمی کے نام سے منسوب تھیں اور یہی گویا ان گلیوں کا قصور تھا۔

رہی آپ کی یہ بات یعنی لکھنؤ کو چار چاند لگانے کی بات تو عرض کردوں کہ گومتی کو صاف کرنے کا ہمارے سامنے ایک ٹھوس منصوبہ ہے، افسوس کی بات ہے کہ کچھ تنگ نظر کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ گومتی محض ہندو دھرم کی مظہر اور علامت اور اس کی عقیدت ومحبت کا محور ومرکز ہے، یہ سخت نادانی کی بات ہے گومتی ہو یا مان سرور سے پھوٹنے والی تمام ترندیاں، وہ قدرت کی کاریگری وصناعی کی مظہر اور خلق خدا کی راحت وآسائش کے لئے ہے اور اس لحاظ سے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ تو ہندو مسلم سکھ عیسائی کے مابین اتحاد ویگانگت کی علامت ہیں، ندیاں، پہاڑ یہ تو کسی مذہب کا نہیں بلکہ انسانی سرمایہ ہوا کرتے ہیں، قدرت کی دین اور انسانیت کے لئے تحفہ ہوتے ہیں، جس طرح آپ کو وہ دن یاد دلایا ہے، اقبال نے کہ جب ہمارا کارواں گنگا کنارے اترا تھا اور اس کے آب رواں سے ہمارے اسلاف نے وضو کیا تھا، اسی طرح گومتی بھی ہمیں وضو کا پانی فراہم کرتی ہے جس کے بعد ہم اپنی جبین نیاز بارگاہ رب ذوالجلال کے سامنے خم کرتے ہیں اور گومتی کے پانی سے وضو کر کے فضاؤں میں اڑ کر حرمین شریفین کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔

گومتی کے دونوں کنارے ہم ایک زبردست Complex بنانے جارہے ہیں، کچھ بڑے پیمانے کی کمپنیاں ہیں ان سے ہمارا انشاء اللہ جلد ہی معاہدہ (Agreement)

ہونے جا رہا ہے۔

آپ کے ندوہ کے پاس جو دو پل ہیں، اس پر انشاء اللہ چار دروازے بنائیں گے، قبل از وقت تو میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن رب قدیر نے چاہا تو یہ دروازے بھی دیکھنے سے تعلق رکھیں گے، اتنے بلند بھی ہوں گے اور انشاء اللہ اتنے ہی دیدہ زیب اور خوبصورت بھی، اس کام کے لئے دو کروڑ کی رقم میں دے بھی چکا ہوں۔

س:- وزیر محترم! آپ کی سیاسی زندگی میں آپ کی جو سیاسی شبیہ بنی ہے وہ ایک صاف گو اور بے باک رہنما کی ہے، گویا آپ نے طبیعت اور مزاج ہی حق گوئی کا پایا ہے اور احقر کے نزدیک جو شخص صاف گو ہوتا ہے وہ صاف بات سننے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے، چنانچہ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ عوام میں علی العموم سماج وادی پارٹی کی شبیہ ''دوہرے معیار'' پر عمل پیرا ہونے کی بن رہی ہے، ایک طرف تو وہ ایسے اقدامات کا مظاہرہ کرتی ہے جس سے گویا مسلم اقلیت کھلونے دے کے بہلائی جاتی رہے لیکن دوسری طرف وہ فاشسٹ طاقتوں کو درپردہ تقویت پہنچاتی دکھائی دیتی ہے، خصوصاً الیکشن کے موقع پر ایس پی کا یہ کردار نمایاں طور سے محسوس کیا جاتا ہے۔

ج:- یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے، بہوجن سماج پارٹی اور کانگریس نے جتنے امیدوار (Candidates) کھڑے کئے وہ سب ہارنے کے لئے اور یہ پالیسی انہوں نے Declare بھی کی کہ نہ ہم جیتیں گے اور نہ ہی جیتنے دیں گے۔

س:- جناب والا! سیاست اور جرائم کے مابین رشتہ جس تیزی سے مستحکم ہو رہا ہے اس پر ایک عام ہندوستانی شہری ہی نہیں، پرانے دور کے بچے کھچے سیاست داں بھی بار بار اپنی تشویش کا اظہار کر چکے ہیں، کیا میں عرض کر سکتا ہوں کہ سیاست اور جرائم کا چولی دامن کا یہ ساتھ یوں ہی قائم رہے گا یا ایک بار پھر مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسی شفاف سیاسی شخصیتوں کا ہم عام ہندوستانیوں اور سچے مخلص سیاست دانوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر بھی ہو سکے گا؟ آپ کی پارٹی شفافیت کے سلسلہ میں کون سے عملی اقدامات کر رہی ہے؟

ج:- دیکھئے سماجی اور سیاسی معیار پوری دنیا کا گرا ہے، اخلاقیات پوری دنیا سے کمزور

ہوئی ہے اور سب سے زیادہ بلند بانگ اخلاقیات کا دعویدار امریکہ جہاں کھڑا ہے، اس سے آپ بھی واقف ہیں، خود ہمارے ملک میں سیاسی سطح کی اخلاقیات کا حال کسی سے مخفی نہیں ہے، علاوہ ازیں عوام کی سطح اور معیار کیا ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ جو آدمی اگلے سے ایمانداری کی توقع رکھتا ہے وہ خود بے ایمان ہے، دوکاندار اصلی مال خریدنا چاہتا ہے اور ملاوٹ کا مال بیچنا چاہتا ہے تاکہ ملاوٹ زیادہ کر سکے، خریدتے وقت ڈنڈی مار کر زیادہ لانا چاہتا ہے اور بیچتے وقت ڈنڈی مار کر کم تولنا چاہتا ہے، تو ہم ایک عجیب وغریب معاشرہ میں اس وقت پھنس گئے ہیں، یہ امید کہ بہت زیادہ بہتری آسکتی ہے، اس کی فی الحال گنجائش اور آثار کم دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن ہمارے یہاں برابر اس بات کی فکر اور کوشش کی جارہی ہے کہ سیاست میں Criminilisation کو حتی المقدور کم کیا جاسکے، آپ کو یاد ہوگا کہ سابق وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی نے ایک دفعہ اپیل کی تھی کہ پارٹیاں مجرمانہ شبیہ رکھنے والوں کو اپنے یہاں کم کرنے کی کوشش کریں، ہماری پارٹی نے تو الحمد للہ اس کا عملی ثبوت دیا اور تین لوک سبھا کے ممبران کو پارٹی سے نکال دیا، اگر ایک چھوٹی سی پارٹی تین لوک سبھا ممبران کو پارٹی سے نکال دیتی ہے تو یہ بات اپنی جگہ معنی اور اہمیت رکھتی ہے، اس کے بعد ہم نے بجا طور پر اس کی توقع کی کہ مجرمانہ شبیہ رکھنے والے سیاست دانوں سے اپنی اپنی پارٹیوں کو پاک کرنے کا عمل اور اقدام کانگریس اور بی جے پی بھی کرے گی لیکن اس سلسلہ میں کوئی عملی اقدام اور عملی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

الحمد للہ جرائم پیشہ یا مجرمانہ شبیہ رکھنے والے سیاست دانوں سے حتی المقدور ہم نے اپنی پارٹی کو پاک کرنے کے عمل میں پہل کر دی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ بحالت مجبوری ''کم از کم برے لوگوں'' کو ٹکٹ دیا جائے، البتہ جہاں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹنے والا ہی چاہئے اور بظاہر کوئی دوسرا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہی نہیں تو وہاں مجبوری ہوتی ہے۔

لیکن ایسے حلقوں میں بھی ہم کہتے ہیں کہ عوام اپنے ووٹ کا حق اختیار کرنے میں

آزاد ہے، اس لئے کہ اصل فیصلہ عوام کا ہے، اگر سیاسی جماعتیں الیکشن میں غلط شبیہ رکھنے والوں کو اپنا امیدوار بنا کر پیش کرتی ہیں تو عوام کو انہیں مسترد کردینا چاہئے، آج نہیں تو کل یہ فیصلہ ہم سے زیادہ عوام کو لینا پڑے گا۔

س:-مسلمانوں کا سیاسی وزن اس ملک میں کیسے قائم ہوسکتا ہے، نیز مسلمانوں کی اجتماعی اور مجموعی ترقی کے لئے آپ کے ذہن میں اپنے طویل تر سیاسی و تعلیمی تجربات کی روشنی میں کیا خاکہ ہے؟

ج:- ایک تو تعلیمی میدان میں کام ہونا چاہئے، اس میدان میں مسلمان زیادہ سے زیادہ آگے بڑھیں، نیز کاروبار وصنعت کو اپنانا اور اس میدان میں ترقی کی فکر بھی لازمی طور سے ان کو دامن گیر ہونا چاہئے، نوکریاں کسی قوم کا مستقبل نہیں ہوسکتیں، نہ مستقبل کو سنوارنے کی ضامن ہوسکتی ہیں، آخر ملازمتیں ہوتی ہی کتنی ہیں، اس صورت میں کاروبار اور ضروریات پیش آنے پر بینک سے قرض کی سہولیات اور دیگر اسکیموں سے استفادہ وغیرہ ہمارے پیش نظر ہونا چاہیے۔

سیاسی استحکام اس لئے ضروری ہے کہ اسمبلی و پارلیمان میں اچھے لوگ آئیں گے تو اچھے قوانین بنیں گے جس قدر ہم سیاسی طور پر مستحکم ہوں گے، اس قدر ہماری ''سیاسی حصہ داری''، مستحکم ہوگی۔

ایک تو ہم میں سیاسی اعتبار سے چھچھڑا پن ہے وزیر ہوجانا ہرگز کافی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ وزیر ہوکر ہم نے کیا خدمات انجام دیں، کون سے (Issues) اور کام ہم منوا پائے، الحمدللہ اتر پردیش میں کتنے کام ہیں جو ہم خاموشی اور حکمت عملی سے کروا چکے ہیں اور کروا رہے ہیں، اس کے علاوہ ہم ایک رائے ہوں متحد ہوں، بند مٹھی کی طرح، ان دونوں میں جب دکھی تھا مسلمانوں کے باہمی انتشار اور تفرقہ سے تو میں نے تو یہاں تک کہنے کی جسارت کی تھی کہ چلو بی جے پی میں ہی چلیں لیکن ایک ساتھ چلیں، متحد ہوکر وزن بنا کر چلیں، شاید اس سے پارٹی کی ذہنیت اور سوچ پر ہم اثر انداز ہوسکیں، حاصل یہ کہ کسی بھی جماعت یا ملک میں ہماری وقعت اسی وقت ہوگی جب ہم متحد ہونے کا واقعی ثبوت دیں گے، منتشر انگلیوں کی طرح نہیں رہیں گے بلکہ گھونسہ اور مٹھی کی

طرح ایک طاقت بن کر ابھریں گے۔

س:-مسلم پرسنل لاء بورڈ کو لے کر گزشتہ دنوں ملت نے جس انتشار کا ثبوت دیا اس پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

ج:- میں نے تو شدید مخالفت کی ہے نئے نئے تشکیل شدہ بورڈوں کی، لکھنؤ کے حالیہ شیعہ سنی فساد کے موقع پر میں نے کہہ بھی دیا تھا، بریلی سے اس کا آغاز اور وہاں کے تشکیل شدہ بورڈ کی مخالفت کے نتیجہ میں تو میرے پتلے تک جلائے گئے اور میں بڑی لعن طعن کا شکار ہوا، بس ایک مخصوص گروپ ہے بریلی کا، وہ مرکز عوام میں عقیدت سے دیکھا جاتا رہا ہے، اس لئے ان سے وابستہ شخصیتیں بھی عقیدت واحترام سے دیکھی جاتی ہیں لیکن ان کا نہ کوئی وزن ہے نہ کوئی وژن (Vision) ہے، لکھنؤ کے لوگوں میں سے ایک فرقہ کے چند لوگوں نے پرسنل لاء بورڈ بنایا لیکن انہیں بھی دوسرے بورڈوں کی طرح عوامی Recognition بالکل نہیں ملا، عوام میں ان بورڈوں کی پذیرائی بالکل نہیں ہوئی البتہ شرارت تو ہوئی اور لکھنؤ کا دنگہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔

س:- اردو زبان آزادی کے بعد سے تعصب وعناد کی شکار رہی، اس میں خود اردو والوں کا بھی اپنی زبان کے سلسلہ میں قصور ہے لیکن اردو بہر حال گنگا جمنی تہذیب کی ایک علامت ہے، آزادی وطن میں اس کا کردار نمایاں رہا ہے اور وہ تسلیم شدہ زبانوں میں سے اپنی شیرینی کی بدولت آج بھی مقبول ہے اس لحاظ سے اس عظیم قومی ورثہ کے تحفظ، اس کے فروغ اور روزی روٹی سے اس زبان کو جوڑنے کے سلسلہ میں آپ کی حکومت کے پیش نظر کون سے منصوبے ہیں؟

ج:- اردو کو روزی روٹی سے جوڑا جائے یہ میرا ہی Concept تھا، جب پارٹی کا مینی فیسٹو تیار ہو رہا تھا اور بات مسلمانوں کے حقوق کی آئی تھی تو اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی تجویز اور تعبیر میری ہی تھی اور میں نے ہی اس میں اسے شامل کرایا تھا۔

ہماری حکومت بنی، وزیر اعلی صاحب نے مجھ سے پوچھا اور اردو مترجمین اور اردو اساتذہ رکھے گئے، امید تھی کہ یہ ہمارے لئے مددگار ثابت ہوں گے لیکن دکھ کے ساتھ عرض

کرتا ہوں کہ بڑی مایوسی ہوئی، وہ بات کہنے اور چھپنے کی ہے بھی نہیں۔

ادھر اردو اکیڈمی اور فخر الدین علی احمد اکیڈمی بے دم ہوئی جارہی تھیں، ان دونوں اکیڈمیوں کو الحمدللہ میں نے زندہ کیا ہے، دو کلیدی پوسٹ (Posts) ہوا کرتی ہیں اکیڈمیوں کی، ایک تو چیئرمین اکیڈمی کے اور دوسرے اکیڈمی کے صدر، ایک عہدہ تو اردو اکیڈمی کو ملتا تھا اور دوسرا عہدہ وزیر اعلی اپنے پاس رکھتے تھے، میں نے اس مرتبہ دونوں عہدے صاحبان اقتدار سے عوام میں منتقل کردیئے ہیں، وزیر اعلی جو عہدہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے اس کا حق بھی اب عوام کی صف میں سے ہی کسی فرد کو تفویض کردیا گیا ہے، اس طرح اردو اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ہیں اور ایکزیکیٹیو کے چیئرمین مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب ہیں، بدایونی ہیں، مرد فاضل ہیں، فعال شخص ہیں، اکیڈمی کا کچھ بجٹ بڑھوانا چاہتا ہوں، ان حضرات کے ساتھ نشست ہونے والی ہے اور ایک ایسی نشست بھی انشاء اللہ وزیر اعلی کے ساتھ ہونا طے ہے جس میں سارے اردو ایڈیٹرس اور اخبارات کے ذمہ داران جمع ہوں اور ان کے مسائل سنے جائیں۔

اردو زبان کو واقعی فروغ ہو اس سلسلہ میں بھی پیش رفت کرنا چاہتا ہوں، بدقسمتی سے مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کے معاملہ میں ان دنوں الجھا ہوا ہوں، اگرچہ اردو کے سلسلہ میں کام تو ہو ہی رہا ہے لیکن اس میں مزید کیسے استحکام لایا جائے، اسے زیادہ سے زیادہ کیسے پرکشش بنایا جائے تاکہ اردو کی جڑوں کو پانی دینے کا کام ہو سکے، اس سلسلہ میں اقدامات ذہن میں ہیں، اللہ کرے کہ انہیں روبہ عمل لانے کا موقع مل سکے۔

س:- آپ کے خوابوں کا ہندوستان کیوں کر وجود میں آسکتا ہے؟

ج:- میرے خوابوں کا ہندوستان! اگر اس ملک میں لوگ رشوت لینا چھوڑ دیں اور تنخواہوں پر گزارہ کرنا سیکھ لیں تو ہندوستان سونے کی چڑیا ہی ہے، کاش میرا یہی ایک خواب پورا ہوجائے تو ہندوستان ہمارے خوابوں کی تعبیر ہونے کی ڈگر پر چل سکتا ہے، صرف رشوت اور کمیشن اگر ہندوستان سے ختم ہوجائے تو انشاء اللہ ہمارا وطن عزیز دنیا کے نقشہ پر ایک طاقت بن کر ابھرے گا اور اس کا وزن ساری دنیا محسوس کرے گی۔

س:- ہندوستان میں آپ کے نزدیک ملت کا مستقبل؟

ج:- انشاء اللہ العزیز ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نہیں روشن ہی ہے، ہم ۱۹۴۷ء کی طرف مڑکر اگر دیکھیں کہ کس قدر پرآشوب حالات تھے، سوسائٹی کا کریم Cream تو پاکستان جاچکا تھا، یہاں بس کوڑا رہ گیا تھا لیکن آپ نے دیکھا کہ خدا کی شان کہ اس نے اس کوڑا کو ایک اچھی کھاد سے تبدیل کردیا اور اس میں جو بیج بچے کھچے رہ گئے تھے، وہ برگ وبار لائے، ہاں! کبھی کبھی خون آشام فرقہ وارانہ فسادات سے دل متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ ہم سوئے ہوؤں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام بھی کرتے ہیں، سونامی کی لہروں نے کتنے لوگوں کو نگل لیا لیکن اس میں اللہ رب العزت کی طرف سے ایک پیغام ہے، انشاء اللہ ہمارے بعد آنے والے لوگ اور آنے والی نسلیں ہم سے زیادہ بیدار مغز ہوں گی اور اچھے جذبہ کی مالک ہوں گی اور اپنی حسن کارکردگی کا ثبوت دیں گی، الحمدللہ ساؤتھ کی ریاستوں میں تعلیمی اعتبار سے مسلمان خاصا کام کررہے ہیں، جو یقیناً انشاء اللہ خوش آئند ہے، خود آپ حضرات بھی جو خدمت علم انجام دے رہے ہیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، بس میرے لئے دعا کریں کہ میرا ابھی مدرسہ (مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی) بھی بن جائے۔

(بانگ حراء، لکھنؤ، مئی ۲۰۰۵ء)

میں متنازعہ اس وقت بن گیا

جب ہاؤس میں ''بابری مسجد'' کو ''مسجد'' کہہ دیا!

وزیر شہری ترقیات حکومت اتر پردیش

جناب محمد اعظم خاں صاحب سے ایک ملاقات

مولانا محمد علی جوہرؒ نے کہا تھا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی میں اس تخیل اور Vision کی بھرپور عکاسی ملتی ہے، ان کی قد آور شخصیت پر نقد کرنے والوں نے ان کی بیباکانہ وجرأت مندانہ کوششوں کو جذباتیت سے تعبیر کیا اور ستم گروں نے تو انہیں ایک ناکام سیاست داں تک کہنے میں بھی تامل نہ کیا، واقعہ یہ ہے کہ بزدلی اور مصلحت میں بڑا لطیف اور نازک فرق ہے اور عموماً یہ ہوتا آیا ہے کہ اپنی بزدلی کو حکمت ومصلحت کا خوبصورت نام دے دیا جاتا ہے اور پھر نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ ع

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

مولانا محمد علی جوہر کے شہر رامپور کے ہی گوہر شب چراغ جناب محمد اعظم خاں صاحب بھی اپنی صاف گوئی اور جرأت مندی کے اظہار کے سلسلہ میں مصلحت کوشوں کی نگاہ میں ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، لیکن اگر ان کا

کچھ قصور ہے تو بس اتنا کہ ان کی دوربین نگاہیں ملک دشمن طاقتوں کے عزم وارادہ کا ادراک کرنے میں دیر نہیں کرتیں اور نہ اس کے برملا اظہار میں انہیں لومۃ لائم کی پرواہ ہوتی ہے، اقبال کی زبان میں وہ کبوتر کی مانند پلٹ کر جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کی قلندرانہ شان کے مالک ہیں تاکہ لہو گرم رہے اور ملت سرد مہری کا شکار نہ ہو۔

باخبر قارئین جانتے ہیں کہ وزیر موصوف نے تاج محل سے متعلق فرقہ پرستوں کے حالیہ باطل ریمارکس کا سخت نوٹس لیا ہے، وزیر باتدبیر کے پیش نظر اس اقدام کے پس پشت کون سے مضمرات ہیں اور ان میں کن خطرات واندیشوں کا تدارک ہے اسے ملاحظہ کیجئے، درج ذیل انٹرویو میں۔

س:- وزیر محترم! سیاسی افق پر آپ کی شبیہ ایک نڈر اور بے باک اور حق گو وانصاف پسند سیاسی رہنما کی حیثیت سے ابھری ہے، آپ کی اس شخصیت سازی کے پسِ پشت کون سے عوامل رہے ہیں اور کون سی شخصیات کی تربیت کو دخل رہا ہے؟

ج:- میں نے دراصل ایک ایسی درس گاہ سے تعلیم حاصل کی جو محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ درحقیقت تربیت گاہ بھی تھی، میرے زمانۂ طالب علمی کے دوران مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایسے حالات پیش آئے جس نے میری تربیت میں کافی اہم رول ادا کیا، مثلاً یہی وہ زمانہ تھا جب اقلیتی تعلیمی کردار کی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک کو شروع کرنے والوں میں جو شخصیات رہیں، ان سے ظاہر ہے کہ میں بہت متاثر ہوا، الحاج شفیق الرحمٰن صاحب، جناب ظفر احمد صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب وغیرہ، تو الحمدللہ ایسی شخصیات کے ساتھ کام کرنے کا، ان کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقع ملا، پھر میری یہ بھی خوش نصیبی رہی کہ طلبہ کی طرف سے میں مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی میں طلبہ کا واحد نمائندہ تھا، سلطان صلاح الدین اویسی صاحب بھی ساتھ جاتے تھے اور ریڈینس (Radiance) والے جناب یوسف صدیقی صاحب بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے، تو الحمدللہ ان حضرات

کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، کچھ کرگزرنے کا مزاج بنتا رہا اور جذبہ پروان چڑھتا رہا۔

مجھے یاد ہے کہ میری تربیت کی غرض سے ظفر احمد صدیقی صاحب نے پٹنہ میں ایک پریس کانفرنس مجھ سے Face کروائی، میں ان دنوں بہت چھوٹا تھا، پریس کلب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ایک صاحب جو نام سے مسلمان معلوم ہوتے تھے، انہوں نے کچھ ایسے سوالات کئے کہ جن پر سوائے غصہ آنے کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، ایک سوال انہوں نے تقریباً گالی دینے کے برابر تھا، انہوں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ غنڈے ہوتے ہیں، بدمعاش ہوتے ہیں، اور یونین کے طلبہ ان کے نمائندے ہوتے ہیں، مجھے سخت غصہ آیا، اور میں نے ایک زوردار لات ماردی اس میز پر جس پر چائے بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے، اور ہنگامہ ہوگیا کہ الفاظ واپس لو، یہ واقعہ میری زندگی کے لئے یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، ظفر احمد صدیقی صاحب نے تو رونا شروع کردیا، انہیں چپ کرانا بڑا مشکل کام تھا، میں نے خود کو بڑا مجرم قرار دیا، پریس کے لوگ ان کی بزرگی کا احترام کرتے تھے، ان کو وہ منانے میں لگے رہے، اور انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ جو اعظم خان ہے جب بھی کسی پریس کانفریس میں چلا جاتا ہے تو بغیر پٹے آتا نہیں، ظفر احمد صاحب کے تئیں ان کا احترام ہی کہیے کہ پریس والوں نے یہ بھی کہا کہ کل کے اخبارات میں اس پریس کانفرنس میں جو کچھ بھی ہوا اس سے متعلق ایک لفظ بھی چھپا ہوا نہیں ملے گا، اور الحمدللہ دوسرے دن کے اخبارات میں ایسا ہی ہوا، تو الحمدللہ ایسی محسن وجہاندیدہ شخصیت کی محبتیں اور صحبتیں مجھے میسر آئیں۔

اسی زمانہ میں بہار جمشید پور میں بڑا زبردست فساد ہوا، ہمارے پروگرام میں جمشید پور کا دورہ بھی شامل تھا، لیکن جب ہم جمشید پور پہونچے تو Administration نے کہا کہ آپ کر لیجئے، چنانچہ tent لگا اور اس سلسلہ میں ضروری انتظامات کئے گئے، وہ جو کبھی آپ نے سنا ہوگا کہ ایک ایسی سبھا کا واقعہ ہوا کہ جس میں شعراء کے علاوہ سامعین میں سے صرف ایک ہی موجود تھا، اور جب اس سے پوچھا گیا کہ قدر دان! تم نے کیوں آنے کی زحمت اٹھائی، تو اس کا

جواب تھا کہ صاحب آپ لوگ تشریف لے جائیں تو میری ذمہ داری دری لپیٹنے کی ہے، تو ایسی نوعیت تھی، اس جلسہ کی کہ سوائے مائک اور tent والوں کے مجمع میں کوئی دوسرا نہیں تھا، جناب ظفر صاحب صدیقی نے کہا کہ میں نے تم کو پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں جلسہ نہ کرو، لیکن تم نے ضد کی، اب کس کو سناؤ گے اپنی بات اور اپنا موقف؟ تو میں نے کہا کہ صاحب! نظر کا فرق ہے، یہاں جو ہزاروں کی فورس لگی ہوئی ہے یہ بھی تو ہمارے سامعین ہیں، اور انہیں بھی اپنا مسئلہ سمجھانا ضروری ہے، اس لئے کہ یہی تو ڈنڈا گولی چلاتے ہیں، چنانچہ جلسہ شروع ہوا اور اتنے ہی شباب اور اتنے ہی جوش وخروش کے ساتھ، چنانچہ ہم جمشید پور کے اس جلسہ کو مسلم یونیورسٹی کی اقلیتی کردار کی لڑائی کا ایک کامیاب جلسہ مانتے ہیں۔

بس اللہ کا شکر ہے کہ ایسی مربی اور شفیق شخصیات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، جس سے بہت کچھ الحمدللہ میں نے سیکھا، اس بات پر بھی رب کریم کا میں بے پایاں شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے جس راہ اور ڈگر کو روز اول سے اپنے میدان کار کے طور پر چنا تھا اور جو موقف اپنایا تھا اس سے نہ تو میں ہٹا ہوں اور نہ منحرف ہوا ہوں، اور نہ اس میں لچک آئی ہے، میں اپنے رفقا سے کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دھوکہ دہی اور فریب کاری سے ترقی ہوتی ہے تو یہ ان کی نادانی اور غلط فہمی ہے، سچائی کے راستہ سے ہی حقیقی اور دیرپا ترقی ملتی ہے، البتہ اس میں دشواری زیادہ ہے، محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے، خود پر قابو پانا پڑتا ہے، کوٹھی نہ سہی گھر سے کام چل جاتا ہے، نئی نہ سہی پرانی گاڑی سے کام چل جاتا ہے، بڑا bank balance نہ سہی، چھوٹے bank balance سے کام چل جاتا ہے، اچھا لباس نہ سہی صاف ستھرے لباس سے کام چل جاتا ہے۔

س: وزیر موصوف! آپ کی شخصیت اکثر وبیشتر ایک متنازعہ شخصیت بنا کر پیش کی جاتی ہے، جس کی ایک وجہ تو آپ کا صاف گوئی سے کام لینا سمجھ میں آتا ہے، اس کے علاوہ اس کی اور وجوہات کیا ہوسکتی ہیں؟

ج-: دیکھنا یہ ہے کہ میں متنازعہ کب سے ہوا ہوں؟ میں متنازعہ اس وقت بنایا گیا

جب میں نے ہاؤس میں بابری مسجد کو مسجد کہہ دیا،اس سے پہلے میں اتر پردیش اسمبلی میں ایک لیبر لیڈر(labour leader) کی حیثیت سے جانا جاتا تھا،مزدوروں کے مسائل اٹھاتا تھا،اور میرے اوپر فرقہ پرستی کی کوئی چھاپ نہیں تھی،لیکن بابری مسجد کو بابری مسجد کہہ دینے کے بعد صورت حال یہ رہی کہ راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے ایوان میں میں جب جب بھی بولنے کھڑا ہوتا تو مجھے آئی ایس آئی کا ایجنٹ،اور دہشت گرد جیسے القاب سے شیوسینا اور دوسری فاشسٹ تنظیمیں نوازنے سے نہیں چوکیں۔

اگر بابری مسجد نہ کہہ کر مجھ سے سیکولر ہونے کی توقع کی جارہی ہے یا اگر قتل عام کو جائز قرار دینا سیکولرزم ہے تو یہ کیسا سیکولرزم ہوا؟ لوگ سیکولرزم کے معنی یہ نکالتے ہیں کہ عبادت گاہیں شہید کردیں،شناخت مٹادیں،لڑکیوں کو حاملہ کردیں،اور ہم کو پوچھنے کی اجازت بھی نہ ہو کہ یہ کس کی اولاد ہیں؟ میں ان چیزوں کو غلط کہتا ہوں،تو میں Communal ہو گیا، میں نے مسجد کو مسجد کہہ دیا تو آخر میں نے کونسا جرم کردیا؟ میں تنہا تو بابری مسجد کو بابری مسجد نہیں کہہ رہا ہوں۔

۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب بابری مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور ایک مقدمہ قائم ہوا تو ایک پنڈت داروغہ اور ایک پنڈت محاضر نے state verses کے نام سے مقدمہ لکھا اور آج حکومت اتر پردیش بابری مسجد گرانے والوں اور مورتیاں رکھنے والوں کے خلاف مقدمہ لڑنے والوں میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہے،وہ مقدمہ لڑ رہی ہے تو مسجد کو مسجد کہنے کی بناء پر اگر کوئی فرقہ پرست ہے تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ اتر پردیش سرکار فرقہ پرست ہے،سرکار کہہ رہی ہے اسے مسجد!میں اگر اسے مسجد کہہ رہا ہوں تو ٹھیک ہے کہ میرا مذہب ہی اسلام ہے لیکن سرکار کا مذہب تو اسلام نہیں ہے،اس کا مذہب تو سیکولرزم ہے، پھر وہ کیوں کہہ رہی ہے اسے بابری مسجد!میں نے دنگوں کو دنگے کہا،مرادآباد،میرٹھ وملیانہ کے فسادات پر میں بے چین ہو گیا تو میں فرقہ پرست کہلایا!میری تقریریں آپ لوگوں نے نہیں ،غیروں نے چھاپ چھاپ کر پورے ہندوستان میں بٹوائیں،تو جب سے مسجد کا تالا

کھلا ہے اور میں نے حق گوئی سے کام لیا ہے اس وقت سے میں متنازع ہوں،اور الحمدللہ اس پر مجھے کوئی ملال بھی نہیں ہے!

شکر ہے کہ اس قدر متنازع ہونے کے باوجود اور لعن طعن سننے اور سہنے کے باوجود میں اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا ہوں، بلکہ الحمدللہ آگے بڑھ رہا ہوں،نہ میں جھکا ہوں،نہ بکا ہوں،نہ پیچھے ہٹا ہوں۔

س: جناب والا آپ وزیر ہیں اور آپ کا نام اعظم ہے،اس طرح اس کا مرکب وزیر اعظم ہوا،میں نے یہ تمہید اس لئے باندھی کہ آپ کا اسم گرامی تاج محل جیسے شاہکار سے جڑ گیا ہے،تاج محل کو تاجیشوری مندر کہہ کر فاشسٹ قوموں کے مذموم ریمارکس نے بجاطور پر ہمیں تشویش میں مبتلا کردیا ہے اور خاکم بدہن اس سے بابری مسجد کی تاریخ دہرائی جانے کی بو آرہی ہے،آپ کی حکومت اس سلسلہ میں کون سے حفاظتی اور پیش بندی کے اقدامات کرنے جارہی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا کیا موقف ہے؟

ج: جب مجھے میڈیا کے ذریعہ معلوم ہوا کہ توگڑیا اور اشوک سنگھل نے اسے تاجیشوری کا مندر کہا،تب میں نے چیرمین سنی وقف بورڈ سے بات چیت کی،ہمارا موقف بالکل صاف اور دوٹوک ہے کہ وہاں قبریں ہیں،عمارت کتنی بھی شاندار ہو،چاہے اس کو سونے چاندی سے ڈھک دیا جائے،یا پلاٹینم سے،لیکن بہرصورت قبریں،قبریں ہی رہیں گی، سیاست داں کی حیثیت سے مجھے 50/100 سال کے آنے والے مستقبل کو بھی دیکھنا چاہیے اور 50/100 سال پہلے کے گذشتہ ماضی کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے،بابری مسجد کے انہدام کے اسباب اور منظر کو دیکھ لیجئے آپ!انگریزوں نے صرف اتنی شرارت کی کہ گزیٹئر میں یہ لکھا کہ said that there was ram mandir also in Ayodhya صرف اتنی شرارت کا یہ انجام ہوا کہ ۲۲؍دسمبر کو کانگریس کے دور اقتدار میں مسجد میں مورتیاں رکھوادیں گئیں،شیلانیاس کرایا گیا،ایک بڑی بھیڑ گئی اور اس نے ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو بالآخر ۴۰/۴۵ برسوں کے بعد ایک منظم انداز سے بابری مسجد کا انہدام کردیا اور آج

وہاں مندر ہے، تو تجربہ اس بات کا سامنے آیا کہ جو چیز پہلے کہی گئی تھی، وہ بات ۵۰/ برسوں کے بعد عمل میں لے آئی گئی۔

اس لئے پہلے ہی دن جب میں نے تاج محل سے متعلق بیان پڑھا اور سنا تو میں مڑ کر دیکھا تو مجھے بابری مسجد نظر آئی، اور...... دیکھا تو تاج محل نظر آیا! بہت برسوں پہلے کی بات ہے کہ میں ایک سفر میں تھا، دوران سفر کچھ لوگ دلآزاری کی باتیں کر رہے تھے، لیکن میں خاموش رہا، ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ صاحب! آپ کیوں خاموش ہیں، میں نے ان سے کہا کہ اگر میں جواب دوں گا تو آپ کے نزدیک نامناسب ہوگا، اور آپ مجھے کھڑکی سے باہر پھینک دیں گے، انہوں نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، البتہ آپ جواب دیجئے، ان کے دو سوال تھے، ایک تو یہ کہ لال قلعہ کے دروازہ پر جو جانور کی تصویریں بنی ہوئی ہیں وہ خنزیر سے مماثلت رکھتی ہیں، اور دوسری بات یہ کہ شاہجہاں نے ممتاز محل کی یاد میں تاج محل بنایا ہوتا تو اس کا صحیح نام ممتاز محل ہوتا، میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے دونوں باتوں کے جوابات دوں گا، لیکن میری شرط یہی ہے کہ جو ابھی میں نے آپ کے سامنے کہا...... تو میں نے کہا کہ لال قلعہ پر بنی جانوروں کی تصویروں سے متعلق عرض یہ ہے کہ لال قلعہ پر بنی تصویریں آپ کو خنزیرنما معلوم ہوتی ہیں، جبکہ مجھے گھوڑے لگتے ہیں، تو آئینہ میں آپ کو اپنی صورت نظر آتی ہے اور ہم کو اپنی صورت نظر آتی ہے، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ غصہ تو انہیں بہت آیا لیکن چونکہ ہم سے وعدہ کر چکے تھے کہ ہمیں چلتی ٹرین کی کھڑکی سے نہیں پھینکیں گے، اس لئے عافیت رہی، ان کے دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ شاہجہاں ممتاز سے بہت محبت کرتے تھے، اور وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب میری معشوقہ کو لوگ ممتاز نہیں ''ممتاج'' کہیں گے، تو انہوں نے مستقبل میں ہونے والی اس غلطی کا اندازہ لگاتے ہوئے ممتاز محل کے بجائے اس یادگار عمارت کا نام تاج محل رکھنا پسند کیا، آپ کی زبان، تلفظ، قابلیت کے بارے میں شاہجہاں کو خوب اندازہ تھا، تو اب آپ کتنا بگاڑیں گے...... تو اصل مسئلہ یہ ہے، ورنہ اس کا نام ''ممتاز محل'' ہی ہوتا۔

میرا کہنا یہ ہے کہ تاج محل میں دو قبریں ہیں، ہمارے پاس سنی سنٹرل وقف بورڈ ہے، اور وہ ایک اعتبار سے شرعی اور دستوری ادارہ ہے، اگر بابری مسجد کا اندراج سنی سنٹرل وقف بورڈ میں نہ ہوتا تو آج کوئی سرکاری Organisataion یا سرکاری فریق اس قضیہ میں عدالت سے مقدمہ لڑ رہا ہوتا، آج جو باڈی پہلے روز سے عدالت میں بابری مسجد کا مقدمہ لڑ رہی ہے اس کا نام ہے سنی سنٹرل وقف بورڈ، میں چاہتا ہوں کہ تاج محل میں موجود ان دونوں قبروں کا اندراج بھی سنی سنٹرل وقف بورڈ میں ہو جائے، تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہے؟ قبریں، قبریں ہیں، چاہے دو ہی کیوں نہ ہوں، وہ قبرستان ہے، تو وقف میں اس چھوٹے سے قبرستان کا اندراج ہو جائے، آخر اندارج میں فاشسٹ ذہنیت رکھنے والوں یا سنٹرل گورنمنٹ کو اعتراض تو نہیں ہونا چاہیے، بس اتنا ہی تو چاہتا ہوں کہ وہاں موجود قبروں کا اندارج سنی سنٹرل وقف بورڈ میں ہو جائے، اس وقت جو ماحول تیار کیا جا رہا ہے اور جو ذہن تاج محل کے سلسلہ میں بنایا جا رہا ہے اس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ فلاں گزٹ یا فلاں مورخ یا فلاں بک میں اس طرح کی بات تاج محل سے متعلق ہے، یہ شوشہ خدانخواستہ کوئی فتنہ کی شکل اختیار کر لے اور منفی عوامی جذبات ابھار کر ایک بھیڑ ہلہ بول دے، اور اگر گورنمنٹ کانگریس کی ہوئی تو وہ ماضی کی طرح صاف کہہ دے گی کہ صاحب! ہم قتل عام تو نہیں کر سکتے تھے، دو قبروں کی خدانخواستہ مٹی پلید کر دینا اور اس کی جگہ شیولنگ رکھ دینا کتنی دیر کی بات ہے؟ تاج محل پھر بھی دنیا کا عجوبہ بنا رہے گا ایسا ہی شاہکار رہے گا، لیکن خدا نخواستہ شیولنگ کے ساتھ رہے گا۔

سنٹرل گورنمنٹ کے معترض ہونے کی کچھ وجوہات ہیں، اس لئے کہ اس کی نظر ہے اس بکس پر جس سے آمدنی ہوتی ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، ہاں ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ تاج محل کی ساری دیکھ بھال حکومت اتر پردیش کے سپرد ہے، جتنی بھی وہاں فورسیز لگی ہے وہ حکومت اتر پردیش کے زیر کنٹرول ہے، صرف Booking Office دلی سرکار چلاتی ہے، اگر حکومت اتر پردیش ٹکٹ بیچنے کے بھی قابل نہیں ہے تو ٹھیک ہے، سنٹرل گورنمنٹ ہی

ٹکٹ فروخت کرے، اگر پیسہ کمانے سے انہیں دلچسپی ہے تو اس پر ہمیں اعتراض نہیں، البتہ قبروں کا رجسٹریشن وقف بورڈ میں ضروری ہے، انشاء اللہ اندراج تو ہوگا ان قبروں کا، تاکہ خدانخواستہ کل کوئی بات پیش آئے تو ہمارے پاس ثبوت تو رہے کہ یہاں قبریں ہیں، میں اگر کوئی غلط یا غیر واجب بات کررہا ہوں تو میں جاننا چاہوں گا کہ میں کونسی قابل اعتراض بات کررہا ہوں، فتنہ کی شروعات تو فاشسٹ افراد اور تنظیموں نے کی ہے، ہم نے صرف قبروں کی وقف بورڈ میں اندراج کی بات کی ہے، اس پر یہ بلک گئے، اور بوکھلا گئے ہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔

رہی ان کی یہ بات کہ بابری مسجد غلامی کی نشانی تھی تو اس وقت بھی میں نے کہا تھا کہ غلامی کی نشانی اگر ہے تو دلی کا لال قلعہ! پارلیمنٹ ہاؤس، راشٹرپتی بھون، تاج محل!! غلامی کی ان نشانیوں میں سے تاج محل جیسی شاہکار عمارت اور دنیا کے ایک عجوبہ کو گرانا چاہتے ہو تو چلو میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ، تاکہ دنیا دیکھے کہ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ تمہاری ذہنیت کیا ہے؟ اور تم کون ہو؟ اور کس ظرف کے حامل ہو؟

(ماہنامہ ''بانگ حراء'' لکھنؤ: جون ۲۰۰۵ء)

ملت کی طرف سے

ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا جو مستقبل کی راہیں ہموار کر سکے!

وزیر شہری ترقیات و پارلیمانی امور حکومت اتر پردیش

جناب محمد اعظم خاں صاحب سے ایک ملاقات

یہ انٹرویو اوائل مئی ۲۰۰۵ء کو لیا گیا تھا جس میں وزیر باتدبیر نے اپنی ایک حسین آرزو یعنی مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کا تذکرہ کیا ہے، نیز اس راہ میں حکومتی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ حزب مخالف کی پیدا کردہ رکاوٹوں اور مخالفتوں کا بھی برملا اظہار کیا ہے، گویا یہ محض ایک انٹرویو نہیں بلکہ ایک دستاویز بھی ہے جو حزب مخالف کے اس رویہ کی تصویر کشی کرتی ہے کہ ؎

نئے جھگڑے، نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

انٹرویو کے بعد اس بل سے متعلق جو نشیب وغراز آتے رہے ان سے ہمارے باخبر قارئین واقف ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی جناب محمد اعظم خاں صاحب کا ایک ایسا خواب ہے جسے انشاء اللہ شرمندۂ تعبیر ہونا ہے اس لئے کہ سیدوالا گہر کی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اس سپوت کے پس پشت کوئی سیاسی جذبہ کارفرما نہیں بلکہ عصری تعلیم کا فروغ مقصود ہے اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی دوسری سب

سے بڑی اکثریت کا تعلیمی فروغ جو تعلیمی پس ماندگی کے لحاظ سے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب سے بھی پیچھے ہے، تعلیمی کاموں میں سیاست کو دخیل نہیں ہونا چاہئے اور اسے سب کو مل کر کرنے کا کام سمجھنا چاہئے۔

ہمارے باخبر قارئین جانتے ہیں کہ اس انٹرویو کے بعد اس بل کے سلسلہ میں بعض اہم اقدامات سامنے آئے ہیں، جنہیں مقصد سے لگن اور عشق ہوتا ہے وہ اس راہ کے موانع دور کرتے چلے جاتے ہیں، رب کائنات جن کو زندگی کا حوصلہ دیتا ہے انہیں ناکامیاں توڑ کر نہیں رکھ دیتیں، وہ ساحل پہ نہیں چلا کرتے بلکہ اپنے سفینہ کو موجوں کی زد پہ ڈال دیتے ہیں۔

بہر حال محمد اعظم خاں صاحب سورج کی طرح اپنے ہی مدار پر گھومنے کے قائل نہیں بلکہ دریا کی طرح اپنی راہ خود بناتے چلے جاتے ہیں اور جن کی حق گوئی کو دیکھ کر حضرت علیؓ کا وہ مقولہ یاد آتا ہے کہ جہاں حق بات کہنی ہو، وہاں خاموشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

س:- آپ کے ذہن میں مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی بنانے کا خیال کیوں کر آیا؟ کیا رامپور سے مناسبت کی وجہ سے کہ مولانا محمد علی جوہر کا تعلق بھی رامپور سے تھا یا کسی کی تحریک پر اس سلسلہ میں آپ نے پیش رفت کی؟

ج:- اس سلسلہ میں یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ ملت کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا جو مستقبل کی راہیں ہموار کر سکے، یونیورسٹی بنانے کے لئے نہ تو کوئی فرد مجھ سے ملا نہ مجھ سے کوئی جماعت ملی، نہ کوئی تنظیم، نہ کوئی پولیٹیکل آرگنائزیشن، مجھ سے کسی نے ایسی یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ نہیں کیا چنانچہ یہ جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں، یونیورسٹی کے سلسلہ میں، یہ کسی کے مطالبہ کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ محض میرے جذبہ کی بنیاد پر ہے، میں اکثر اپنے رفقاء سے کہا کرتا تھا کہ الحمد للہ اللہ تعالی نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا، مقام و مرتبہ عطا فرما دیا، وزیر بھی بنا دیا اور الحمد للہ ایسا وزیر جس کی بات سنی بھی جاتی ہے لیکن ان

سب کے باوجود قوم وملت کے لئے میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکا، میرے بعد میرے نام کے ساتھ کچھ یاد کیا جا سکے گا، یہ سوچ کر مجھے پریشانی ہوتی ہے، اس کے لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ایک تعلیم گاہ بنائی جائے، یہ میری اپنی سوچ اور میرا اپنا فیصلہ ہے۔

س:- مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی بل کے بعد سے آپ کی ذات سے متعلق ایک سوال یہ بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ آپ کی تعلیمی خدمات کیا رہی ہیں؟ اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- جب جب بھی ہماری سرکاریں رہیں تو میری کوشش رہی کہ مسلمانوں میں تعلیم کا فروغ ہو، اس کے لئے میں یہ کرواتا تھا کہ جن اسکولوں کو Recognition نہیں مل پاتا تھا وہاں اسکول قائم کر دیتا، جب میں راجیہ سبھا کا ممبر ہوا تو کروڑوں روپیوں سے اسکول اور کالجز کی معاونت کی، اور ڈومریا گنج میں مولانا آزاد کے نام سے ایک کالج بھی میں نے بنوایا، رامپور میں کوئی مدرسہ ایسا نہیں ہے جسے میں نے پکا نہیں کرا دیا ہے، کوئی نگر پالیکا کا اسکول ایسا نہیں ہے جسے میں نے نہ بنوایا ہو، تعلیم کی طرف میرا رجحان ہمیشہ رہا۔

ایک وجہ اور بھی ہے، جن دنوں ہم مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی لڑائی لڑ رہے تھے، ان دنوں میں یونیورسٹی کا ممبر بھی تھا، ان دنوں برابر یہ جذبہ مجھ میں پروان چڑھتا رہا اور اسے تقویت ملتی رہی کہ ہم بھی ضرور کچھ نہ کچھ تعلیمی کام کریں، البتہ یہ بات ان دنوں میرے ذہن و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میں کسی یونیورسٹی کے بنانے میں مددگار بن سکوں گا! خدا کی شان اور فضل ہی ہے یہ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ جب مدارس کو آئی ایس آئی کا اڈہ کہا گیا، دہشت گردی کا الزام ان پر عائد کیا گیا تو شاید میں پہلا سیاسی شخص تھا جو نکل کر سامنے آیا اور واضح لفظوں میں جس نے اس بے بنیاد اور جھوٹے الزام کی مذمت کی، پھر حالات بدلے، ہماری سرکار آئی، اور مدارس کے لئے حکومت اتر پردیش سے گرانٹ منظور ہوئی، ۶۷ اور مدرسوں کو گرانٹ میں لے لینے کا فیصلہ ہوا جس کا معاملہ برسوں سے ٹھنڈے بستہ میں پڑا ہوا تھا، اب ان کی گرانٹ جاری ہوگئی ہے، اب ملائم سنگھ یادو جی اپنے ہاتھ

سے اس کی شروعات کریں گے۔

اس بیچ جب مجھے خیال آیا کہ تعلیم کے فروغ کے لئے کوشاں رہا ہوں، مقدور بھر لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، میدان سیاست سے جڑا ہونے سے عوام سے برابر رابطہ میں ہوں، اور میرے متعلق اتنی بری رائے نہیں ہے، اگرچہ اگر اچھی رائے نہ ہو تو اس وقت میں نے یونیورسٹی کا خواب دیکھا، اس کا تذکرہ پچھلی سرکار میں میں نے نیتا جی سے کیا۔

مجھے آپ سے یہ بات کہنے میں کوئی تامل یا تکلف نہیں ہے کہ میں جب مسلمانوں کے تعلق سے ارباب اقتدار کے سامنے کوئی بات رکھتا ہوں تو اس میں ''نہ'' کا تصور بھی نہیں ہوتا، اللہ کا شکر ہے کہ اعتماد کی فضا ہے۔

نوئیڈا میں IAS اور PCS کا کوچنگ سنٹر بننے جا رہا ہے، میں نے اس کا سنگ بنیاد رکھا ہے، اس سے اقلیت سے تعلق رکھنے والے طلبہ مستفید ہوں گے، اور دلی کے جو بہترین کالجز ہوں گے، ان کو contact دیا جائے گا، اور اس شرط پر دیا جائے گا کہ ہمارے طلبہ IAS اور PCS کے امتحانات میں اسی ratio اور تناسب سے کامیاب ہو کر آئیں گے، جس تناسب سے آپ کے کالجز کے طلبہ کامیاب ہوں گے، ورنہ آپ کو پیسہ نہیں دیا جائے گا، اس Condition کے ساتھ ہم اسے بنا رہے ہیں، اس میں سرکاری عملہ ہم نہیں رکھیں گے، private agencies جو contact لیتی ہیں ان سے رابطہ ہوگا، پورے ہندوستان میں انشاء اللہ اپنی نوعیت کا یہ پہلا فیصلہ ہوا ہے، کہ اتر پردیش کے رہنے والے دو ہزار طلبہ جنہوں نے چاہے ہندوستان کے کسی ادارہ میں تعلیم حاصل کی ہو، اور ہماری مطلوبہ صلاحیت و پوزیشن پر پورے اترتے ہوں، ان کو ایک ہزار روپئے سے دو ہزار روپئے تک اسکالرشپ دی جائے گی، صرف مسلمان طلبہ اس کا استحقاق رکھیں گے، مذہب کے نام پر ایسا نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ ہماری تعلیمی پسماندگی ہمارے پیش نظر ہے، چاہے وہ طلبہ IIT میں ہوں، یونیورسیٹیز میں ہوں، البتہ نمایاں نمبر لائے ہوں، انہیں وظیفے دئے جائیں گے، اس

بجٹ میں اس کا provision ہے، انشاء اللہ جلد ملنا شروع ہو جائے گا۔

س: بات مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کی چل رہی تھی!

ج: جی ہاں! تو پچھلی سرکار میں ہم یونیورسٹی کا بل لانا چاہتے تھے، نیتا جی تیار تھے، اور آپ ان کی اقلیت نوازی اور علم دوستی کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ انٹگرل کالج کے یونیورسٹی بنانے اور اسے اقلیتی ادارہ قرار دینے کے معاملہ میں بھی مجھے بس دس پندرہ دن انہیں کچھ باتیں ذہن نشیں کرانا پڑیں، اس اعتبار سے کہ وہ سن لیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسے ہوگا، پھر میں سمجھاتا تھا، ایک دن انہوں نے کہا کہ اچھا بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟ میں نے کہا بس کرنا یہ ہے کہ آپ کو وہاں چلنا ہے، ایک function ہوگا، اس میں آپ کو انٹگرل کالج کے انٹگرل یونیورسٹی ہونے کا اعلان کرنا ہے، باقی کام تو سرکاری عملہ کرے گا، چنانچہ وزیر اعلی ملائم سنگھ جی گئے، اور اسے اقلیتی ادارہ بھی declare کیا، اور اس کا یونیورسٹی ہونا بھی declare کیا، اس چیز نے میری ہمت بڑھائی اور میں نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم مولانا محمد علی جوہر کے نام سے کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے کہا بتاؤ کیا کیا کرنا چاہتے ہو، تو ہم نے کہا کہ ایک تو مولانا کے نام سے ایک ریسرچ سنٹر کا قیام، دوسرے ایک اور یادگار جہاں مولانا جنگ آزادی کے سلسلہ میں قید رہے، اور تیسرا کام یہ کہ مولانا کے نام سے رامپور میں ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام جہاں عربی، اردو، فارسی کی ایڈوانس اسٹڈیز کا انتظام ہو، اور وہ ایک Complete University ہو۔

س: میڈیا سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی بل کے سلسلہ میں کانگریس کا کردار منفی رہا ہے، اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: کانگریس کی طرف سے جو ماحول بنایا گیا کہ ایک تو یہ کہ یہ اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی ہے، اس طرح یہ ایک بلند تعلیمی تصور و تخیل کو بھونڈا کرنے کی نازیبا کوشش کانگریس کی طرف سے ہوئی، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اتر پردیش میں الحمد للہ کس قدر عربی مدارس ہیں، اور وہ کتنی بلند سطح کا کام کر رہے ہیں، دیوبند کے بارے میں سب جانتے ہیں،

ندوہ کے بارے میں سبھی جانتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی مدارس ہیں، جہاں میرا جانا ہوتا ہے، تو ان سب مدارس کی موجودگی میں میں محض عربی زبان کے لئے ایک یونیورسٹی بنا کر بہت بڑا کام کرسکوں گا، ایسا میں نہیں سمجھتا! اتر پردیش میں عربی مدارس کے وجود اور ان کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے کانگریس کے پیش کردہ مفروضہ کے تحت تو مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی بھی اسی طرح کا ایک عربی تعلیمی ادارہ ہوکر رہ جائے گی، میں تو اس راستہ سے ایک مکمل یونیورسٹی بنانا چاہتا ہوں، میں نے جو نقشہ اس یونیورسٹی کا بنایا ہے، اس میں تمامتر faculties شامل ہیں، اس میں ہوائی جہاز اڑانے کی ٹریننگ دی جائے گی، engeineering,medical گویا اس میں وہ تمامتر faculties شامل ہیں جو ایک مکمل یونیورسیٹی میں ہونے چاہییں، اور اس کے ساتھ ساتھ اردو، عربی، فارسی کی ایڈوانس اسٹڈیز کا انتظام! یہ بل پاس ہوگیا، اس بل کا نام ''مولانا محمد علی جوہر وشوودیالیہ ۲۰۰۴'' تھا، اس وقت مولانا محمد علی جوہر اردو وشوودیالیہ کا نام نہیں تھا، یہ مغالطہ دے کر غلط تصویر کشی کرنا چاہی، ہم نے تو بس اتنا ہی کہا کہ اس یونیورسیٹی میں ایڈوانس اسٹڈیز (اردو، عربی، فارسی) کا بھی انتظام ہوگا، لیکن جب کانگریس کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی محض اردو، عربی، فارسی کی اعلی تعلیم کی یونیورسٹی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مکمل یونیورسٹی ہے تب کانگریس نے اپنے مخالفت میں شدت پیدا کی، وہ محض یونیورسٹی کی حد تک تیار تھی، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ایک مکمل یونیورسٹی بننے جارہی ہے تو اس کے لئے وہ تیار نہیں، اس یونیورسٹی میں میرا نام پروچانسلر کے لئے مندرج تھا، cabinet سے پاس ہوگیا، ordinance کے لئے گورنر کے پاس گیا، ordinanace پر گورنر موصوف نے دستخط نہیں کئے، اس پر ہم نے صبر کیا، کہ ordinance پر گورنر موصوف نے دستخط نہیں کئے تو ہم نے سوچا کہ چلو اس کو مضبوطی سے ہم ایکٹ بنادیں گے، چنانچہ اسمبلی میں بھاری اکثریت سے act پاس ہوگیا۔

س: یہاں آپ کے پروچانسلر بننے کی جو تجویز ہے اس پر آسمان سر پر اٹھایا جارہا ہے،

اصل بات کیا ہے؟

ج: یہاں دو باتیں ہیں، کہ کسی صوبہ کا گورنر اس صوبہ کے تمام یونیورسٹیز کا چانسلر ہوتا ہے، نیز کسی بھی گورنر کے لئے ایجوکیشن کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، وہ پڑھا لکھا شخص بھی ہوسکتا ہے، اور بے پڑھا لکھا بھی ہوسکتا ہے، ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسے صاحب بھی گورنر رہ چکے ہیں جن کی تعلیم سے راہ ورسم نہیں تھی، تو ضروری نہیں کہ راشٹرپتی سائنس داں ہی ہو، سابق گورنر آنجہانی وشوکانت شاستری کے پاس شاستری کی ڈگری تھی، ایم بی بی ایس جیسی کوئی ڈگری ان کے پاس نہیں تھی، وہ scientist نہیں تھے، تو کوئی criteria اور پیمانہ تعلیمی اعتبار سے گورنرشپ کے لئے نہیں ہے، بس سماج کا کوئی بھی اچھا شخص ریاست کا گورنر ہوسکتا ہے، جب یہ پیمانہ ہے گورنرشپ کا، تو میرے جیسا آدمی کیا پروچانسلر نہیں ہوسکتا؟ جو چانسلر کا اسسٹنٹ ہوگا، اور یہ بھی ایک اکیڈمک اور ایڈمنسٹریٹو post ہوجائے گی، کانگریس اپنے بیانات میں مجھے برابر پروائس چانسلر کہہ رہی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

س: کیا تاحیات پروچانسلر کی مثالیں پہلے سے اس ملک میں موجود ہیں؟

ج: ہیں! یقیناً ہیں، پہلے تو میں یہ عرض کردوں کے پروچانسلر کی حیثیت سے میرا رول صرف اتنا ہوتا کہ گورنر صاحب اپنی مصرفیات کی بناء پر ہر جگہ نہیں جاسکتے، تو مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کے کسی پروگرام کو میں preside کرلوں گا، صرف اتنا رول تھا، وہ بھی کانگریس کو برداشت نہیں ہوا، اس کے علاوہ جیسا کہ آپ نے پوچھا کہ ہندوستان میں کئی ایک یونیورسٹیاں ہیں جس کے پروچانسلر life long ہیں، مثلاً انا ملائی یونیورسیٹی تامل ناڈو، اس میں پانچویں نسل ہے long life پروچانسلر کی، اس کا ہر بڑا بیٹا پروچانسلر ہوتا ہے، اس پر کانگریس کو اعتراض نہیں ہے! ایک تو آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ملائم سنگھ سرکار میں پہلی بار ایسا ہونے جارہا تھا کہ ایک مسلمان پروچانسلر بننے جارہا تھا، دوسرے یہ کہ کانگریس کو اندازہ ہے کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس میں اتنا اعتماد اور حوصلہ ہے کہ وہ یونیورسٹی بنالے گا، کانگریس کسی ایسے مسلمان کو وائس چانسلر بنانے پر تیار ہوجاتی جو کانگریسی کلچر سے واقف

ہو، کہ وہ ایسا مسلمان ہو جو اٹھتے بیٹھتے ان کو آداب بجالائے، تو میرے یہاں ممکن نہیں ہے، وہ ایک ''جی سرکار'' کہنے والا پروچانسلر چاہتے ہیں، اور میں یونیورسیٹی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے والا! تو کانگریس کی مخالفت میں کوئی دم نہیں ہے۔

اگر لائف لانگ (تاحیات) پروچانسلر ہونا جرم ہے تو ہندوستان میں جتنے تاحیات پروچانسلر ہیں وہ سب ہٹادئے جائیں، مجھے کوئی شکوہ نہیں، مسز سونیا گاندھی خود لائف لانگ پریزیڈنٹ (تاحیات صدر) ہیں راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کی، جس فاؤنڈیشن کے پاس 18 seater جہاز ہے، جس سے وہ چلتی ہیں، جس کا بجٹ دس یونیورسیٹیز زیادہ ہے، وہ اندرا گاندھی پرتشٹھان کی تاحیات صدر ہیں، تو وہ لائف لانگ صدر رہ سکتی ہیں، لیکن ہم تاحیات پروچانسلر نہیں رہ سکتے۔

س: سرکاری بل کی نوعیت کیا تھی اور اس سلسلہ میں رویہ کیا رہا؟

ج: سرکاری یونیورسٹی جنرل یونیورسٹیوں کی طرح تمام طبقات اور عام سطح کی یونیورسیٹی تھی، کسی مخصوص فرقہ کے لئے نہیں تھی، اس بل کی کاپی راجیہ پال مہودے نے راشٹر پتی جی کو بھیج دیا، راشٹر پتی جی نے human resources ministry کو بھیج دیا، اور ہیومن ریسورسز منسٹری نے اتر پردیش حکومت کو بھیج دیا، یہ کہہ کر اس کا ودھک پرکشن کرا لیا جائے، اور اس کے تحت انہوں نے لکھا کہ کیا اس کو دستور ہند کی روشنی میں دیکھ لیا گیا ہے؟ کیا اس سوال کی عینک سے اسے دیکھ لیا گیا؟ اور آخری اور تیسرا سوال انہوں نے یہ بھی کیا کہ اس یونیورسٹی کو بنانے کے پیچھے منشاء کیا ہے؟ اس طرح اپنی اصل ذہنیت کانگریس نے آشکارا کر دی، اس تیسرے سوال کے ذریعہ کہ ''اس یونیورسٹی کو بنانے کے پس پشت منشاء کیا ہے''، میں نے یہی جاننا چاہا کانگریس سے کہ کسی اسکول یا کالج کو بنانے کا مقصد و منشاء کیا ہوتا ہے؟ تعلیم دینا! اور میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ میرا منشاء اس میں دیش دروہی تیار کرنا دہشت گرد تیار کرنا اور آئی ایس آئی کے ایجنٹ تیار کرنا نہیں ہے، میرا منشاء غریب اقلیتی طبقات کو تعلیم سے آراستہ کرنا ہے، جواب چلا گیا اور حیرت ہے مجھے منسٹری آف ہیومن ری

سورسز human resores کے ایجوکیشن سے متعلق محکمہ سے، ہم سے وہ query کرتا ہے جس کا اسے حق نہیں ہے، کوئی بھی بل جب تیار ہوتا ہے تو وہ law dept میں جاتا ہے، اور جب law dept اس کا clearance کر دیتا ہے تو higher education اس کو clearance دے دیتے ہے تو cabinet میں آتا ہے، اور cabinet اسے approval دے دیتی ہے تو ہاؤس میں آتا ہے اور سترہ کروڑ عوام اس کو apporval دے دیتی ہے، تب وہ راجیہ پال جی (گورنر جی) کے پاس آتا ہے، ہاؤس میں کسی بل کے پاس ہونے کا مطلب ہے کہ ۱۷ کروڑ لوگوں نے اسے منظوری دے دی ہے۔

راجیہ پال ایک دستوری عہدہ ہے، لیکن راجیہ پال مہودے کی اپنی حدیں ہیں، اور وہ اپنی حدوں سے تجاوز نہیں کر سکتے، اور دستور راجیہ پال کو غیر جانب دار مانتا ہے، وہ کسی سیاسی جماعت کا نہیں ہوگا، وہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھے گا، اور سب کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کرے گا، اور اس کا یہ برتاؤ صرف لکھا ہوا نہیں بلکہ عمل سے ثابت ہونا چاہیے، مولانا محمد علی جوہر یونیورسیٹی بل کے سلسلہ میں راج بھون کا جو رویہ رہا ہے اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اس رویہ سے گورنر جیسے باوقار اور سب کے لئے قابل قبول منصب سے جانب داری یا غیر جانب داری کے ثبوت دینے کا پتہ چل رہا ہے؟

س: private بل سے متعلق رویہ؟

ج: اب رہا پرائیویٹ بل، ہم نے یہ سوچ کر کہ کانگریس کے صدر نے رامپور میں جاکر کہا کہ اعظم خان مولانا محمد علی جوہر یونیورسیٹی کیوں بنانا چاہتے ہیں، ITI کیوں نہیں بنانا چاہتے ہیں، جس سے ٹرنر فٹر تیار ہو سکیں، تو گویا صدر کانگریس نے ہمارا معیار طے کر دیا، اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ اس میں لفظ ''مولانا'' کیوں ہے؟ یہ مولانا کیا ہوتا ہے؟ تو جب ہم نے اگلا بل لایا تو لفظ مولانا ہٹادیا، کہ ہم آپ کے اعتراضات ہٹائے دیتے ہیں، انہیں افسوس تھا اس بات کا کہ مولانا محمد علی جوہر یونیورسیٹی اس خطہ میں بننے جارہی تھی جس سے زیادہ استفادہ اقلیتیں اٹھا پاتیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خزانے پر ہمارا کوئی حق نہیں

ہے،ہمیں صرف ٹیکس ادا کرنا ہے،اس پر ہماری کوئی حصہ داری نہیں ہے،اس پر بھی ہم نے صبر کرلیا،اور میں نے ہاؤس میں یہاں تک کہا کہ اگر کانگریس کو محمد علی پر بھی اعتراض ہے تو ٹھیک ہے،ہم اسے جوہر یونیورسیٹی بنادیں گے!یا آپ ہی کوئی نام تجویز کردیں،بس گورنر صاحب سے دستخط کردینا،!تو یہ ہے کانگریس کی ذہنیت!!

س:مولانا محمد علی جوہر یونیورسیٹی سے پرائیویٹ بل میں لفظ''مولانا'' ہٹانے پر عوام غلط فہمیوں کا شکار ہورہی ہے،اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

ج:لفظ مولانا کے ہٹانے کے پیچھے ایک تکنیکی وجہ ہے،اور وہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کے نام سے ایک بل سدن میں پاس ہوچکا ہے،پہلا سرکاری بل جس پر ابھی گورنر نے انکار نہیں کیا ہے،تو اس طرح یہ بل pending میں ہے،جب تک انکار نہیں ہوجاتا،ہم اس نام کو مرا ہوا نام نہیں کہہ سکتے،چنانچہ اسی نام سے دوسری یونیورسیٹی نہیں بن سکتی تھی،اس لئے اس تکنیکی دشواری کی وجہ سے میں نے فی الحال لفظ مولانا ہٹادیا ہے، amendment کبھی بھی آسکتا ہے،اس طرح تکنیکی وجہ سے لفظ مولانا کو فی الحال ہٹادیا گیا،ورنہ چیلنج ہوجاتا کورٹ میں،اب یہ بل بھی پاس ہوگیا بھاری اکثریت سے اور یہ بھی راجیہ پال مہودے کے پاس چلا گیا۔

کانگریس پروپیگنڈہ میں لگی ہوئی ہے،اور کانگریس صدر پہلے کہہ چکے تھے کہ سرکاری تو سرکاری،ہم اس بل کو پرائیویٹ سطح پر بھی پاس نہیں ہونے دیں گے،منظوری نہیں ہونے دیں گے،اس لئے راجیہ پال کے اس بل پر دستخط نہیں ہورہے ہیں،راجیہ پال بھون سے query آئی ہے کہ trust deed بھیجا جائے،ہم نے فی الحال ایسا کرنے سے انکار کیا اور کہا ہے کہ آپ کے دائرہ اختیار سے باہر کی بات ہے،راجیہ پال کو غیر جانبدار ہونا چاہیے،انہیں سب کے ساتھ مساوات کا عملی ثبوت دینا چاہیے،آپ کے سامنے ایک ساتھ دو بل گئے تھے،ایک amity university کا اور دوسرا مولانا محمد علی جوہر یونیورسیٹی کا،دونوں ٹرسٹ کے ذریعہ بنائے گئے تھے،اگر آپ کو trust deed مانگنا تھا تو آپ دونوں سے طلب کرتے،لیکن

آپ نے amity university بل پر تو دستخط کرنے دیئے،لیکن ہمارے بل پر کانگریس نے اس لئے دستخط نہیں کردئے کہ اب اس بل سے جس یونیورسیٹی کی منظوری ہوگی اس کے تحت اس کا شمار جنرل یونیورسیٹی میں نہیں ہوگا،بلکہ یہ ایک اقلیتی یونیورسیٹی کی حیثیت سے ہوگا،یہ بل سپریم کورٹ کے فیصلہ کی رو سے minority یونیورسیٹی کے بل کی حیثیت سے منظور ہوا ہے،اور اس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کا وہ پورا paragraph اور clause ڈالا گیا ہے،اس کے تحت اس یونیورسیٹی میں پچاس فیصد طلبہ کا داخلہ اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ کا ہوگا،تو چونکہ کانگریس نے اس میں یہ clause پڑھ لیا ہے کہ اس میں اقلیتوں کو یہ تحفظ دیا گیا ہے،اس لئے اسے یہ گوارہ نہیں ہے،اور میں یہ مان کر چلتا ہوں کہ 50% طلبہ میں سے بھی کم از کم بیس فیصد طلبہ تو merit میں بھی آجائیں گے،اس طرح ایسے 20% طلبہ کا داخلہ اس طرح،اور پچاس میں سے جو پوزیشن لاسکیں گے،تو اس طرح 70%......ایسی یونیورسیٹی کا قیام کانگریس کو برداشت نہیں،گوارا نہیں،trust deed مانگی تھی تو دونوں سے مانگتے،مجھ کمزور سے کیوں مانگی گئی،لیکن میری قوم نے مجھے اتنے پیسے دےدئے ہیں کہ میں زمین خرید سکتا ہوں،کچھ خود میری اپنی زمین تھی،میرے پاس ایک اچھا خاصا پلاٹ تھا جو فروخت ہوگیا ہے،ان دونوں رقوم کو ملا کر میں نے زمین خریدنا شروع کردیا ہے،میرا دوسوا دوسو کا target ہے،۱۰/روپئے کے stamp پر الحمدللہ......ایکڑ کی زمین کے بیع نامے ہوچکے ہیں،۵۰/ایکڑ کی اس میں شرط ہے،جو بل پاس ہوا ہے اس میں ۵۰/ایکڑ زمین ہونے کی شرط ہے،الحمدللہ میرے پاس اس سے زیادہ ہے،۱۰/لاکھ روپئے endorsment فیس کی ادائیگی بھی شرط ہے،الحمدللہ میرے پاس ۲۵/۳۰/لاکھ رقم بینک میں موجود ہے،یہ شرط میں پورا کرتا ہوں،جس روز بھی گورنر صاحب اس بل پر دستخط کرکے اسے منظوری دےدیں گے،تو یونیورسیٹی کا کام شروع ہوجائے گا،اور''ملا ملائم سنگھ جی'' کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا،اور اگر خدانخواستہ دستخط نہیں بھی ہوئے تو ایک''تصوراتی یونیورسیٹی'' کی تعمیر کا کام انشاء اللہ بہرحال شروع ہوکر رہے گا،میں کالجز کا recognition لوں گا،مختلف faculties کا،انشاءاللہ۔

بہرحال تاریخ میں یہ ریکارڈ رہے گا اور شاید دنیا کے کسی ہاؤس کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود ہو کہ چھ ماہ کے اندر ایک عظیم شخصیت کے نام سے مجھ جیسے کمزور شخص نے یونیورسیٹی کے دو بل پاس کرائے، یہ اپنی جگہ ایک تاریخ ہے اور ریکارڈ ہے، اسے گنیز بک میں درج ہونا چاہیے اور یہ بھی اپنی جگہ ایک ریکارڈ رہے گا کہ ایک مخصوص سیاسی جماعت نے سماج کے ایک مخصوص طبقہ کے تعلیمی مفاد کے لئے قائم کی جا رہی یونیورسیٹی کو گوارہ نہیں کرنا چاہا، اور دونوں بل میں سے کسی بل پر بھی گورنر کے دستخط ہونے میں مانع بنی رہی، کانگریس کا یہ بے بنیاد الزام ہے کہ ملائم سنگھ محض بیوقوف بنا رہے ہیں، مسلمانوں کو یونیورسیٹی کے معاملہ میں، تو ہمارا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ آپ گورنر صاحب سے دستخط کرا دیں اور اگر اس کے بعد یورنیورسیٹی نہیں بنتی ہے تو ملائم سنگھ خود بے نقاب ہو جائیں گے، اور اگر بنا دیا تو تم شرمندہ ہو جاؤ گے، آپ دستخط کر دیں، غیر سرکاری پر بھی کر دیں اور سرکاری پر بھی کر دیں، اگر تمہارا دعوی صحیح ہے تو کیوں نہیں پہنچاتے ملا ملائم سنگھ کو ان کے گھر تک، اور اگر اس کے بعد بھی ہم نے یونیورسیٹی نہیں بنائی تو تمہارا فائدہ ہو جائے گا تم آ جانا ستا میں اور اگر بنا دیا تو تم شرمندہ ہو جاؤ گے۔

(ماہنامہ ''بانگ حراء'' لکھنؤ، جولائی ۲۰۰۵ء)

ہمیں رہزنوں میں سے ہی کسی رہبر کو منتخب کرنا ہوتا ہے!

سابق وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی

محترمہ ڈاکٹر روپ ریکھا ورما سے ایک گفتگو

محترمہ روپ ریکھا ورما محض لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر کی حیثیت سے متعارف نہیں بلکہ مدت دراز سے ایک دنیا انہیں ایک انسانیت پسند اور انسانیت دوست شخصیت کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے، شعبۂ فلسفہ سے وابستہ محترمہ روپ ریکھا ورما نے شروع ہی سے اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھا اور مذہبی تعصب و تنگ نظری کو اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا، نتیجہ میں وہ اس مقام کو پا گئیں جہاں انسان مذہب کی حد بندیوں سے پرے انسانیت کے لئے سوچتا، انسانیت ہی کے لئے جیتا اور اسی کے لئے مرنے کی آرزو رکھتا ہے۔

محترمہ روپ ریکھا ورما نے تدریس جیسے پاکیزہ شغل کو اختیار کیا جو نئی نسل کی فکر کی تعمیر کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے لیکن وہ دانش گاہوں تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے چاہا کہ سماجی سطح پر بھی شعور کی تربیت کا کام اپنی بساط بھر کیا جائے اس مقصد کے تحت انہوں نے ''ناگرک دھرم سماج'' کی بنیاد ڈالی، اس ملک کے بسنے والوں کو جو چیز ایک ہی لڑی میں پروتی ہے وہ ہے شہریت (CITIZENSHIP)، ہمارے ملک میں مختلف مذہب و ملت اور مسلک کے ماننے والے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ

موجود ہیں، اس صورتِ حال میں وطن کی تعمیر کی خاطر جمع ہونے اور دلوں کو جوڑنے کے لئے کوئی قدر مشترک چاہئے اور وہ قدر مشترک شہریت (CITIZENSHIP) ہی ہوسکتی ہے، پھر ایک شہری کے حقوق (RIGHTS) بھی ہوتے ہیں اور فرائض (DUTIES) بھی، اس لحاظ سے ''ناگرک دھرم سماج'' کے پسِ پشت ایک ایسا فکر اور نظریہ ہے جو ہر شہری کو ملک کی تعمیر میں اپنے فرض کو یاد دلاتا ہے۔

اس ملک کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہاں فرقہ پرستی کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں، مذہب کی آڑ میں نفرت کے پرچار کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے لیکن یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے کہ آج بھی اس سرزمین پر ایسی ہستیاں موجود ہیں جن کے دم سے نفرت کی آندھیوں میں محبت کے چراغ روشن ہیں اور جن میں باطل کو للکارنے کی قوت وصلاحیت موجود ہے، رات کی سیاہی میں جگمگاتی اس کہکشاں میں ایک روشن و درخشندہ نام محترمہ روپ ریکھا ورما کا بھی ہے جو ایک معلم و مفکر اور دانش ور ہی نہیں، حق کی سپاہی اور روشنی کی سفیر بھی ہیں۔

لکھنؤ کے اربابِ فکر ونظر سے ان کی حق گوئی و بے باکی اور جرأتِ رندانہ کے متعلق کچھ باتیں سنی تھی، بالمشافہ ان کے افکار ونظریات جاننے اور سننے کا اشتیاق تھا خصوصاً ملت اسلامیہ ہند کے مسائل پر وہ کس رخ سے سوچتی ہیں، ملک کدھر جارہا ہے اور اگر یہی رفتار رہی تو ملک کا کیا بنے گا، طلباء میں بڑھتے ہوئے اضطراب و بے چینی کی وجوہات کیا ہیں، الیکشن سر پر ہے اپنی نوعیت کا نہایت نازک الیکشن! ان جیسے حساس موضوعات پر میں ان کی رائے جاننا چاہتا تھا اس لئے بھی کہ بجا طور پر ان کی رائے اور فکر کو سیکولر اور انصاف پسند دانش ور طبقہ کی نمائندہ فکر سمجھا جاتا ہے۔

میرا پہلا سوال تھا۔''۱۲ ویں لوک سبھا تحلیل کردئے جانے کے بعد جو صورتِ حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس ملک کے سیکولر شہریوں کو نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے باہمی انتشار اور مفاد پرستی کے رویہ سے شدید تکلیف پہنچی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ پارٹیاں بی جے پی کو اقتدار تک پہنچانے کے لئے راہیں ہموار کررہی ہیں، اس صورت میں ہم سیکولر وطن دوست شہری کدھر جائیں اور کیا کریں؟''

محترمہ روپ ریکھا ورما نے جواب میں فرمایا:-''مجھے احساس ہے کہ اس وقت ہم ایک افسوسناک صورتِ حال سے گزر رہے ہیں، ایک طرف بی جے پی کا کمیونل کیرکٹر (COMMUNAL CHARACTER) اور اسکی آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) بالکل واضح ہے، دوسری طرف ہمارے سامنے کوئی ایسی پارٹی نہیں ہے جو سیکولرزم کے تئیں واقعی دیانت دار اور وفادار (LOYAL) ہو، گزشتہ دنوں جو کچھ ہوا اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ سیکولر پارٹیاں وطن کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینے کا حوصلہ اور ارادہ نہیں رکھتیں، ان کے سامنے اپنے ذاتی مفادات ہیں، بس اقتدار کا حصول ہی ان کا مقصد ہے اور اس کے لئے وہ اخلاقیات اور اصولوں کے پابند نہیں ہیں، مرکز (CENTRE) اور یوپی دونوں جگہوں پر بی جے پی اپنی موت آپ مر رہی تھی، ان سیکولر پارٹیوں نے اسے نئی زندگی بخش دی، افسوس کہ ان سیکولر پارٹیوں کے سامنے کوئی واضح فکر اور نقشہ نہیں البتہ کمیونسٹ پارٹیاں اس سطح پر اب تک تو نہیں اتری ہیں، ان کے سامنے کچھ اصول ہیں جن کی پاسداری کی وہ کوشش کرتی ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا حلقۂ اثر چند ریاستوں تک محدود ہے، خود کو سیکولر کہلانے والی پارٹیوں کو اگر واقعتاً سیکولرزم عزیز ہوتا تو اس کی خاطر وہ قربانی (SACRIFICE) سے بھی دریغ نہیں کرتے، کسی ملک کے سیاسی نقشہ اور ڈھانچہ میں کسی تعمیری فکر اور نظریہ (Ideas) کے لئے کوئی جگہ نہ ہو، یہ نہایت صدمہ کی بات ہے۔

گزشتہ دنوں جو کچھ پیش آیا اس نے سیکولر پارٹیوں کے سچ مچ سیکولر ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ سیکولرزم کو باقی رکھنے اور اسے جیون دینے کے لئے وہ کسی قسم کی قربانی

(SACRIFICE) دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس کے بالمقابل جو لوگ فرقہ پرستی (COMMNUNALISM) کے علمبردار ہیں ان میں ایک جذبہ دکھائی دیتا ہے، بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے ایک بھیڑ جمع ہوگئی تھی، منفی جذبہ ہی سہی لیکن ایک جذبہ ہی نے انہیں اکٹھا کر دیا تھا، آر ایس ایس کی کوکھ سے جنم لینے والی بی جے پی اور دوسری فرقہ پرست پارٹیاں اس ملک کو ایک رنگ میں رنگ دینے اور ایک سانچہ میں ڈھال دینے کا نظریہ رکھتی ہیں، اپنے اس مقصد کے لئے مذہب کے نام پر انہوں نے سوسائٹی کو تقسیم (DIVIDE) کرنا شروع کیا، ہندوستانی سماج کی اس تقسیم کا عمل کہاں جا کر رکے گا، سمجھ میں نہیں آتا، اس پر باندھ باندھنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسے جیالوں کی ضرورت ہے جو اس مقصد کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہ کریں، اس لئے کہ مسئلہ بڑا نازک اور سنگین ہے، اس موضوع پر اپنے تاثر میں وہ دکھی لب ولہجہ میں بولتی چلی جا رہی تھیں، میں نے پوچھا کہ پارلیمانی الیکشن ہمارے سر پر ہے، ہمارا موقف کیا ہونا چاہئے، انہوں نے جواب میں کہا: ''ہم ووٹرس کی مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے راستے محدود (LIMITED) ہیں، سیاست میں اخلاقیات (MORAL VALUES) کے زوال کا آپ نے بھی ذکر کیا، ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں رہزنوں میں سے ہی کسی رہبر کو منتخب کرنا ہوتا ہے، جو لیڈر ہیں وہ مافیا ہیں اور جو مافیا ہیں، وہ لیڈر ہیں، کچھ مستثنیات (EXCEPTIONS) ضرور ہیں، اب اس کو بدقسمتی کے سوا کیا کہئے گا، اس صورت میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان میں کم خطرناک کون ہے یا اسے یوں کہئے کہ ان میں جو سب سے زیادہ خطرناک ہے اس کو اقتدار سے دور رکھنے کی صلاحیت کس کے اندر ہے، ووٹ دیتے وقت ہمیں اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے، ظاہر بات ہے کہ یہ اطمینان بخش حل تو نہیں ہے، اس لئے ہمارے سماج کو اس کا متبادل (ALTERNATE) تلاش کرنے کی بھی کوشش کرنا چاہئے۔

مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے لئے بھی یہ ایک نازک مرحلہ ہے اور انہیں نہایت ہوش

مندی اور فراست سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ میں اس سے آگے بڑھ کر کہتی ہوں کہ یہ مسئلہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں ہی کا نہیں سیکولر ذہن رکھنے والے سب ہی لوگوں کا ہے، اس موقع پر ان سب کو متحد ہو جانا چاہئے اور اس طوفان کو روکنے کی بھر پور کوشش کرنا چاہئے، اس سلسلہ کی پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے ووٹ تقسیم نہ ہونے پائیں، ایک اور بات میں بڑے ادب کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ انتخاب کی اس سیاست میں فتوؤں کا بازار نہ گرم ہو، الیکشن کے موقع پر کسی کی حمایت یا مخالفت میں فتوی جاری ہو جانے کا اثر مسلمانوں پر تو دکھائی نہیں پڑتا البتہ فرقہ پرست طاقتیں ضرور اس سے فائدہ اٹھا لیتی ہیں''۔

''آپ کے نزدیک ملک کو کون سے خطرات (CHALLENGES) درپیش ہیں؟

''اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا ''ہم ایک بنیں اور اندرون ملک امن وچین ہو'' یہ اس ملک کے لئے ناگزیر ہے اور افسوس کہ آج اسی بات کو خطرہ درپیش ہے، اسی ایک اصولی بات سے دوسرے چیلنجز (CHALLENGES) جڑے ہوئے ہیں، مثلاً غریبی، بے روزگاری اور جہالت وغیرہ، جس ملک کی سیاست کا دار و مدار ذات پات کے بھید بھاؤ اور دھارمک جذبات کے استحصال (EXPLOITATION) پر ہو اور یہی اصول اقتدار کے حصول کا ذریعہ سمجھا جائے تو پھر اس ملک کا کیا بنے گا؟ ہمارے ملک کو لاحق دوسرا بڑا خطرہ اور مرض کرپشن (CORRUPTION) کا ہے، یہ گھن کی طرح سے ملک کو کھوکھلا کر رہا ہے، چپراسی سے لے کر منسٹر تک سب اس میں ملوث ہیں ''j{kd gh Hk{kd'' کی صورتِ حال ہے، کرپشن کی جڑیں بھی سیاست (POLITICS) سے جا ملتی ہیں''۔

میرا اگلا سوال تھا ''آپ کے خوابوں کا ہندوستان؟'' ''روٹی کپڑا اور مکان ہر شہری کو میسر ہو، انہیں ایسے جائز وسائل اور ذرائع مہیا ہوں جس سے ان کی بنیادی ضرورتیں (BASIC NEEDS) پوری ہو سکیں اور وہ آبرومندانہ زندگی جی سکیں، حالات معتدل (NORMAL) ہوں، امن وچین ہو، ظلم وجبر نہ ہو، تعلیم کا فروغ ہو۔ ایک ایسا ہندوستان جہاں ایک عام شہری بھی ملک کو درپیش مسائل کے بارے میں سوچتا ہو اور اس کی فکر وسوچ

کو بھی COUNT کیا جاتا ہو۔ جہاں مذہب Religion خدا کی بندگی کے لئے ہو، لوگوں کے مابین جنگ و جدال کا باعث نہ ہو، ایسا ہندوستان جہاں آرٹ اور کلچر کے پنپنے کے امکانات روشن ہوں اور جہاں راکششی کارناموں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو ۔ یہ ہے میرے خوابوں کا ہندوستان۔ ایک صحت مند و باوقار ملک!! اور امن کا گہوارہ!!'' محترمہ روپ ریکھا ورما جی سے میری گفتگو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی (PHILOSOPLY DEPT) میں ہو رہی تھی، چند مہینوں پہلے وہ اس یونیورسٹی کی وائس چانسلر کے منصب پر فائز تھیں، تعلیم اور دانش گاہ سے ان کے گہرے اور دیرینہ رشتہ کا حق تھا کہ ان سے پتہ چلایا جاتا کہ طلباء و طالبات میں بڑھتے ہوئے اضطراب و بے چینی کی کیا وجوہات ہیں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ''دیکھئے ہمارے یہاں COMPETITION بڑھ گیا ہے، ہماری سوسائٹی COMPETITIVE SOCIETY ہوگئی ہے، ہمارے زمانہ طالب علمی میں صورت حال یہ تھی کہ اگر کوئی طالب علم محنتی ہے اور پڑھنے میں اچھا ہے تو اسے مستقبل کے لئے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اطمینان رہتا تھا کہ اسے کوئی معقول ملازمت مل ہی جائے گی لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طالب علم پر بیک وقت دسیوں COMPETITIVE EXAMS کی فکر سوار رہتی ہے اور ایسی فکر اس کو تناؤ (TENSION) سے دوچار کر دیتی ہے، اس ذہنی تناؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کام اس کے بس میں ہو سکتا تھا، اس سے بھی وہ محروم ہو جاتا ہے، اس صورتِ حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو بھی اپنے معیار و وقار کا پاس و لحاظ نہیں رہ گیا ہے، تعلیمی اداروں میں سیاست کی دخل اندازی ظاہر ہے کہ مفید ثابت نہیں ہو سکتی، تعلیم گاہوں میں پلنے والے غنڈہ عناصر کو اپنے سیاسی آقاؤں کی پشت پناہی حاصل رہتی ہے، یہ پشت پناہی نہایت مجرمانہ فعل ہے اور خود طلباء کے ساتھ بد دیانتی کے مترادف ہے، مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ڈاکٹر نتیا نند نے مجھ سے بتایا کہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے، لاہور میں واقع یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کے صاحبزادہ کا معاملہ تھا، اس یونیورسٹی میں یہ قانون بنا کہ کوئی

طالب علم کار سے یونیورسٹی نہ آئے، صاحبزادہ نے اس قانون کی خلاف ورزی کی، ان دنوں اس کے والد کسی صوبہ کے گورنر تھے، بہرحال موجودہ وائس چانسلر نے صاحبزادہ پر ۵۰ روپے جرمانہ عائد کر دیا، جب اس واقعہ کی خبر صاحبزادہ کے والد تک پہنچی تو انہوں نے وائس چانسلر سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ میرے لڑکے نے ضابطہ شکنی کی ہے، اس جرم پر ۵۰ روپے فائن کی سزا کافی نہیں ہے، میں پولیس بھیج رہا ہوں جس کی مدد سے آپ اسے گرفتار کریں اور جس سزا کا وہ مستحق ہے وہ سزا اسے ضرور دی جائے، تو اس کا نام ہے کردار اور یہ ہے بچوں سے سچی ہمدردی۔

میدان تعلیم میں انحطاط کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ طبقہ بھی اپنے معیار کو باقی نہیں رکھ سکا ہے جس سے طلباء INSPIRATION حاصل کر سکتے ہیں، طلباء کے آدرش ہوتے ہیں، ان کے والدین اساتذہ، سماجی کارکن اور سیاسی لیڈران! آج کا ایک طالب علم کھلی آنکھوں دیکھتا اور صاف محسوس کرتا ہے کہ ان کے یہ آدرش کن راہوں سے دولت و شہرت و عزت کی منزلیں طے کر رہے ہیں، بچہ کے سامنے ہم لاکھ تقریر کریں کہ فلاں کو آدرش مانو مگر غیر شعوری طور پر وہ متاثر ہوتا ہے، صاحب قوت وحیثیت (POWERFUL) لوگوں سے یہ ایک نفسیاتی بات ہے، اب آپ ہی بتائیں کہ آج جو لوگ صاحب قوت وحیثیت ہیں، وہ کون ہیں اور کس راہ سے اس مقام تک پہنچے ہیں؟ اس لحاظ سے طلباء میں بگاڑ اور ان میں پائی جانے والی بے چینی کا ذمہ دار تو سماج ہی ہوا۔ طلباء اور نوجوان چاہتے ہیں کہ وہ بھی جلد از جلد دولت و شہرت و عزت کی ساری منزلیں طے کر لیں اور اس کے لئے ان کے سامنے ایک نسخہ ہے، سیاست (POLITICS) میں داخل ہو کر دولت بٹورنے، شہرت پانے اور عزت کمانے کا آسان نسخہ!! نوجوانوں میں بڑھتا یہ رجحان نہایت خطرناک ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو، سیاست کے لئے عوام کو کچھ وقت دینا ہوگا، میرا مطلب یہ نہیں کہ عام لوگ الیکشن کے میدان میں کود پڑیں بلکہ یہ ہے کہ وہ سیاست سے متعلق امور پر غور و فکر کریں، موجودہ صورتِ حال کو بدلنے کے لئے انہیں اپنی طاقت وقوت

کا اندازہ اور احساس ہو، وہ اچھے بُرے کی تمیز کر سکیں، ان میں ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ ہو۔ اسے آپ NON-ELECTORAL POLITICS کا نام دے دیں، موجودہ روش کو بدلنے کے لئے عوام میں اس قسم کی سیاسی بیداری لانی ہوگی اور اس طرح ایک PRESSURE بنانا ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہمیں نہایت سنجیدہ ہونا چاہئے ورنہ خدانخواستہ آنے والے دن بہت بُرے دن ہوں گے، آج سماجی سطح پر دکھائی دینے والی یہ بیماری کل گھر گھر میں داخل ہوچکی ہوگی، زندگی اجیرن ہوجائے گی اور ہم میں سے ہر ایک کا بچہ درندگی کا مظاہرہ کررہا ہوگا''۔

محترمہ روپ ریکھا ورما ایک بڑے خطرہ کی نشاندہی کر رہی تھیں، اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ ملک کو ایک اور خطرہ درپیش ہے، ذہن کو مسموم کرنے اور نفرت کے بیج بودینے کا خطرہ!! تاریخ کو کیسری رنگ میں رنگ دینے کی کوششیں!! میں نے اس سلسلہ میں ان کی رائے جاننا چاہی، جواب میں انہوں نے کہا ''اس سلسلہ میں دو طرح کے کام ہورہے ہیں، ایک تو DISTORTION کا کام، تاریخ کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کا کام تاریخ میں درج کسی واقعہ کی تشریح (INTERPRETATION) اس طرح کرنا جس سے ان کے فرقہ واریت کے کاز کو تقویت ملتی ہو اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ہورہا ہے کہ من گھڑت تاریخ لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسے آپ چاہیں تو ''کرشمہ'' کا نام دے دیجئے، مجھے یاد آیا کہ یہاں تاریخ کی کتابوں میں یہ بات شائع ہوئی کہ اس ملک میں آریہ باہر سے نہیں آئے، ہم نے اس کا نوٹس لیا، حقائق پیش کئے، لکھنؤ کی سطح سے اٹھائے جانے والے اس مسئلہ کو خاصا COVERAGE ملا اور آخر کار انسانی وسائل (HUMAN RESOURCES) کے اس وقت کے وزیر ارجن سنگھ نے آدیش جاری کئے کہ نصابی کتابوں سے ایسی چیزیں حذف (DELETE) کی جائیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، تو اس قسم کی کوششوں کے خلاف سیکولر ذہنیت کے لوگوں کو لوہا لینا چاہئے، ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ یا تو مفاد پرست (SELFISH) ہیں یا

فرقہ پرست (COMMUNAL) اس لئے ہمیں خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہئے اور اپنی سطح پر کوشش کے فرض سے غافل نہیں ہونا چاہئے، یہ کام بھی عوامی سطح پر بیداری کا متقاضی ہے''۔

''ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے متعلق آپ کیا سوچتی ہیں؟'' اس سوال پر انہوں نے کہا ''ایک المیہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان مسائل کے ذریعہ سیاست کا بازار گرم کیا جاتا رہا دوسری بات یہ کہ اس ملک میں بسنے والی ہر اقلیت (MINORITY) کو یاد رکھنا چاہئے کہ آج وہ، کل ہماری باری (TURN) ہے، جب بابری مسجد شہید ہوئی تو میں نے کہا تھا کہ عیسائی بھائیوں کو اس مسئلہ سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہئے، کل کوئی مصیبت ان پر بھی آسکتی ہے، گذشتہ دنوں آپ نے دیکھا کہ کس طرح عیسائیوں پر ظلم وزیادتی کی گئی، اس لئے میں پھر کہتی ہوں کہ اقلیتوں کا باہم متحد ہونا نہایت ضروری ہے۔

اپنے مسلمان بھائیوں سے میں خصوصیت کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ وہ عصری تعلیم (MODERN EDUCATION) کو عام کرنے کے لئے جنگی پیمانہ پر مہم چلائیں، اور اپنی نسلوں کو ہمسایہ قوموں سے پچھڑنے نہ دیں، اس کے علاوہ وہ اپنے معاشرہ میں REFORM MOVEMENT چلائیں، معاشرہ میں بگاڑ کی اصلاح کی طرف توجہ دیں شخصیت کے ارتقاء (DEVELOPMENT OF PERSONALITY) میں کسی چیز کو مانع نہ بننے دیں۔

ایک بات اور اقلیتیں سیکولر ذہن رکھنے والے ہندو بھائیوں کو اپنے ساتھ لے کر چلیں، جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ ایک المیہ (TRAGEDY) ہے کہ COMMUNALISM تو آسانی سے FASHION فیشن نہیں بن پاتا، اس سلسلہ میں اپنی کوششوں کو منظّم ومرتب اور تیز تر کرنے کی ضرورت ہے''۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ محترمہ روپ ریکھا ورما جی قومی یکجہتی (NATIONAL

INTEGRATION) کے لئے اس راہ میں ان کے تجربات ومشاہدات جان سکوں، جواب میں انہوں نے کہا ''ہمارے سماج کا ڈھانچہ اور SET-UP بڑا کمزور ہے جس سماج میں اوما بھارتی اور سادھوی رتمبھرا کی زہر میں بجھی ہوئی تقریریں مقبول ہوجاتی ہوں، اس سماج کے SET-UP کو کمزور ہی کہا جائے گا، جس سماج میں بابری مسجد شہید کرنے کے جرم میں کلیان سنگھ اور اس ذہنیت کے لوگ خود کو اپرادھی نہیں بلکہ ہیرو سمجھتے ہوں، اس سماج کے SET-UP کے کمزور ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، پھر اس جرم کی پاداش میں کلیان سنگھ کو SYMBOLIC سزا دی گئی، عدالت ہی کو لیجئے، بابری مسجد کا مسئلہ زیر سماعت ہے، بظاہر تو محسوس ہوتا ہے کہ سالہا سال بیت جائیں گے، اس مقدمہ کے فیصلہ کے انتظار میں شاید ہمارے پوتے بھی اس دنیا سے رخصت ہوجائیں اور انتظار انتظار ہی رہے، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو تو SET-UP کی اس کمزوری کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ ہمارے سماج کا ایک عام آدمی ٹھیک ٹھاک ہے، اس کی ذہنیت زہر آلود نہیں ہے، اس لئے امید بندھتی ہے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، قومی یکجہتی کے سلسلہ میں ہم نے جب بھی کوشش کی تو محسوس ہوا کہ ہماری آواز صدا بصحرا نہیں ثابت ہوئی، لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، اس سلسلہ میں تسلسل کے ساتھ کام کرتے رہنے کی ضرورت ہے اور عوام میں بیداری لانے کی ضرورت ہے''۔

محترمہ روپ ریکھا ورما جی بار بار اس پر متوجہ کررہی تھیں کہ ہمیں اس دیش کی تقدیر کو بدلنے کے لئے عوامی سطح پر بیداری لانا ہوگی، وہ اقتدار کی کرسیوں پر براجمان لیڈران سے زیادہ پُرامید نہیں دکھائی دیتیں، ان کی امیدیں عوام سے وابستہ ہیں، سیاسی انقلاب ہو یا سماجی نوعیت کا انقلاب (REVOLUTION)، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عوام کروٹ نہ لے اور اس کا جمود نہ ٹوٹے، مصلحین (REFORMERS) کی کوششوں پر نگاہ ڈالئے تو وہاں بھی یہ نکتہ دیکھنے کو ملے گا کہ انہوں نے عوامی سطح پر بیداری کے کام کو نہایت ناگزیر سمجھا، فکر کی تعمیر اور شعور کی تربیت کا کام اصل اور بنیادی کام ہے، اس کے بغیر ایک

صحت مند سماج کے قیام کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس پیغام اور فکر میں ایک معلم کی روح کار فرما ہے۔

میں نے اجازت چاہی، محترمہ روپ ریکھا ورما جی نے رخصت کرتے ہوئے کہا ''مجھے افسوس ہے کہ میں اردو زبان سے ناواقف ہوں'' میں نے عرض کیا ''لیکن آپ محبت کی بولی سے تو واقف ہیں!!'' حفیظ میرٹھی نے کہا تھا۔

حفیظؔ اپنی بولی محبت کی بولے
نہ اردو نہ ہندی نہ ہندوستانی

عوامی سطح پر بیداری کا کام کرنے والوں کے لئے کتنی ناگزیر اور کس قدر کارگر و مؤثر ہے محبت کی یہ بولی!

شعبۂ فلاسفی سے میں باہر آیا تو سہ پہر کا وقت تھا، ماہ مئی کی چلچلاتی دھوپ!! میرے قدم تھوڑی دیر کے لئے رک گئے، مجھے محسوس ہُوا کہ یونیورسٹی کیمپس کے سایہ دار درخت زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار شجر سایہ دار راہ میں ہیں

میں ان کی چھاؤں میں چل رہا تھا، بے ساختہ مجھے ساغر کا شعر یاد آگیا۔

ایک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسایہ کے آنگن میں بھی سایہ جائے

محترمہ روپ ریکھا ورما جی اور ان جیسے انسانیت دوست شخصیتوں کے پیغام کی روح بھی تو یہی ہے!!

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ: جون ۱۹۹۹ء)

ظلم واستحصال کے خلاف ہم سب متحد ہوں!!

ہندی کے معروف ادیب، افسانہ نگار، نقاد اور دانشور

جناب مدرارا کھشس سے ایک ملاقات

ہندی دنیا جناب مدرارا کھشس کے نام اور کام دونوں سے خوب واقف ہے، چالیس سے زائد کتابوں کا یہ مصنف ہندی ادب میں ایک کہانی کار، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہے، لکھنؤ یونیورسٹی سے فلسفہ میں سند یافتہ مدرارا کھشس جی کے ذہن کے دریچے کھلے ہوئے ہیں، چنانچہ وہ روشنی کو نہ صرف قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ظلمتوں سے لوہا لینے کا حوصلہ بھی ان کے اندر موجود ہے، جرنلزم اور میڈیا سے بھی ان کا رشتہ بہت گہرا ہے، اس راہ سے بھی حق کی لڑائی لڑنے کے ان کے جذبہ کو بڑی تسکین ملی اور ظلم واستحصال کے خلاف آواز بلند کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکے، ان کی یہ روش ان کے دادا، والد اور چچا کی ذہنیت اور ان کے طرز عمل سے یکسر مختلف ہے، وہ لوگ اس ذہنیت کے حامل تھے جو آج کل کی ہندوتو کے نام لیواؤں کی ذہنیت ہے، ان کے دادا ہندی کے معروف قلم کار تھے جن کے قلم سے ایک کتاب ''اسلام کا کلپ ورکھش'' بھی سامنے آئی تھی، جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں پر سخت حملے کئے تھے اور جس کو پڑھ کر پریم چند جی نے ان سے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا، دادا نے مدرارا کھشس جی کو اس ارمان کے ساتھ سنسکرت پڑھائی تھی کہ وہ بھی

ان ہی کی طرح مسلم مخالف مہم کے علمبردار ثابت ہوں گے۔ مگر قدرت نے مدرارا کھشس جی کی طبیعت میں انصاف پسندی رکھی تھی، ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہیں، چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں مظلوم کی دادرسی ہی نہیں کرتے بلکہ ظالم کی بیخ کنی کی بات بھی کرتے ہیں۔

گزشتہ چند مہینوں سے آزاد ہندوستان میں پہلی مرتبہ جارحیت پسند ہندوؤں نے عیسائیوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، ان فسطائی قوتوں کا عیسائیوں پر الزام یہ ہے کہ وہ دلتوں اور آدی واسیوں کو زبردستی عیسائی بنا رہے ہیں، اور اس کے لئے لالچ کا حربہ بھی استعمال کر رہے ہیں چنانچہ بائبل اور گرجا گھر ہی ان جارحیت پسند قوتوں کے غیظ وغضب کا نشانہ نہیں بنے بلکہ راہبائیں اور مبلغ بھی ان کی سفاکی اور درندگی کا شکار ہوئے، راہباؤں کی عصمت دری اور آسٹریلوی عیسائی مبلغ اور اس کے دو بچوں کو زندہ جلا دینے کے واقعات نے انسانیت کو لرزہ براندام کر دیا، تبدیلئ مذہب کا موضوع چھڑ گیا، ہمارے وزیر اعظم اٹل جی نے تبدیلئ مذہب پر مباحثہ کی بات کہی چنانچہ یہ موقع تھا کہ بات سے بات چلتی اور تبدیلی مذاہب کی وجوہات اور اس کے عوامل ومحرکات پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کیا جاتا۔

اسی غرض سے راقم الحروف نے مدرارا کھشس جی سے ملاقات کی تاکہ ایک ایسی شخصیت سے براہ راست تبدیلئ مذہب کی حقیقت اور اس کی وجوہات معلوم کی جائیں جس نے بالاستیعاب وید اور شاستر کو بھی پڑھا ہے اور جو بنظر غائر مدت سے اس سماج کا مطالعہ بھی کر رہا ہے۔

چنانچہ ان سے میرا پہلا سوال تھا ''مدرارا کھشس جی! ان دنوں تبدیلئ مذہب کا مسئلہ موضوع بحث ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟''

جواب میں موصوف یوں گویا ہوئے کہ دیکھئے، یہ بے بات کی ایک بات ہے یہ بات صاف طور پر کہی جانی چاہئے کہ جولوگ مذہب تبدیل کررہے ہیں وہ ہندو نہیں ہیں، ہندو بھی عملاً انہیں ہندو تسلیم نہیں کرتے، کوئی برہمن بنیا یا ٹھاکر اپنا مذہب تبدیل نہیں کررہا ہے، تبدیل کرنے والے وہ ہیں جنہیں آپ دلت، پچھڑے طبقے اور آدی واسی کہتے ہیں اور یہ سب لوگ ہندو نہیں ہیں، کسی بھی شاستر نے انہیں ہندو تسلیم نہیں کیا ہے، خود ہندوؤں کا طرز عمل بھی ان کے ساتھ یہ ہے کہ انہیں یگیہ کی اجازت نہیں، جنیئو پہننے کی وہ جسارت نہیں کرسکتے، ان کی مجال نہیں کہ وہ مندر میں چلے جائیں، اپنے کنویں سے انہیں پانی لینے یا پینے کی اجازت نہیں، تو پھر کس بنیاد پر اور کس منہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ ہندو ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ فسطائی قوتوں کا الزام ہے کہ عیسائی زور زبردستی سے بھی اور لالچ دے کر بھی دلتوں کو عیسائی بنارہے ہیں، آپ کے نزدیک یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟

مدرا راکھشس جی نے کہا کہ یہ دونوں الزامات بھی سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں، زور زبردستی سے کسی مذہب کو اختیار کرنے سے روکا تو نہیں جاسکتا ہے، لیکن اس کے ذریعہ کسی مذہب کو قبول نہیں کروایا جاسکتا، مذہب کی قبولیت کا معاملہ انسانی دل ودماغ سے ہے، یہ فیصلہ دل ودماغ کرتے ہیں، اس قسم کے فیصلہ کو کسی پر تھوپا نہیں جاسکتا، اس لئے تبدیلی مذہب کے لئے زور زبردستی کئے جانے کا الزام ایک بچکانہ بات ہے، ہاں کردار کی قوت سے ایک شخص دوسرے شخص کو متاثر کرسکتا ہے، ایک شخص مظلوم کی دادرسی کرے، اس کے دکھ درد میں شریک ہو، اس کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کرے اور اس کا نظم کرے، اس کی عزت نفس کا خیال رکھے، اسے آبرومندانہ زندگی گزارنے کی راہ سجھائے تو ان باتوں کو ''لالچ'' کا نام دینا کہاں کا انصاف ہے، کلفت اور ذلت کی زندگی سے چھٹکارہ دلاکر راحت وعزت کی طرف لانے کے کام کو لالچ کا نام دینا بڑے ظلم کی بات ہے۔

آسٹریلوی مبلغ کا حال آپ نے پڑھا ہوگا، اس کا قصور کیا تھا؟ وہ دلت کوڑھیوں کی خدمت کرتا تھا! ایک دلت جس کے سایہ سے ہندو نفرت کریں اور اگر وہ کوڑھ میں مبتلا

ہوجائے تو پھر ستم بالائے ستم، لیکن ایک مبلغ اگر اس کے زخموں پر مرہم رکھے اور اس کے نتیجہ میں اس کے دل میں مبلغ کی عظمت اور مبلغ کے مذہب کی عظمت پیدا ہوتی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

زور زبردستی اور لالچ کا الزام عائد کرنے والوں کو ان حقائق پر غور کرنا چاہئے آخر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ خبر آتی ہو کہ انسانوں کی ایک تعداد ہندو مت میں داخل ہوگئی؟

بات شودروں کی چلی تو میں نے عرض کیا ''مدرا راکھشس جی! ہندو سماج کی چار طبقوں میں تقسیم کی حقیقت کیا ہے؟''

جواب میں موصوف نے فرمایا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ بیرون سے ہندوستان میں آریہ آئے اور انہوں نے اپنے سماج کو چار طبقوں میں بانٹ دیا، برہمن، کھتری، ویش اور شودر، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے اس لئے کہ شودر ان کے طبقے کا حصہ نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے تین طبقات تو بنائے یعنی برہمن، کھتری اور ویش۔ شاستر میں ان تینوں کے حقوق کا تذکرہ ہے، ان تینوں طبقات کے علاوہ کو شاستر نے شودر قرار دیا اور ان کو ان حقوق کا مجاز ہرگز ہرگز نہیں مانا گیا جو حقوق برہمن، کھتری اور ویش کو حاصل ہیں جو کام ہوا وہ یہ تھا کہ ظلم و استحصال کو روا رکھنے والی اس جماعت نے اس طبقے کو اپنا غلام بنالیا جس کو اس ملک میں اکثریت حاصل تھی، ایسا دھارمک آدھار پر کیا گیا، آج دلت اور آدی واسی صدیوں کی اس غلامی سے اگر نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس پر اس قدر واویلا کیوں مچایا جارہا ہے''۔

اس پر میں نے پوچھا کہ کیا ماضی قریب میں بھی کچھ ایسی کوششیں ہوئیں جن سے پانچ ہزار سال سے چلی آرہی غلامی کے اس سلسلہ کو تقویت ملی ہو؟ مدرا راکھشس جی نے فرمایا کہ ہاں! ایسی نہایت منصوبہ بند کوشش ہوئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری رائے سے اتفاق کرسکیں گے بھی یا نہیں لیکن یہ ایک صداقت اور حقیقت ہے جسے نہ تو جھٹلایا جاسکتا ہے اور نہ فراموش کیا جاسکتا ہے۔ غلامی کی ان جڑوں کو مضبوط کرنے والی شخصیت کا نام ہے موہن داس کرم چند گاندھی! آپ چونکئے نہیں، میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ اسی ۳۰/جنوری کو

ہمارے پردھان منتری اٹل بہاری واجپائی نے اپواس رکھا اور گاندھی جی کو خراج پیش کیا، سنگھ پریوار کے جلسوں میں بھی آپ کو ان دنوں گاندھی جی کی قد آدم اور نمایاں تصویر دکھائی دے گی، اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے، اس پر غور کیا آپ نے؟ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے پچاس برسوں کے بعد سنگھ پریوار پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ گاندھی جی ہمارے بہت بڑے محسن ہیں، اگر ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے ایماء واصرار پر پونا پیکٹ نہ ہوا ہوتا تو آج اس ملک میں ہندو اقلیت میں ہوتے، اس ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا، پونا پیکٹ (POONA PACT) کیا ہے؟ نصاب کی تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا تا کہ نسلیں جان نہ سکیں کہ کس کمال ہوشیاری سے گاندھی جی نے اس ملک کی اکثریت کو ایک اقلیت کا غلام بنا دیا، ۱۹۳۰ء کی بات ہے جب یہ طے ہوا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی قوم اپنا اپنا نمائندہ منتخب کرے، (SEPERATE ELECTORAL) کی بات تھی، اس کارروائی کو COMMUNAL AWARD کا نام دیا گیا تھا جس کے تحت دلتوں کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا استحقاق حاصل تھا لیکن گاندھی جی نے بھوک ہڑتال کی اور کہا کہ دلتوں کو ہندوؤں سے ہٹ کر کوئی علاحدہ قوم نہ سمجھا جائے، ان کی بھوک ہڑتال پر ملک کے لیڈران بڑے فکرمند ہوئے اور انہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کو راضی کیا کہ وہ گاندھی جی کے منشاء کو تسلیم کرلیں، اس طرح گاندھی جی نے اپنی جان کی بازی لگا دی اور آدی واسیوں، دلتوں اور پس ماندہ طبقہ کو بھی ہندو شمار کروا دیا، اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر (POONA PACT) نہ ہوا ہوتا تو آج اس ملک میں ہندوؤں کی تعداد صرف ۱۲ کروڑ شمار ہوتی اور وہ اقلیت میں ہوتے''۔

دلتوں (SEPERATE ELECTORAL) کے ذریعہ عزت نفس کو پانے اور بچانے کی جو کوشش کی تھی، افسوس کہ گاندھی جی نے اس پر پانی پھیر دیا اور نتیجہ میں آج ''ایک جھوٹی اکثریت'' کے بل بوتے پر اس ملک کے اقتدار پر یہ لوگ قابض ہیں، ظلم ان کے یہاں جرم نہیں ہے، دوسرے مذہب کے لوگوں کو زندہ جلانے میں انہیں کوئی تامل نہیں، آسٹریلوی مبلغ اور اس

کے بچوں کے ساتھ یہ حرکت ہوئی، ۱۹۸۴ء میں میری آنکھوں نے سکھوں کو زندہ جلتے دیکھا ہے، اس زمانے میں یہ کام کانگریسی کر رہے تھے، کانگریس ہو یا بی جے پی، دونوں اس نکتہ پر متفق ہیں کہ ۱۲-۱۳ کروڑ اونچی ذات کے ہندوؤں کی بالادستی رہے اور بس!

میں نے پوچھا کہ آخر اس صورت حال کو بدلنے کے لئے کیا کیا جانا چاہئے؟ جواب میں موصوف نے کہا ''ہماری مشکل یہ ہے کہ اس بات کو نہ ملائم سنگھ سمجھتے ہیں، نہ لالو یادو، بی ایس پی کی مشکل یہ ہے کہ اس کے پیش نظر بس اقتدار ہے، اس نے بنیادی لڑائی لڑی ہی نہیں اور شاید وہ لڑنا بھی نہیں چاہتی، ان سب کے پیش نظر اصل مسئلہ یہ ہونا چاہئے کہ پونا پیکٹ سے پیدا شدہ صورتحال کو کیسے بدل دیا جائے، یہ بڑی نادانی کی بات ہے کہ دلتوں اور آدی واسیوں کے لئے ریزرو سیٹوں (RESERVE SEATS) کو اس طبقہ کی نمائندگی باور کیا جائے، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان نام نہاد ریزرو نشستوں سے زیادہ تر بی جے پی کے نمائندے کامیاب ہوئے ہیں۔ آخر ووٹ دینے اور دلانے کی طاقت برہمن وٹھاکر ہی کے پاس تو ہے! اس حقیقت سے ہم صرف نظر کیوں کرتے ہیں؟

لیکن ہاں! ایک بات امید افزا ضرور ہے، پونا پیکٹ (POONA PACT) کی میعاد ۱۹۹۹ء میں ختم ہو رہی ہے، اس وقت انگڑائی لی جاسکتی ہے، وہ لوگ جو سچ مچ اس ملک کی اکثریت ہیں، اگر جاگ جائیں اور پونا پیکٹ سے پیدا شدہ صورتحال کو کالعدم قرار دیدیا جائے تو اس ملک میں ایک انقلاب رونما ہوسکتا ہے، دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقہ پر مشتمل قوم ۱۲-۱۳ کروڑ پر مشتمل اقلیت کی غلامی سے نجات پاسکتی ہے، لیکن نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور منصوبہ بند طریقہ سے ہم سب کو مل کر یہ لڑائی لڑنا ہوگی۔

میرا اگلا سوال تھا ''مدرا جی! عیسائیوں پر جارحانہ حملوں کے پس پشت کون سی نفسیات کارفرما ہے'' مدرا جی نے جواب دیا ''دلت اور آدی واسی ہمارے جال سے نکلنے نہ پائیں، یہ کولھو کے بیل کی طرح ہمارا حکم بجالائیں اور جو کوئی بھی انہیں اس کولھو سے نجات دلانا چاہے ان پر دھاوا بول دیا جائے، یہ ہے ان کی ذہنیت اور نفسیات، ایک بات احساس برتری کی بھی ہے اور

احساس برتری دراصل احساس کمتری ہی تو ہے، وہ اپنے مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلے میں ارفع واعلی سمجھتے ہیں لیکن ثابت نہیں کرپاتے چنانچہ زورزبردستی پراتر آتے ہیں، دنیا میں شاید ہندو دراصل ایک ایسی واحد جماعت ہے جس کے سامنے کوئی متعین اور واضح اصول نہیں ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم ہے لیکن ہندوؤں کے پاس واضح احکامات پرمشتمل کوئی ایسی کتاب نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ ہمارے پاس وید ہیں لیکن وید تضادات سے پر ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود ہندوؤں میں وید کو احترام اور عقیدت کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں قرآن اور بائبل کو حاصل ہے۔

تو میں عرض کررہا تھا کہ دو ہزار سال پہلے جو مذہبی کتابیں ہندوؤں کی لکھی گئیں ان میں تضادات بہت ہیں مثلاً ایک کتاب میں درج ہے کہ پتی کے مرجانے کے بعد بیوی کو ستی ہوجانا چاہئے، جب کہ دوسری کتاب میں ستی ہونے کی مذمت کی گئی ہے۔ ایک کتاب میں ہے کہ مردہ کو جلادیا جائے، لیکن یہ حکم بھی مطلق نہیں ہے، کہا گیا کہ بوڑھا یا بچہ ہو تو دفنا دیا جائے۔

آپ نے اس قوم کی نفسیات کے متعلق پوچھا تو ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ یہ اصطلاحات کے سلسلے میں بھی دوسری قوموں کی نقل کرنے میں چوکتے نہیں، مثلاً بابری مسجد کو ڈھا دینے کے موقع پر انہوں نے کارسیوا کی اصطلاح استعمال کی، کارسیوا کا لفظ تو کسی گرنتھ میں نہیں ہے، یہ تو سکھوں کی اصطلاح ہے، ۱۹۸۴ء میں سکھوں کی طرف سے اپنی اس اصطلاح کا تذکرہ سامنے آیا تھا، اسی طرح مسلمان جمعہ کی نماز کے لئے بڑی تعداد میں مسجد میں جمع ہوتے ہیں، انہوں نے بھی جمع ہونا چاہا اور اسے ''بڑی آرتی'' کا نام دے دیا ''بڑی آرتی'' کی اصطلاح کسی گرنتھ میں نہیں ہے، ایک مثال اور لیجئے، سکھ کرپان رکھتے ہیں، انہوں نے بھی ترشول رکھنا شروع کردیا ہے، مندروں کا مسئلہ لیجئے، چرچ کی تعمیر سے پہلے مندروں کی تعمیر ثابت نہیں ہے، دو ہزار سال پہلے کیرل میں چرچ تعمیر ہوئے، اس کی نقل میں ہندوؤں نے مندر تعمیر کئے، چنانچہ مندروں کی تعمیر کی تاریخ بس بارہ سو اور آٹھ سو برس پرانی تاریخ ہے، عیسائی کرسمس میں یسوع مسیح کی جھانکیاں بناتے ہیں، انہوں نے بھی

کشن کی جھانکیاں بنانا شروع کردیں۔

تو ان کی ایک نفسیات نقالی کی بھی ہے، اس کے علاوہ احساس کمتری اور اس کے ساتھ اپنی بالادستی کو برقرار رکھنے کی خواہش! تو اس قسم کی ذہنیت اور نفسیات اپنے منصوبوں کو روبہ عمل دیکھنے کے لئے تشدد پر بھی اتر آتی ہے، جس کی مثالیں اس ملک میں آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔

میرا اگلا سوال تھا کیا ماضی قریب میں کوئی ایسی شخصیت بھی گزری ہے جس نے اس ذہنیت اور نفسیات کے خلاف آواز بلند کی ہو؟

مدراجی نے فرمایا کہ ہاں، اس شخصیت کا نام پیریار ہے، انہوں نے علی الاعلان اس ظلم واستحصال کے اور مورتی پوجا کے خلاف بھی آواز اٹھائی، مدراس اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں یہ صورت حال ہوئی کہ ان لوگوں نے پیریار کی منت سماجت کی، البتہ ہندو مت سے ان کا ردعمل اس قدر شدید تھا کہ انہوں نے تمام مذاہب ہی کو مسترد کردینا چاہا، اگر پیریار میں یہ شدت نہ ہوتی اور وہ اعتدال اور حقیقت پسندی سے کام لیتے تو آج ان کی کوششوں کے مثبت نتائج سامنے آتے''۔

میرا آخری سوال تھا ''ماہنامہ بانگ درا کے ذریعہ آپ کا پیغام؟'' ''ظلم واستحصال کے خلاف ہم سب متحد ہوں اور اس سے نجات پانے کے لئے لائحہ عمل تیار کریں، یہی میرا پیغام ہے'' میں نے پوچھا کہ اس سلسلہ میں وہ کس حد تک پرامید ہیں تو انہوں نے پراعتماد لب ولہجہ میں انہوں نے جواب دیا کہ مجھے یقین ہے کہ ظلمتوں کے بعد سحر نمودار ہوکر رہے گی!! میں نے مدراجی کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک دکھائی دی، ایسی چمک جو حقائق سے نہ صرف نظریں نہیں چراتی بلکہ مظلوم کو ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے!!

میں مدراراکھشس جی سے اجازت لے کر باہر نکلا تو میرے قدم ہی نہیں، من بھی بوجھل تھا، مجھے جنگ احد کا وہ واقعہ یاد آگیا جب سرکار دوعالم ﷺ کے متعین کردہ محاذ سے ہٹ جانے کے نتیجہ میں فتح، شکست سے بدل گئی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ ٹھیک اسی طرح یہ امتِ دعوت بھی

اپنے منصب و مقام اور اللہ و رسول کے متعین کردہ محاذ سے ہٹ گئی ہے اور نتیجہ میں عزت و سربلندی کے بجائے ذلت وخواری کو اس نے گلے لگالیا ہے، ورنہ جس ملک میں ذات پات، چھوت چھات اور طبقاتی نظام کی کش مکش کا سلسلہ سو دوسو برس سے نہیں، ہزاروں برس سے قائم ہوا اُس ملک میں دعوت کے کس قدر کھلے امکانات ہیں!!! پھر مجھے سیرت نبوی ﷺ سے وہ واقعہ بھی یاد آ گیا جب پہلی وحی کے نزول کے موقع پر آپؐ سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے تسلی آمیز کلمات کہے تھے اور عام انسانوں سے آپؐ کی ہمدردی وغم گساری کا اور خدمت خلق کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرمایا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ اس امت نے محسن انسانیتؐ کے خدمت خلق کے اس درس کو بھی شاید بھلا دیا ہے، جبکہ عیسائی مشنریاں اس حکمت کو اپنا کر دلوں کو جیتنے کا کام کر رہی ہیں!!! مسلمانوں میں بڑھتے ہوئے برادری کے رجحان کا بھی مجھے خیال آیا، سلمانی برادری، انصاری برادری اور دوسری کئی ایک برادریاں، احساس کمتری اور احساس برتری کا شکار برادریاں! 'تعارف' کی حدتک تو اس کی گنجائش ہے لیکن اس میں وہ شدت وعصبیت نہ آئے کہ جو 'تعارض' کی شکل اختیار کرلے ورنہ اسلامی اخوت ومساوات کا تذکرہ کتابوں میں پڑھنے کو تو ملے گا مگر سماج میں اس عملی نمونہ کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس جائیں گی!!! پھر مجھے ظلم واستحصال کا بھی خیال آیا، ظلم سے ٹکر وہی لے سکتا ہے جو اپنے اختیار اور اپنے دائرہ کار میں خود ظلم کو روا نہ سمجھتا ہو جب کہ خود ہماری اپنی صفوں کا بھی حال یہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے اور اسے عین حق سمجھ رہی ہے!!! مجھے خیال آیا کہ جس طرح اٹل جی سے یہ بات کہنے کی ہے کہ تبدیلیٔ مذہب پر مباحثہ چھیڑنے کے بجائے ''طبقاتی نظام میں اصلاح'' پر بحث چھیڑی جائے، ٹھیک اسی طرح ''اپنوں'' سے بھی یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ طبقاتی نظام اور ظلم واستحصال کے اس ماحول میں دعوت کے کھلے امکانات کے باوجود آپ کو دوسروں سے محض ''عداوت'' ہی کا شکوہ کیوں ہے!!! ہے کوئی جو اس مسیحا کے مرض کی فکر کرے!!!

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ: مارچ ۱۹۹۹ء)

اس ملک پر

مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہندوؤں کا!

معروف گاندھیائی رہنما، مجاہد آزادی اور بابری مسجد کی حفاظت اور تعمیر نو کے داعی

جناب اکشے برہمچاری جی سے ایک ملاقات

بابری مسجد کی شہادت کا زخم ایسا زخم ہے جو مندمل نہیں ہوتا، مسلمانوں نے نہ صرف اسے یاد رکھا ہے بلکہ ان کی خواہش ہے کہ ان کے بعد ان کی نسلیں بھی اسے یاد رکھیں، یہاں کے مسلمانوں کی بھی اور اس ملک کی بھی خوش قسمتی ہے کہ اس احساس درد وکرب میں مسلمان تنہا نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم سیکولر محبانِ وطن بھی حق وانصاف کی لڑائی میں ان کے شانہ بشانہ ہیں، ان میں ایک ممتاز نام معروف گاندھیائی رہنما اور مجاہد آزادی جناب اکشے برہمچاری جی کا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا بےجا نہیں کہ وہ بابری مسجد قضیہ کے سلسلہ میں صرف مسلمانوں کے شانہ بشانہ نہیں رہے بلکہ حق وانصاف کے لئے لڑی جانے والی اس لڑائی کی انہوں نے قیادت بھی سنبھالی، ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے میں انہوں نے جو پہل کی وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ہے، اس محاذ پر وہ برابر ڈٹے رہے اور آج بھی ان کی خواہش ہے کہ اُسی جگہ بابری مسجد تعمیر ہونے کی کوئی صورت ضرور پیدا ہو، کورٹ میں چل رہے مقدمہ کو وہ بابری مسجد کے مسئلہ کا حل نہیں مانتے، ۱۹۴۹ء میں جب بابری مسجد میں رات کے اندھیرے میں مورتیاں رکھ دی گئیں تو

یہ اکشے برہمچاری جی ہی تھے جنہوں نے مورتیوں کو بابری مسجد سے ہٹانے کا مطالبہ لے کر برت رکھا، اس وقت کے وزیر داخلہ جناب لال بہادر شاستری کی یقین دہانی پر انہوں نے برت توڑ تو دیا لیکن بابری مسجد کی بازیابی کے سلسلہ میں وہ برابر فکر مند رہے، وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو صلاح ومشورہ بھی دیتے رہے، ہندو بھائیوں سے مذاکرات بھی کرتے رہے، ان کی ان تمام تر کوششوں کا مقصد صرف یہ رہا کہ وطن اور اہل وطن کو یہ باور کرادیا جائے کہ بابری مسجد، مسجد تھی، مسجد ہے اور مسجد رہے گی، بابری مسجد کی شہادت کے بعد حق کے اس سپہ سالار پر جو کچھ بیتی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن وہ آج بھی مایوس نہیں دکھائی دیتے، ان کا نعرہ ہے ''سوگندھ رام کی کھاتے ہیں، مسجد وہیں بنائیں گے''۔

س:- تبدیلئ مذہب کا موضوع بھی گذشتہ دنوں زیر بحث رہا، وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی اس تجویز سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کہ تبدیلئ مذہب پر مباحثہ ہونا چاہئے، آزاد ہندوستان میں حال میں عیسائیوں پر ہونے والے مظالم پر آپ کا ردعمل؟

ج:- حال میں ہندوستان میں عیسائیوں پر ہونے والے مظالم کی ہم مذمت کرتے ہیں، ہمارے ملک کے دستور کی دفعات ۲۵ تا ۳۰ میں مذہبی اقلیتوں کو ان کے حقوق دئے جانے کی بات کہی گئی ہے، تمام مذہبی اقلیتوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ، ہم اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر جیسے مذہبی حقوق کی اجازت دی گئی ہے، ان بنیادوں پر کسی مذہبی اقلیت کو مظالم کا نشانہ بنانا دستور کے منافی ہے، چنانچہ فرقہ پرست عناصر کی جانب سے عیسائیوں پر جو حملے ہو رہے ہیں، اس کی ہر طرف سے مذمت کی گئی ہے اور ہم نے بھی مذمت کی، ظلم کو ظلم کہنا ہمارے مذہب کی روح کے عین مطابق ہے، البتہ ہم اپنے عیسائی بھائیوں سے بھی اس کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ موقع پڑنے پر وہ بھی ہمارے معاملے میں حق و انصاف کی آواز بلند کریں۔

تبدیلئ مذہب کے سلسلے میں جس جبر اور لالچ کی بات کہی جاتی ہے تو یہ بات اس لحاظ سے مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان آٹھ سو برس یہاں برسر اقتدار رہے، اگر جبر و لالچ سے کام لینے کو وہ درست سمجھتے تو اس ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، یہی صورت حال مغلیہ دور حکومت کے بعد عیسائیوں کے ساتھ تھی۔

البتہ راجستھان میں آج سے سات آٹھ برس پہلے دھرم پریورتن کے نام سے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ آخر کیا تھا؟ کہا جارہا تھا کہ یہ لوگ اپنے سابقہ مذہب یعنی ہندو مذہب میں لَوٹ رہے ہیں، اس کی میڈیا کے ذریعہ باقاعدہ تشہیر ہو رہی تھی، تقریبات دکھائی جارہی تھیں، کیا اسے تبدیلئ مذہب کا نام نہیں دیا جائے گا؟

یہ تو ہمارے ملک کے سیکولر کیریکٹر (SECULAR CHARACTER) کی بات ہے کہ اس ملک میں مختلف مذہب کے لوگ رہتے ہیں اور رہیں گے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق مذہب اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حق ہے، چنانچہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کی اس تجویز کی کہ تبدیلئ مذہب پر مباحثہ ہونا چاہئے، سب ہی نے مخالفت کی۔

''قسم خدا کی کھاتے ہیں، مسجد وہیں بنائیں گے'' لکھنؤ میں چنہٹ کے مقام پر مٹیاری روڈ پر واقع ستیہ آشرم میں مقیم جناب اکشے برہمچاری جی کے ملاقات کے کمرہ میں بابری مسجد کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں ہے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ امید و یاس کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ میری یہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے بابری مسجد کو اُسی جگہ پر تعمیر ہوتا دیکھنا چاہتی ہیں۔

جناب اکشے برہمچاری جی یادگار زمانہ لوگوں میں سے ہیں، اب وہ ان بچی کھچی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے گاندھی جی سے تربیت حاصل کی، جنہوں نے گاندھی جی کے افکار سے اپنی فکروں کے چراغ روشن کئے اور آج کی تیز وتند ہواؤں میں بھی وہ اپنے چراغ کو جلائے ہوئے ہیں، حق بات کہنے کے لئے اخلاقی جرأت چاہئے اور اخلاقی جرأت کو تروتازہ اور جوان رکھنے کے لئے فکری غذا کی ضرورت پیش آتی ہے، برہمچاری جی کو یہ غذا اپنی مذہبی کتابوں اور

گاندھی جی کی تعلیمات سے ملتی ہے، وہ ایک نہایت مذہبی انسان ہیں۔

بدقسمتی سے ان دنوں ہندوستان میں فسطائیت کو عروج حاصل ہوگیا ہے، فرقہ واریت کا عفریت اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ان قدروں کو پامال کردینے کے درپے ہے جو سیکولر قدریں کہلاتی ہیں، ہندوتوا کے نام پر ایک مخصوص فرقہ کے نظریات اس ملک کے باسیوں پر تھوپی جانے کی منصوبہ بند کوششیں ہورہی ہیں، وطن کی یہ صورت حال ایک عام محبّ وطن کے لئے بھی تشویشناک ہے، جناب اکشے برہمچاری جی تو مجاہد آزادی ہیں! وطن کی آزادی کے لئے انہوں نے قربانی دی ہے، صعوبتیں اٹھائی ہیں پھر ملک کی اس تصویر کو دیکھ کر ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی!!!

ان کی اس کیفیت کو جاننے کے لئے ان سے ملاقات کی میری دیرینہ خواہش تھی، چنانچہ گزشتہ دنوں جب یوپی میں اسکولوں میں سرسوتی وندنا اور وندے ماترم پڑھنے کو لازمی قرار دئے جانے کا شوشہ چھوڑا گیا تو میں نے چاہا کہ وندے ماترم کی حقیقت براہ راست اس مجاہد آزادی سے پوچھی جائے جو اُن دنوں ''قومی نعرہ وندے ماترم'' کہہ کر جیل چلے جاتے تھے، چنانچہ اکشے برہمچاری جی سے میرا پہلا سوال وندے ماترم ہی سے متعلق تھا۔

محسوس ہوا کہ سوال سن کر جیسے وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئے ہوں، وہ یادیں جوان کا شاید سرمایہ اور حاصل ہے، انہوں نے مہاتما گاندھی، نہرو جی، مولانا آزاد، مولانا مدنی اور رفیع احمد قدوائی کو یاد کیا، کیا دن تھے وہ، موصوف نے فرمایا ''قومی ترانہ وندے ماترم'' ہمارے سلوگن (Slogan) کے الفاظ تھے، یہ ہمیں حوصلہ دیتے تھے، ان کو ادا کرتے ہوئے ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے جاتے تھے، لیکن آج سنگھ پریوار کے جو لوگ وندے ماترم سے اپنی محبت ودلچسپی کا اظہار کررہے ہیں، وہ میری سمجھ سے باہر ہے، ایسا میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب ہم آزادی کی آخری لڑائی لڑ رہے تھے تو اُن دنوں جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکرجی انگریزوں کی ''وائسرائے کونسل'' کے ممبر تھے، ہم تو وندے ماترم کہہ کر جیل کی سختیاں جھیل رہے تھے اور وہ اقتدار کا لطف لے رہے تھے'' انہوں نے مزید کہا ''وندے

ماترم کے سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مجاہدین آزادی کو اس کے صرف شروع کے حصہ (Portion) سے سروکار تھا اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کانگریس نے نہایت سوچ سمجھ کر وندے ماترم کو اپنے قومی ترانوں میں شامل نہیں کیا، میں آر ایس ایس والوں سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۲۵ء سے تمہاری یہ تنظیم قائم ہے، تمہاری شاکھائیں چلتی ہیں، تم نے اپنی پرارتھنا میں اب تک وندے ماترم کو کیوں نہیں شامل کیا''۔

میں نے پوچھا کہ وقتاً فوقتاً اس قسم کے ISSUES کو اٹھانے کے پس پشت سنگھ پریوار کا اصل مقصد کیا ہے؟ سنگھ پریوار کے ذریعے وندے ماترم اور دیگر issues کے اٹھانے کے پس پشت وطن سے محبت کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ اقلیتی فرقہ کی دل آزاری مقصود ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اپنے اکثریتی فرقہ کے لوگ ان کے ساتھ رہیں، افسوس ہے کہ اب ہمارے ملک میں اعداد وشمار کی یہ سیاست چل پڑی ہے اور اس قسم کی کوششوں کا مقصد اقتدار کا حصول ہے'' وہ کہتے رہے ''بابری مسجد کے مسئلہ کو بھی رام جنم بھومی کہہ کر مذہب سے جوڑنے کی کوشش کی گئی، ایودھیا کے سادھو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برہمچاری جی! رام جنم بھومی کی بات کرنے والے یہ لوگ کیسے ہندو ہیں، یہ لوگ نہ تو ہنومان جی کے درشن کرنے جاتے ہیں اور نہ ہی اسنان کرنے جاتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ سوال تو آپ اُن ہی سے کریں، سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ذاتی طور پر مذہب اور دھرم سے دلچسپی نہیں، انہیں تو بس عوام کے مذہبی جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنے سے دلچسپی ہے، رام جنم بھومی تحریک چلانے میں بھی اعداد وشمار کے کھیل کی ذہنیت کارفرما تھی، ''اقلیتی فرقہ کی تذلیل کرکے اکثریتی فرقہ کی خوشنودی حاصل کرنا'' یہ ان کا ایک اصول ہے، اگرچہ میرا دعوی ہے کہ اکثریتی فرقہ بھی پوری طرح ان کا ہم نوا نہیں ہے، میں جب انہیں چیلنج کرتا ہوں تو جواب نہیں دے پاتے، میں کہتا ہوں کہ تمہارا یہ دعوی صحیح نہیں ہے کہ ۸۵% ہندو رام جنم بھومی مسئلہ میں تمہارے ساتھ ہیں اس لئے کہ ہندوؤں میں ایک بڑی تعداد آریہ سماجیوں، کبیر پنتھیوں، پرارتھنا

سماج والوں کی ہے اور یہ سب مورتی پوجا کے خلاف ہیں، کس قدر کھوکھلا ہے تمہارا یہ دعوی!! رام جنم بھومی کے مسئلے میں اب وہ دم خم نہیں رہا، اس لئے انہوں نے وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے مسئلہ کو اٹھا کر پینترا بدلنے کی کوشش کی ہے''۔

میں نے پوچھا کہ اس صورت حال میں مسلمانوں کو کون سی حکمت عملی اپنانی چاہئے؟

برہمچاری جی نے کہا ''اس ملک پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہندوؤں کا، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خود کو تنہا نہ محسوس کریں اور اسی طرح وہ خود کو الگ تھلگ بھی نہ کریں، یہ فرقہ واریت اور سیکولرزم کی لڑائی ہے، سیکولر ہندو ان کے شانہ بشانہ لڑائی لڑنے کے لئے تیار ہیں، ان کا ضمیر زندہ ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کو ساتھ لے کر چلیں، اگر وہ ایسا نہیں کر سکے تو یہ اس ملک کی بڑی بدقسمتی ہوگی اور فرقہ پرست طاقتیں بازی مار لے جائیں گی''۔

میرا اگلا سوال تھا ''آزاد ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مابین خلیج کی بنیادی وجوہات کیا ہیں، اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے''۔

جواب میں اکشے برہمچاری جی گویا ہوئے ''میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان چند باتوں کو سمجھ لے، ان باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت ساری غلط فہمیوں نے جنم لیا ہے، سب سے پہلی بات جو سمجھانے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہم تقسیم ملک کے واقعہ (partition) کو، Explain کریں، عام تاثر یہ ہے کہ تقسیم ملک کا عمل دراصل ہندو مسلم بٹوارہ تھا، میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں، تقسیم ملک کا عمل ہندو مسلم بٹوارہ نہیں تھا بلکہ یہ خطہ کی تقسیم کا معاملہ اگر ہم اپنے ملک کے سامنے یہ بات گاندھی جی اور نہرو جی کی زبان میں نہیں کہہ سکتے تو کم از کم قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریر کے وہ الفاظ ہی دہرا دیں جو انہوں نے پاکستان کی Constituent Assembly میں کی تھی، دونوں ملک کے دستور کی بات لیجئے، اگر ہندوستان کو ہندوتوا کا آئینہ دار بنانا ہوتا تو اس کا دستور ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں نہ بنایا جاتا جو بودھ مت قبول کر چکے تھے، اسی طرح پاکستان کا دستور بنانے کی ذمہ داری جگن ناتھ

منڈل کو دی گئی...... یہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ تقسیم ملک کا واقعہ ہندو مسلم بنیادوں پر عمل میں نہیں آیا......اس موقع پر کچھ مسلمان اور ہندو ایک سے دوسرے ملک میں منتقل ضرور ہوئے، لیکن اگر بنیاد یہی ہوتی تو پھر ہندو آبادی اور مسلم آبادی کا تبادلہ ایک دوسرے ملک کے درمیان پوری طرح سے ہونا چاہیے۔

میں نے پوچھا......''ایک طبقہ گاندھی جی کو تقسیم کا ذمہ دار گردانتا ہے، اس کے کیا حقیقت ہے''

برہمچاری جی نے فرمایا''......گاندھی جی نے تو کہا تھا کہ تقسیم میری لاش پر ہوگی، گاندھی جی نے اپنا یہ قول سچ کر دکھایا، ملک کی تقسیم ہی ان کی شہادت کی وجہ بنی، آزادی کے بعد ملک میں پھوٹ پڑنے والے فسادات سے گاندھی جی کا دل بڑا دکھی تھا......انہوں نے برت رکھا، پھر لاہور چلے جانے کا فیصلہ کیا، لاہور جانے کا پروگرام بن چکا تھا، لیکن یہاں کے فرقہ پرستوں کو گاندھی جی کی یہ امن پسندانہ کوششیں پسند نہیں آئیں، اور بالآخر انہوں نے گاندھی جی کا کام تمام کر دیا......یہی لوگ ہیں جو گاندھی جی کو ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں......!

ایک روز سبھدرا جوشی گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوئیں، باپو نے پوچھا''...... کیا حال ہے؟'' ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری تھا، چنانچہ سبھدرا جوشی نے کہا کہ باپو! بہت برا حال ہے، چودہ ہزار مسلمان مارے جا چکے ہیں......اس پر گاندھی جی نے پوچھا ''کتنے کانگریسی مارے گئے؟'' سبھدرا جوشی اس کا جواب نہ دے سکیں، خاموش ہو گئیں ......بات بالکل صاف ہے کہ گاندھی جی کے اس سوال کا منشأ کیا تھا......گاندھی جی چاہتے تھے کہ فسادات سے اور بلوائیوں سے نمٹنے کے لئے کانگریسیوں کو سامنے آنا چاہیے، آگے آنا چاہیے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔

آزادی کے معا بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات کے زمانہ کی بات ہے، دلی کے بلیماران علاقہ کے کچھ مسلمان بھائی گاندھی جی کے پاس آئے اور کہا کہ باپو! ہم عمر بھر آپ

کی بات مانتے رہے، اب ہمارے ساتھ اس ملک میں یہ سب ہو رہا ہے......اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟......گاندھی جی خاموش رہے، جب وہ لوگ چلے گئے تو گاندھی جی نے اپنی سکریٹری سے کاغذ طلب کیا اور اس پر یہ تحریر لکھی کہ ’’آج میرے پاس کچھ مسلمان بھائی آئے تھے، انہوں نے اپنی بپتا سنائی اور مجھ سے پوچھا اب ہم کیا کریں؟......میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا......اب میں برت رکھ رہا ہوں......‘‘ ان کے سکریٹری نے اس خط کو ٹائپ کر کے نہرو جی اور ولبھ بھائی پٹیل کے پاس بھیجا، ولبھ بھائی بمبئی کے لئے جا چکے تھے، نہرو جی دوڑے ہوئے گاندھی جی کے پاس آئے اور منت سماجت کی کہ باپو برت نہ رکھیں، ان کی صحت اس کی متحمل نہیں......!

تو یہ تھا مشن گاندھی جی کا...... مجھے افسوس ہے کہ کانگریس گاندھی جی کے اس مشن کو آگے نہیں بڑھا سکی......

میں نے ۴۹ء میں جو برت رکھا تھا اس کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ بابری مسجد سے مورتیاں ہٹائی جائیں اور بابری مسجد کو بچایا جائے، بلکہ اس کے ساتھ میرا مقصد یہ بھی تھا کہ کانگریس اس مشن کو لے کر آگے بڑھے، جو گاندھی جی کا مشن تھا، خصوصیت کے ساتھ وہ تقسیم ملک کی وضاحت کرے اور یہ بتائے کہ ملک کی تقسیم ہندو مسلم بنیادوں پر نہیں ہوئی......اگر گاندھی جی کے اس مشن کو پوری قوت کے ساتھ جاری رکھا گیا ہوتا تو تقسیم ملک سے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا اور اس ملک کی اکثریت میں اقلیت کے تحفظ کا احساس جاگتا اور مسلمانوں کے ساتھ وہ حق تلفیاں نہ ہوتیں جو ہوئیں......خصوصاً بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں اس ملک کے مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی اور ناانصافی ہوئی ہے......اس لئے بابری مسجد جب تک اسی جگہ تعمیر نہیں ہو جاتی، تب تک ہمیں خود کو سیکولر (Secular and Demoratic) کہنے کا حق نہیں پہونچتا......آزادی کے معاً بعد نہرو جی کے کہنے پر میں بریلی اور علی گڑھ میں کیمپ کر رہا تھا......اپنے مسلمان بھائیوں کو میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسی ملک میں

رہنے سہنے اور جینے مرنے کا فیصلہ کریں، گاندھی جی کی خواہش یہی تھی کہ اس نازک گھڑی میں ہم لوگ مسلمانوں کو تنہا نہ چھوڑیں، تو ایک بات تو یہ کہ تقسیم ملک (Partition) کی حقیقت لوگوں کو سمجھائی جائے، اور دوسری بات یہ کہ باہمی رواداری کی اہمیت وضرورت کو لوگ سمجھیں، Tolerance کی ضرورت واہمیت اجاگر کی جائے......ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ وجذبہ ہمارے اندر ہونا چاہیے......ہمارا یہ وسیع وعریض ملک جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ رہتے اور بستے ہیں، وہاں Tolerance کے جذبہ کی شدید ضرورت ہے......اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قومی ایکتا کی جتنی ضرورت ہمارے ملک کو ہے، اتنی شاید دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ہو۔

اکشے برہمچاری جی نے اپنی گفتگو میں جب ڈاکٹر امبیڈکر کا تذکرہ کیا تو میرا ذہن حال میں چل رہے تبدیلی مذہب کے موضوع کی طرف منتقل ہو گیا، چنانچہ میں نے پوچھا کہ ان دنوں تبدیلیٔ مذہب کا موضوع زیر بحث ہے، اس سلسلہ میں گاندھی جی کا کیا موقف تھا......؟

موصوف نے جواب میں فرمایا کہ گاندھی جی کا تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں کیا نظریہ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ گاندھی کے صاحبزادے ہری لال نے اسلام قبول کر لیا تھا......گاندھی جی نے ہریجن میں لکھا کہ اگر ہری لال نے اسلام سمجھ کر قبول کیا ہے تو میں انہیں مبارکباد دینا چاہوں گا، لیکن اگر کسی دنیوی یا مادی غرض کے لئے انہوں نے ایسا کیا ہے تو یہ مناسب نہیں ہے......

میں نے پوچھا کہ تبدیلیٔ مذہب کے سلسلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا اس میں ذات پات کی تقسیم کو دخل ہے؟......برہمچاری جی کا جواب تھا......’’تبدیلیٔ مذہب کا تعلق دل سے ہے، اگر کوئی شخص شعوری طور پر کسی مذہب کو اپنی فلاح اور نجات کا ذریعہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے تو اس میں قباحت کی کیا بات ہے......اسے حق ہے کہ وہ اس بھلائی کی طرف اور لوگوں کی بھی توجہ مبذول کرے......لیکن جو سیاسی نوعیت کے تبدیلیٔ مذہب کے واقعات ہوتے ہیں، ان کی ہمت افزائی نہیں ہونی چاہیے......ڈاکٹر امبیڈکر صاحب نے ایک بڑی

تعداد کے ساتھ بدھ مت قبول کیا، ظاہری بات ہے کہ اتنی بڑی تعداد نے شعوری طور پر اپنے مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ نہیں کیا، بدھ مت کی تعلیمات سے منشرح ہو کر تو انہوں نے یہ قدم نہیں اٹھایا...... مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے جو عزت مآب پالیوال صاحب سابق وزیر نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ کچھ مہتروں نے عیسائی مذہب قبول کیا...... ایک روز چند پادری ان کے گھر گئے، اتفاق سے وہ ہولی کے دن تھے...... مہتروں نے رنگ سے پادریوں کا استقبال کیا...... پادریوں نے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو؟ تم تو عیسائی ہو گئے ہونا! ......ان مہتروں نے کہا کہ عیسائی ہو گئے تو کیا ہوا، ہم نے اپنا دھرم تھوڑے ہی چھوڑا ہے!! ......تو بغیر شعور اور ادراک کے مذہب کی تبدیلی کوئی معنی نہیں رکھتی، افسوس اس کا ہے کہ اس کو سیاست سے جوڑ دیا جاتا ہے، ورنہ تبدیلیٔ مذہب فی نفسہ کوئی بری بات نہیں، یہ تو انسان کا بنیادی حق ہے......''

بات فسطائی قوتوں کی چل رہی تھی، مجھے یاد آیا کہ مہاراشٹر میں بجرنگ دل نے حال ہی میں شوشہ چھوڑا ہے کہ چونکہ بقرعید اور مہاویر جینتی ایک ہی دن پڑ رہی ہیں، اس لئے مہاویر جینتی کے احترام میں اس روز جانوروں کے ذبح پر پابندی لگائی جائے...... چنانچہ میں نے پوچھا کہ بجرنگ دل کے اس اعلان پر آپ کا کیا ردعمل ہے اور یہ کہ گاندھی جی کا گئوکشی کے سلسلہ میں کیا موقف تھا؟

جواب میں برہمچاری جی نے فرمایا...... ''گاندھی جی گئو سیوا کی بات کرتے تھے، گاندھی جی کے نزدیک ہنسا صرف یہی نہیں تھی کہ کسی کی جان لی جائے، بلکہ کسی کے دل کو ٹھیس پہنچانا بھی ان کے نزدیک ہنسا کا عمل تھا...... کثرت تعداد کے بل بوتے پر کوئی ایسا قانون بنا لینے کو وہ صحیح نہیں مانتے تھے، جس سے اقلیتی فرقہ کی مذہبی آزادی پر حرف آتا ہو، اس زور زبردستی کو بھی وہ ہنسا ہی سے تعبیر کرتے تھے...... اس ملک کی اکثریت گائے کو مقدس مانتی ہے، لیکن اس ملک کے باسیوں کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو گائے کو ایک عام جانور سمجھتی ہے، چنانچہ گاندھی جی نے گائے کے ذبح پر پابندی لگانے کو کبھی بھی

مناسب نہیں سمجھا...... مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً ۶۷ء یا ۶۸ء کی بات ہے، ان دنوں اندرا جی وزیر اعظم تھیں، ونوبا جی نے گئوکشی کا قانون بنانے کا مطالبہ لے کر برت رکھنا چاہا، میں نے سوچا کہ دنیا بھر میں ونوبا جی کو گاندھی جی کا وارث سمجھا جاتا ہے، ان کے اس قدم سے دنیا یہ سمجھے گی کہ اس سلسلہ میں گاندھی جی کا موقف یہی تھا، جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا...... میں فکر مند ہو گیا، چنانچہ دلی گیا...... ان دنوں راجہ مہندر پرتاپ جی زندہ تھے، ان ہی کے گھر پر میٹنگ بلائی، اس میٹنگ میں بشمبھر ناتھ پانڈے تھے، سمن نارائن جی تھے، پنڈت سندر لال جی تھے...... میں نے کہا کہ ونوبا جی یہ کیا کر رہے ہیں، گاندھی جی کا گائے کے سلسلہ میں یہ موقف تو نہیں تھا...... اندرا جی کی رائے ہوئی کہ اس بارے میں ونوبا جی سے بات کر لی جائے، بشمبھر ناتھ پانڈے نے اس موضوع سے متعلق گاندھی جی کے وہ سارے مضامین یکجا کئے جو ہریجن اور نوجیون میں شائع ہوئے تھے...... سمن نارائن جی نے انہیں سمجھایا، ونوبا جی مان گئے اور قصہ ختم ہوا...... گاندھی جی کا نظریہ تو یہ تھا کہ گائے کی سیوا کیجئے...... رہی بات بجرنگ دل والوں کی، تو یہ بات کسی مذہبی جذبہ یا جانوروں سے ہمدردی کے جذبہ کے تحت نہیں کہی گئی، یہ تو بس اقلیتی فرقہ کی دل آزاری کر کے اکثریتی فرقہ کے ایک طبقہ کو خوش کرنے کی سطحی سیاست ہے...... گیتا نے تو پنڈت کی تعریف یہ کی ہے کہ گائے، ہاتھی، چانڈال اور کتے کو ایک نگاہ سے دیکھے، وہ پنڈت ہے......!

(بانگ درا، لکھنؤ: اپریل ۱۹۹۹ء)

اسی جگہ بابری مسجد کی تعمیر کے مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے!

سوامی اکشے برہمچاری جی کی ایک تجویز

گزشتہ شمارہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس شمارہ میں سوامی اکشے برہمچاری جی کے ان خیالات کا تذکرہ کیا جائے گا جو بابری مسجد سے متعلق ہیں، بابری مسجد سے متعلق اکشے برہمچاری جی آئینہ کی طرح اپنے صاف شفاف نظریہ اور حقائق کا بار بار اظہار کر چکے ہیں، ان کی صاف اور سیدھی رائے یہ ہے کہ حقائق وشواہد کی روشنی میں کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بابری مسجد کسی مندر کو ڈھا کر تعمیر کی گئی تھی، چنانچہ بابری مسجد کو شہید کرنے کا سانحہ اس جمہوری ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے جسے دھونے اور صاف کرنے کی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جو وطن سے محبت رکھتا ہے اور جسے سیکولرزم عزیز ہے...... آج اگرچہ بابری مسجد شہید کی جا چکی ہے اور مندر کی تیاریوں کا وقتاً فوقتاً پرچار کیا جا رہا ہے لیکن ان حالات میں بھی سوامی اکشے برہمچاری جی مایوس نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حق اور انصاف اس ملک کے خمیر میں شامل ہے اور آج بھی خود ایودھیا کے سادھو سماج میں ایسے باضمیر افراد ہیں جو یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ان کی آنکھوں نے بابری مسجد کو مسجد ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے...... انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ حقائق کو نہ صرف توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا بلکہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے کہ لوگوں کی نگاہوں سے

حقائق بالکل اوجھل ہو کر رہ جائیں اور ایک ایسی نئی تصویر ان کے سامنے پیش کر دی جائے جس کی بدولت حقائق کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہی نہ ہو...... ۸۶ء تک یہ بات عوام کے ذہن میں رہی کہ وہ مسجد ہے، پھر تالا کھول دیا گیا جس سے لوگوں کو توجہ دوسری طرف مبذول ہوئی، پھر دسمبر ۹۲ء میں شہادت کا واقعہ پیش آ گیا، اب وہاں رام مندر کی تعمیر کا چرچا ہے، اس طرح سے حقائق سے توجہ پھیرنے کے مسلسل اقدامات ہو رہے ہیں جو حق وانصاف کے لحاظ سے نہایت تشویش ناک ہیں۔

سوامی اکشے برہمچاری جی کے نزدیک جنم بھومی اور جنم استھان دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں، ایودھیا نگر، ایودھیا شہر کو آپ جنم بھومی کہہ سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایودھیا میں کوئی ایک مخصوص جگہ اور محل ہی رام جی کا جنم استھان رہا ہوگا...... رام جی کا عہد چھ ہزار برس قبل مسیح کا ہے، ایودھیا میں رام لیلاؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جتنے محل اور مقامات بنائے گئے ہیں وہ چند صدیوں پہلے کے ہیں، وہاں کے سنت سادھوؤں نے تاریخی تحقیق اور کھوج کے مطابق وہاں رام جی سے متعلق مختلف مقامات تعمیر کئے، دشرتھ جی کا محل اس زمانہ میں رہا ہوگا، چنانچہ وہاں دشرتھ جی کا محل بنا، اسی طرح کی کئی بھون بنا، کوشلیا بھون بنا، سمترا بھون بنا، جہاں رام جی دانتن کلہ کیا کرتے تھے وہاں دنت دھاون کنڈ مندر بنا ہوا ہے، جہاں وہ پڑھتے تھے وہاں بشٹھ جی کا مندر بنا ہوا ہے، جہاں سے وہ راج کرتے تھے وہاں رتن سنگھاسن بنا ہوا ہے، جہاں وہ وشرام کرتے تھے، وہاں رنگ محل بنا ہوا ہے، جہاں سے انہوں نے دنیا کو چھوڑ وہاں گپتار گھاٹ پر مندر بنا ہوا ہے...... اور ان سب کے علاوہ رام جی کے جنم استھان پر مندر بنا ہوا ہے...... یہ بات بالکل صاف ہے کہ جنم استھان اور بابری مسجد جہاں تھی، اس کے درمیان تقریباً ۳۵ فٹ کی سڑک بنی ہوئی ہے اور آج کی نہیں سیکڑوں برس پہلے کی بنی ہوئی ہے...... تو جب رام جی کے استھان پر مندر بنا ہوا ہے اور ایودھیا کا سادھو سماج بھی اور باہر سے جو لوگ زیارت کرنے آتے ہیں، وہ بھی اس کو رام جی

کے جنم استھان کا مندر مانتے ہیں تو پھر آخر جھگڑا کس بات کا ہے......؟

وہ لوگ جنھوں نے رام جی کے جنم استھان کو متنازعہ بنادیا ہے، وہ رام جی کے سب سے بڑے ورودھی اور دشمن ہیں...... مسلمانوں سے نفرت اور بغض وعناد کی بنیاد پر رام جی کے جنم استھان کو تبدیل کردینا کس قدر نادانی کی بات ہے! کعبہ جہاں ہے، وہاں ہے!! لیکن اگر کوئی کسی دوسرے مقام پر کعبہ ہونے کا دعوی کرے تو اس کی عقل پر ماتم کرنا چاہئے کہ وہ تو کعبہ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کررہا ہے ایک کہاوت ہے کہ اگر کوئی شخص سفر کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ صبح صبح کسی کانے کو دیکھ لے تو دیکھنے والے کو کوئی نقصان اٹھانا پڑتا ہے...... تو کسی کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے کیا یہ عقلمندی کی بات ہے کہ آدمی اپنی آنکھ پھوڑ لے...... رام جی جنم استھان کو متنازعہ بنانا اسی طرح کا عمل ہے......

''مورتیوں کی پوجا کا رواج ہندو مذہب میں کب سے ہوا؟'' کے جواب میں اکشے برہمچاری جی کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ بودھ کال میں مورتی سازی کا آغاز ہوا، لیکن بودھ، مورتی کی پوجا نہیں کرتے تھے...... کیرالا کے شنکراچاریہ نے جب بودھ مت کی مخالفت کی تو ان کے زمانے میں مورتی پوجا کا آغاز ہوا، پہلے انہوں نے شنکراچاریہ جی کی لنگ کی پوجا کی، پھر درگا کی پوجا ہوئی، پھر گنیش کی، پھر کرشن کی، رام جی کی مورتی پوجا، رامانند کے بعد ہوئی، تقریباً ۶ سو برس پہلے رامانند ایک اچاریہ ہوئے...... لیکن یہ سلسلہ گوسوامی تلسی داس کی کوششوں سے خوب پھلا پھولا...... ان کی رام چرت مانس کی وجہ سے گھر گھر رام کا چرچا ہوا اور ان کی مورتی پوجا کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لئے ایسا کوئی بھی مندر جس میں رام کی مورتی ہو، وہ پانچ سو برس سے زیادہ پہلے کی بنی ہوئی نہیں ہے۔

گوسوامی تلسی داس کا جنم ۱۴۹۵ء میں ہوا، بابر کی ہندوستان آمد ۱۵۲۶ء میں ہوئی، بابری مسجد اگر مندر توڑ کر بنائی گئی تو یہ عمل گویا ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ گوسوامی تلسی داس ایودھیا میں رہتے تھے، اس وقت ان کی عمر ۳۱ سال تھی...... گوسوامی تلسی داس کے سامنے اگر مندر توڑا جاتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کا تذکرہ نہ کرتے!! اتنا بڑا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑتا اور وہ اف تک نہ کرتے!......

گوسوامی تلسی داس رام کے سب سے بڑے بھگت تھے کوئی ان سے بڑھ کر رام بھگت بننے کی بات کرتا ہے تو اس کی عقل پر ہنسی آتی ہے...... اس کے علاوہ ایک بات اور قابل توجہ ہے ویشنو کے کسی گرنتھ میں اس مندر کا ذکر نہیں ہے...... رام جی کے جنم استھان کا مندر کوئی معمولی مندر تو نہیں ہوسکتا تھا، اس بات کو یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کی مساجد مل کر بھی کعبہ کی عظمت و مرتبہ اور مقام کو نہیں پہونچ سکتیں اور اگر کعبہ کا تذکرہ مسلمانوں کی بنیادی مذہبی کتاب میں نہ ہوتا تو اس سے کعبہ کے متعلق کیا نتیجہ اخذ کیا جاتا؟ سری ویشنو گرنتھوں میں اس مندر کا تذکرہ نہ پایا جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس قسم کے مندر کا وجود تھا ہی نہیں۔

''رام مندر کے پائے جانے اور پھر اس حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اسے ڈھائے جانے سے متعلق دعوی خود ہندو مت کی مذہبی کتابوں اور گرنتھوں سے مسترد ہوجاتا ہے تو پھر اس پر انہیں اصرار کیوں کررہا؟ اس کے جواب میں برہمچاری جی نے فرمایا کہ اس کو بغض وعناد کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ بابری مسجد سے متعلق حقائق تو بالکل واضح ہیں لیکن اس بات پر اصرار کہ تاریخ کو کریدا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ایک ہزار بارس پہلے فلاں عمارت کیا رہی ہوگی، نہایت نامناسب بات ہے اور اس سے کسی بھی محبّ وطن کو اتفاق نہیں ہوسکتا، اس سے ملک کی تصویر بگڑ جائے گی اور سیکولرزم، رواداری، آپسی بھائی چارگی سب کا جنازہ نکل جائے گا۔ اس لئے جن کو وطن کی فکر ہے ان کا فریضہ ہے کہ وہ آگے آئیں اور اس ملک کو بچائیں...... بابری مسجد کی اسی جگہ تعمیر کے سلسلے میں میری تجویز ہے کہ ۱۹۹۱ء میں جو ایکٹ بنا کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بنیاد مان کر اس دن جس عبادت گاہ کی جو حیثیت تھی، اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے، جو تاریخی عمارتیں متنازعہ ہیں یا ہوسکتی ہیں، ۱۵/اگست ۴۷ء کو بنیاد مانتے ہوئے انہیں اسی حیثیت میں محفوظ رکھا جائے...... اب ہم سیکولر محبان وطن کو آواز اٹھانی چاہیے کہ ۱۹۹۱ء کے اس ایکٹ پر اس لحاظ سے نظر ثانی کی جائے کہ اس ایکٹ میں جس ایودھیا معاملہ کو مستثنی کیا گیا تھا، اس کو بھی اس میں شامل کیا جائے اور اس کے تحت کورٹ یہ طے کرے کہ ۱۵/اگست ۴۷ء کو بابری مسجد، مسجد تھی یا مندر تھا اور جو حیثیت ثابت ہو اس لحاظ سے اسے Restore کیا جائے...... یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ

جب نرسمہاراؤ کے زمانہ میں ریفرنس بھیجا گیا تھا تو ہم نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی تھی کہ ریفرنس کے ذریعہ اور حکومت اپنے فیصلہ کے ذریعہ مقدمہ کو اس طرح فیصل اور ختم کرے کہ ایک فریق محروم رہ جائے، صحیح نہیں ہے......اس موجودہ تجویز کے سلسلے میں اس قسم کا اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ایکٹ ۱۹۹۱ء سے اس ایکٹ کے دفعہ ۵ کو حذف (Delete) کرنے کے بعد بھی مقدمہ عدالت میں زیر سماعت رہے گا، البتہ اس میں زیر بحث بات صرف یہ رہے کہ ۱۵/اگست ۴۷ء کو وہ مندر تھا یا مسجد......اس کے علاوہ اور کوئی ایشو (Issue) اس میں نہ اٹھایا جائے، اس طرح عدالت کے وقار واحترام پر بھی ہرگز کوئی حرف نہیں آئے گا......اس حقیقت کے دلائل ہیں کہ بہرحال وہ مسجد تھی، ۴۴ء میں شیعہ سنی وقف بورڈ کے مابین چل رہے مقدمہ کا فیصلہ کورٹ نے دیا تھا، اس کے علاوہ بھی دوسرے حقائق ہیں...... چنانچہ یہ موقع ہے کہ ہم لوگ ایک آواز ہو کر اس بات کو اٹھائیں......خوش قسمتی سے چند ایک ایسی شخصیتیں آج بھی زندہ ہیں جنہوں نے گاندھی جی کی صحبتیں اٹھائی ہیں، ان کے وجود کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اس وقت پارلیمنٹ بھی غنیمت ہے اور اس میں سیکولر ذہن موجود ہے۔ضرورت ہے کہ اس ذہن کو ساتھ لے کر ایک مہم چلائی جائے، یہی ایک راستہ ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ ہماری آنکھیں بابری مسجد کی اسی جگہ تعمیر کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتا دیکھ سکتی ہیں۔

اکشے برہمچاری جی سے میں نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی، سورج ڈوب چکا تھا، شام ہو چکی تھی اور دھندلکا گہرا ہو گیا تھا، میں نے ان کے ستیہ آشرم سے باہر جھانکا تو آسمان پر ایک تارہ نہایت روشن، نہایت تاباں!! جھلملا رہا تھا، میں نے پھر اکشے برہمچاری جی کی طرف دیکھا، مجھے ان دونوں میں بڑی مماثلت دکھائی دی۔ایک آسمان کی تاریکیوں میں نور بکھیرتا روشنی کی علامت تھا، تو دوسرا مایوسیوں کے دھندلکوں میں جگمگاتا قندیل! خدا کرے بیاباں کی شب تاریک میں اس قندیل سے اس پُر پیچ راہ کی گزرگاہیں روشن ہو سکیں، ربّ قدیر سے کچھ بھی بعید نہیں!!

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ)

اردو

صرف مسلمانوں کی نہیں، ہندوستانیوں کی زبان ہے!

ڈاکٹر کرن سنگھ سے ایک ملاقات

ڈاکٹر کرن سنگھ لکھنؤ پارلیمانی حلقہ سے امیدوا ہیں، لکھنؤ کی یہ پارلیمانی نشست اس حیثیت سے بھی اہم ہے کہ یہ حلقہ اٹل بہاری واجپی جی کا حلقہ ہے لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ ڈاکٹر کرن سنگھ نہ صرف مدت دراز سے اور اپنی نوعمری سے ہی میدان سیاست کی خاردار وادیوں کے مرد میدان رہے بلکہ ایک دانشور، فلسفی، ادیب وشاعر اور مفکر کی حیثیت سے بھی وہ ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں وہ کشمیر کے راجہ ہری سنگھ کے فرزند اور وارث ہی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی تہذیب وسنسکرتی کے بھی وارث وامین ہیں۔گل پوش وادیوں اور دلفریب جھیلوں کے علاقہ سے وابستہ ڈاکٹر کرن سنگھ نے قلم بھی شاداب وگہربار پایا ہے، چنانچہ ان کے قلم سے فلسفہ سیاسیات، تعلیم، مذہبیات اور دیگر موضوعات پر وقیع کتابیں نکلیں وہ ایک شاعر بھی ہیں انگریزی اور اپنی مادری زبان ڈوگری دونوں کے شاعر......بنارس ہندو یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کے وہ چانسلر رہے اور ان کی کتابیں آج بھی ملک وبیرون ملک کی دانش گاہوں میں شامل نصاب ہیں......ایسے قد آور معلم، مصنف، ادیب وشاعر اور دانش ور فلسفی کی اس شہر میں آمد ہو تو ایک طالب علم کا اس سے ملاقات کا اشتیاق ایک

فطری بات ہے اس سے قطع نظر کہ وہ کانگریس کے امیدوار بھی ہیں......مگر ہاں! ایک بات اور ہے اور بہت اہم ہے کہ علم وفلسفہ ہو یا شعر وادب یا ادارے......بلکہ یوں کہئے کہ سارے نیک ارادوں کے پھلنے پھولنے، پنپنے اور پروان چڑھنے کیلئے حالات کا معتدل (NORMAL) رہنا بھی ضروری ہے، لیکن اب اسے کیا کہئے کہ ادھر چند برسوں سے اس ملک میں فسطائی ذہنیت کو تقویت ملتی رہی ہے، فسطائی ذہنیت جو اس ملک کی ''کثرت میں وحدت'' (UNITY IN DIVERSITY) پر تیشہ چلانا چاہتی اور اس ملک کو کیسری رنگ میں رنگ دینا چاہتی ہے! اس کا ایک نظریہ اور ایک فکر ہے اور افسوس کہ وہ فکر منفی ہے اور اس کی بنیاد نفرتوں اور عداوتوں پر ہے......اور اب نوبت تو یہاں تک آ پہنچی ہے کہ کل تک جو لوگ سیکولرزم کی دہائی دیتے تھے، اقتدار کی ہوس نے انہیں بھی فسطائی ذہنیت رکھنے والوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے!......ان حالات میں ملک کے حالات کو نارمل کیوں کر کہا جا سکتا ہے، یہ صورت حال سچے ہندوستانی کو فکر وتشویش میں مبتلا کر دینے بلکہ تڑپا دینے کے لئے کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کرن سنگھ سے راقم کی گفتگو کا موضوع علم وادب، فلسفہ وحکمت اور مذہبیات واخلاقیات نہیں رہا بلکہ حالات حاضرہ کی سیاست گفتگو پر چھائی رہی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ تو نوعمری ہی سے سیاست سے وابستہ رہے مگر غالباً اخلاقی قدروں کے زوال سے دل برداشتہ ہوکر وہ مدت مدید سے افق سیاست سے غائب بھی رہے، چنانچہ یہ ایک فطری بات تھی کہ ان سے اس 'کوچہ' کی طرف دوبارہ رخ کرنے کی وجہ پوچھی جاتی ......ڈاکٹر کرن سنگھ اس سوال کے جواب میں یوں گویا ہوئے جیسے وہ اس کے لئے تیار بیٹھے ہوں، انہوں نے صاف اور سیدھی بات کہی ''......دیکھئے! کانگریس کی آج سے جو چند

برسوں پہلے کی کیفیت تھی، اگر اس میں تبدیلی نہ آتی تو میں بھی کانگریس میں دوبارہ شامل نہ ہوتا، ایک واقعہ ہے کہ سونیا گاندھی کا کانگریس کی صدر بن جانے کے بعد سے ایک تبدیلی (Change) آئی ہے، مردنی زندگی سے بدلی ہے، پارٹی میں جان آئی ہے، ورنہ اس سے قبل تو کانگریس تقریباً ٹوٹ گئی تھی......عوام نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا ہے اور اسی لئے دلی، راجستھان، مدھیہ پردیش، گوا، بھونیشور میں عوام نے کانگریس کو چناؤ میں کامیاب بنایا ہے ......میں نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا اس فضا کو باقی رکھنے کا......میں اپنا کردار بھی نبھایا جائے اور کانگریس کی اس تعمیر نو میں ہاتھ بٹایا جائے......ملک جس راستہ پر جا رہا ہے، وہ آپ کے علم میں ہے، آئے دن کے الیکشن اور نئے نئے وزیر اعظم، عدم استحکام (INSTABLITY) کی یہ فضا ملک کے لئے کیسے سود مند ہو سکتی ہے؟......اس کے علاوہ جواہر لال نہرو کے خاندان سے ہمارے مراسم بھی دیرینہ رہے ہیں، جواہر لال جی میرے بزرگ رہے، میں انہیں اپنا گرو مانتا رہا، اندرا گاندھی میری بڑی بہن کی مانند تھیں، ان کا دس برس کابینہ میں ساتھ رہا، راجیو گاندھی پانچ برس کے تھے جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا، وہ ہمارے سامنے بڑے ہوئے، ہماری ہی AIR LINES میں وہ پہلے پائلٹ بنے، ان دنوں میں ہی وزیر تھا......یہ ہے پس منظر اور یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے میں دوبارہ آیا اور آتے ہی سونیا جی نے کہا کہ کیا آپ لکھنؤ سے الیکشن لڑیں گے......میں نے کہا کہ لڑوں گا اور لڑوں گا ہی نہیں، جیتوں گا بھی......اب ہم شہر لکھنؤ میں حاضر ہیں جو اپنی مہمان نوازی کے لئے اپنی شناخت اور شہرت بھی رکھتا ہے، اس لئے میں یہاں کے رائے دہندگان سے بھی ان کی نیک تمناؤں کا خواہش مند ہوں۔

بات رائے دہندگان کی اور براہ راست الیکشن کی آئی تو میں نے عرض کیا کہ ''......اٹل جی بھی تو میدان میں ہیں''......اس پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت سکون اور پر اعتماد لہجہ میں کہا ''......دیکھئے، اٹل جی میرے بزرگ ہیں، ان کے خلاف میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ وہ تین بار لکھنؤ سے پارلیمنٹ کے نمائندہ رہے ہیں لیکن افسوس کہ لکھنؤ

والوں کا کوئی مسئلہ حل ہوتا دکھائی نہیں دیتا...... پانی کا مسئلہ ہے، بجلی کا مسئلہ ہے، بے روزگاری کا مسئلہ ہے، اساتذہ کا طبقہ دکھی ہے، سرکاری ملازمین خوش نہیں ہیں...... تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فضا پر پورتن اور تبدیلی کے لئے بالکل تیار ہے...... اور پھر اٹل جی نے گذشتہ مرتبہ کہا تھا کہ میں اس کے بعد چناؤ نہیں لڑوں گا اس صورت میں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ان الفاظ کی عزت رکھنا بھی تو اب ہماری ذمہ داری ہے''۔

ڈاکٹر صاحب اٹل جی کا تذکرہ کر رہے تھے اور مجھے یاد آ رہا تھا کہ ڈاکٹر کرن سنگھ پر تو ایک الزام یہ بھی عائد کیا جا رہا ہے کہ وہ وشو ہندو پریشد سے متعلق رہے ہیں وہ ''ہندو وراٹ سماج'' کے بانی تو ہیں ہی لیکن وشو ہندو پریشد سے ان کی وابستگی کی باتوں کی حقیقت آخر کیا ہے...... چنانچہ اس سے متعلق میرے سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے کہا''...... یہ ایک الزام ہے، میں اس بات کو کئی بار صاف کر چکا ہوں کہ وشو ہندو پریشد سے میرا کوئی تعلق نہیں، رہی بات ہندو وراٹ سماج کی تو دیکھئے ہماری ایک عالمی تحریک مذاہب ہے اس میں دمشق کے مفتی اعظم بھی ہیں، پوپ بھی ہیں، دلائی لامہ بھی ہیں تو اس میں شمولیت کے لیے مجھے کوئی بنیاد چاہیئے تھی اور کوئی پلیٹ فارم چاہیئے تھا، ورنہ یہ سوال کھڑا ہوتا کہ آخر ہم کس کی نمائندگی (REPRESENTATION) کر رہے ہیں، اس لئے میں نے ''ہندو وراٹ سماج'' کی تشکیل کی...... تو ہماری عالمی مذاہب تحریک ہے، اس کا مقصد ہے تمام مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اس پلیٹ فارم سے تمام مذاہب کی اعلیٰ قدروں کی ترویج و اشاعت کرنا تاکہ مذاہب ایک دوسرے سے رقابت نہ رکھیں، تنگ نظری سے کام نہ لیں اور باہم قریب ہوں اور دنیا میں اخلاقی قدروں کی بحالی کی فضا بن سکے......''

محسوس ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے جو شخص کانٹوں بھری سیاست کا تذکرہ کر رہا تھا، وہ یہ عزم بھی رکھتا ہے کہ دنیا میں کانٹے بچھانے والوں کے مقابلہ پھول بکھیر دئے جائیں اور خوشبوؤں کو پھیلا دیا جائے!!...... میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا کہ ڈاکٹر صاحب! ہمارے ملک میں جو لوگ ''ہندوتوا'' کی بات کر رہے ہیں وہ بھی تو مذہب ہی کا نام لیتے ہیں

......ڈاکٹر صاحب گویا ہوئے''...... دیکھئے یہ تو PRESENTATION کی بات ہے اور نیت کی بات ہے، اسے یوں سمجھئے کہ آپ کا مذہب اسلام ہے، اب آپ کے حلقہ میں ہمارے جیسے جو صوفی سنت اور بزرگ ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ اسلام وہ مذہب ہے جو کہتا ہے کہ اللہ صرف مسلمانوں کا رب نہیں ہے، وہ رب المسلمین نہیں، وہ رب العالمین ہے لیکن اسلام کے نام لیواؤں میں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو اسلام کی ایسی تصویر پیش کریں گے جس سے لوگ خوف کھائیں اور اس سے دور ہو جائیں...... بس اسی پر ہندومت کو قیاس کر لیجئے، آپ لوگ تو اپنے پاس قرآن رکھتے ہیں، ایک قرآن، جب کہ ہمارا معاملہ اس سے مختلف ہے، ہمارے پاس وید ہیں اور اشلوک ہزاروں ہیں تو ان میں سے کون سی بات کہاں کہی جائے اور کب کہی جائے اور اس کو کس طرح پیش کیا جائے، یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے...... ہندو دھرم کے متعلق، اپنشد سے متعلق میرے مضامین پڑھیں، کتابیں پڑھیں، میں ۳۰/۴۰ برس سے لکھ رہا ہوں، میرے لکچرس (LECTURES) ہیں، انہیں سنیں، میں نے ہندو دھرم کی جس طرح تشریح کی ہے اور اس کی تعلیمات کو جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی اس کی بنیاد محبت پر ہے۔ اس کی عظمت پر ہے۔ کسی دوسرے مذہب کے خلاف نفرت و عداوت پر نہیں، یہی وجہ ہے کہ میری ان تشریحات کو پسند کیا گیا، میرے PRESENTATION کو پسند کیا گیا، ہمارا تو ایک ایشو (ISSUE) ہے، رگ وید کا ایک جملہ ہے''...... سچائی ایک ہے، اسے کہنے اور سمجھنے کے الگ الگ راستے ہیں......'' تو منزل ایک ہے اور اگر کوئی خلوص دل، سچے دل اور شردھا سے چلے تو وہ اسے پالیگا...... لیکن جو لوگ ہمارے ملک میں ''ہندوتوا'' کا نام لے رہے ہیں وہ تنگ نظری سے کام لے رہے ہیں اور ان کی سوچ منفی (NEGATIVE) ہے۔

ہندوتوا کا ذکر چلا تو اس کے نام لیواؤں کے ہاتھوں بابری مسجد کی شہادت کے میرے زخم کو ہرا کر گیا...... مجھے یاد آیا ان دنوں اخبارات ڈاکٹر کرن سنگھ کی اس تجویز کا ذکر کر رہے ہیں جو انہوں نے اس قضیہ کے شباب پر پہنچنے کے دنوں میں پیش کی تھی، میرا جی چاہا کہ اس

تجویز کو خود ڈاکٹر کرن سنگھ کی زبانی سنوں ......میرے اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا’’...... میں تو رگھونشی ہوں، میں خود ایودھیا گیا تھا تو میری آنکھوں نے دیکھا کہ مسجد میں مورتیاں رکھی ہوئی ہیں اور پوجا ہو رہی ہے۔اس وقت بہر حال یہی صورت حال تھی۔تو میں نے کہا کہ جو حصہ متنازعہ ہے disputed ہے،اس حصہ کو چھوڑ دیا جائے اور اس سے متصل ایک مندر بن جائے، رہا معاملہ disputed جگہ کا،تو اس کے لئے عدالت سے رجوع کیا جائے۔عدالت کے فیصلے کے ماننے میں تو مسلمانوں کو بھی اعتراض نہیں ہے،تو متنازعہ مقام کا عدالت جو فیصلہ کرے اسی کے مطابق عمل کیا جائے،اگر کورٹ آپ کے حق میں فیصلہ دے دے تو ٹھیک، ورنہ آپ کا مندر تو اس سے ملحق ومتصل بن جائے گا،تو یہ ایک عقل مندی کی بات تھی لیکن کون سنتا ہے......پھر میں نے کہا کہ اس طرح تو تمہارے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں، وہاں تم پوجا کر ہی رہے ہو، میری اس تجویز کے مطابق اس طرح اس سے متصل مندر بھی بن جائے گا،ایسے مندر پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔مندر بناؤ،ضرور بناؤ مگر خوش اسلوبی سے،ہم آہنگی کا لحاظ کرتے ہوئے،کسی کو اعتراض نہ ہو ایسی شکل بناؤ،ایودھیا رام چندر جی کی جائے پیدائش ہے،اس سے تو انکار نہیں ہے لیکن بس جگہ کا تھوڑا اختلاف ہے،سید شہاب الدین صاحب بھی میرے اچھے ملنے والوں میں ہیں،انہیں بھی میری اس تجویز کا علم ہے،آپ کبھی ان سے پوچھ سکتے ہیں......تو بہر حال افسوس اس کا ہے کہ میری یہ تجویز نہیں مانی گئی، مسجد بھی ٹوٹ گئی، مندر بھی نہیں بنا اور انہوں نے رام کو شامیانہ کے نیچے لاکر کھڑا کر دیا،مسجد کے توڑے جانے سے ہم ہندوؤں پر تہمت الگ لگی اور عبادت گاہوں کے انہدام کا جو کلنک ہمارے ماتھے پر نہیں تھا وہ کلنک بھی لگ گیا......تو تنگ نظری سے کام بنتے نہیں، بگڑتے ہیں......‘‘

معروف صحافی ابراہیم علوی صاحب بھی وہاں تشریف رکھتے تھے،اس گفتگو کو سن کر انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! بابری مسجد کے تعلق سے سونیا جی کا کوئی بیان اب تک نہیں آیا ہے......سورن مندر کے بارے میں تو انہوں نے کچھ کہا بھی مگر بابری مسجد کے متعلق کچھ

نہیں کہا......اس پر ڈاکٹر کرن سنگھ نے کہا کہ کچھ کہا تو ہوگا لیکن اگر ایسی بات ہے جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں تو یہ بات میں ان تک پہنچا دوں گا۔

بات اقلیتوں کی چل پڑی تھی تو میں نے چاہا کہ مسلمانوں کا ذکر چھیڑ دوں،چنانچہ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں تو ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے۔کیا کانگریس کے رویہ میں مسلمانوں کے تئیں کسی تبدیلی کی توقع ہے اس لئے کہ آزادی کے بعد سے دہائیوں تک کانگریس کے دور اقتدار میں مسلمانوں کو خوش گوار تجربے تو نہیں ہوئے......!

جواب میں ڈاکٹر کرن سنگھ یوں گویا ہوئے’’......میرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانا ہوا تھا مجھے بنارس ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دونوں یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگری تفویض کی گئی ہے،تو علی گڑھ میں سرسید ہال میں میں نے ایک بات کہی تھی،وہ بات آپ سے بھی کہنا چاہوں گا کہ میں ہی ایسے چند لوگوں میں سے ایک ہوں جو اقلیتوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو بخوبی سمجھ سکتا ہے،اس لئے کہ میں خود اپنی ریاست میں اقلیت میں ہوں......اس لئے میں جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ایک اقلیت کے کیا احساسات ہوتے ہیں،ان کے دلوں میں کیا اندیشے اور خدشات ہوتے ہیں......واقعہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں نے کانگریس کا بھرپور ساتھ دیا وہ اقتدار میں رہی لیکن ادھر کانگریس کے طرز عمل کی وجہ سے کچھ بدمزگی بھی ہوئی اور مسلمان ناراض بھی ہوئے،اب جب کہ مسلمان اپنی ناراضگی کو بالائے طاق رکھ کر اگر کانگریس کی طرف مائل ہو رہے ہوں تو کانگریس کو بھی اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا کہ وہ ایسا طرز عمل اپنائے جس سے اقلیتیں خوش رہیں اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس کو اس بار موقع دیا اور وہ اقتدار میں آئی تو مسلمانوں کو انشاء اللہ اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکے گی۔

کانگریس کے علاوہ جن لوگوں نے خود کو اقلیتوں کا مسیحا بنا کر پیش کیا ان کا حال آپ کے سامنے ہے۔خصوصاً ملائم سنگھ جی کا وہ رخ تو یاد رہے جب اٹل سرکار گرگئی،استعفیٰ دے

دیا سرکار نے، صدر جمہوریہ نے سونیا جی کو سرکار سازی کی دعوت دے دی اور عین اس موقع پر ملائم سنگھ جی نے اپنا رخ بدل دیا، تو سرکار گر جانے کے باوجود اٹل سرکار ہمارے سر پر ان دنوں ہے، وہ ملائم سنگھ ہی کی مرہون منت ہے......اس کے علاوہ ملک کی سیاسی صورت حال کا جو نقشہ اس وقت ہے، اس میں کانگریس ہی ایک ایسی واحد پارٹی ہے جو فسطائی قوتوں کو شکست دے سکتی ہے......دوسری طرف این ڈی اے کی چوبیس پارٹیوں کا گٹھ جوڑ ہے۔ جنتا پارٹی کے دور میں ۱۳ پارٹیوں اور بی جے پی کے دور میں ۱۸ پارٹیوں کے گٹھ جوڑ کا حشر آپ نے دیکھ لیا، تو ۲۴ پارٹیوں کے گٹھ جوڑ سے کام کیسے چل سکتا ہے، اگر اس ملک کو چلانا اور اسے ترقی کی چوٹی تک پہنچانا ہے تو ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے......''

ڈاکٹر کرن سنگھ روانی سے بول رہے تھے، ان کے سکریٹری اردو سے واقف ہیں، انہوں نے خود مجھ سے یہ بات کہی، چنانچہ میرا ایک سوال اردو سے متعلق بھی تھا......ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا کہ میرا تعلق ہی ایک ایسی ریاست سے ہے جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو ہے بھی بڑی خوبصورت اور شیریں زبان! یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں، ہندوستانیوں کی زبان ہے!!......مجھے تو ہر زبان سے محبت ہے، میری مادری زبان ڈوگری ہے، پڑوس کی زبان کشمیری اور پنجابی ہے، ریاست کی زبان اردو ہے، ہماری راشٹر بھاشا ہندی ہے، سنسکرتی اور تہذیب کی زبان سنسکرت ہے، عالمی زبان انگریزی ہے تو میں تو ہر زبان سے محبت کرتا ہوں، ہندی کا ہم نے خوب پرچار کیا لیکن انگریزی کی مخالفت ہم نے نہ کبھی کی نہ کریں گے......اردو کے بھی مسائل ہیں، گجرال کمیٹی کی سفارشات اور اس قسم کے ہوئے کاموں کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے......کانگریس نے کوشش کی ہے ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں کہ دلی میں چار زبانوں میں سڑکوں کے ناموں کی تختیاں ہیں انگریزی، ہندی، گورمکھی اور اردو میں......لیکن بہت کچھ ہونا ہے، ہم یقین دلاتے ہیں کہ اردو کے بارے میں جو کچھ ہو سکے گا، ہم وہ ضرور کریں گے......''

میرا مقررہ وقت ختم ہو رہا تھا، باہر لان میں ایک بڑی تعداد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی

مشتاق تھی جب کہ میرے سوالنامے میں کچھ سوالات رہ گئے تھے مسئلہ کشمیر کا حل! بابری مسجد کا حل! لکھنؤ کی ترقی کے لئے ان کا پروگرام اور خصوصیات کے ساتھ یہ کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کے لئے ان کے ذہن میں کیا کوئی ٹھوس پروگرام اور خاکہ بھی ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے سوالات!......لیکن بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ بھی تشریف لے آئی تھیں اور کانگریس کے ورکروں کی ایک تعداد بھی اندر کمرہ میں داخل ہو رہی تھی......میں نے اجازت چاہی، ڈاکٹر صاحب نے کہا ''ہاں! لیکن آپ کی چائے تو باقی ہے، لیجئے کہیں ٹھنڈی نہ ہو گئی ہو......'' میں نے کہا ''لیکن کمرہ کا ماحول تو گرم ہے اور ہر شخص یہاں سرگرم دکھائی دے رہا ہے'' ڈاکٹر صاحب مسکرائے، گرمجوشی سے انہوں نے مصافحہ کیا اور پھر دوسرے ملاقاتیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

میں چائے پی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ملک کی سیاست بھی ایک چائے کی پیالی سے کس قدر مشابہ ہے، کبھی سرد اور کبھی گرم اور اسی کی بدولت ملک اور اس کی بے چاری غریب عوام سرد اور گرم سب کچھ جھیل جاتی ہے......!!!

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

مسلمانوں کو جذباتیت سے اونچا اُٹھ کر

اپنی لڑائی آپ لڑنے کی ضرورت ہے!

دلت لیڈر راُدِت راج سے خصوصی بات چیت

مسلمانوں کے مسائل سے متعلق دوسرے لیڈران کس طرح سوچتے ہیں؟
یہ جاننے کے لئے دلت لیڈر رادت راج سے ایک گفتگو۔

س:- بہت ساری پارٹیوں خصوصاً دلتوں کے مسائل کو بنیاد بنا کر وجود میں آنے والی پارٹیاں میدان میں ہیں، اس کے باوجود وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو جسٹس پارٹی آف انڈیا بنانے کا خیال آیا اور وہ کونسی امتیازی خصوصیات ہیں جو جسٹس پارٹی کو دیگر پارٹیوں سے ممیّز کرتی ہیں؟

ج:- اگر موجودہ سیاسی پارٹیوں کی کارکردگیوں پر آپ کی نظر ہے تو آپ بھی گواہی دیں گے کہ عام طور سے سیاسی پارٹیوں کے پیش نظر ذات پات، دھرم ڈنڈا طاقت وقوت اور پیسہ ہے، یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں محور کہا جا سکتا ہے، جن کے ارد گرد سیاسی جماعتوں کی کارکردگیاں گھوم رہی ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ اس دیش میں وہ جمہوریت رائج ہے جو یورپ کی دین ہے اور یورپ کے نزدیک سیاسی کوششوں کے پیش نظر صرف اقتدار کا حصول ہے، میرے نزدیک یہ ایک بنیادی غلطی ہے کہ سیاسی جماعتوں کا واحد مقصد صرف اقتدار کا حصول ہو، بلکہ اسی کے ساتھ ان کے پیش نظر سماجی مسائل اور ان کی اصلاح بھی ہونی چاہئے، اونچ نیچ کی ناہمواری، سماجی مساوات جیسے بنیادی مسائل کا حل بھی ان جماعتوں کے مقاصد میں شامل ہو، ہر سیاسی پارٹی کو رائج جمہوری نظام میں اس بات کو مدنظر رکھنا

چاہئے کہ ان کا وجود یورپ کے سماج میں نہیں بلکہ بھارت کے سماج میں ہے، سیاسی دَل یا جماعتیں سماج کے انقلاب میں ایک مؤثر رول ادا کر سکتی ہیں، اس لئے یہ بڑی ناسمجھی کی بات ہوگی کہ سیاسی جماعتیں اپنا ہدف صرف اقتدار اور کرسی کو بنائیں، جسٹس پارٹی آف انڈیا کے خیالات اس سلسلہ میں دوسری سیاسی پارٹیوں سے مختلف ہیں، ہندوستانی معاشرہ میں کی جانے والی سیاست کا مقصد صرف اقتدار نہ ہو بلکہ معاشرتی مسائل کا حل ڈھونڈھنا بھی ہوتا کہ محسوس ہو کہ ہم نے جمہوری نظام میں جو طرز عمل اپنایا ہے، اس میں ہندوستانی سماج کی پوری پوری رعایت ہے، مسائل پر گہری نگاہ ہو جو ان کی وجوہات پر محیط ہوں مثلاً کوئی پارٹی صرف امیر اور غریب کے ایشو پر بات کرتی ہے تو یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے، ورنہ واقعہ تو ہے کہ پیٹ کی بھوک سے زیادہ بھی کہیں اور دوسرا مسئلہ موجود ہے، جب ہم ''دلت'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف ایک خاص ذات و دھرم کے لوگ ہرگز مراد نہیں ہوتے بلکہ دلتوں کا تو ایک ازدہام ہے، مجمع ہے اور ان کے دلت ہونے کی بنیادیں اور وجوہات مشترک ہیں، خواہ ان کا مذہب کچھ ہو، انہیں خیالات وافکار کو لے کر جسٹس پارٹی آف انڈیا میدان عمل میں اتری ہے، ہمیں پتا ہے کہ راستہ دشوار ہے، یہاں جذباتیت پر مبنی باتوں کی تحسین ہوتی ہے، لیکن بہر حال سچائی کا بول بالا ہو، اس کے لئے ہمیں سنگھرش اور جدوجہد تو کرنا ہی پڑیگا۔

س:- سچّر کمیٹی رپورٹ پر آپ کی رائے کیا ہے؟

ج:- رپورٹ تو اچھی ہے، قابل قدر ہے لیکن اس سلسلہ میں مَیں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ جب تک ملت اپنی مدد آپ نہیں کریگی اور اپنے مسائل ومشکلات پر قابو پانے کے لئے اپنی بساط بھر جدوجہد نہیں کریگی محض حکومت سے اور اس کے چاہنے اور کوششوں پر تکیہ کرنے سے کام نہیں چلے گا۔

س:- آپ کی پارٹی کی ترجیحات کیا ہیں؟

ج:- سب کے لئے تعلیم، سب کے لئے روزگار اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی خصوصاً

تعلیم جو شاہ کلید ہے اور مساوات پر مبنی سماج کی تشکیل۔

س:- آپ پسماندہ طبقات کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور ان کے مسائل سے واقف ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- ملت کو جذباتیت سے اونچا اٹھ کر اپنی لڑائی آپ لڑنے کی ضرورت ہے، ورنہ اب تک ملت سیاست کے جن دو پاٹوں کے بیچ پس رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک سے ڈراتا ہے اور دوسرا اس کا ظاہری سہارا بننے اور ہونے کا ڈراما رچتا ہے، ضرورت ہے کہ ملت صورتحال کا مقابلہ کرنے کا اپنے اندر شعور پیدا کرے اور اپنا سیاسی وزن بنا کر ان کا استحصال کرنے والی قوتوں کا متبادل بنائے۔

س:- دھرم پریورتن یا تبدیلی مذہب کی مخالفت میں حکومتیں قانون بنا چکی ہیں، آپ کے نزدیک دھرم پریورتن کی وجوہات کیا ہیں؟

ج:- ہندو دھرم میں کرانتی اور انقلاب کی ضرورت ہے، اسے اصلاحات سے گذرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا، ورنہ تبدیلی مذہب کا عملاً واقع ہونا ایک سماجی ضرورت بن کر ابھرتا رہے گا۔

س:- تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طبقات میں تبدیلی مذہب کے عمل کے لئے شعور کی کمی کا رول تو ہوگا ہی، اس سلسلہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:- یہ ذمہ داری اس دھرم کے ماننے والوں کی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی محاسن سے عام لوگوں کو واقف کرائیں، اس کے بغیر کسی بھی دھرم کا صحیح سندیش کیسے پہنچ سکتا ہے، اس سلسلہ میں کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں، مثلاً مغلیہ دور حکومت سات سو برسوں پر محیط رہا لیکن ان حکمرانوں نے اسلام کے لئے کیا کیا، پھر ایک چیز ہے دھرم اور دوسری چیز ہے اس دھرم کے ماننے والے، دونوں میں فرق ہے اور ضروری نہیں کہ کسی دھرم کے ماننے والے اس کی تعلیمات کی سچی تصویر پیش کر رہے ہوں اس رخ پر بھی سوچنا چاہئے۔

س:- دلت مسلم اتحاد کس حد تک ممکن ہے اور کسی بھی اتحاد کے لئے کونسے بنیادی

اصول پیش نظر رہنے چاہئیں؟

ج:- دوستی برابر والوں سے کی جاتی ہے، اگر کمزوروں نے مضبوط قوم سے دوستی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ظاہر ہے اس میں کمزور کا نہیں بلکہ مضبوط قوم کا فائدہ ہوگا، میرے نزدیک اس ملک میں مسلمانوں سے یہ غلطی ہوئی ہے، سماجی اقتصادی تعلیمی معاملات سے اپنے سے برابری رکھنے والوں سے دوستی کا عمل مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

س:- سیاسی تبدیلی کے لئے آپ کے نزدیک کیا بنیادی شرائط ہونی چاہئیں؟

ج:- سیاسی تبدیلی کا عمل اس وقت تک ناممکن اور ناقص ہوگا جب تک کہ سماجی تبدیلی پر توجہ نہ دی جائے، بھید بھاؤ جیسی برائیوں کے خاتمہ کے بغیر محض سیاسی تبدیلی سے دوررس نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

س:- ایک دلت خاتون رہنما نے مسلمانوں کے بارے میں گذشتہ دنوں کہا تھا کہ وہ کٹر پنتھی کو پسند کرتے ہیں اس پر آپ کا تبصرہ؟

ج:- وہ خود جواب دیں کہ بی جے پی جیسی فاشسٹ جماعت کی ساز باز سے سرکار بنانے کو وہ کیا عنوان دیں گی، کیا یہ عمل کٹر پنتھیوں کو پسند کرنے کا عمل نہیں ہے؟

س:- طبقاتی تقسیم میں شدت کی موجودگی میں ہمیں اپنے آپ کو ایک Nation کہنا کیسا ہے؟

ج:- عملی لحاظ سے Nationality کا مطلوبہ تصور مفقود دکھائی دیتا ہے، ہمیں مختلف عصبیتوں سے اونچا اٹھنا ہوگا اور اس قسم کے احساس سے آزاد ہونا پڑیگا، تب ہی کہیں جا کر ہم صحیح معنوں میں Nation کہلائے جانے کے مستحق ہوسکیں گے، ہزاروں برس سے چلی آ رہی اس خرابی کو دور کئے بغیر ہمارا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

(روزنامہ جدید عمل، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۶ء)

زبان،تہذیب اورمعاشرت

اردو کی شہزادی پر ہندی کا آسیب سوار ہو گیا ہے!

معروف شاعر،ادیب،معلم،ناظم مشاعرہ اوراردوتحریک کے روح رواں

پروفیسر ملک زادہ منظوراحمد سے ایک ملاقات

پروفیسر ملک زادہ منظوراحمداردودنیا کاایک معتبرنام ہے،وہ اردو کے مسائل سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ اردو کے مسائل پراردو کی لڑائی لڑرہے ہیں،ملاحظہ فرمایئے ان سے اردو کے مسائل پر گفتگو۔

س-آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پراردو کے کشتی کے کھیون ہار ہونے کے ناطے آپ کیا محسوس کررہے ہیں؟ ہندوستان اور خصوصاًیوپی میں اردو کے مستقبل کے تیئں آپ کس حدتک پُرامید ہیں؟اسے روزی روٹی سے جوڑنے کے لئے خود آپ کے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟اردواکیڈمیوں کی کارکردگی سے آپ کس حدتک مطمئن ہیں؟

ج:-آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پراردو کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل اور تکلف نہیں ہے کہ مختلف حکومتوں کی منظّم اور مجرمانہ سازشوں کی بناپر دونسلیں اردو کی تعلیم اور تہذیب دونوں سے محروم کردی گئی ہیں،نتیجہ میں تیسری نسل کے اندراردو کے لئے وہ جذب وشوق باقی نہیں رہ گیا ہے جو پچھلی نسلوں کے لئے سرمایہ افتخار تھا،ہمارے ''شرفائے ادب''ممکن ہے اس انحطاط کی ذمہ داری خوداردو والوں کے سرپر ڈالتے ہوں،مگر میں اردووالوں سے پہلے حکومتوں کواس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں،یہ بات شخصی اوراستبدادی حکومتوں میں سچ تھی کہ زبانیں سرکاری دارالضرب میں نہیں ڈھلتیں،بلکہ عوام کی آغوش میں پلتی اور بڑھتی ہیں،مگر جمہوریت میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا،اس لئے کہ حکومت اورعوام جمہوریت میں ایک ہی سکّہ کے دورُخ ہوجاتے ہیں،نتیجہ میں

ہر وہ زبان یتیم اور مفلوک الحال ہوجاتی ہے جس کی سرپرستی حکومت نہیں کرتی، یوپی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں اگر حکومت اردو کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑ دے تو اردو کا مستقبل محفوظ و مامون ہوجائے، بصورت دیگر آنے والی صدی میں یہ رفتہ رفتہ وہی حیثیت اختیار کرلے گی، جو فارسی، عربی اور سنسکرت کی ہے یعنی یہ دانشگاہوں اور دارالعلوموں میں تو باقی رہے گی مگر سرکاری اور عوامی زندگی سے اس کا چلن ختم ہوجائے گا۔

اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لئے محبان اردو متحد ہوکر حکومت کو مجبور یا آمادہ کرنا پڑے گا کہ وہ ملازمتوں کے دروازے اردو تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کھول دے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب صرف اردو پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جس کی مادری زبان اردو ہے متحد ہوکر ''دباؤ'' بنائے اور وہ تمام ذرائع استعمال کرے جو جمہوریت میں اپنے حقوق کو منوانے کے لئے کیے جاتے ہیں۔

اردو اکاڈمیاں اور دیگر سرکاری ادارے اردو شعر و ادب اور اردو شعراء و ادباء کی خدمت ضرور کرتی ہیں مگر اردو زبان کے عوامی دائرہ کو تنگ سے تنگ کرنے کا فریضہ غیر محسوس طریقہ پر انجام دیتی ہے، کتابیں ہزاروں ہیں مگر انعام صرف چند اچھی کتابوں کو ملتا ہے، اردو طلباء ہزاروں ہیں مگر وظیفہ سب سے زیادہ نمبر پانے والے کو ملتا ہے، لائبریریاں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں مگر امداد صرف چند معیاری کتب خانوں ہی کو ملتی ہے، نتیجہ میں اردو ادب تو ترقی پاتا ہے مگر اردو زبان کا پھیلاؤ ایک ''جوئے کم آب'' بن جاتا ہے اور یہ بتلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ آزاد ہندوستان میں اردو ادب کا نہیں بلکہ اردو زبان کا مسئلہ الجھا ہوا تھا، اگر پچاس برس تک کسی زبان میں اچھا ادب نہ پیدا ہوا تو المیہ نہیں ہے، سانحہ یہ ہے کہ اچھا ادب تو پیدا ہو رہا ہے مگر اس کے پڑھنے والے رفتہ رفتہ کم ہوتے جارہے ہیں، اکاڈمیاں اگر دیانت داری سے اپنے دائرہ اور دستور العمل میں رہ کر کام کریں تو ادب کی تخلیق میں یقیناً ممد و معاون ہوسکتی ہیں مگر زبان کے پھیلاؤ میں اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر رہے گی۔

س- اردو کی بقاء کے لئے حکومتی سطح کی کوششوں سے قطع نظر خود اس زبان کے بولنے

والوں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ ان کے لئے وہ کونسا لائحہ عمل ہوسکتا ہے جس کے ذریعہ اس زبان کا تحفظ و ترقی ممکن ہو؟

ج:- کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں نے عربی زبان معانی و مطالب کے ساتھ کیوں نہیں پڑھی، جبکہ اس زبان سے ان کا مذہبی تعلق بھی بنتا ہے، نماز پڑھنے کے لئے تو ہم نے سورتیں یاد کرلی ہیں، مگر ان کے مفاہیم سے اکثریت ناآشنا ہے، وجہ صرف اتنی ہے کہ ہندوستان میں اس زبان کا رشتہ سرکاری سطح پر کبھی روزی روٹی کے ساتھ نہیں جڑا، اردو زبان بولنے والوں کی سب سے بڑی اور ترجیحی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اپنی تحریک کو دو حصوں میں تقسیم کردیں، داخلی اور خارجی، داخلی سطح پر متحد ہوکر حکومت کو مجبور کرے کہ سرکاری ملازمتوں میں اردو کو اس کا دستوری اور جمہوری حق دے۔

س- آپ کی شخصیت اور مشاعرے بڑی حد تک لازم و ملزوم ہوگئے ہیں، اردو زبان کی خدمت اور مقبولیت میں مشاعروں کا کیا رول ہے؟ آج منعقد ہونے والے مشاعروں اور آج سے تین چار دہائیاں پہلے ہونے والوں مشاعروں کی قدروں نیز سامعین کے ذوق میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج:- ہر دور کے اپنے الگ الگ مطالبات ہوتے ہیں، میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ ہمارے دور کا اولین مطالبہ اردو نہیں بلکہ اردو زبان کے فروغ کا تھا، اور یہ بات میں بڑی حد تک ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آزادی کے بعد اردو کی لسانی جمہوریت کو وسیع کرنے میں مشاعروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے، پہلے جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے (انیسویں صدی کے اواخر تک) وہ عموماً خانقاہوں، دیوان خانوں، محلوں اور امراء و رؤساء کے گھروں پر ہوتے تھے جن میں سامعین کی تعداد محدود ہوتی تھی اور وہی لوگ مدعو کئے جاتے تھے جو اردو اور فارسی کے نئے اور پرانے منظرنامے سے واقف ہوتے تھے، یہ مشاعرے آداب مجلس، حفظ مراتب اور ادبی معیار مرتب کرنے کا ذریعہ ہوتے تھے، مگر

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور جمہوریت کی ہوائیں خوشگوار پا کر اب مشاعرے پارکوں، سڑکوں، نمائشوں، میلوں، کالجوں اور اسکولوں میں برپا ہو رہے ہیں جن میں سامعین کی تعداد کبھی کبھی تیس ہزار اور چالیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے، مگر ان سب کا رشتہ اردو زبان سے کٹا ہوتا ہے، وہ صرف اچھے ترنم اور اچھے انداز پیش کش سے محظوظ ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں آج کا عوامی مشاعرہ ادبی ذوق پیدا کرنے کا نرسری اسکول بن گیا ہے اور یہ ذمہ داری وہ بدرجہ اتم پوری کر رہا ہے۔

س- ہزار مخالفتوں کے باوجود اردو نہ صرف زندہ ہے بلکہ جادو کی طرح سر چڑھ کر بول رہی ہے، اس کی زندگی اور تابندگی کا راز آپ کے نزدیک کیا ہوسکتا ہے؟

ج:- میں رجائی فکر وخیال کا انسان ہونے کے باوجود اس قدر خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں جتنا آپ کا سوال، ہم چونکہ اردو والوں کے درمیان رہتے ہیں، اس لئے اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی شہزادی پر ہندی کا آسیب سوار ہو گیا ہے، جس کے باعث ہمارا لہجہ اور ہمارا تلفظ مجروح ہو رہا ہے اور الفاظ اپنے معانی تبدیل کر رہے ہیں، اگر آپ نے غزلوں کے کیسٹوں کی مانگ اور مشاعروں کی بھیڑ سے یہ اندازہ کیا ہے تو آپ کو غیر جذباتی ہو کر یہ سوچنا چاہئے کہ کیا لوگ غزلوں کے محاسن کی بنا پر انہیں پسند کرتے ہیں یا گانے والے یا گانے والی کی خوش الحانی کی بنا پر، کیا آج اردو گھرانے کا بچہ اردو کے بجائے ہندی کا اخبار نہیں پڑھ رہا ہے، کیا آج اردو جاننے والے والدین کو اپنے بیٹوں کے خطوط ہندی میں موصول نہیں ہو رہے ہیں، کیا آج قبرستانوں میں لوح مزار پر کتبے ہندی میں نہیں نظر آرہے ہیں؟ کیا آپ کے علماء کرام اس بات پر زور نہیں دے رہے ہیں کہ ہمیں اپنی مذہبی کتابوں کو ہندی رسم الخط میں شائع کر دینا چاہئے تا کہ آئندہ نسل مذہب سے بیگانہ نہ ہو جائے، کیا آپ کی نئی نسل نماز اور روزہ کی دعائیں ہندی رسم خط میں تلاش نہیں کر رہی ہیں، کیا آپ نے مجلسوں اور میلادوں کے اشتہارات اور بینر ہندی میں نہیں دیکھے ہیں، اگر ان باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر

آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ آنے والا دور مستقبل کے پردہ غیب میں کتنی بشارتیں اور کتنی نحوستیں آپ کے لئے چھپائے ہوئے ہے۔

س-''اردو مسلمانوں کی زبان ہے'' جیسا موضوع اکثر وبیشتر موضوع بحث رہتا ہے، اردو کے دیرینہ خادم اور جہاں دیدہ استاذ وشاعر کی حیثیت سے اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:- مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، ان معنوں میں درست نہیں کہ اردو سے مسلمانوں کا کوئی اسلامی رشتہ ہے، اردو کے آغاز وارتقاء سے صدیوں پہلے مسلمان ساری دنیا پر چھا چکے تھے اور مختلف زبانیں بول رہے تھے، خود ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں آج بھی مسلمان مختلف زبانیں بولتے ہیں، البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ملک کے کچھ علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے مذہبی معتقدات اور اپنے اکابر کی سیرت کو اردو میں کتابیں پڑھ کر یا اردو میں کی گئی علماء کی تقریروں سے سیکھا ہے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی، اسی لئے میں نے اکثر اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کے بقاء وتحفظ کی ذمہ داری مسلمانوں پر برادران وطن سے زیادہ ہے، انہیں بحیثیت ایک ہندوستانی اس زبان کو اس لئے بچانا چاہئے کہ یہ ہماری مشترکہ تہذیبی روایات کی امین اور وارث ہے، اور بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان اس لئے اور بھی زیادہ اس کے تحفظ وترقی کی کوشش کرنی چاہئے کہ اس میں ہمارا بہت زیادہ مذہبی لٹریچر ہی موجود نہیں ہے بلکہ بے پڑھے لکھے مسلمانوں نے بھی علمائے کرام کی تقریریں اردو میں سن کر مذہب سے اپنے رشتہ کو استوار کیا ہے، البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ مختلف زبانوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اور اس حقیقت سے انکار کرنا ایک تاریخی صداقت کو جھٹلانے کے مرادف ہوگا۔

س- آپ ایک شاعر بھی ہیں اور ایک استاذ بھی، قدرت نے آپ کو حساس اور دردمند

دل دیا ہے،اس کے علاوہ اردو کی لڑائی بھی آپ لڑ رہے ہیں اور اس طرح کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں سے متعلق ایک مسئلہ آپ کی شخصیت سے وابستہ ہے،اس ملک میں مسلمانوں کے سامنے حقیقی مسئلہ کیا ہے؟اور اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کی ترجیحات کیا ہونا چاہئیں؟ مولانا آزاد کے افکار ونظریات پر آپ کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا ہے،اگر آج مولانا آزاد حیات ہوتے تو آپ کی رائے میں وہ مسلمانان ہند کو کیا مشورہ دیتے؟

ج:اتحاد اور حصول علم،ان دونوں مسائل کو اگر مسلمان اپنی ترجیحات میں شامل کرلیں تو وہ ملک کی تعمیر وترقی اور اس کے جمہوری نظام میں اپنی شناخت کے ساتھ اپنا بھرپور کردار ادا کرسکتے ہیں،یہ المیہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات سے آزادی کے قبل کا مسلمان متفق نہیں ہوسکا،اور شاید اسی لئے آزادی کے فوراً بعد انہوں نے اپنی ایک تقریر میں خود کو ایک ’’دور افتادہ صدا‘‘ اور ’’وطن میں غریب الوطن‘‘ کہا تھا،مگر پچاس برسوں کے نشیب وفراز اور مدوجزر کو دیکھنے والے اب ان کی بصیرت کے معترف ومداح ہورہے ہیں اور انہیں ان کی یاد آنے لگی ہے،اگر وہ آج زندہ ہوتے تو مسلمانوں کو یہی پیغام دیتے کہ خدا کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور علم حاصل کرو،اس لئے کہ یہی وقت کا تقاضا اور منشائے الٰہی ہے۔

(بانگ درا لکھنؤ،دسمبر تا فروری ۱۹۹۸ء)

باتیں امریکہ اور امریکی معاشرہ کی

ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی (نیویارک) سے گفتگو پر مبنی

ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی ندوہ کے ایک سابق بزرگ ترین استاد پرنسپل سمیع صدیقی کے صاحبزادہ ہیں،ان کا بچپن اور لڑکپن گھر پر جو لکھنؤ میں واقع ہے گزرا،ان کا مکان ندوہ کے کیمپس سے بالکل متصل ہے،پرنسپل سمیع صدیقی اور ان کے بڑے صاحبزادہ پروفیسر وصی احمد صدیقی نے ندوہ سے تعلق کو قائم کیا جو آج تک برقرار ہے،ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کی بہت سے یادیں ندوہ سے وابستہ ہیں،پھر وہ اعلی تعلیم کے لئے بیرون گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے،انہوں نے تعلیمی اور معاشرتی دونوں لحاظ سے بہت ترقی کی،چونکہ مدت دراز سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں،اس لئے وہ ملک اور اس کے معاشرہ کو خوب جانتے ہیں،ان کی آمد کو غنیمت جانتے ہوئے راقم نے امریکہ اور امریکہ معاشرہ کے موضوع پر ان سے گفتگو کی جو درج ذیل ہے:

بات ۱۹۷۹ء کی ہے،جب راقم آثم نے کالج سے دارالعلوم کا رخ کیا،اس وقت کا تاثر بھی بجا طور پر علمائے کرام سے متعلق حمیت اسلامی سے سرشار نوجوان طبقہ کی طرح ویسا ہی تھا جو کتابوں میں پڑھ کر اس کے ذہن میں قائم ہوتا ہے یعنی علماء سے مراد ایسے افراد جو اسلامی تعلیمات کی منھ بولتی اور جیتی جاگتی تصویر ہوں!! آسمان کی سی بلندی اور زمین کی سی انکساری ان کا خاصہ ہو!! دارالعلوم آنے پر اس احساس اور تاثر کو اس وقت تقویت ملی

جب ان گنہگار آنکھوں نے جناب سمیع صدیقی صاحب کو دیکھا جنہیں لوگ 'ماسٹر سمیع صدیقی' کہا کرتے تھے، جناب سمیع صدیقی صاحب رسمی اور روایتی عالم تو نہیں تھے۔ مگر ندوہ کے استاذ الاساتذہ کی حیثیت سے ان کے 'عالم گر' ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے؟ طلباء میں ان کی محبوبیت ومقبولیت دیکھتے ہی بنتی، طبیعت از خود ان کی طرف کھنچتی محسوس ہوتی اور جب ان سے گفتگو کا موقع ملتا تو بجا طور پر ایک طالب علم محسوس کرتا کہ ندوہ میں اسے ایک شفیق سایہ نصیب ہے۔ وہ جب بات کرتے تو ایسا لگتا جیسے پھول جھڑ رہے ہوں، ان سے گفتگو کے بعد ایک قسم کی تازگی وفرحت کا احساس ہوتا اور سینہ میں عزائم بیدار ہوتے محسوس ہوتے ......وہ انگریزی کے استاد تھے سیرت طیبہ ؐ پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف رحمت عالمؐ کا سمیع صدیقی صاحب کا انگریزی ترجمہ ان ہی دنوں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، وہ اکثر وبیشتر طلباء کو انگریزی میں استعداد پیدا کرنے کی طرف متوجہ فرماتے، اس نیت کے ساتھ کہ وہ اپنا داعیانہ کردار ادا کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوسکیں، باتیں انگریزی کی ہوتیں تو انگریزی بولنے والے ملک امریکہ کا ذکر بھی آجاتا اور جب امریکہ کا ذکر آتا تو وہ اپنے ایک صاحبزادہ ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی (پیدائش ۱۹۳۹ء) کا تذکرہ بھی بڑی محبت وشفقت سے فرمایا کرتے تھے۔

اس طرح ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کا نام اسی زمانہ میں کانوں میں پڑا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ امریکہ میں سرجن ہیں، لکھنؤ، علی گڑھ، چنڈی گڑھ کے علاوہ انگلینڈ اور امریکہ میں بھی وہ اپنے تعلیمی سلسلہ میں مقیم رہے، نیویارک میں ٹریننگ حاصل کی اور وہیں پریکٹس شروع کردی، اپنے فن میں کمال پیدا کیا۔ Best doctors of Newyork State میں ان کا نام شامل ہے۔

گزشتہ کچھ دنوں پہلے مخدوم ومربی مولانا واضح رشید ندوی اور مخدومنا المکرّم مولانا برہان الدین سنبھلی نے ان کی آمد کا تذکرہ فرمایا تو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا ایک تو اس نسبت سے کہ وہ استاذ الاساتذہ کے صاحبزادہ ہیں۔ اور دوسرے اس مناسبت سے کہ وہ

مدتوں سے امریکہ میں ہیں۔ وہ امریکہ جہاں ۱۱ر ستمبر کی تاریخ کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو تاریخی بن گیا۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ ۱۱ر ستمبر ایک تاریخ (Date) نہیں بلکہ تاریخ کا ایک باب (Chapter) ہے۔

۱۱ر ستمبر کو تخریب کاری کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں اور اسلام پر اشکالات کا سلسلہ چل پڑا، اگرچہ ارباب اقتدار کے بیانات بھی آتے رہے کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں......لیکن کسی کو شک کے دائرے میں لے آنا ہی بذات خود ایک سزا ہے شک چور دروازوں سے دبے پاؤں داخل ہوتا ہے پھر ایسے لوگ جو ''شک'' کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا اپنے اندر اس کی جسارت نہیں پاتے، تو شک ان کے دلوں کے نہاں خانوں میں نہ صرف جگہ بنالیتا ہے بلکہ مسلط ہوجاتا ہے اور اس طرح ان کے دماغوں پر شک کی حکمرانی قائم ہوجاتی ہے......لیکن اس کے برخلاف ایسا طبقہ بھی ہوتا ہے جو پیدا کئے گئے شک وشبہ پر غور کرتا ہے اور اسے حقیقت کی سطح پر جانچتا ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منفی بنیادوں پر استعمال کئے جانے والا شک کا حربہ اپنی تاثیر کھودیتا ہے اور تدبیر الٹی پڑ جاتی ہے......۱۱ر ستمبر کے بعد دنیا کو اس بات کا مشاہدہ بھی ہوا اور عملی تجربہ بھی۔ خصوصاً دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنے کی منفی کوششوں کے سلسلہ میں اس پروپگینڈہ کے مثبت نتائج سامنے آئے لیکن یہ ساری باتیں اخبارات کی پڑھی ہوئی اور سنی سنائی تھیں۔ ہم چاہتے تھے کہ امریکہ میں مقیم ڈاکٹر صاحب سے براہ راست ۱۱ر ستمبر اور اس کے بعد کے موضوع پر گفتگو ہو چنانچہ اس کی سبیل پیدا ہوگئی۔

ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی صاحب نے ۱۱ر ستمبر کے بعد کی صورت حال سے متعلق بتایا کہ پنٹاگن کے حملے میں بے گناہ افراد موت سے ہمکنار ہوئے ہیں، ان میں بہت سے مسلمان بھی شامل ہیں، ان کی دکانیں بھی اس حادثہ کی نذر ہوئیں شکار ہونے والوں میں وہ Migrant بھی تھے جن کے پاس Geencard تھے......جب ہم لوگوں کو اس کی اطلاع ملی تو ہماری زبانوں پر یہی تھا کہ خدا کرے اس عمل میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کی باتیں

صحیح نہ ہوں اس لئے کہ اس سے پہلے تخریب کاری کی اس نوعیت کا واقعہ Okalhoma میں ہوا تھا تحقیق سے قبل اس وقت بھی مسلمانوں پر شک کیا جا رہا تھا لیکن بعد میں ثابت ہو گیا کہ اس میں کسی مسلمان کا ہاتھ نہیں تھا......لیکن اس حادثہ میں ان کا نام لیا جا رہا ہے......کچھ ایسا ماحول بنا کہ عام مقامات (Public places) پر جانے میں مسلمانوں کو تامل ہوا کرتا، لیکن ان ہی دنوں صدر امریکہ اسلامک سینٹر گئے، ان کے اور مزمل صدیقی صاحب کے بھی ایسے بیانات آئے جن سے تناؤ اور نفرت کی کیفیت میں کمی آئی ورنہ Mob mentality تو اندھی ہوتی ہے، چنانچہ Taxes میں بیچارے ایک سکھ کو پگڑی اور داڑھی کے جرم میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ۱۱ر ستمبر کے واقعہ کا یہ منفی پہلو ہے لیکن اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اسلام سے متعلق جو شبہات واشکالات پیدا ہوئے ان کی بنیاد پر مختلف اسلامک سینٹرس میں فون آنا شروع ہوئے، وہاں کے لوگوں کی ایک خوبی ''ذوق جستجو'' بھی ہے چنانچہ انہوں نے جاننا چاہا کہ آخر اسلام کیا ہے قرآن کریم کے نسخے خوب خریدے گئے اور پڑھے گئے۔ IQna اور ISna جیسی Organizations سے لوگوں نے اسلام اور اس سے متعلق کتابیں خریدیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف 'رابطہ' اور ذوق جستجو سے متعلق کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ قوموں کے مابین غلط ازالہ کی تدبیر باہمی رابطہ ہی تو ہے فاصلے بڑھتے ہیں تو غلط فہمیاں بڑھتی ہیں اور فاصلے گھٹتے ہیں تو غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں......'رابطہ' وہ نسخہ ہے جس میں نفرت کے زہر کا تریاق ہے......اور رہا ذوق جستجو، تو یہ زندوں کی علامت ہے اور زندہ رہنے والوں کا شعار ہے۔

پھر ڈاکٹر موصوف نے ایک واقعہ سنایا کہ Long island نیو یارک کے ایک گاؤں میں ایک خوبصورت مسجد ہے، عید اور دیگر تقریبات کے موقع پر مسلمان وہاں جمع ہوتے ہیں پولیس کو بھی ایسے اجتماعات کی اطلاع دی جاتی ہے تا کہ نظم ونسق میں ان کا تعاون حاصل رہے......ان پولیس والوں میں ایک زنانہ پولیس تھی۔ معلوم ہوا کہ اسکا رویہ مسلمانوں کے

تئیں مثبت نہیں ہے چنانچہ انہیں ہراساں بھی کیا کرتی، وہ مسلمانوں کے ان اجتماعات اور تقریبات کے موقع پر تعینات رہتی لیکن نہ جانے اس کو ان تقریبات کی کون سی ادا پسند آ گئی کہ چار ماہ بعد ہی اس نے اسلام قبول کر لیا۔

ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کے اس واقعہ کے نقل کرنے پر مجھے علامہ اقبالؒ کی وہ بات یاد آ گئی کہ قبولیت اسلام کے واقعات میں دماغ سے زیادہ دل کو دخل ہوتا ہے......لیکن اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لئے وہ عقل کو بھی اپیل کرتا ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ امریکہ میں مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جنہوں نے مطالعہ کے بعد اطمینان حاصل ہونے پر اسلام قبول کیا۔

امریکی معاشرہ کا ایک مسئلہ 'کالے گورے' کا بھی رہا ہے میرے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ Black Americans سے متعلق امتیاز (Discrimination) ختم ہو رہا ہے البتہ ان میں ابھی پوری طرح بیداری (Awareness) دکھائی نہیں دے رہی ہے......ہاں کھیل کود (Music) اور (Sports) کے میدانوں میں انہوں نے اپنا مقام ضرور بنایا ہے، کاش کہ وہ فلاحی اور رفاہی کاموں کی طرف بھی متوجہ ہوں......محمد علی کلے سب کی نگاہوں میں معزز ہیں، امریکہ میں مقیم ساری قومیں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں......!

بات بلیک امریکیوں کی آ گئی تو خیال آیا کہ امریکہ میں مقیم ان ہندوستانیوں کے متعلق پوچھا جائے جو روزگار کے لئے چھوٹے موٹے پیشوں سے وابستہ ہیں، موصوف کا جواب تھا Taxi Driving جیسے پیشہ سے متعلق لوگوں کے ساتھ مسائل ہیں، اس معاشرہ میں برائیوں کے امکانات اور وسائل بھی زیادہ ہیں اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہیکہ وہ اپنے بچوں پر توجہ نہیں دے پاتے، عموماً ایسے بچے ضائع (Spoil) ہو جاتے ہیں میں شاکی ہوں کہ یہ ماں باپ اپنی اولاد کو توجہ سے محروم رکھتے ہیں۔

ہماری گفتگو کا ایک موضوع 'امریکہ میں تعلیم اور تعلیمی مواقع بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب

نے کہا کہ امریکہ میں تعلیم مہنگی ضرور ہے لیکن سہولتیں (Facilities) بھی ہیں، تعلیم کے لئے قرض کی سہولت ہے، ایسا قرض جو ملازمت کے حصول کے بعد ادا کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم Competitive ہے...... الحمدللہ تعلیمی میدان میں تعصب اور امتیاز نہیں برتا جاتا، وہاں ہندو پاک اور عرب ممالک کے طلباء بھی زیر تعلیم ہیں البتہ تعلیمی میدان میں ہم مسلمانوں کو مزید توجہ اور محنت کی ضرورت ہے، دوسری قوموں کی بہ نسبت زیادہ محنت اور مقابلہ کی ضرورت ہے تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں میں بیداری ضروری ہے، مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیمی ادارے قائم ہورہے ہیں۔

۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ امریکہ تشریف لائے تھے، ان دنوں وہاں مسلمان اس قدر نہیں تھے لیکن اس کے باوجود حضرت مولاناؒ پر اچھا تاثر قائم ہوا تھا...... امریکہ میں حضرت مولاناؒ کی ان تقریروں کا آج بھی تذکرہ ہوتا ہے اور اس دورہ کی یادیں تازہ ہوتی ہیں...... کاش کہ حضرت مولاناؒ کی عمر نے وفا کی ہوتی اور بار بار امریکہ کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا، لیکن اللہ کی مرضی ہے! وہی کارساز ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کے سفر امریکہ کی باتوں اور یادوں کا تذکرہ آیا تو خیال ہوا کہ امریکہ میں عرصۂ دراز سے مقیم ایک ہندوستانی ڈاکٹر کا یہ تاثر معلوم کیا جائے کہ اس معاشرہ میں اسلام کو پیش کرنے والے علماء کو کن صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب نے جواباً کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں علماء کرام کا قدرداں ہوں، البتہ کاش یہ ہو پاتا کہ علماء کرام کی توجہ مغرب کو بھی کما حقہ حاصل ہو پاتی...... مغرب میں بھی برائیاں ہیں اور دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں زیادہ برائیاں ہیں۔ لیکن مسئلہ تناسب کے کم اور زیادہ ہونے کا ہے ورنہ تو مشرق بھی اس سے پاک نہیں ہے، ہر معاشرہ میں خرابیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً امریکی معاشرہ ہی کو لیجئے، وہاں آپ کو مختلف علوم وفنون کے ایسے ماہرین بھی ملیں گے جنہوں نے خود کو ان کاموں کے لئے وقف کر رکھا ہے ان میں Devotion ہے Dedication ہے، انہیں دنیا کے ہنگاموں سے

کوئی سروکار نہیں، لغو فضول کاموں کے لئے ان کے پاس مہلت نہیں...... تو ہمارے علماء کرام ایسے معاشرے سے قریب ہوں جس میں ایسے افراد بھی رہتے ہیں۔ امریکہ بڑا ملک ہے، تعلیم ومعاشی اعتبار سے بھی وہ ترقی یافتہ ہے، اگر ہمارے علماء کرام ان مثبت پہلوؤں اور امکانات کو بھی پیش نظر رکھیں تو انشاء اللہ خیر کے دروازے کھلیں گے...... ذہن کے دریچے کھلیں گے۔

امریکہ میں مقیم برصغیر ہندوپاک کے تعلیم یافتہ مسلم گھرانوں کی صورت حال کیا ہے؟ کے جواب میں موصوف نے کہا کہ الحمدللہ ان نوجوانوں میں بیداری ہے، تعلیمی اعتبار سے بھی اور دینی لحاظ سے بھی، شعائر اسلامی کا پاس ولحاظ ہے۔ ان کے کمروں میں آپ کو جائے نماز بچھی ہوئی دکھائی دے گی جو نماز کے تئیں ان کی فکرمندی اور پابندی کی علامت ہے۔ دینی شعور ہے اگر مسجد دور ہوتی ہے تو اس صورت میں وہ فرداً فرداً نماز ادا کرنے کے بجائے کسی کمرہ یا ہال میں جماعت کر لیتے ہیں۔

میں نے پوچھا اپنے تجربات کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ دینی شعور کی بیداری کے ساتھ جدید تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دیں، اپنی توانائیوں کو تعلیم کے فروغ پر مرتکز کردیں...... ہم اس تاریخ کے امین ہیں جو ہمارے اسلاف کے علمی کارناموں سے روشن ہیں لیکن افسوس کہ ادھر انحطاط آیا ہے جس کی تلافی کی شدید ضرورت ہے، اس پر بلا تاخیر توجہ درکار ہے...... ساتھ ہی یہ بھی عرض کردوں کہ الحمدللہ من حیث القوم ہم مسلمانوں میں صلاحیت ہے، ہم میں ممتاز ذہنی وفکری صلاحیت کے پائے جانے کا تجربہ ومشاہدہ ہوتا رہتا ہے اس سے ہمیں تقویت حاصل کرنی چاہئے۔ والدین اپنی ذمہ داری کو کما حقہ محسوس کریں اور عملی طور پر اپنی بیداری کا ثبوت دیں، تو موجودہ صورت حال تبدیل ہوسکتی ہے۔ سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمی ماحول بنائے، اس کی ہمت افزائی کرے اس لئے کہ ماحول کا بھی فرد کی تعمیر وترقی میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔

ندوہ کی مسجد کے زیر سایہ پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب کے راحت کدہ پر ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی صاحب سے بڑی دیر سے امریکہ اور امریکہ معاشرہ کی باتیں ہو رہی تھیں ...... مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کا بچپن تو ندوہ کی چہار دیواری میں گزرا ہے...... گویا ندوہ ان کا وطن ہے ان سے پوچھوں کہ مدتوں بعد یہاں واپسی پر آپ اپنے چمن 'ندوہ' کے متعلق کیا محسوس کر رہے ہیں ...... یہ سوال سن کر ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، کہنے لگے ندوہ آ کر جو روحانی سکون ملتا ہے اس کے لئے میں اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا، کرتے پاجامہ میں ملبوس طلباء اذان سن کر جس طرح مسجد کا رخ کرتے ہیں وہ منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔

میں ۱۹۶۴ء تک ندوہ کیمپس (Campus) میں رہا، ۶۴ء کے ندوہ اور آج کے ندوہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے خدا نظر بد سے بچائے اور ہر طرح سے اسے محفوظ و مامون رکھے میرے والد صاحب جناب سمیع صدیقی مرحوم میرے استاد تھے، اتالیق تھے، میرے معلم و مربی تھے، ان کی رہنمائی اور ان کی دعائیں زندگی کے ہر گام پر کام آتی رہیں......تو وہ یادیں جب تازہ ہوتی ہیں تو ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے، بچپن میں ندوہ کے جن اساتذہ کی خدمت میں میں حاضر ہوا کرتا تھا ان میں شاہ حلیم عطا صاحبؒ تھے مولانا ابوالعرفان خاں صاحب مرحوم تھے، مولانا عبدالسلام صاحبؒ تھے اور مفتی صاحب ہیں......رب کریم ندوہ کو ہر اعتبار سے ترقی کی راہوں پر گامزن رکھے۔ اس کے ارباب حل وعقد کو سلامت رکھے اور اس کے اساتذہ و جملہ کارکنان کو مزید ہمت و حوصلہ اور جذبۂ اخلاص و عمل عطا کرے۔

ڈاکٹر صاحب ندوہ کے تعلق سے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کر رہے تھے...... ندوہ سے ان کی جذباتی وابستگی اور شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ نیویارک میں ان کے دولت کدہ کا نام 'ندوہ' ہے، ہماری اس ملاقات کے ایک دو روز بعد ہی ان کی واپسی تھی، انہوں نے رخصت کرتے ہوئے تپاک سے مصافحہ کیا اور کہا آپ ہمارے ملک ضرور آئیں غریب خانہ حاضر ہے......میں نے عرض کیا کہ خدا معلوم 'مشرق کے ندوہ' سے آپ کے بسائے

ہوئے 'مغرب کے ندوہ' میں آنے کا اتفاق ہوگا بھی یا نہیں ''مغرب کے ندوہ'' پر بہت محظوظ ہوئے، میں نے پھر کہا کہ لا شرقیہ ولا غربیہ اسلامیہ اسلامیہ......اسلام تو آفاقی مذہب ہے کالے گورے، محمود و ایاز، مشرق و مغرب سب کو ایک لڑی میں پرو لینے کی اسلام کی صلاحیت کا دنیا مشاہدہ کرتی رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی اور وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے مجھے محسوس ہوا کہ انٹرویو تو اب شروع ہونا چاہئے تھا چنانچہ چلتے چلتے میں نے ایک سوال پوچھ ہی لیا......کوئی پیغام؟......تو کہا کہ عزت و عظمت کا راز محنت میں مضمر ہے اگر آپ Dedication سے کام لیں گے تو آپ کو Discrimination کا شکوہ نہیں ہوگا۔

میں باہر نکلا تھا تو دھوپ تھی، سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، قرآن پاک کی وہ آیت مجھے یاد آ گئی '' والشمس تجری لمستقر لھا۔الخ

سورج اپنے مقرر کردہ راستہ پر پابندی سے چل رہا ہے اور ظلمتوں کو روشنی سے بدل رہا ہے، امت بھی اپنے تفویض کردہ کام پر جم جائے اور اس پر تسلسل سے چلتی رہے تو اندھیرے کیوں نہ چھٹیں اور نور کیوں کر نہ پھیلے......''عزت و عظمت کا راز تو محنت میں ہی مضمر ہے''!!

(ماہنامہ بانگ درا، لکھنؤ)

لیہہ (لداخ) میں دینی وملی سرگرمیاں

امام جامع مسجد لیہہ، لداخ

جناب محمد عمر لداخی ندوی سے ایک ملاقات

یاد آتا ہے کہ ندوہ کی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں میں ایک طالب علم کو دیکھا کرتا تھا، چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا، کندھا جھکائے اور ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب دبائے چلا جارہا ہے، مگر راہ گیروں سے بے نیازی اور مستغنی ہوکر نہیں بلکہ ہر ایک سے ملتا بلکہ سلام میں پہل کرتا ہوا، کسی سے مصافحہ کرتا اور کبھی تو کسی سے بغل گیر بھی ہوتا...... بات ندوہ کی ہے، جس کی فضا علمی بھی ہے اور عالمی بھی، ہندوستان کے صوبوں کی بات جانے دیجئے، کیا تھائی لینڈ اور کیا ملیشیا اور کیا افریقہ اور امریکہ اور روس، غرضیکہ غیر ملکی طلباء کی ایک بڑی تعداد علم کے شوق میں اپنے وطن کے نگارخانہ سے کھنچ کھنچ کر ندوہ چلی آتی...... اس لئے وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا چھوٹا سا طالب علم کبھی کسی سے عربی زبان میں ہم کلام ہوتا، کسی سے انگریزی میں بات کرتا اور کسی سے اردو میں گویا ہوتا، ہر ایک سے تواضع سے ملتا، میٹھی بولی بولتا، ایسا لگتا جیسے علم کے ساتھ قدرت نے اسے حلم سے بھی نوازا ہو، پھر مجھے معلوم ہوا کہ ان تینوں زبانوں میں سے کوئی زبان بھی اس کی اپنی زبان نہیں، چنانچہ وہ ایک اور زبان بولتا دکھائی دیتا، میرے لئے غیر مانوس اور عجیب سی ہوتی وہ زبان، لیکن اس زبان کو نہ سمجھتے ہوئے بھی نہ معلوم مجھے وہ

کیوں بھلی لگتی، شاید اس لئے کہ وہ بولی ایک بھلے اور بھولے طالب علم کی زبان سے ادا ہو رہی ہوتی...... وہ بولی تھی لدّاخی بولی اور محبت کی اس بولی کا بولنے والا تھا محمد عمر لداخی...... جوان دنوں صرف محمد عمر لداخی نہیں، مولانا محمد عمر لداخی ندوی ہیں، ندوہ اور کشمیر یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، لیہہ کی جامع مسجد کے ایک باوقار موئثر امام، جو منبر ومحراب سے محض روایتی خطبے دے لینے کے قائل نہیں بلکہ اس کے ذریعہ جاگو اور جگاؤ کی تحریک بپا کردینے کے قائل ہیں، انجمن معین الاسلام لیہہ لداخ کی شرعی کمیٹی کے چیرمین، جس کے فیصلے عامتہ المسلمین ہی کے لئے نہیں، عدالت کے نزدیک بھی معتبر ہیں، لیہہ کی اسکول کے ایک ایسے ہر دلعزیز معلم جو معلّمی کو کارپیمبری سمجھتے ہیں، حکومت کے شعبۂ تعلیم کی زیر نگرانی تشکیل نصاب کمیٹی کے رکن اسلام کے ایسے داعی جو حکمت و دانائی سے اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر محمد عربی ﷺ کے ایسے امتی جن کو قدرت نے امت کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح کے لئے تڑپنے پھڑکنے کا جذبہ بھی دیا اور سلیقہ بھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ان کے شیخ ومربی تھے، یہ تعلق رسمی نہیں قلبی تھا، یہ تعلق علمی نوعیت کا بھی تھا اور روحانی نوعیت کا بھی، یہ تعلق اظہار تفاخر کے لئے نہیں، اصلاح حال کے لئے تھا، وہ حضرت مولاناؒ سے توصیہ (سفارشی خط) کے طالب نہیں بلکہ ان سے نصیحت و وصیت کے طالب تھے، ان کا تعلق محض تسبیحات کے دانوں کی گنتی کیلئے نہیں، دل کی انگیٹھی کو گرمانے کی خاطر تھا، یہ تعلق شخصیت پرستی اور اس کے پرچار کے لئے نہیں بلکہ خداپرستی اور خداپرستی کی دعوت کے لئے تھا، اپنے شیخ کی شخصیت ان کے لئے بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کا درجہ رکھتی تھی، چنانچہ

اپنے ساتھ پیش آنے والے معاملات میں وہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے ،ان کی فکر کواپناتے اوراسے اپنانے کی دعوت بھی دیتے ۔

گزشتہ برس جب عمر صاحب ندوہ تشریف لائے تو حضرت مولاناؒ کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم تھا،ندوہ اوراس کے مہمان خانہ میں بڑی رونق تھی،ان مہمانوں میں عمر صاحب اپنے مخصوص لداخی لبادہ کے باعث بآسانی اوردور سے ہی پہچان لئے جاتے اور نئے لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی بن جاتے ،ان آنکھوں نے وہ مناظر بھی دیکھے جب بچے عمر بھائی کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہوتے اورعمر بھائی آنے جانے والوں سے بے نیاز انہیں لداخی زبان میں نظمیں سنا رہے ہوتے ،دوسری طرف یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ندوہ میں وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی آئے ہوئے ہیں اورعمر بھائی وہاں متعینہ حکام سے مل کر انہیں تحریک پیام انسانیت کی دعوت سمجھا رہے ہیں اوراس کا لٹریچر انہیں تھما رہے ہیں، کتاب کا ایک بنڈل اکثر ان کے ہاتھ میں ہے، بس میں، آٹو رکشا میں، ریل میں، ہمہ وقت پاس بیٹھنے والوں سے گفتگو میں پہل کی، خالق و مالک کی یاد دلائی اور چلتے چلتے اپنے پاس موجود لٹریچر میں سے کوئی کتابچہ حسب حال انہیں تھما دیا۔

کبھی ندوہ میں طلباء میں کھڑے ہوئے ہیں، اور طالبان علوم نبوت کو ان کا مقام یاد دلا رہے ہیں تو کبھی کسی مندر میں پہنچ کر اس کے پجاری سے اکرام انسانیت کی بات کر رہے ہیں، مگر اپنے عقیدہ کی پختگی و صلابت کا پورا خیال رکھتے ہوئے، اس طرح کہ اس میں مداہنت کا شائبہ تک نہ ہونے پائے، پھر بھلا وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز کیوں نہ بنتے۔

عمر بھائی اگر چہ عمر میں راقم سطور سے چھوٹے ہیں لیکن چھوٹے اور بڑے ہونے کا پیمانہ عمر نہیں، علم و عمل ہے اور بلاشبہ ہر دو میدان میں وہ راقم آثم

سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لحاظ سے وہ مجھے عزیز بھی ہیں اور میرے لئے محترم بھی، ان کی نیت میں خلوص ہے، اس لئے قدرت نے انہیں علم سے بھی نوازا اور میدان عمل بھی بخشا......اور میدان عمل بھی کون سا! نبوت سے جڑا ہوا میدان عمل جو آزمائش بھی ہے اور نعمت بھی......پھر لدّاخ کی برف پوش پہاڑیوں اور فلک بوس چوٹیوں کا علاقہ جو برودت اور جمود و تعطل سے عبارت ہے، اسی لئے قدرت نے عمر صاحب کو حرارت ایمانی اور حرکت و عمل عطا کیا ہے۔

اس لئے جی چاہا کہ عمر صاحب سے کچھ باتیں کروں، کیا عجب کہ ان باتوں سے کام کرنے والے اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔

میرا پہلا سوال بدھسٹوں سے متعلق تھا، چنانچہ میں نے پوچھا کہ تصادم کے امکانات میں باہمی اعتماد کی فضا بنانے کی کوئی ترکیب آپ کے ذہن میں ہے؟ عمر بھائی یوں گویا ہوئے جیسے اس کے لئے تیار بیٹھے ہوں کہا کہ دیکھئے، ان کے ساتھ مل کر ہم نے سماج کی مشترکہ برائیوں سے لڑنے کا پروگرام بنایا، مثلاً کرپشن ہے، زنا ہے، رسومات میں فضول خرچی ہے گویا اصلاح معاشرہ سے متعلق ایک خاکہ ہم نے بنایا اور الحمد للہ ہمارے بدھسٹ بھائیوں نے بھی اس میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور کر رہے ہیں، ہم نے ان سے کہا کہ شمشان گھاٹ ہو یا قبرستان، دونوں میں گندگی اور گندے کاموں کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے، موت کو یاد دلانے والے یہ مقامات جوا اور فحاشی کے اڈے بن جائیں، یہ ہم سب کے لئے غیرت کی بات بھی ہے اور چیلنج کی بھی، چنانچہ اس کے خلاف مشترکہ مہم چلی اور الحمد للہ نتیجہ خیز رہی، اسی طرح بجلی کے غیر ضروری استعمال کے خلاف ہم نے رائے عامہ ہموار کی سب نے اس کوتاہی کو محسوس کیا اور اس کی مثبت اثرات مرتب ہوئے......!

بات بدھسٹوں کی چل رہی تھی، میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کا تعاون کس حد تک آپ کے ساتھ رہتا ہے؟ عمر بھائی نے کہا خدا کا شکر ہے کہ ان کے یہاں مسجد کے اعلان کی بڑی

اہمیت ہے، وہ نہایت مؤثر ہوتا ہے۔منبر سے کہی ہوئی بات لداخ کے مسلمانوں کے نزدیک قابل قدر ہی نہیں ، قابل عمل بھی ہوتی ہے ، الحمدللہ مسلمان وہاں اجتماعیت سے رہنے کا ہنر جانتے ہیں چنانچہ وہاں اجتماعی کام بھی آسانی سے ہوجاتے ہیں مثلاً زکوٰۃ ہی کو لیجئے اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں اجتماعی زکوٰۃ کا نظام قائم ہے، مستحقین زکوٰۃ تک ان کا حق خاموشی سے پہنچا دیا جاتا ہے،عوام بھی اس کام کے کرنے والوں پر اعتماد رکھتی ہے شرعی کمیٹی کے ذمہ ایک کام مسلمانوں کے مابین تنازعات کا حل نکالنا بھی ہے، اسے بھی عامۃ المسلمین کا اعتماد اور احترام حاصل ہے، اس لئے اللہ کا شکر ہے کہ وہاں مسلمانوں کے معاملات اور تنازعات عدالتوں اور پولس تھانوں میں نہیں جاتے ، پہلے تو کوشش ہوتی ہے کہ انفرادی طور پر ہی مسئلہ حل ہوجائے ورنہ شرعی کمیٹی میں مسئلہ پیش ہوتا ہے، عموماً شرعی کمیٹی کا فیصلہ فریقین کے لئے قابل قبول ہوتا ہے، شرعی کمیٹی کے وقار اور وقعت کا یہ عالم ہے کہ عدالت میں مسئلہ پیش ہونے کی صورت میں وہ شرعی کمیٹی ہی کے فیصلہ کی توثیق کرتی ہے اختلاف کی صورت میں ہم فریق مخالف سے کہتے ہیں کہ وہ ندوہ اور دیوبند کو لکھے اور ان سے فیصلہ چاہے۔

لدّاخ کے مسلمانوں کے مابین اتحاد اور شرعی کمیٹی سے متعلق ان کے احترام واعتماد کی بات میں سن رہا تھا اور مجھے اپنے یہاں کی صورت حال کا خیال آرہا تھا، کس قدر مختلف ہے یہاں کی صورت حال، لدّاخ دینی تعلیم کے لحاظ سے بظاہر ایک پس ماندہ علاقہ ، علماء سے بڑی حد تک خالی علاقہ ،لیکن وہاں زکوٰۃ کا اجتماعی نظام بھی قائم اور شرعی کمیٹی اور اس کے فیصلے بھی قابل قبول......لیکن اس کے برعکس یہاں دینی تعلیم بھی عام اور علماء کی بھی کثرت ، لیکن افسوس کہ ایسے علاقوں میں نہ اجتماعی زکوٰۃ کا نظام قائم ہو پاتا ہے اور نہ ہی شرعی پنچایتیں یا دارالقضا اپنا کوئی اثر ہی رکھتی ہیں ۔معاً مجھے خیال آیا کہ ملت کے انتشار میں کہیں قصور تعلیم کا تو نہیں، ایسی تعلیم کا جو تربیت سے خالی ہو، ایسی تعلیم جو انسان میں انکساری و رواداری کے بجائے عجب و پندار اور خود پسندی پیدا کردے! نتیجہ میں آج ملت میں خود

ساختہ قائدین کی کھیپ تیار ہے جو ملت کو ایک ہونے نہیں دیتی ،لیکن خیر جانے دیجئے بات لداخ کی ہو رہی تھی ، بلندیوں پر آباد علاقہ کی بات...... بلند علاقہ کی بات کو بھی بلند ہونا چاہئے !!!

عمر بھائی کہتے جا رہے تھے......’’وہاں مسلمانوں کی ایک انجمن ،انجمن معین الاسلام کے نام سے ہے، لیہہ کی جامع مسجد کا امام اس کا سرپرست ہوتا ہے، اس انجمن کا دائرہ کار اور دائرہ اثر لیہہ اور کارگل دونوں ضلعوں میں ہے، اس کے ماتحت مساجد کا نظام ہے، اوقاف ہیں، ان کی زمین جائداد کی نگرانی وغیرہ کے کام ہیں، انگلش میڈیم اسکول اس کی نگرانی میں چل رہے ہیں، مکاتب قائم ہیں، تو جب انجمن کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے تو اس میں امیر وغریب سارے مسلمان جمع ہوتے ہیں، اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں، کھلے دل سے سنے جاتے ہیں اور قابل قدر مشورے خندہ پیشانی سے قبول کئے جاتے ہیں ،مسلکی اختلافات کو چھیڑنے نہیں دیا جاتا، کوشش ہوتی ہے کہ مثبت طریقہ سے کام ہو مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے بلکہ اسے یوں کہتے ہیں کہ یہ کام مسنون نہیں ہے......‘‘

محسوس ہوا کہ معاملہ بدھسٹوں کا ہو یا مسلمانوں کا، عمر بھائی نے دونوں میں اپنے پروگرام کے لئے مثبت طرز اور مثبت طریقہ کار کو اپنایا ہے۔داعی اور مصلح کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ حکمت سے کام لیتا ہو۔اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے عمر بھائی نے مزید کہا......’’ہم نے طلباء میں امتحان ہال میں نقل نویسی کے خلاف مہم چلائی، اسی طرح شراب نوشی، سگریٹ نوشی اور گداگری کے خلاف ذہن بنایا، بدھ مت کی مذہبی تعلیمات میں شراب کو برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے، اس سے شراب کے خلاف چلائی گئی مہم کو بڑی تقویت ملی......‘‘

طلباء کی بات آئی تو میں نے پوچھا کہ وہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا ہے؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ لیہہ میں سینوں کے انگریزی میڈیم اسکول ہیں، الحمدللہ مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان پایا جاتا ہے، اس میں مسلم ڈاکٹرس اور انجینئرس بھی ہیں۔

تعلیم کے لئے طلباء کشمیر یونیورسٹی جاتے ہیں ۔بعض طلباء پونا میں بھی زیر تعلیم ہیں اعلی

عہدہ پر بھی مسلمان ہیں البتہ ان کا تناسب کم ہے SECMOL (اسٹوڈنٹس آف نیشنل اینڈ کلچرل موومنٹ آف لداخ) طلباء کی ہمت افزائی کرتی اور بساط بھر ان کے کام آتی ہے، اس کا آرگن ....LADDAKH MELO (آئینہ لداخ) کے نام سے جاری ہے۔

عمر بھائی انجمن کی اصلاحی و دینی اور SECMOL کی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں میں اہم کردار کرادارہے تھے، مجھے خیال آیا کہ یہ پوچھا جائے کہ وہاں کی مسلمان عورتوں کے معاشرہ کا کیا حال ہے؟ اس لئے کہ ان کی اصلاح کے بغیر انقلاب کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا، عمر بھائی نے افسوس کے ساتھ کہا کہ ہمارے یہاں آپ کے یہاں کی طرح برقعہ کا رواج نہیں ہے، البتہ یہ بات قابل اطمینان ہے کہ عورتوں میں بے حیائی نہیں ہے، سر پر دوپٹہ رہنے کا رواج ہے، یہ بات تشویش ناک ضرور ہے کہ سیاحوں (TOURISTS) کی آمد سے بے راہ روی کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔

''لیکن عورتوں کی تعلیم خصوصا دینی تعلیم کا آپ کے یہاں کیا نظم ہے؟'' جواب میں عمر بھائی نے کہا کہ لیہہ میں جامعۃ الصالحات مالیگاؤں کی تعلیم یافتہ چار عالمہ موجود ہیں، آٹھ دس بچیاں الحمدللہ رائے بریلی اور راجستھان میں بھی دینی تعلیم حاصل کر رہی ہیں، لیہہ میں ایک مدرسہ ہے جہاں حفظ کی تعلیم ہوتی ہے۔ ٹھیکسے گاؤں میں شعبہ حفظ میں ۸ طلباء زیر تعلیم ہیں، اس طرح تعلیمی بیداری آ رہی ہے، امید ہے کہ ان جلائے ہوئے چراغوں کی لو تیز تر ہوگی اور چراغ سے چراغ جلتے رہیں گے، عبدالقیوم ندوی، شبیر احمد ندوی، مولوی اصغر صاحب، مولوی بشیر صاحب، مولوی محی الدین بانڈے دینی و تعلیمی سرگرمیوں میں الحمدللہ مصروف عمل ہیں۔

تعلیم کے موضوع پر بات ہو رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ کیا لداخی زبان میں مسلمانوں کا بھی کچھ CONTRIBUTION اور ان کی بھی کچھ خدمات ہیں؟

جواب میں عمر بھائی نے کہا''...... ہاں! کچھ ہے، لداخی زبان کے ایک شاعر خواجہ عبد الحمید صاحب ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ بدھسٹ لداخی زبان کو اپنی زبان سمجھتے ہیں،

مسلمانوں کو لداخی زبان سیکھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

لداخی کا رسم الخط چینی رسم الخط کی طرح ہے، البتہ ایک زبان ہے بلتی، اس کا رسم الخط اردو ہے، اس رسم الخط کو متعارف کرانے اور عام کرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں......''

''کیا لداخی زبان میں اسلامی لٹریچر کے ترجمہ کا کام ہوا ہے......؟''

عمر بھائی نے جواب میں کہا''اس سلسلہ میں ابھی بہت سا کام ہونا ہے۔ حاجی عبد الکریم ملک مرحوم نے قرآن مجید کے پہلے پارہ کا لداخی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اسلامیات و دینیات کا جو بنیادی لٹریچر ہے اس کا ترجمہ ترجیحی بنیاد پر کرنے کی ضرورت ہے۔ لداخ کے ہمارے طلباء و طالبات اب دینی مدارس کی طرف رخ کر رہے ہیں، انشاء اللہ یہ ضرورت اللہ ان کے ہاتھوں پوری کرائے گا......'' ''اور لداخ میں اردو؟''

''اسکولوں میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، لیکن اس کے فروغ کے لئے ہمیں ذاتی محنت، توجہ اور فکرمندی سے کام لینا ہوگا......'' ''مسلمانوں کی معاشی حالت'' ''بحیثیت مجموعی ٹھیک ہے۔ زراعت تجارت اور ملازمت عموماً یہ مسلمانوں کے معاش کے ذرائع ہیں'' طالب علمانہ شان سے بیٹھے جواب دے رہے عمر بھائی سے میں نے آخری سوال کیا'' کیا آپ تقابلی مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں سے آپ کا واسطہ ہے تو comparative study تو آپ کے لئے ناگزیر ہے......''

اس پر عمر بھائی نے کہا''......جی ہاں! اخلاقیات کی بحالی کے لئے جو مہم ہم نے چلا رکھی ہے اس کے پرچار میں ہم بدھ مت کی تعلیمات کا بھی حوالہ دیتے ہیں، بلکہ حسب ضرورت لداخی زبان کے جو مشہور شعراء و ادباء ہیں ان کے اقتباسات اور اشعار بھی ہم QUOTE کرتے ہیں، اس سے ان کے اندر اپنائیت اور کشش پیدا ہوتی ہے۔

لداخ ریڈیو سے میرا ایک پروگرام ''اوتریز'' یعنی روشنی کے نام سے نشر ہوتا ہے جس میں میں عموماً اخلاقیات کا موضوع اپناتا ہوں، بیشک دین و مذہب سے متعلق بھی اس میں باتیں ہوتی ہیں......!

اسی طرح ہمارے یہاں LAS نام کی ایک تنظیم LADDAKH ACTION COMMITTEE ہے، وہ بظاہر چھوٹے موٹے اہم اور دوررس نتائج کے حامل کام کر رہی ہے مثلا سگریٹ نوشی کے خلاف اس کی مہم ہے،اس کی نگرانی میں جگہ جگہ مختلف Stickers لگے ہوتے ہیں مثلا YOR FOR NOT SMOKING THANK عمر بھائی گویا تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اللہ کا یہ مخلص بندہ......رب العلمین کا یہ بندہ اور رحمۃ للعلمین ﷺ کا یہ امتی عام سطح سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کس قدر فکرمندی اور حکمت و دانائی سے کر رہا ہے اس کے پیش نظر مسلمان، ہی نہیں انسان بھی ہیں ...... مجھے ہندوستانی مسلمانوں کا خیال ایک بار پھر آیا جنھوں نے یہاں کے مسائل کو ''ہندو مسئلہ'' اور 'مسلمان مسئلہ' کی عینک سے دیکھا اور سمجھا اس سے ہرگز انکار نہیں کہ یہاں مسلمان مسائل میں الجھائے گئے ،لیکن کاش مسلمان اپنے داعیانہ منصب اور داعیانہ شان کے ساتھ ملک کے مسائل کو ''بنی نوع انسان کی فلاح کی عینک'' سے بھی دیکھتے، بلا اختلاف مذہب وملت مشترکہ برائیوں کے خلاف مخلصانہ لڑائی چھیڑتے اور اس مہم کی قیادت کرتے تو جو لوگ آج ان کے حریف دکھائی دے رہے ہیں، کیا عجب تھا کہ وہ ان کے حلیف ہوتے بلکہ ان کی نسلیں بھی مسلمانوں کی احسان مند ہوتیں افسوس کہ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں شاید مسلمانوں کے مزاج نبوی سے کماحقہ، رہنمائی اور روشنی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی......!

اس تاثر کے ساتھ میں نے عمر بھائی سے اجازت چاہی، مصافحہ کیا، اس وقت ان کے چہرے پر نظر پڑی تو میں نے محسوس کیا چھوٹی چھوٹی آنکھیں رکھنے والے عمر بھائی کو رب کریم نے بصارت ہی نہیں بصیرت بھی دی ہے اور علم وعشق کا امتزاج بھی بخشا ہے۔ **ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔**

(ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ: اگست ستمبر ۲۰۰۰ء)